سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ سرگزشت کراچی

نومبر 2020ء

صفحات 290
قیمت 100 روپے

بانی
معراج رسول

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

انوکھی قسم: ایک سنگ دل ماں کی سچ بیانی

نگینے: پاکستان کے نامور ہنرمندوں کا ذکر خاص

زانِ آہن: اپنی محنت سے ارب پتی بن جانے والی دوشیزہ کی روداد حیات

گولڈن جوبلی نمبر

قارئین کرام / ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں

تمام قارئین کرام / ایجنٹ حضرات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

جنوری 2021ء میں کامیابی کے ساتھ اپنے **سنہرے پچاس سال** مکمل کرتے ہوئے **گولڈن جوبلی** منا رہا ہے۔

اس موقع پر ادارہ **322** صفحات پر مشتمل خاص نمبر شائع کر رہا ہے جس میں ہر کہانی کا خاص انداز اور دلچسپ مزہ صرف آپ کے لیے..... امید ہے ہماری یہ کاوش آپ سب کو ضرور پسند آئے گی۔

322 صفحات

قیمت 150/- روپے

سنہرے مصنفین کا جمگھٹ

احمد اقبال، طاہر جاوید مغل، نجمہ مودی، ناہید سلطانہ اختر، منظر امام، ایچ اقبال، اسما قادری، حسام بٹ، امجد رئیس اور ڈاکٹر ساجد امجد ایک ساتھ

اس کے علاوہ

سسپنس کلاسک میں طویل ترین سلسلہ دیوتا کے خالق "محی الدین نواب" کی یادگار تحریر کا انتخاب

(ادارہ)

07
مقبول عالم
سرگزشت
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

08
شہر خیال
گفت و شنید
مدیر/قارئین
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

16
زنِ آہن
شخصیت
زویا اعجاز
اس عورت کی داستان جس
نے غربت کو شکست دی

46
نور و نار
صوفی نامہ
زین مہدی
صوفیا کرام کے ایک اشارے
سے زندگی بدل جاتی ہے

69
پہلا مہم جو
مہم جوئی
رضوانہ نگہت
موت کی طرف
بڑھنے والے کی کتھا

69
باغی
تاریخ
[illegible]
محبت کیسی کیسی کہانیاں
جنم دیتی ہے

75
نگینے
فلم نگری
انور فرہاد
فلمی دنیا
کے شب و روز کا احوال

108
سفر پہلا پہلا
سفرکہانی
[illegible] اقبال
الفاظ کی جادوبیانی کا شہکار
ایک الگ انداز کی سفرکہانی

124
روسیاہ
معاشرت
عاطر شاہین
ایک شوریدہ سر نوجوان
کی جنوں خیزی

162
انوکھی قسم
پہلی سچ بیانی
فرح انیس
ماں نے اس کی زندگی
کو ویران بنا دیا

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جُملہ حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصّے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

* تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

WWW.PAKISTANIPOINT.COM

171

آہ......

دوسری سچ بیانی

عمران قریشی

لوگ کس طرح رنگ بدلتے ہیں، تحیّر انگیز کتھا

201

رقیب

تیسری سچ بیانی

کنول انصاری

ایک مرغا جو لڑکی کا رقیب بنا، دلچسپ داستان

215

محافظ

چوتھی سچ بیانی

سحر نسیم

ایک پولیس افسر کی انوکھی داستانِ دوستی

222

انعام

پانچویں سچ بیانی

خورشید زمان

محبت کے حقیقی معنی سے روشناس کرانے والا واقعہ

227

نفرت

چھٹی سچ بیانی

حسن جواد

ایسا عجیب و غریب شخص آپ کے آس پاس بھی ہوگا

231

کھیل

ساتویں سچ بیانی

انجم شوکت

اس شخص نے زندگی کو کھیل سمجھ لیا تھا

242

محبت

آٹھویں سچ بیانی

سنبل

ایک باولی سی لڑکی کا انوکھا اندازِ محبت

253

کاش

نویں سچ بیانی

ڈاکٹر سونیا

لڑکیاں ہی نادانی میں اپنی زندگی جہنم بنا لیتی ہیں

271

خبیث

دسویں سچ بیانی

ایم الیاس

ایسے خبیث انسان بھی ہمارے درمیان رہ رہے ہیں

**

پارچے

سوغات

قارئین / ادارہ

دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلوماتی انکشافاتی پارچے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 30 ❖ شمارہ 8 ❖ نومبر 2020ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

❖❖❖

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

❖❖❖

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 100 روپے ❖ زرِ سالانہ 1500 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ❖ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ہر دو تین سال بعد ہمارے دلوں کو پاش پاش کرنے کی سازش رچی جاتی ہے۔ ہر کچھ دنوں بعد ایک نیا فتنہ پیدا کیا جاتا ہے۔ سیدھا ہمارے دلوں پر وار کیا جاتا ہے تاکہ ہم غصے میں بھر اٹھیں، ہوش کھو بیٹھیں۔ غصے کو حرام اسی لیے کہا گیا ہے کہ غصے کے عالم میں انسان اپنا ہی نقصان کر بیٹھتا ہے۔ اپنے ہی املاک کو نقصان پہنچانا شروع کر دیتا ہے۔ بغور دیکھیں، مسلمانوں کے جذبات سے مسلسل کھیلنے کی کوشش نہیں ہو رہی ہے؟ کبھی خاکے تو کبھی اسمِ مبارک کی توہین کا ڈراما نہیں کھیلا جا رہا ہے؟

مقبول عالم

5 ربیع الثانی 1280ھ یعنی کہ 19 اگست 1863ء کو بوقت صبح اس بچے نے مولوی عبدالحق کے گھر جنم لیا۔ مولوی عبدالحق تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے اس لیے انہوں نے بچے کو ہوش مند ہوتے ہی پڑھائی کی جانب راغب کر دیا۔ ہر روز رات میں اسے گود میں لے کر بیٹھ جاتے اور اسے عربی ابجد کی پہچان کراتے۔ اپنے ساتھ وعظ کی محفلوں میں بھی لے جاتے۔ کچھ اور بڑا ہوا تو اسے ایک کھیل نے اپنا اسیر بنالیا۔ اسے جب بھی بازار بھیجا جاتا، وہ راستے میں آنے والی کسی نہ کسی مسجد میں داخل ہو جاتا۔ نو دس بجے مسجدیں خالی ہوتی ہیں۔ اسے موقع مل جاتا اور وہ منبر پر جا بیٹھتا پھر جو بھی ذہن میں آتا وعظ کے انداز میں بیان کرنے لگتا۔ گویا کہ وہ فنِ تقریر پر خود ہی عبور حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ پانچ سال کا تھا تو والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسے تائی اماں محبت و شفقت کے سایے میں پروان چڑھا رہی تھیں۔ کچھ اور بڑا ہوا تو اسے والد نے کانپور کے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ یہیں سے اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ اس نے اپنی زندگی کو اسلامی اصولوں پر پابند کرنا شروع کر دیا۔ ابھی طالبِ علم تھا پھر بھی لوگ اسے بصد شوق بلاتے۔ اس سے پند و نصائح کی باتیں سنتے۔ جب وہ لوگوں کی فرمائش پر زیبِ منبر ہوتا تو محفل پر سکتہ طاری ہو جاتا۔ لوگ اس کے بیان کے سحر میں اس طرح کھو جاتے کہ اگر منہ کھلا ہے تو کھلا رہ گیا۔ بچپن کا شوق جوانی میں کام آ رہا تھا۔ علم کا ایک دریا فصاحت و بلاغت کا سیل رواں تقریر میں ہوتا۔ کانپور ہی نہیں دور دور کے شہروں میں بھی اسے بلایا جانے لگا تھا پھر اس نے کانپور سے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور کچھ دنوں بعد وہاں سے مکہ مکرمہ کا قصد کیا۔ مکے میں اچھا وقت گزرا۔ واپس آ کر دوبارہ دیوبند کا رخ کیا۔ اس دوران ایک کتاب لکھی جو دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کے ہر گھر کی ضرورت بن گئی۔ لوگ شادی بیاہ میں بھی جہیز کے ساتھ وہ کتاب دینے لگے تھے جبکہ ان کی ایک اور کتاب مقبول ہو چکی تھی۔ بیان القرآن مقبول ضرور ہوا تھا مگر اس کتاب جیسی شہرت حاصل نہ کر سکی تھی۔ اس کتاب کو لکھنے کی اصل تحریک بیگم نے دی تھی۔ جس طرح وہ دنیا پر دین کو ترجیح دینے والے تھے اسی طرح ان کی بیگم بھی دنیا کو صرف ایک امتحان گاہ سمجھتی تھیں۔ جس نے جو کہا اس پر یقین کر لیا۔ جس نے جو مانگا دے دیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ مقروض رہتیں۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ان پر بہت زیادہ قرضہ چڑھ گیا۔ یہ خبر ان تک پہنچی تو انہوں نے بیگم سے کہا۔ ''اگر موت آ گئی تو سر پر بار رہے گا۔'' بیگم نے ترنت جواب دیا۔ ''آپ ادا کر دینا۔'' انہوں نے کہا۔ ''اگر ہم دونوں کی موت ایک ساتھ ہوئی تو؟'' بیگم نے جواب دیا۔ ''مجھے دعا پر کامل اعتماد ہے، آپ دعا کر دیں۔'' اس کے اگلے ہی دن اعظم گڑھ سے بلاوا آ گیا۔ وہ وہاں پہنچے تو نذرانے میں جمع شدہ رقم ایک ہزار ملی۔ یہ رقم انہوں نے گھر آ کر تھما دی کہ یہ تمہاری دعا کا نتیجہ ہے، فوراً قرض ادا کر دو اور آئندہ احتیاط کرنا۔ اس معروف عالم دین کی تدوین و تصنیف کی تعداد 345 ہے جس میں سب سے مقبول کتاب ''بہشتی زیور'' ہے۔ انہیں ہم مولانا محمد اشرف علی تھانوی کے نام سے پہچانتے ہیں۔

.....☆.....☆.....☆.....

شہر خیال

مدیراعلیٰ

☆رانا محمد شاہد کی بورے والا سے آمد ”اس دفعہ بھی سرگزشت کا بنڈل 13 اکتوبر کو ڈاک خانے سے لایا۔ حالانکہ نیوز ایجنسی والے نے تو 12 تاریخ کو فون کرکے کہا تھا کہ آج سرگزشت آگیا ہوگا لیتے آنا۔ مگر جب پتا کیا تو نہیں آیا تھا۔ آپ نے مختلف ڈائجسٹوں کی جو تاریخیں دی ہیں۔ ان کے مطابق نہیں مل رہا۔ سرگزشت کی 3 تاریخ بتائی گئی ہے اور 13 کو مل رہا ہے۔ (لاک ڈاؤن کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوئے ان پر قابو پانے کی مسلسل کوشش جاری ہے انشاءاللہ جلد تمام پرچے وقت پر آجائیں گے) اداریے میں کتاب کے حوالے سے ہمارے رویے کی بہت بہتر عکاسی کی۔ ویسے بھی ہمارا شمار ان قوموں میں ہوتا ہے جو ایک وقت کے کھانے پر 5 ہزار خرچ کردیتے ہیں جبکہ 5 سو کی کتاب کے لیے سوچتے رہتے ہیں۔ جہاں جوتے، شیشوں کے باکس میں پڑے ہوں اور کتابیں فٹ پاتھ پر وہاں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس قوم کو کتابوں سے زیادہ جوتوں کی ضرورت ہے۔ اشفاق احمد نے کہا تھا۔ ”اس قوم کو علم و حکمت کی کیا قدر جو مہنگا جوتا خریدنے میں فخر اور سستی کتاب لینے میں دقت محسوس کرے۔ ایسا کیوں نہ سمجھا جائے کہ اس قوم کو کتابوں سے زیادہ جوتوں کی ضرورت ہے۔“ ڈاکٹر یاور عباس کی یک صفحی سرگزشت دلچسپ رہی۔ قسمت میں میری چین سے جینا لکھ دے، ان کی یہ نعتیہ رباعی تو بہت مرتبہ قوالی تاجدار حرم میں سنی۔ شہر خیال میں آفتاب احمد نصیر کا خط دلچسپ تھا مگر انہوں نے اپنی تعریف جس انداز میں کی وہ کچھ عجیب سا لگا۔ انہیں 25 سال ہوگئے ہوں گے تو ہم نے بھی شہر خیال میں پہلا خط 96ء میں لکھا تھا۔ دوسری دو باتوں، کہ سال میں تین مرتبہ مسند صدارت اور گیارہ گیارہ خطوط والی بات کا اعزاز تو ہمیں بھی حاصل ہے اور شاید شہر خیال کے کچھ اور باسی بھی نکل آئیں۔ یہ اعزاز اگر ادارے کی طرف سے ہوتا تو وہ یہ اعزازات گنوا سکتے تھے اسی لیے میں نے روبینہ نفیس صاحبہ سے کہا کہ وہ جسے چاہیں دیں۔ یہ انہی کا استحقاق ہے۔ میری کوئی بات آفتاب صاحب کی طبیعت پر گراں گزری ہو تو معذرت چاہوں گا۔ سلمان بشیر قلمی سفر میں مشکلات تو آتی ہیں اور آپ نے صحیح کہا کہ ریجیکٹ ہونے کے بعد سلیکٹ ہونے کی خوشی ناقابل بیان ہوتی ہے جو کبھی گرا نہیں اسے کیا معلوم کہ گرنے کے بعد اپنی صلاحیت پر کھڑے ہونے والے ہی کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ فرح انیس اگر آپ کی کہانی ٹائٹل اسٹوری کے طور پر لگی ہے تو یقیناً اس میں دم خم ہوگا۔ بقول بلگرامی صاحب کہ اچھی تحریر خود اپنی جگہ بناتی ہے۔ انیلہ ظفر، عاطر شاہین اور سید امتیاز حسین بخاری کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ ماسٹر بسیم الدین غوری سینئر لکھنے والے ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں وہ لکھتے رہے ہیں تو میرے خیال میں انہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ کیا میں کہانی بھیج دوں؟ اس لیے کہ آپ کی تحریر بولتی ہے۔ ہاں کسی خاص موضوع کے حوالے سے پوچھنا ہو تو الگ بات ہے۔ مجھ سے اگر کوئی نیا لکھنے والا پوچھتا ہے کہ میں فلاں رسالے میں تحریر بھیجوں شائع ہوجائے گی تو میرا جواب یہی ہوتا ہے کہ اگر آپ کے لکھے الفاظ میں روانی اور جان ہوگی تو آپ کو نام اور پہچان بنانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اعجاز حسین سٹھار کا تبصرہ بھی بھرپور رہا۔ اس دفعہ زویا اعجاز معروف مسلم تاریخ داں ابن خلدون کی سرگزشت کے ساتھ حاضر تھیں۔ مختلف واقعات اور تحریر کی روانی قاری کی دلچسپی کو بڑھادیتی ہے۔ ویسے قاضی البساطی اور ان کے ساتھیوں نے یہ غلط کہا کہ وہ بے

نام ونشان مر گیا اس لیے کہ حق اور سچ کے ساتھ کھڑے ہونے والے لوگ کبھی نہیں مرتے۔ زندہ رہتے ہیں۔ دلوں میں بھی اور تاریخ میں بھی۔ دیکھ لیں جسے وہ گمنام اور بے نام ونشان کہہ رہے تھے۔ ان سازشیوں کا نام بھی ابن خلدون کے اصول و کردار کی بدولت لیا جارہا ہے۔ ایک حسینہ کی خاطر ہزاروں نوجوانوں کا مارا جانا یا مختلف جنگوں کا ہونا، تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ بیبرک کارمل جمالی کی تحریر دلچسپ رہی۔ منظر امام کی تحریر دو دل ہارے، رلا دینے والی تحریر تھی۔ جب دو دل مل گئے دونوں نے ایک ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیماں کر لیے تو کیسے اچانک آنے والی آفت نے سب کچھ ختم کر دیا۔ ویسے تو سائمن کی موت کے ساتھ ہی پیٹرا بھی مر گئی تھی کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتی تو اس کی یادیں اکٹھی نہ کرتی پھرتی اور اس کے غم میں اپنے وجود کو یوں نہ گھسیٹتی کہ وقت کا ہر ہر لمحہ اس کے نام کر دیتی۔ اس داستان کا دلچسپ پہلو یہ رہا کہ دو محبت کرنے والوں کی جدائی کا سبب 2004ء میں بنکاک کے جزیرے میں آنے والا سونامی بنا۔ منظر امام صاحب کو اس ناول کا نام بھی بتانا چاہیے تھا جو پیٹرا نے اپنے محبوب سائمن کی جدائی میں لکھا۔ انہوں نے اس کتاب کا نام بھی نہیں بتایا جو پیٹرا نے اپنے بچپن کے حالات اور ماحول کو سامنے رکھ کر لکھی تھی۔ انور فرہاد کے مضمون میں مہناز کے حالات زندگی پڑھی۔ ''چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نینا'' اور ''میں جس دن بھلادوں ترا پیار دل سے'' تو ان کے مقبول عام گیت تھے مگر سچی بات بتاؤں کہ تیرا پیار میرے جیون کے سنگ رہے گا، کے بول پڑھ کر مہناز کا گاتے ہوئے چہرہ سامنے آ گیا۔ شاید اس لیے کہ پی ٹی وی کے سنہرے دنوں میں ان کا یہ گیت بہت بار سنا تھا۔ ردا حسن عابدی کا انوکھا اور دل کو چھو لینے والا واقعہ مشہور واقعہ ہے اور پہلے بھی کہیں پڑھا ہے مگر ردا صاحبہ نے اپنے انداز بیاں سے اس میں خوب صورتی بھر دی۔ روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والی اس داستان کے آخری پیرا گراف سے تو دل بھر آیا۔ ابو عبداللہ نے صحیح کہا تھا جو نعمتیں دنیا میں نہیں مل سکتیں وہ آخرت میں منتظر ہوتی ہیں۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وہ نعمت فیروزاں تھی۔ ارشاد حسین نے عالمی شہرت یافتہ رائٹر اور مفکر برنارڈ شا کی زندگی کے حوالے سے مختصر موثر تحریر لکھی۔ اتنے بڑے لکھاری کی درجنوں تحریریں مسترد ہوئیں۔ اوپر تلے لکھے پانچوں ناول مسترد ہوئے۔ اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ یہ سبق ہے نئے لکھنے والوں کے لیے کہ جو چند تحریریں نہ چھپنے پر مایوس ہو کر لکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ابو الفرح ہمایوں نے ایک ریڈیائی ڈرامے کو دلچسپ انداز میں لکھا۔''

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کا تبصرہ بھکر سے ''اکتوبر کا سرگزشت وقت پر ملا لکھنے میں دیر ہو گئی۔ موسم کی بدلتی کیفیت نے اتنا اثر ڈالا کہ طبیعت بوجھل سی رہنے لگی ہے۔ سرورق اچھا لگا۔ آگے بڑھے تو مدیر شکوہ کناں نظر آئے اور یہ شکوہ بھی حقیقت اور سچائی پر مبنی ہے۔ مطالعہ کا شوق دن بہ دن کم ہوتا جارہا ہے۔ بچے، بڑے سب ہی موبائل اور ٹی وی میں مصروف رہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بڑے خود ہی بچوں کو موبائل کا عادی بناتے ہیں اور خود ہی گلہ کرتے ہیں۔ ایک کمرے میں تین، چار افراد ہوں تو بھی ایک دوسرے سے بے گانے ہوتے ہیں۔ موبائل میں اتنے مصروف کہ اپنے آس پاس کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ آپ مطالعہ کی بات کرتے ہیں یہاں تو اپنوں کو ٹائم دینے کا بھی ٹائم نہیں ہوتا۔ اللہ پاک رحم فرمائے، ہم سب کے حال پر (آمین) شہر خیال کے باسیوں کیسے ہیں آپ سب۔ بشریٰ افضال کیسی ہیں آپ؟ آفتاب احمد صاحب میرا پوچھنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ جو اس حق کے قابل ہے اس کو ضرور دیا جائے۔ آپ نے اتنی تفصیل سے اپنی بات بیان کی کہ ہم نے آپ کو اس اعزاز کے لیے چن لیا۔ باقی 2 افراد رہ گئے پلیز اس کے لیے بھی میری رہنمائی کریں۔ قیصر خان تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ رانا محمد شاہد، حوصلہ افزائی کرنے کا شکریہ۔ آپ نے کہا کہ یہ 3 ماہ کا سرگزشت تحفہ دینا میرا حق ہے۔ آپ کی بات بجا ہے جس کے خطوط شہر خیال میں اول نمبر پر ہیں۔ وہ اس اعزاز کے لائق ہے۔ مدیر محترم اس بارے میں امید ہے میری رہنمائی کریں گے لیکن یاد رہے یہ اعزازی تحفہ صرف شہر خیال والوں کے لیے ہے۔ کہانیوں میں ''سیاست'' نے متاثر کیا۔ آج کل تو تقریباً سب ہی سیاست دان مطلب پرست اور خود غرض نظر آتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے تو عوام کو نہ جانے کیسے کیسے سنہری خواب دکھاتے ہیں۔ یہ عوام کو بے وقوف بنا کر ان کے مستقبل کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ بے چارے لوگ ان کے بہکاوے میں آجاتے ہیں اور جب منصب کرسی پر براجمان ہوتے ہیں تو سب وعدے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ بے چارے عوام پھر سے مہنگائی اور بڑھتے ہوئے مسائل میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ کاش سب سیاست دان سید شیر شاہ جیسے سچے اور عوام دوست ہو جائیں تو وہ دن دور نہیں جب پاکستان اور اس کی عوام

دنیا میں نمبر ون ہو جائیں گے۔ جائیں تو جائیں کہاں، علی عمران کی اچھی کاوش ہے۔ اس ملک میں قانون تو نہ ہونے کے برابر ہے اگر غلطی سے کسی کو انصاف مل بھی جائے تو سمجھ لیجیے معجزہ ہو گیا تھا۔ کسی بھی دہشت گرد مجرم کو سزائے موت نہیں ملتی۔ میں بولتی ہوں کہ چند دہشت گرد مجرموں کو سرعام پھانسی دی جائے تو ممکن ہے کہ اس ملک سے مجرموں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر رہ جائے۔ سفر پہلا پہلا، پر تبصرہ فون پر بھی بتایا تھا یہاں بھی لکھ رہی ہوں کہ ندیم اقبال کے قلم میں جادو ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ زویا اعجاز بھی خوب لکھ رہی ہیں۔''

☆ایم فرحان انصاری نے سبزی منڈی بھکر سے خط بھیجا ہے ''میں کافی عرصے سے سرگزشت کا خاموش قاری ہوں۔ سرگزشت میں موجود کہانیاں مجھے بے حد پسند ہیں یہی وجہ ہے کہ مجھے ہر ماہ بے چینی سے سرگزشت کا انتظار رہتا ہے۔ شہر خیال میں سب ہی دوست بہت عمدہ انداز سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے شہر بھکر سے روبینہ نفیس لکھتی ہیں جن کے تبصرے پڑھ کر مجھے بھی شوق ہوا لکھنے کا۔ کچھ ماہ سے سوچ رہا تھا اب ڈر بھی تھا کہ پتا نہیں میرا تبصرہ شامل اشاعت ہوتا بھی ہے یا نہیں پھر روبینہ نفیس صاحبہ نے میری حوصلہ افزائی کی اور میں لکھنے بیٹھ گیا۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ بھی لکھنے کی جسارت کروں گا۔ باقی مجھے آفتاب احمد نصیر، انیلہ ظفر، رانا محمد شاہد، ارباب خان اور اعجاز حسین ستھار کے تبصرے بہت پسند آئے۔ بازی، کہانی نے حوصلہ دیا۔ حالات جیسے بھی ہوں اگر ثابت قدم اور ہمت کا دامن نہ چھوٹے تو حالات خوشگوار موڑ پر آجاتے ہیں۔ برا کرنے والے کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ مونا شہزاد، نے اپنے قلم سے حقیقتوں کو روشناس کروایا ہے۔ رشتوں کا پاس بہت کم لوگ رکھتے ہیں شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ کچھ نیک اور اچھے لوگوں کی بدولت دنیا قائم ہے۔ انسان وہی کامیاب ہوتا ہے جو سب رشتوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ کیا خیال ہے آپ سب کا؟''

☆نزاہت افشال، گاؤں مہورہ فتح جنگ اٹک سے لکھتے ہیں ''ستمبر کا شمارہ بڑے انتظار کے بعد ملا۔ یک صفحی سرگزشت متاثر کن تھی ایسے نوجوان ہمارے ملک اور ہماری قوم کا سرمایہ ہیں۔ اداریہ بھی عمل کی تلقین کر رہا تھا۔ زویا اعجاز قوم کی خاطر جان نذر کرنے والے عظیم سپوت آکاش کی بہادری کی داستان بہت اچھے انداز میں بیان کر گئیں۔ موساد کا شکار بھی معلوماتی تحریر تھی۔ سفر پہلا پہلا، اپنی جادو گری قائم رکھے ہوئے ہے۔ ندیم صاحب بہت ہی مہارت سے اپنی واردات قلبی کو بیان کر دیتے ہیں۔ ویسے کیا ہی اچھا ہوتا کہ ندیم اقبال صاحب قندِ فارس، یعنی نسرین کی اور اپنی کہانی دوبارہ سے شروع کرتے۔ یوں سفر نامہ بھی مکمل ہو جاتا اور قارئین کرام کی تشنگی بھی دور ہو جاتی۔ قیدی شہنشاہ، مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی داستان المناک تھی، حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اور نگزیب عالمگیر پر تمام ہو گئی تھی۔ بعد ازاں باقی بس رسمی بادشاہت تھی۔ بہادر شاہ ظفر سلطنت سے محروم ہو کر گمنام نہیں ہوا بلکہ اپنے کلام کی بدولت اس کا نام زندہ رہے گا۔ ایک تصحیح ضروری ہے'' نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں، کسی کام میں جو نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں'' یہ غزل ظفر کی نہیں بلکہ مضطر خیر آبادی کی ہے۔ (جی ہاں، یہ غزل مضطر خیر آبادی کی کلیات میں شامل ہے مگر اسے گانے والوں نے بہادر شاہ سے منسوب کیا تو یہ ابہام پھیلا) سچ بیانیوں میں ایک تھی حسینہ، پڑھ کر آنسو نکل آئے۔ ہم انسان بھی کتنے ظالم ہیں۔ حالانکہ شکلوں اور عمروں میں کچھ نہیں رکھا۔ ذہنی ہم آہنگی، اچھی سیرت اور اچھے اخلاق والی شریک حیات کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ فائدہ، پڑھ کر حیرانگی ہوئی، اللہ اللہ دنیا کیسے کیسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ ملامتی عورت، بہترین اور سبق آموز تحریر تھی۔ آصف اور تنویر بھٹی جیسے لوگ مرد کے نام پر دھبا ہیں بلکہ شیطان کے بھائی ہیں۔ ماورا جیسے بھی تھی آخر اس کے اندر کی ماں تانے اپنی بیٹی کے لیے اسے کچھ کرنے پر اکسایا۔ اکلوتا شوہر اور دست راست بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرنے والی تحریریں تھیں۔ فاروق اور سردار نے غریب کرم دین کے بیٹے کو قتل کر کے دریا برد کر دیا تھا آخر کار کرم دین نے بدلہ لے ہی لیا۔ دو راہیں اور باقی سچ بیانیاں بھی لائق مطالعہ تھیں۔ شہر خیال میں ستھار صاحب کو صدارت پر موجود پایا۔ طویل اور بامعنی تبصرہ تھا۔ ارے یہ کیا یہ سدرہ بانو نا گوری خاموشی سے سدرہ نعمان ہو گئی اور ہمیں بتایا تک نہیں۔ یہ تو شہر خیال کے بہن بھائیوں کے ساتھ دھوکا ہوا نا۔ آفتاب نصیر اشرفی صاحب حاضر تھے مگر چھوٹی گڑیا صبح آفتاب نہ تھی۔ آفتاب نصیر صاحب آپ اکبر کے حوالے سے وہ تحریر مجھے بھیجیں شکر گزار رہوں گا۔ رانا شاہد اور قیصر خان بھی اپنے اپنے انداز میں حاضر تھے۔ ارے یہ بشریٰ افضل ہیں، خوش آمدید۔ پیاری بہنا اگر آپ 2019ء اور 2018ء کے سرگزشت کے شہر خیال ملاحظہ کریں تو آپ کو پتا چلے گا کہ آپ کے اس چھوٹے بھائی نے آپ کو سب سے زیادہ یاد کیا۔

اب غائب نہ ہونا ورنہ اغوا کرلیں گے ہم آپ کو۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، آپ بہت عظیم انسان ہیں اللہ پاک آپ کے بھائی لیاقت حسین کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، (آمین) پچھلے شمارے میں کراچی کی ممتاز کنول کا خط پڑھا تھا۔ تب سے اب تک دل بے چین ہے دعا ہے کہ اللہ پاک ہماری اس پیاری بہنا کو سکون قلب اور صبر جمیل عطا کرے اور مرحومین کو بخشے۔ کورونا وائرس کی وجہ سے حالات کافی خراب تھے اس لیے میں شہر خیال میں حاضر نہ ہوسکا۔ لاہور سے میرے پیاری بہن زویا اعجاز کی خدمت میں بہت بہت آداب مع عقیدت واحترام۔ تمام قارئین کے لیے دعا گو ہوں۔''

☆سید امتیاز حسین بخاری چک نمبر 36 سرگودھا سے آئے ہیں ''دیدۂ زیب دلکش سرورق سے مزین ماہ اکتوبر کا سرگزشت مل گیا۔ یہ کمال کی بات ہے۔ اس سے پہلے تو کافی انتظار۔ کوفت اذیت، بوریت کا شکار ہو کر ملتا تھا۔ سب سے پہلے اس بار میں نے اپنے پسندیدہ اور محبوب سلسلہ مضامین کا مطالعہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا جو کتابوں کے بارے میں تھا کہ بک اسٹالوں پر اسلامی کتب کے نام پر انگلش کتب کی بھرمار ہوتی ہے اور اردو اسلامی کتب جو در حقیقت غیر اسلامی ہوتی ہیں بہت ہی کم ہوتی ہیں' بچے اور عورتیں ان ہی کتب کو پسند کرتی ہیں اور مطالعہ کرتی ہیں۔ ان کتابوں کی تعلیمیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوتی ہیں۔ عام قارئین دور ہوتے جارہے ہیں آپ نے اس کی واحد وجہ قومی زبان اردو سے بے اعتنائی، بے توجہی بتائی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے معاشرے کو سنوارنا سدھارنا ہے تو کتابوں سے رشتہ استوار اور مستحکم کرنا پڑے گا میں تو عرصہ پچاس سال سے کتابوں سے رشتہ استوار کیے ہوئے ہوں۔ میرا نام مع کلام ومضامین تعارف وتصویر ملکی وغیر ملکی اردو کتب میں شائع ہو چکے ہیں ہنوز سلسلہ جاری وساری ہے' موجودہ دور میں کتاب کی قیمت ایک ہزار سے پندرہ ہزار تک تجاوز کر چکی ہے۔ میں نے 4 ہزار 5 سو تک کی کتاب خریدی ہے۔ مطالعہ میرا پسندیدہ اور محبوب مشغلہ ہے مجبوراً کتابیں خریدنا پڑتی ہیں کیونکہ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا ہے۔ میں کتاب دوست اور انسان دوست ہوں۔ میں نظر کی کمزوری کی وجہ سے رات کو کتاب کو ہاتھ نہیں لگاتا دن میں پڑھتا ہوں۔ میں 71 سال کے پیٹے میں ہوں عالمی سطح پر معروف شاعر، ادیب، صحافی، محقق ہوں۔ شہر خیال میں داخل ہوا تو نئے اور پرانے دوستوں کے دلچسپ خطوط پڑھنے کو ملے، نئے دوستوں کو خوش آمدید! جی آیاں نوں نئے قارئین کی ہمت افزائی، عزت افزائی، حوصلہ افزائی، پذیرائی کیجیے گا تاکہ ان کے قلم اور تحریر میں نکھار، پختگی، شگفتگی آئے اور اچھے قلم کار بن سکیں۔ میں آفتاب احمد، نصیر اشرفی کی تجاویز، آرا، مشوروں سے اتفاق اور تائید کرتا ہوں اور متفق ہوں آپ نے شعر وشاعری، علمی آزمائش، ہیبت بازی کے سلسلے ختم کر دیے اب قارئین کو شہر خیال کے ساتھیوں کا تعارف کرایا جائے لکھاری خواتین ومرد کے انٹرویوز شائع کیے جائیں۔ (ہر پرچے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ جن شعرا، ادیب پر تحریر ہوتی ہے یہ کیا ہے؟) کراچی کا افتخار فلم نگری انڈسٹری کا طویل ترین تذکرہ بہت ہی معلوماتی تھا ہر لفظ سحر میں ڈوبا ہوا تھا۔ محترم انور فرہاد تو معلومات کا بے پایاں سمندر ہیں ایسی معلومات سے آشنا کیا کہ میں پہلے آشنا نہیں تھا۔ موسیقار اعظم سید نثار علی المعروف نثار بزمی یکتائے روزگار منفرد موسیقی کے شناور تھے اسرار ورموز سے بخوبی واقف تھے سونے پر سہاگا شاعری اور فن عروض میں مہارت نامہ اور عبور رکھتے تھے مدھر بھری رومانی مستانی دھنوں کے خالق اور کمپوزر تھے جو آج بھی کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ شہد ٹپکاتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ خوش گلو، شیریں آواز کے حامل گلوکار بھی تھے کسی قیمت پر معیار پر سمجھوتا نہ کرتے تھے سخت اصول پسند تھے۔ بلبل پاکستان کوئل کراچی، مہناز جو وصی علی اور کجن بیگم جیسی عظیم مرثیہ خواں کی قابل فخر بیٹی تھی اس کے بارے میں معلومات کے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ مجھے پہلی بار کنیز فاطمہ مہناز کا اصل نام معلوم ہوا اور بھرپور فلمی گیتوں کی معلومات ملیں۔ میں مہناز کے سارے مقبول گیتوں اور نغموں کو سن چکا ہوں۔ شاعروں اور موسیقار کے نام بھی سن چکا ہوں۔ ریڈیو، ٹی وی پر باقاعدگی سے سن رہا ہوں وہی نغمگی اور تازگی شرینی ہے جو کانوں میں رس گھولتا ہے اور زندگی خوب صورت اور حسین لگتی ہے۔ انگ انگ مستی میں ڈوب جاتا ہے دل سرور میں آنے لگتا ہے۔ قتیل شفائی کا یہ گیت موسیقار عنایت حسین کی کمپوزیشن میں مہناز نے کس درد اور سوز وگداز سے دلبریز دلی جذبات کے ساتھ جادوئی آواز میں گایا تھا'' گیت اداکارہ نشو پر فلم بند ہوا تھا مجھے بے پایاں پسند ہے اور میں گنگناتا رہتا ہوں ''دنیا ہزار ظلم کرے اس کا غم نہیں، مارا جو پھول تو نے وہ پتھر سے کم نہیں'' فلم اسٹار شاہین المعروف زیبا کی منفرد اسٹائل کی اداکاری اور فلموں کا تذکرہ جامع انداز میں کیا گیا ہے جو معلومات کا انسائیکلو پیڈیا ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے اداکار محمد علی وراسٹائل عظیم فنکار

تھے۔ ان کی انسان دوستی ضرب المثل تھی جو افتخار پاکستان تھے۔ براعظم پاک و ہند کے عظیم شعرا و اداکار نغمہ نگار رئیس امروہوی، جون ایلیا، محشر بدایونی، شاعر لکھنوی، سرور بارہ بنکوی، کمال امروہوی، صادقین، شاعر صدیقی، نسیم امروہوی، نجم آفندی دیگر بھی افتخار کراچی تھے۔ کراچی جو روشنیوں کا شہر تھا اور عالم میں انتخاب تھا۔ اس کی راتیں جاگتی تھیں اب مسائل کا گڑھ ہے۔ کراچی کی حالت زار دیکھ کر رونا آتا ہے۔ رقصِ شمشیر بہر ک کامل جمالی کی رومانی و جمالیاتی تحریر ہے جو بلوچ سردار میر چاکر اعظم رند اور میر لاشار خان المعروف میر گوہرام خان لاشاری کی رومانی عشقیہ داستان اور جنگوں کا احاطہ کرتی ہے، قابل مطالعہ ہے۔ جنگ جو شجاع، رند اور لاشاری قبائل کے معروف گاؤں میں ہی میں مقیم ہوں جو مردم خیز خطہ ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلح افواج میں کلیدی عہدوں پر فائز ہیں ہر شعبہ حیات میں ممتاز حیثیت پر چھائے ہوئے ہیں۔ خوشاب شاہ پور میانوالی سے لے کر سندھ، بلوچستان تک بلوچ قبائل آباد ہیں۔ لاشاری قبیلہ نے سالوں ڈیرہ اسماعیل خان پر حکومت کی ہے۔ رند قبائل نے بھی دریا خان ڈیرہ غازی خان پر صدیوں تک حکومت کی ہے۔ ان کی زبان سرائیکی ہے۔ بلوچستان کے بلوچ ان کو بلوچ نہیں مانتے جبکہ میر چاکر اعظم رند کا مقبرہ بھی پنجاب میں ست ٹھڑہ جواو کاڑہ اور ساہیوال کے درمیان وسیع خطہ ہے، میں ہے جو کہ مغل شہنشاہ ہندہمایوں نے ان کی فوجی خدمات کے صلہ میں دیا تھا۔ میر لاشار خان بنگال میں وفات پا گیا تھا اس کی قبر تک معلوم نہیں ہے۔ اولاد پاکستان کے چاروں صوبوں میں موجود ہے۔ ''دو دل ہارے'' منظر امام نے کمال خوبی سے لکھا ہے جس کی تعریف نہ کرنا کم ظرفی ہے۔ محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی۔ دل فگاراں رداحسن عابدی کی خوبی تحریر کی مظہر ہے جو داستان عشق کو خوب اجاگر کرتی ہے۔ علم و عرفان عطا کرتی ہے۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر ہے۔ سفر پہلا پہلا ندیم اقبال نے اس بار شعر و شاعری، سنگیت و نغمہ کا ایک خوب صورت امتزاج پیش کیا ہے جو ان کی اعلیٰ شعری ذوق اور سخن شناسی کی غمازی کرتا ہے، پڑھ کر بہت ہی زیادہ لطف آیا ہے۔ سنہرے لوگ ارشاد حسین کا اچھا شاہکار ہے۔ توہم پرستی گمجت کا کارنامہ تحریر ہے۔ روسیاہ، عاطر شاہین کی اقساط زبردست سنسنی خیزی پیدا کر رہی ہیں پڑھنے پر نشاط برستی ہے لطف آتا ہے۔ کتاب عشق، کنیز زہرا کا ناقابل فراموش تحریری شاہکار ہے۔ عشق اپنا مزاج رکھتا ہے تو وفا کر یا بے وفائی کر۔ بھرم، محمد وسیم نیازی نے بہت ہی متاثر کن انداز میں لکھا ہے' پڑھ کر بہت ہی شاد کام ہوا۔ ''دوڑ'' منیر الحسن صاحب نے کمال مہارت سے داستان محبت کو اجاگر کیا ہے، مثبت تحریر سے نوازا ہے خوش ہوا ہوں۔ پارچے، اقتباس بہت ہی زیادہ معلوماتی تھے۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ سرگزشت کے محدود صفحات کی وجہ سے مختصر تبصرہ کیا ہے اکتوبر کا شمارہ بہت ہی خوبیوں سے مزین ہے۔ آپ کا انتخاب عمدہ اور لاجواب ہے' ان شاء اللہ پھر حاضر ہوں گے۔ میں یہ لکھنا بھول گیا کہ طائر عرفان طویل ترین مقالہ تھا اور بے شمار معلومات کا حامل تھا۔ ٹھروندا ریت کا محترمہ سلمٰی اعوان کا طویل ترین مقالہ مشکل ترین ہے آسان لکھنا مشکل فن ہے۔''

☆ماسٹر رازق بخش ز کی آہیر کا خط جلال پور پیر والا سے ''سرگزشت اکتوبر 2020ء ملا۔ سب سے پہلے کہانی روسیاہ کا مطالعہ کیا۔ قسط کے آخر میں حیدر الماس کا انوا حیران کن ہے اور امریکا کے ویزے میں تاخیر ہو گئی ہے۔ سفر پہلا پہلا بات محبت سے شادی تک جا پہنچی۔ روسیاہ اور سفر پہلا پہلا آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ کتاب عشق ادھوری کہانی لگتی ہے۔ بازی کی نوشابہ بازی جیت گئی۔ مصیبتیں جھیل گئی بچوں کو پال گئی اور سدھار گئی۔ اس کا بدبخت بدنصیب خاوند بازی ہار گیا بلکہ کئی بازیاں ہار گیا۔ اگر اب پچھتایا ہو گا تو کیا فائدہ۔ دوڑ، کی صیغہ اچھی سوچ رکھتی ہے اس نے دو دوستوں کو ایک دوسرے کا رقیب بننے سے بچالیا اور اپنا گھر تنگ بسالیا، وہ سارے اب بھی دوست ہیں اور خوش ہیں۔ آخری سچ بیانی سیاست، ناقابل فراموش ہے علاوہ ازیں لمحہ آگہی، بھرم اور ہم نشین ٹھہرا۔ اچھی کہانیاں ہیں (آپ نے جس کہانی کی جانب اشارہ کیا ہے وہ نوٹ کر لیا ہے مصنف سے جواب مانگا ہے) بقیہ رسالہ یعنی مضامین زیر مطالعہ ہیں۔ سرگزشت کی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔''

☆اعجاز حسین ستھار کا تبصرہ نور پور تھل سے ''آفتاب نصیر اشرفی، سید امتیاز حسین بخاری اور رانا محمد شاہد نے یاد کیا، نیک جذبات قبول کریں۔ سرگزشت میں تحریر چھپوانے کے لیے کتنے قارئین بے تاب ہیں، پالیسی میں تھوڑی سی نرمی کر کے ان کی حوصلہ افزائی کریں جب یہ شجر پھل دینے لگیں گے تو ادارہ ہی فائدہ اٹھائے گا۔ کئی سلسلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے فلم نگری میں جا پہنچے اور انور فرہاد کی محنت کا نتیجہ کراچی کا افتخار، کا مطالعہ کیا۔ اب ماضی کے ہنرمندوں کا

ذکر کرتے ہوئے آہ نکل جاتی ہے، گو ہم نے زیادہ تعداد میں فلمیں نہیں دیکھیں، لیکن رسائل میں مضامین پڑھ کر معلومات ملی ہیں۔ دراصل وہ لوگ ایک جذبہ کے تحت کام کرتے تھے، ایک مقصد ذہن میں ہوتا تھا اور پورے گھرانے کے لوگ ایک ساتھ تفریح لیتے اور خوشیاں، طمانیت اور آسودگی سمیٹ کر گھر لوٹتے، ساری ٹینشن، دور بھاگ جاتی اور چہرے پر مسکراہٹ بسیرا کر لیتی اب جب سب اجڑ گیا ہے تو رونے دھونے، ماتم کرنے سے اپنا ہی نقصان ہو گا۔ انور فرہاد صاحب کئی ماہ سے فلموں سے متعلق ریکارڈ بیان کر رہے ہیں جبکہ ہنرمندوں کی ذاتی زندگی، جدوجہد اور معلومات پس پشت رہ جاتی ہیں براہ مہربانی اس پر ضرور توجہ دیجیے گا۔ پہلی سچ بیانی کتاب عشق نے واقعی ہم پر بھی عشق حقیقی کا رنگ چڑھا دیا ہے، ستارہ ناز کتنے پاک کردار اور صاف ذہن کی لڑکی تھی، دولت، شہرت، مصنوعی لب ولہجہ اور چکاچوند پسند نہ تھی وہ اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھل کر سادہ زندگی کی خواہاں تھی لیکن اسے پہلے خونی اور پھر اخلاقی رشتوں نے دھوکا دیا، کوئی اجڑ کر نئے سرے سے آشیانہ جوڑ لیتا ہے لیکن وہ بدقسمت رہی کہ خوابوں کا باغ یوں اجڑا کہ کوئی کونپل بحال ہونے کے قابل نہ رہی اس لیے اس کی زبان پر بہاریں واپس آنے کی دعا نہ آئی، خود کو ایسے بکھیڑے میں الجھایا کہ معبود سے قربت حاصل ہو گئی لیکن حسن، جوانی اور گھریلو سکون کی قربانی دینا پڑی، گو ظالم اور لالچی توصیف سزا پا چکا لیکن کتنی غریب بچیاں ستارہ ناز جیسی مقدس ہستی سے فیض حاصل کرنے سے محروم رہ گئیں، کنیز زہرہ نے خوب رنگ جمایا۔ تواتر سے شائع ہونے پر مبارک باد قبول کریں۔ لمحہ آگہی، میں رضوانہ نے جیسی راہ دکھائی ہے یہ مسائل کا آدھا حل ہے۔ دوسروں پر اپنی کمزوریاں ظاہر کرنے سے تماشا بن جاتا ہے لیکن ایسے پر تشدد ماحول اور ناانصاف لوگوں سے گزارہ کرنا، رشتہ استوار رکھنا اور بہتر مستقبل کی امیدیں پالنا بھی سراب ہے۔ آخر ایسے تھانے دار ٹائپ شوہر کے ساتھ پوری عمر گزارنے کا خواب ہی ہولناک ہے جو درندے کی فطرت رکھتے ہوں ان کے سدھرنے کے اسباب ڈھونڈنے ہوں گے تب برداشت، صبر اور جبر سہنے کے بعد روشن صبح کا انتظار خوشگوار تجربہ ہو گا۔ بھرم، میں کچھ دخل خونی رشتوں کی کشش کا ہے یہی محبت غالب آ گئی پھر بالا کی ماں بھی زندہ ہے اس کے احترام میں ہار ماننا پڑی اور یہ ایک آگ اور طوفان کا مزاج رکھنے والے انسان کا کتنی عقل مندی کا فیصلہ ہے کہ اپنی بات بھی رہ گئی اور دوسروں کے منہ بھی بند ہو گئے اور سب کسی انہونی آزمائش سے بچ گئے۔ ہاں اگر غزالہ ماں کو درمیان میں ڈال کر معاملہ افہام وتفہیم سے حل کراتی تو ایسا الجھا ہوا مسئلہ نہ تھا، آخر بالا نے بھی ہار مان لینی تھی اب تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جو ہوا، بہتر ہوا لیکن یاد گار شادی کا دھوم دھڑکا دیکھنے سے محروم رہ گئے۔ بازی، میں نوشابہ نے محنت، صبر کی اور فراز نے دھوکا دہی، عیاشی اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی فصل کاشت کی، ظاہر ہے جو بیج بویا، ویسا پھل ملا۔ میں فراز کی ہڈ حرامی، بے غیرتی اور نوشابہ کی احساس ذمے داری، لگن اور زندہ رہنے کی امنگ دیکھ کر حد سے زیادہ حیران بیٹھا ہوں، دونوں میں اپنی فطرت کے لحاظ سے غیر معمولی منصوبے اور صلاحیت تھی جس کا جی بھر کا استعمال کیا اور جھولیاں بھر کر فصل اٹھائی۔ فراز نے دوزخ خریدی، زمانے میں ذلالت کو گلے کا ہار بنایا اور برداشت کرنے کی وجہ سے نوشابہ کو جنت میں ٹھکانہ ملا اور اولاد کے سنگ کامیابی، سکھ اور معاشرے میں عزت ملی۔ ہم دونوں کرداروں کی تضاد طبیعت کے آئینہ میں اپنا حلیہ آسانی سے درست کر کے آسانیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم نشین ٹھہرا، بولنا منع ہے اور جے ڈی اپنے موضوعات کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں، واقعات الگ لیکن اصلاح کا پہلو نمایاں ہے۔ دوڑ، میں صحیفہ سادہ اور گھریلو لڑکی ہوتے ہوئے زمانہ شناس نکلی، بچپن کے دو دوستوں کو باہم ٹکرانے اور نفرت میں جلنے سے بچا لیا ورنہ کیا خبر جوانی کے جوش میں کسی کا نقصان ہو جاتا اور صحیفہ بھی بدنامی کی زد میں آ جاتی تو یہ رسوائی مستقبل کی زندگی اجیرن کر دیتی تب خاوند کا اعتماد حاصل کرنا مشکل ہو جاتا۔ اس نے ایسا منصوبہ ترتیب دیا کہ جو سب کے بھلے کے لیے تھا اور سب اپنی دنیا میں خوش اور کامیاب ہیں اور تعلقات میں گرم جوشی برقرار ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اپنے مقدر کے لکھے پر قناعت کرنے والے شکر گزار بندوں کے حصے میں کامرانی اور سکون آتا ہے۔ چار دیواری کے اندر کی راحتیں جیتے جی جنت کا مکین بنا دیتی ہیں۔ اس سے بڑھ کر نیک نیتی کا صلہ کیا ہو سکتا ہے ایسے کردار سے دوسروں کو بھی نیکی کی تحریک ملتی ہے۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی سے لکھتے ہیں ''محترمہ ضیا تسنیم بلگرامی صاحبہ کے حق ہماری دلی دعائیں ہمارے لبوں سے جاری ہو کر کئی مرتبہ عرش کی طرف جا چکی ہیں۔ اگر ہماری بے عملی کی وجہ سے قبول نہ بھی ہوئی ہوں گی تو خلوص کی

وجہ سے ان کے حق میں ذخیرہ ضرور ہو گئی ہوں گی۔ اس مرتبہ سسپنس میں حضرت جنید بغدادیؒ کا زندگی نامہ پڑھنے کو ملا جو ہمارے لیے نیا نہ ہونے کے باوجود روح کی سرشاری کا سبب بنا وجہ سلسلہ قادریہ کا ان کی ذات سے منسوب و منسلک ہونا اور پھر ہمارے سلسلہ اشرفیہ کا سلسلہ قادریہ سے جڑ کر اشرفیہ قادریہ کہلانا، ہمیں جب اشرفی ہونے کی سعادت حاصل ہوئی تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہمیں کن جیّد بزرگوں کی نسبت ملنے جا رہی ہے۔ بلگرامی صاحبہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں سلسلہ اشرفیہ چشتیہ و قادریہ کے کئی بزرگوں کے زندگی ناموں سے روشناس کرایا۔ ہر چند کہ ہم یہ تیرے پراسرار بندے، کئی دہائیوں سے پڑھ رہے تھے لیکن جب سے سسپنس میں ہم نے حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا تذکرہ پڑھا ہم بلگرامی صاحبہ کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔ خدا صحت و تندرستی کے ساتھ ان کی عمر دراز کرے، رسالہ قشیریہ میں ہم نے پڑھا تھا کہ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت ابو ثورؒ کے مذہب پر فقیہ تھے اور ان کی موجودگی میں ان کے حلقے میں فتویٰ دیتے تھے اس وقت آپ کی عمر بیس سال تھی۔ آپ فرماتے ہیں کہ جو تیرے اندر کی بات کرے اور تو خاموش رہے وہ عارف ہے۔ اسی طرح آپؒ نے فرمایا کہ لوگوں پر رسول اکرمؐ کی اتباع کے علاوہ تمام راستے بند ہیں۔ سسپنس کی تحریر پر رائے شہر خیال میں لکھنے کی وجہ اس ماہ زویا اعجاز کا طائر عرفان اور ردا احسن عابدی کا دل فگاراں ہے۔ ردا احسن نے صوفی ابو عبداللہ کی زندگی کی نفسانی اور روحانی کیفیات کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ دل موہ لینے والا تھا۔ بزرگانِ دین پر لکھی ہوئی چند سطریں بھی ہمارے اندر اتھل مچا دیتی ہیں دل فگاراں تو سرشاریت کا پہاڑ تھا جسے ہماری بصارت نے سر کیا اور بصیرت کی کثافت کو دھونے میں اپنا حصہ ڈالا، تکبر تو ویسے بھی ابلیس کا تخلیق کار ہے۔ صوفی ابو عبداللہ کو بھی دھتکارا جانا ضروری تھا۔ وحدت الوجود کا پجاری عشق کے سوز سے محروم تھا۔ عاشق بنا تو معلوم ہوا کہ شہ رگ سے بھی قریب ہونے والے کے لیے کتنا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ یعنی آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم، اب جو ہیں خاک انتہا ہے۔ فروزاں کے حسن کے لیے کافر ہو جانے والے ابو عبداللہ کی فروزاں اس کے رب کے عشق میں مبتلا ہو کر آتش کی پرستش سے تائب ہو کر سرخرو ہو گئی۔ سجدہ عشق ہو تو خدا نظر آتا ہے، خالی سجدوں میں تو دنیا ہی بسا کرتی ہے۔ زویا اعجاز کا طائر عرفان اپنی پرواز میں لاجواب تھا اور جس کی گرد کو افلاطون، ارسطو اور آئن اسٹائن نہ پا سکے ہمارا اس کی اڑانوں پر کیا اختیار ہو سکتا ہے۔ ابن خلدون کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں کا احاطہ کرنا شاید ہی کسی لکھاری کے بس کی بات ہو لیکن زویا اعجاز نے عربی ادب کے اس خدا کو کافی سہل بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا۔ زویا اعجاز اور ردا احسن دونوں نے اپنی ادبی حیثیت کی پختگی میں اضافہ کیا ہے دونوں کو ہماری بہت سی دعائیں۔ سفر پہلا پہلا حسب معلوم دلچسپی کے ساتھ جاری ہے۔ الفاظوں کی جادو گری نے کئی مرتبہ سحر زدہ کیا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ندیم اقبال کے لیے ہم ہر ماہ ذخیرہ الفاظ میں سے کون سے منفرد الفاظ چنیں جن سے ان کو سراہا جا سکے۔ شہر خیال میں ہمارا تبصرہ بہت شاندار تھا۔ پڑھ کر اپنی قابلیت پر دل فگاراں کی طرح تھوڑا سا اترائے اور ساتھ ہی توبہ بھی کر لی۔ بشریٰ افضال اور روبینہ نفیس صاحبہ وعدے کے باوجود غیر حاضر خدا خیر کرے۔ اعجاز حسین سٹھار اور رانا محمد شاہد حسب معمول چھائے ہوئے تھے۔ قیصر خان، سلمان بشیر، انیلہ ظفر اور سید امتیاز حسین بخاری کی بھی لکھائیاں پسند آئیں۔"

☆ قدیر رانا کا تجزیہ راولپنڈی سے "سرگزشت سے وابستہ تمام قارئین اور قلم کاروں کو دل کی گہرائیوں سے سلام قبول ہو۔ اکتوبر کا شمارہ اپنے دل فریب ٹائٹل کے ساتھ 15 اکتوبر کو مقامی بک اسٹال سے حاصل کیا۔ اس بار انور فرہاد صاحب، کراچی کا افتخار، لائے ہیں۔ انور فرہاد صاحب فلمی صحافت کے ایک بڑے ستون کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے پاس فلم اور اس سے وابستہ تمام لوگوں کا ایک خزانہ موجود ہے، اس مضمون میں انہوں نے 1957ء میں ریلیز ہونے والی فلم نور اسلام، کی ایک نعت کا تذکرہ کیا ہے۔ نعت کے بول، شاہ مدینہ، یہ نعت آج بھی روز اول کی طرح بڑے شوق سے سنی جاتی ہے انہوں نے اس نعت کو فیاض ہاشمی سے منسوب کیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ یہ نعت تنویر نقوی مرحوم نے کہی تھی کچھ عرصہ قبل نعیم ہاشمی مرحوم کے بیٹے خاور نعیم ہاشمی نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ یہ نعت نعیم ہاشمی کی ہے جو کہ بالکل غلط ہے۔ اس نعت کے شاعر تنویر نقوی مرحوم تھے اس فلم کی موسیقی حسن لطیف نے دی تھی۔ حسن لطیف صاحب ایک اور ٹیلنٹڈ موسیقار تھے۔ گو انہوں نے بہت کم کام کیا ہے لیکن جتنا بھی کام کیا۔ ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں رشید عطرے، ماسٹر عنایت حسین، صفدر، تصدیق حسین، خواجہ خورشید انور، چشتی جیسے موسیقاروں کی

موجودگی تھی 60 کی دہائی میں ریاض شاہد صاحب نے انہیں فلم سسرال میں چانس دیا حالانکہ ریاض شاہد، رشید عطرے کے بے حد اچھے دوست تھے مگر حسن لطیف نے ریاض شاہد کو مایوس نہیں کیا۔ اس فلم کا میوزک اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس فلم کے گانے آج بھی اپنی مقبولیت قائم رکھے ہوئے ہیں۔ فلم سسرال کے گانے، جس نے میرے دل کو درد دیا، مہدی حسن۔ جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا۔ نور جہاں۔ اس فلم کے خاص خاص اداکاروں میں کیلاش، یوسف خان، علاؤالدین، نگہت سلطانہ، دلجیت مرزا اور لہری شامل تھے۔ حسن لطیف مرحوم کی آخری فلم غالباً میری دھرتی میرا پیار تھی جو کہ 1969ء میں ریلیز ہوئی تھی اس خط کا مقصد کسی پر تنقید نہیں بلکہ ریکارڈ کی درستگی کرنا ہے۔ امید ہے آپ میری یہ گزارشات اپنے ماہنامے میں ضرور شامل کریں گے۔ باقی دیگر تمام کارکنوں کو سلام جریدے کی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔''

☆ قیصر خان بکھر سے رقمطراز ہیں ''اداریہ میں زبان کی ترقی کے بارے میں لمحہ فکریہ تھا لوگوں کے دماغ میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ انگریزی میں جو لکھا ہو گا وہ سچ ہو گا۔ باقی اردو میں سب کچھ سچ نہیں لکھا ہوتا ہے۔ یک صفحی میں ڈاکٹر یاور عباس کے بارے میں بہت کچھ جاننے کو ملا ہے واقعی اصل مسلمان تھے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے، (آمین)۔ خلیفہ اشرفی صاحب کو مبارکباں بہترین تبصرہ کے ساتھ صدارت پر تھے۔ ان کے علاوہ تمام تبصروں میں رسالہ کے ساتھ محبت کا اظہار دل سے تھی نئے لوگوں کو خوش آمدید اور غیر حاضر ساتھی کو آنے کی آرزو ہے۔ زویا اعجاز اس بار تاریخی تاریخ داں کی زندگی نامہ لے کر آئیں واقعی وہ بہت بڑے انسان تھے ان کی مشکلیں بھی کم نہ تھیں بڑے لوگ بڑی آزمائش۔ رقص شمشیر، جمالی صاحب نے تحریر میں چاشنی میں تھی دو دل ہارے، سونامی کے ساتھ بہت سے دل ٹوٹے ہیں اور یادیں اب جینے نہیں دیتی ہیں۔ سفر پہلا پہلا، انکل ندیم کے لفظوں، جملوں کی چاہت بڑھتی جارہی ہے بہت خوب انکل جی۔ کراچی کا افتخار، اس بار بھی ہمیشہ کی طرح تحریر بے مثال تھی۔ سنہرے لوگ، ڈراما، توہم پرستی، مضمون اچھے تھے۔ سچ بیانیوں میں کتاب عشق، لمحہ آگہی، بھرم، جائیں تو جائیں، سیاست بہت اچھی اور دل کو پریشان کرنے والی آپ بیتیاں تھیں زمانے میں ایسے کردار پڑھ کر انسانیت پر سے یقین اٹھتا جارہا ہے۔''

☆ سدرہ نعمان ناگوری کی آمد کراچی سے ''امید ہے کہ سبھی پڑھنے اور سبھی لکھنے والے خیر وعافیت سے ہوں گے ایک وہ وقت بھی تھا جب میں ہر ماہ باقاعدگی سے سرگزشت کا حصہ بنا کرتی تھی۔ شہر خیال کی رونقیں بھی عروج پر ہوا کرتیں دوستوں سے گپ شپ بھی ہوتی اور ہم سبھی کے پیارے معراج انکل میرے تبصروں کا انتظار بھی کیا کرتے، معلومات کا ایک وسیع خزانہ تھا جو مجھے سرگزشت سے ملا کرتا مگر اب..... نہ تو مجھے سرگزشت وقت مقررہ پر ملتا ہے اور نہ ہی میں وقت پر خط پوسٹ کر پاتی ہوں وجہ اس کی یہ ہے کہ مجھے سرگزشت ملنے کی صحیح تاریخوں کا علم ہی نہیں ہے آپ سے بارہا پوچھنا چاہا مگر میں نے خطوط اتنے لیٹ لکھے کہ وہ آپ تک پہنچنے کے بجائے راستے میں ہی کہیں ادھر ادھر ہو گئے۔ اب آپ سے ایک مرتبہ پھر میری مودبانہ گزارش ہے کہ براہ کرم آپ مجھے یہ بتادیں کہ سرگزشت کتنی تاریخ تک مارکیٹ میں آجاتا ہے اور خط لکھنے کی آخری تاریخ کیا ہے تاکہ میں اپنے قریبی ہاکر سے کہہ سکوں کہ وہ مجھے بروقت سرگزشت پہنچادیا کرے۔ (خط ہر ماہ کی پہلی تک مل جائے کچھ تکنیکی پرابلم ہیں جلد ختم ہو جائیں گی تو ان شاءاللہ وقت پر چہ ملے گا) ایک تھی حسینہ بے دکھی اور درد سے بھرپور تحریر، الفاظ کا چناؤ اتنے سلیقے سے کیا گیا کہ ہم حسینہ کو ابتدا میں سچ میں ہی حسینہ سمجھ بیٹھے مگر جوں جوں آگے بڑھتے گئے حسینہ کی بدصورتی اتنی خوب صورتی سے واضح ہوتی گئی کہ پڑھ کر روح تک لرز گئی پون صدی بعد، نے بہت دل دکھایا نئی نسل کی رنگ رلیاں، بیتی یادوں کے سارے نشان مٹا بیٹھی ایک یقین ایک اعتبار اور ایک جھوٹ دشمن کے ہاتھوں معصوم سی بسمہ کے سارے خاندان کو تہس نہس کر گیا میرے خیال میں اگر ان دونوں تحریروں کو سال کی سب سے بہترین سچ بیانیاں کہا جائے تو بے جانہ ہو گا اب اجازت دیجیے۔''

قارئین کے مسلسل اصرار پر انعامی سلسلے دوبارہ شروع کیے جارہے ہیں۔
تفصیل اندرونی صحافت میں ملاحظہ کریں۔

زنِ آہن

زویا اعجاز

خونِ جگر برفاب ہو تو ہر ظلم قابلِ برداشت ہو جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ایسا نہ ہوا۔ گوکہ وہ جنسِ ارزاں بن چکی تھی، راستے کا وہ پتھر کہ جس نے چاہا ٹھوکر لگا دیا پھر اسے خیال آیا کہ فکر دوراں تو بہرحال ہے تخریب حیات، اس لیے منزل جنوں کی آرزو کرو، سنوارو زندگانی کو، کارزارِ حیات میں سعی مسلسل کے ذریعہ ہی فتحیابی ممکن ہے۔ بس اس نے خود کو منوانے کی جتن شروع کر دی۔ اس کی یہ مشقّت شب و روز رنگ لائی۔ اس نے خود کو دنیا سے منوایا، دنیا کو باور کرایا کہ انسان اگر چاہے تو کیا نہیں کر سکتا۔

ایک باہمت دوشیزہ کی حوصلہ انگیز سرگزشت

چرچ میں ایسٹر کے تہوار کی خصوصی مناجات جاری تھیں۔

اہلِ علاقہ اپنے تئیں بہترین لباس میں ملبوس عقیدت واحترام سے چوبی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ غربت' محرومی' ذہنی کشمکش اور استحصال کی چکی میں پستے ان سبھی افراد کے لیے خدا ہی واحد اور آخری سہارا تھا۔ آج تو یوں بھی ان کے دلوں میں تمناؤں اور خواہشات کا ایک انبار موجود تھا لیکن فی الوقت ان کی نظریں اپنے سامنے کھڑی ایک تین سالہ بچی پر مرکوز تھیں۔ وہ بھی انہی کی طرح آبنوسی رنگ' پھیلی ہوئی قدرے چپٹی ناک' موٹے ہونٹوں اور کھردرے بالوں کی مالک تھی۔ اس کی باریک آواز میں بلا کا ٹھہراؤ اور چاشنی تھی۔ وہ اصل مطالب سے ناآشنا ہونے کے باوجود انجیل سے یاد کی گئی سطور بلند و دلنشین سروں میں دہرا رہی تھی۔

"Jesus rose on Easter Day,
Hallelujah,Hallelujah...
all the angels did proclaim"

اس کی نظریں گاہے بگاہے سامنے ہی پہلی قطار میں بیٹھی ستاون سالہ 'ہیٹی' پر مرکوز ہو جاتیں۔ ان سطور کو ذہن نشین کروانے کا اصل کمال ہیٹی کی 'چھڑی' کا تھا جو اس کے ننھے جسم اور ہاتھوں کو بے دریغ اپنا نشانہ بنایا کرتی۔ ہیٹی کی نگاہوں میں اعتماد' فخر اور سرشاری دیکھ کر اس تین سالہ بچی کو بے اختیار سکون محسوس ہونے لگا۔ اس کا انداز دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ آج پہلی مرتبہ کسی عوامی مجمع کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ باہمی نظروں کا یہ تبادلہ کچھ دیر یونہی جاری رہا۔ چند لمحوں بعد ہیٹی کے ساتھ بیٹھی عورت کاغذ کا پنکھا جھلتے ہوئے اس کی جانب جھکی اور سرگوشیانہ انداز میں کہنے لگی "یہ بچی تمہاری کیا لگتی ہے خاتون؟"

"میری نواسی ہے یہ۔" ہیٹی نے فخر سے بتایا۔

"بہت خوش قسمت ہو تم! اس بچی پر خداوند یسوع مسیح کا خصوصی کرم ہے ورنہ اتنی سی عمر میں زبان وکلام پر ایسا عبور کبھی کہیں نہیں دیکھا۔" وہ شدید متاثر ہوئی۔

"یہ عبور اور ہنر میری وجہ سے صرف میری محنت کی وجہ سے۔" ہیٹی کا سر فخر سے تن گیا۔

"خداوند تم پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔" عورت نے مرعوب ہو کر جواب دیا۔

"شکریہ۔ کبھی آنا میرے گھر۔ میں نے اپنی نواسی کو اور بھی بہت سے اقتباسات یاد کروا رکھے ہیں۔ اس کی میٹھی زبان تمہیں بے حد لطف فراہم کرے گی۔"

"کیوں نہیں......ضرور!" اس نے عقیدت سے کہا۔

مناجات ختم ہونے تک اس بچی نے وہاں موجود ہر ایک شخص کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اگلے چند ماہ میں ہی اسے چرچ انتظامیہ اور مقامی افراد کی جانب سے "The Preacher" کا خطاب دے دیا گیا۔ اس قصبہ میں وہ راتوں رات مشہور ہو چکی تھی۔

PakistaniPoint www.pakistanipoint.com

☆☆☆

''اوپرا......اوپرا......میری بات سنو!'' ایک متکبر آواز قدرے فاصلہ سے سماعت میں پڑتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ اعصاب پر ایک ہی لحہ میں شدید جھنجلاہٹ طاری ہوئی تھی۔

''ارے! تم سن کیوں نہیں رہی ہو؟'' دوسری پکار پر بھی اس کے قدم نہ رکے۔

''اوپرا! بد دماغ...... بدصورت چمگادڑ......تم کہیں بہری تو نہیں ہو گئیں؟'' ان القابات نے اس کے دماغ میں آتش فشانی کیفیت برپا کر دی لیکن وہ پھر بھی رک کے ہی نہ دی۔ اس کے عقب میں قدموں کی آواز تیزی سے نزدیک آتی محسوس ہونے لگی تھی۔ اگلے ہی پل ایک جھومتا ہوا شخص درشت تاثرات لیے اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔

''میں تم سے مخاطب ہوں اوپرا......تمہارا دماغ تو عرش پر رہنے لگا ہے...... کس بات کا غرور ہے آخر؟ چڑیل کہیں کی'' وہ قدرے نفرت سے اسے دیکھ کر بولا۔

''کیا تم مجھ سے بات کر رہے ہو؟ میں تو سمجھی کہ تم کسی اور سے مخاطب ہو۔'' اس کا اعتماد اور انداز غیر معمولی تھا۔ وہ چار سال کی عمر میں بھی بہت ذہین اور جارحانہ تیوروں کی حامل تھی۔

''اس سمجھ کے کیا کہنے بھئی! لگتا ہے تم میں دماغ نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں۔'' چالیس سالہ اسمتھ جھنجلا کر رہ گیا۔ وہ سفید فام، خوبصورت نقوش کا مالک اور آسودہ حال تھا۔ اس وقت ایک چار سالہ بچی کے پیچھے چلے آنے کا مقصد کوئی انسانی ہمدردی یا مثبت طرز عمل نہیں تھا۔ وہ نشہ آور مواد کے استعمال کا عادی اور اس وقت شدید وحشت کا شکار تھا۔

''میرے پاس تو دماغ موجود ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہاری کھوپڑی بالکل خالی ہے۔'' وہ تنک کر بولی۔

''شٹ اپ یُو......'' اسمتھ نے اسے نازیبا لقب سے نوازا۔ ''ہم سفید فام اپنی اجلی چمڑی کے ساتھ روشن دماغ کے بھی مالک ہوتے ہیں۔ یہ تو تم سیاہ فام لوگوں کا المیہ ہے کہ سیاہ چمڑی کے بعد دماغ میں بھی اندھیروں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

''آہا......تو روشن دماغ کے مالک اسمتھ! تمہیں اتنا بھی علم نہیں کہ میرا نام اوپرا نہیں 'اپرپا' ہے۔''

''اوہ ہاں......میں بھول گیا تھا۔'' اسمتھ گڑبڑا گیا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اس علاقہ میں اپرپا کا اصل نام دھندلاتا جا رہا تھا۔ اکثریت اسے 'اوپرا' کے نام سے مخاطب کیا کرتی۔ وہ بے نیازی سے کندھے اچکاتی آگے بڑھ گئی۔

''ارے رکو! میری بات تو سنو! چلو کھیلتے ہیں۔ میرے پاس بہت سے کھلونے ہیں۔'' اسمتھ اس کا بدن ٹٹولتے ہوئے بولا۔

''نہیں! تم سے بدبو آ رہی ہے۔ ماما کہتی ہے کہ بدبودار چیز خراب ہوتی ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''میرے پاس بہت سے فراک اور نئے کپڑے بھی ہیں۔ تمہیں تو ان کی ضرورت بھی ہے۔'' اس نے طنز کیا۔

''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' وہ تنک گئی۔

''اچھا! تو پھر آلوؤں کی بوری سے بنا یہ تھیلا کیوں پہن رکھا ہے؟'' اسمتھ نے قہقہہ لگایا۔

''یہ میرا لباس ہے۔ مجھے خداوند یسوع مسیح نے اس لباس کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس میں بھی میری ہی بہتری ہو گی۔'' اپرا نے غیر اختیاری طور پر ہو بہو ہٹی کے الفاظ دہرا دیے۔

''گندی نالی میں رینگنے والے کیڑوں سے بھی بدتر زندگی ہے تمہاری۔'' اسمتھ نے ایک اور کچوکا دیا۔ ''کیا اس پورے علاقہ میں کسی کو ایسا تھیلا نما لباس پہنے دیکھا ہے؟''

اوپرا کا ننھا سا دل خون ہو گیا۔ وہ بلاشبہ غیر معمولی ذہین اور اپنے ہم عمر بچوں سے زیادہ ذخیرہ الفاظ کی مالک تھی لیکن اس کے باوجود فی الوقت ایسی بدگوئی کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت کیسے ہو سکتی تھی۔

''سوچ کیا رہی ہو؟ میرے ساتھ چلو! تمہیں بہت سے کپڑے اور کھلونے مل سکتے ہیں۔'' اس کی ترغیب پر اوپرا نے بلا ارادہ وہاں سے دوڑ لگائی اور چند گز کے فاصلے پر موجود دو سیاہ فام عورتوں کے ساتھ چلنے لگی۔

''ارے! یہ تو ہٹی کی نواسی ہے ناں جو بائبل بہت خوش الحانی سے پڑھتی ہے۔'' ایک عورت نے فوری طور پر اسے پہچان لیا۔ وہ دونوں بہت دلچسپی سے اس کے ساتھ گفتگو کرنے لگیں۔ اسمتھ کا دل چاہا کہ اسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا کسی درخت پر پھانسی لٹکا دے لیکن اسی وقت چند دیگر راہگیروں کی آمد نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ وہ نسلی تعصب پر مبنی گالیاں دینے لگا۔

پچاس کی دہائی نے امریکی ریاستوں میں نسلی منافرت اور تعصب کا جن بوتل سے مکمل طور پر آزاد کر دیا

تھا۔عزت اور احترام کا دارومدار صرف رنگ و نسل کی بنیاد پر ہی قائم تھا۔جنوبی ریاستوں میں یہ صورتِ حال مزید ابتری کا شکار تھی۔ریاست مسی پی کے حالات سب سے سوا تھے۔مسی پی کو غربت میں درجہ اوّل حاصل تھا۔اسّی فیصد آبادی سیاہ فام افراد پر مشتمل تھی جو غربت کی انتہائی سطح سے

بھی کمتر زندگی بسر کررہی تھی۔گذشتہ کچھ عرصہ سے تعلیمی اداروں میں بھی رنگ و نسل کی بنیاد پر بٹوارا ہو چکا تھا۔پانی کے کنوؤں' ریسٹ رومز' چرچ' تھیٹر اور ریسٹورینٹس میں سیاہ فام افراد کو داخلے کی ممانعت کا واضح تحریری نوٹس چسپاں کیا گیا تھا۔بسوں میں سواری کے وقت تو یہ عالم تھا کہ کسی سفید فام کی آمد کے ساتھ ہی پہلے سے نشست پر بیٹھے سیاہ فام کو وہ جگہ چھوڑ کر باقی سفر کھڑے ہو کر طے کرنا پڑتا۔

اسمتھ جیسے شخص کے لیے اوپرا کو زبردستی قابو کر لینا مشکل نہ تھا لیکن نشے کی زیادتی اور چند دیگر راہگیروں کی آمد نے اسے اپنے شیطانی ارادوں میں کامیاب نہ ہونے دیا۔اپنی اس خوش بختی سے بے خبر نشے میں دھت اوپرا ان خواتین کو اپنے مخصوص شیریں انداز میں بائبل کے اقتباسات سناتی ہوئی گھر پہنچ گئی۔

اوپرا کا یہ چھوٹا سا گھر دیہاتی طرز کا فارم ہاؤس تھا۔جس کے قرب و جوار میں کھیتوں اور گھاس پھوس کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر ہیٹی پر پڑی جو ایک بڑے سیاہ برتن میں نیم گرم پانی ڈالے گندے کپڑے کھنگال رہی تھی۔غربت اور ناکافی وسائل کی وجہ سے ان کے پاس برقی مشین خریدنے کی استطاعت نہ تھی اس لیے سبھی کام کاج ہاتھوں سے ہی سرانجام دینے پڑتے۔

''کہاں سے آوارہ گردی کر کے آرہی ہو تم؟'' ہیٹی نے اسے درشت لہجہ میں کہا۔

''میں تو بس یہیں ذرا چہل قدمی کرنے گئی تھی ماما!'' وہ ہکلا گئی۔

''اس بارے میں تو تم سے بعد میں نمٹوں گی..... ابھی میرے ساتھ آکر یہ کپڑے کھنگالو!'' اس نے ایک اور حکم صادر کیا۔

''میں کیسے کر سکتی ہوں ماما! یہ مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔'' اوپرا اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو دیکھ کر روہانسا ہوئی۔

''تم اپنی حدود بھولتی جارہی ہو نامعقول لڑکی! کیا

ثمود

حضرت صالحؑ کی قوم کا نام۔یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو قوم عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔اس قوم کے قصے نزول قرآن کے وقت زبان زد عام تھے۔زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بھی اس قوم کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔اسکندریہ اور روم کے قدیم مؤرخین اور جغرافیہ نگاروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔بقول مولانا مودودی مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے۔'' رومی مؤرخین کے مطابق ''یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور قیطیوں کے خلاف لڑے جو ان کے دشمن تھے۔'' قوم ثمود کا وطن شمال مغربی عرب، کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحجر کے نام سے موسوم ہے۔موجودہ زمانے میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جو مدائن صالح کے نام سے موسوم ہے۔یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور زمانہ قدیم میں الحجر کہلاتا تھا۔اب بھی وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں۔جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا اور اس علاقے کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔آنحضورؐ جب غزوہ تبوک کے موقع پر اس علاقے سے گزرے تو آپؐ نے مسلمانوں کو یہ آثار عبرت دکھائے۔ایک جگہ آپؐ نے ایک کنویں کی نشاندہی کی اور فرمایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنویں سے پانی لینا۔دوسرے کنوؤں کا پانی نہ پینا۔

مرسلہ: عارف سلطان، مظفرگڑھ

تمہیں ہر روز یہ یاد کروانا پڑے گا کہ تمہاری ماں اور نانی گھریلو ملازمائیں ہیں۔تمہاری قسمت میں بھی خادمہ بننا ہی لکھا ہے اس لیے بہتر ہے کہ ابھی سے پیشہ وارانہ تربیت حاصل کرلو۔'' ہیٹی نے نہایت سفاکی سے آئینہ دکھایا۔

''نہیں! میں گھریلو ملازمہ نہیں بنوں گی۔'' اس کے وجود میں مزاحمت کی ایک طاقتور لہر اٹھی لیکن وہ زبان سے

کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ایسی کسی بھی جرأت کے بعد ملنے والی سزا کا تصور ہی بہت ہولناک تھا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھی اور نانی کی ہدایات کے مطابق عمل کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں شدید بے بسی سے آنسو امڈنے لگے۔

اوپرا کی زندگی روزِ پیدائش ہی سے ایک بیگار تھی۔ اس کا پہلا جرم یہ تھا کہ وہ انتہائی غریب سیاہ فام گھرانے میں انہی کے نقوش اور رنگت لیے پیدا ہوئی۔ دوسرا جرم یہ ثابت ہوا کہ اس کی والدہ 'ورنیتا لی' خود سے چند سال بڑے 'ورنن وینفری' کی محبت میں گرفتار ہو کر اخلاقی حدود قیود فراموش کر بیٹھی جس کے نتیجہ میں اوپرا ناکردہ جرائم کی سزا بھگتنے اس دنیا میں چلی آئی۔ انیس سالہ ورنیتا ذہنی طور پر اس کی پیدائش کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ غربت اور محرومیوں میں پستی زندگی میں ایک اور ان چاہے وجود کی آمد اور ضروریات پوری کرنے کا تصور بہت بھیانک تھا۔ وہ کسی بھی طور ان نئی ذمّے داریوں کو نبھانے کی اہل ہی نہ تھی۔

اوپرا کی پیدائش کے بعد ورنیتا کی لاتعلقی اس حد تک غیر فطری تھی کہ ایک ہفتہ گذر جانے کے بعد بھی وہ نومولود کا نام رکھنے کی طرف توجہ ہی نہ دے سکی۔ ورنیتا کی چھوٹی بہن ایڈا نے ہی ایک روز اسے احساس دلاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی کا نام کیا رکھو گی ورنیتا؟''

''مجھے کیا پتا بھئی؟ میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔'' وہ جان چھڑاتے ہوئے بولی۔

''تو کب سوچو گی؟ بچی کا سرٹیفکیٹ بھی تو بنوانا ہے۔''

''خود ہی سوچ لو کچھ نہ کچھ۔ میری زندگی میں اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔'' ورنیتا کے دوٹوک جواب پر ایڈا بھی سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے بائبل کے ایک کردار Orpah سے متاثر ہو کر بھانجی کو بھی یہی نام دے دیا جو پہلے تو جانے کس کی غلطی سے پیدائشی سرٹیفکیٹ پر اور پھر کچھ ہی سالوں میں مقامی لوگوں کی کم علمی، جہالت اور غفلت سے 'اوپرا' Oprah بن کر رہ گیا۔

ورنیتا کی غیر ذمہ دارانہ روش اور لاتعلقی میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوا۔ اوپرا کی پرورش اور تربیت کلی طور پر ہٹی کی ذمّے داری تھی۔ ہٹی پرانے خیالات کی مالک خاتون تھی جس کا نظریہ تھا کہ سزا ترک کر دینے سے بچے کے کردار و شخصیت میں بگاڑ اور خرابیاں پروان چڑھنے لگتی ہے۔ وہ نواسی کو اپنی مخصوص روایات کے مطابق پروان چڑھا رہی تھی جس کی رو سے بچہ کو کوئی بھی سوال پوچھنے یا سرپرست کی بات پر 'چوں' کرنے کا بھی اختیار نہ تھا۔ کچھ ماہ قبل ورنیتا بہترین نوکری کے حصول اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی غرض سے شمالی ریاستوں میں قسمت آزمانے نکل کھڑی ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب جنوبی خطہ میں رہائش پذیر افریقی نژاد امریکیوں میں مشی گن، اوہائیو، کلائیولینڈ، ڈیٹرائٹ، ملواکی اور نیویارک منتقل ہو کر اپنی تقدیر بدلنے کا رجحان تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ورنیتا نے بھی ساز و سامان سمیٹ کر بیٹی کو ماں کے حوالے کیا اور اپنی قوت پرواز آزمانے کے لیے منظر سے غائب ہو گئی۔ چار سالہ اوپرا کی زندگی مزید مشکلات کا شکار ہو گئی۔ اب وہ مکمل طور پر نانی اور اس کے بنائے گئے چٹانی اصولوں کی زد میں آ چکی تھی۔

اوپرا اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنا کودنا چاہتی تھی۔ اسے شدت سے سماجی میل جول اور معاشرتی روابط کی طلب محسوس ہوا کرتی لیکن اس کا گھر بستی کے باقی گھروں سے الگ تھلگ اور قدرے فاصلے پر تھا۔ انجام بالخیر اس کے پاس مرغیوں اور ایک بھدی سی بے نقوش گڑیا کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ ان سب کو مختلف نام دے کر کھیل کود میں مگن ہو جاتی۔ دوسری جانب ہٹی نے اس پر کام کا دباؤ بے حد بڑھا دیا تھا۔ وہ اس کم عمری میں ہی اسے تار پر چوبی شکنجہ کی مدد سے خشک ہونے کے لیے کپڑے پھیلانا، سبجی دار پانی سے صابن بنانا اور جنگلی پرندوں کا شکار سکھا چکی تھی۔ ہٹی کی 'چھڑی' سے خوفزدہ اوپرا مرغیوں کو گردن مروڑ کر مار دینے سے متلی کی کیفیت میں مبتلا ہونے لگتی لیکن نانی کو اس کی حالت پر بالکل رحم نہ آتا۔ ان کے گھر میں پانی کا کوئی نلکا موجود نہ تھا۔ نہانے، دھونے، کپڑوں اور برتن کی دھلائی کے لیے ہر صبح اور شام کنوئیں سے پانی بھر کر لانا پڑتا۔ روزمرہ حالات میں وہ کپڑا گیلا کر کے اپنے ہاتھ، پاؤں اور چہرہ صاف کر لیا کرتی تھیں۔ غسل کی عیاشی صرف سنیچر کو ہی میسر ہوتی تھی تاکہ اگلے روز بالکل صاف ستھرے ہو کر چرچ جا سکیں۔

گھریلو کام کاج کے علاوہ ہٹی کی تمام تر توجہ اوپرا کو بائبل کے اقتباسات یاد کروانے پر مرکوز تھی۔ اسے مقامی لوگوں کے سامنے خودنمائی کا بے حد جنون تھا لہٰذا نواسی پر سختی بڑھتی ہی چلی گئی۔ احباب کی تعریفیں اور حاسدانہ جذبات اس کے احساس برتری کو بے تحاشا تسکین دیتے۔

اس گھٹے ہوئے بنیادی انسانی حقوق سے محروم اوپرا ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنی ذات میں مزید تنہا ہوتی جارہی تھی۔ اس کی زندگی سے منسلک ہر رشتہ غیر فطری رویوں کا مالک تھا۔ والدہ سے محبت و توجہ کی بھوک اور نانی کے سخت اصولوں نے اسے وقت سے پہلے ہی سنجیدہ، مضطرب اور مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆☆☆

اوپرا کی نظریں آسمان کی وسعتوں میں بھٹک رہی تھیں۔

ہیٹی نے کچھ دیر قبل ہی اسے اپنے پاس سے اٹھنے کی اجازت دی تھی۔ اس کی طبیعت پر اداسی اور اضمحلال طاری تھا۔ کچھ دیر بعد چوبی جنگلے پر ایک کوا آبیٹھا۔ ننھی اوپرا کی آنکھوں میں چمک بیدار ہوگئی۔ پرندوں کو اپنے سامنے دیکھنا اور ان سے راز و نیاز کرنا اس کے لیے ہمیشہ ہی ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوا کرتا تھا۔

''کیسے ہو پیارے کوے؟'' اس نے ملائمت سے پوچھا۔ کوے نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور شان بے نیازی دکھاتے ہوئے کائیں کائیں کرنے لگا۔

''آج تمہارے ساتھ کوئی ساتھی نظر نہیں آرہا؟ اکیلے آئے ہو کیا؟''

''کائیں..... کائیں..... کائیں.....''

''ہاں بھئی! میں سمجھ گئی..... تم یہی کہنا چاہتے ہو ناں کہ کبھی کبھی کسی کے ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا۔'' اس کے بردبار انداز پر کوے نے ایک بار پھر اپنا مخصوص جواب دہرا دیا۔

''اچھا! ایک بات تو بتاؤ پیارے کوے؟ ماما کہتی ہے کہ تم سب پرندے جنگل میں رہتے ہو۔ کیا وہاں کے باقی جانور اور پرندے تم سے سیاہ رنگت کی وجہ سے نفرت کرتے ہیں۔'' اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور کوے کا 'جواب' سن کر مزید ہمدردانہ انداز میں بولی۔ ''ہاں پیارے! میں تمہاری تکلیف سمجھ سکتی ہوں۔ سیاہ رنگت سے بڑی واقعی کوئی غلطی نہیں۔ تمہیں پتا ہے کہ جب میں پڑھائی میں کوئی سبق ٹھیک نہ سناؤں تو ماما غصہ میں اپنی چھڑی سے پٹائی کر کے مجھے سزا دیتی ہے۔ اس چھڑی سے بہت درد ہوتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف تب ہوتی ہے جب کوئی سفید چمڑی والا شخص ہنستے ہوئے بدصورت چمگادڑ کہہ دے۔''

''اوپرا! کہاں غائب ہو؟ فوراً لکڑیاں کاٹ کر میرے پاس لاؤ۔'' ہیٹی کی کرخت آواز نے اس کی 'بات چیت' میں توقف پیدا کر دیا۔ کوا بھی فوری طور پر اڑ گیا۔

''ماما کبھی مجھے خوش اور سکون سے نہیں رہنے دے گی۔'' اس نے بے بسی سے سوچا اور حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہوگئی۔

ہیٹی کے احکامات بجالاتے اور اسی کی مرضی کے مطابق مختلف عوامی مقامات پر بائبل کے اقتباسات سناتے ہوئے اوپرا نے اپنی عمر کے پانچ پڑاؤ عبور کر لیے۔ 1959 کے موسم خزاں میں اسے ایک مقامی اسکول میں کنڈر گارٹن کا حصہ بنا دیا گیا۔ اسکول میں داخلے سے قبل اوپرا کافی پرجوش تھی۔ اپنے ہم عمر بچوں سے میل جول اور سماجی حلقہ وسیع کرنے کی لاشعوری خواہش اب مکمل ہوتی نظر آرہی تھی لیکن یہ خوشی بہت جلد بوریت میں ڈھل گئی۔ اپنی جماعت میں دیگر بچوں کے برعکس وہ لکھائی اور پڑھائی میں پہلے ہی کافی حد تک طاق ہو چکی تھی۔ اسے جماعت میں پڑھائے گئے سبق اور دیگر سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوتی۔ یہ صورتِ حال کچھ عرصہ تک یونہی جاری رہی۔ ایک روز اسکول کی روزمرہ سرگرمیوں کا آغاز ہوتے ہی اس نے کسی انجانے جذبے کے تحت کاغذ تھاما اور اپنی ٹیچر کے لیے ایک پیغام لکھنے لگی۔ اس وقت اسے ٹیچر کے نام کے ہجوں کا مکمل علم نہیں تھا تاہم اس نے ایک اندازے سے کاغذ پر چند الفاظ لکھ دیئے ''پیاری مس نیو! مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ

سوانحی خاکہ

نام: اوپرا گیل وینفری

جائے پیدائش: 29 جنوری 1954ء کیوسیاسکو۔ مسی سپی۔ امریکا

پیشہ: اوپرا وینفری شو میں پچیس سال تک میزبانی کی۔

Harpo Productions کی چیئرمین اور چیف ایگزیکٹو

'اوپرا وینفری نیٹ ورک' میں چیف کمرشل آفیسر اور چیف ایگزیکٹو

اداکارہ..... مصنفہ

پارٹنر..... اسٹیڈ مین گراہم (یہ دونوں 1986ء سے تاحال ایک ساتھ ہیں)

جماعت میرا مقام نہیں۔''

معلّمہ کے لیے اوپرا کے لکھنے کی صلاحیت حقیقتاً ایک انکشاف تھی۔ حیرت و توصیف کے ملے جلے جذبات میں گھری مس نیو نے اسے اپنے پاس طلب کرلیا۔

''یہ سب کیا ہے اوپرا؟'' اس نے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔

''میرے دل کی آواز۔'' وہ اعتماد سے بولی۔

''کس سے لکھوایا ہے یہ؟'' نیو نے کسی واہمہ کے تحت پوچھا۔

''کسی سے بھی نہیں..... میں نے خود لکھا ہے۔ آپ کہیں تو میں اسی لکھائی میں کوئی نیا جملہ لکھ کے دکھا دیتی ہوں۔'' اوپرا کا انداز اعتماد اور تیور مس نیو کے لیے بے حد حیران کن تھے۔

''لکھنا اور پڑھنا کس سے سیکھا ہے تم نے؟'' وہ ایک مختصر توقف کے بعد بولی۔

''ماما سے..... وہ مجھے بائبل سے سبق یاد کرواتی تھیں۔ ہجوں کے جوڑ توڑ کرنا بھی مجھے انہی نے سکھائے ہیں۔'' اوپرا نے بے نیازی سے جواب دیا۔

مس نیو کے دل و دماغ میں کھلبلی سی پیدا ہوگئی۔ اس کی پیشہ وارانہ قابلیت بھانپ گئی تھی کہ اوپرا کو اس جماعت میں پڑھانے کا براہِ راست مطلب اس کی ذہنی صلاحیتوں پر جمود طاری کرنا ہے۔ اس نے ذاتی کوششوں کے تحت اوپرا کو درجہ اوّل میں ترقی دلوادی۔ اپنی ذہنی استعداد کے مطابق پڑھائی اور ماحول پاتے ہی اوپرا کی بوریت ہوا ہوگئی۔ اس کے وجود میں ایک سرشاری اور اعتماد پیدا ہونے لگا تھا لیکن اوپرا کی یہ خوشی بہت مختصر ثابت ہوئی۔ کچھ ماہ بعد بیٹی نے اسے اپنے پاس بلایا اور ایک نئی ہجرت کا مژدہ سنادیا۔

''اوپرا! اب وقت آگیا ہے کہ تم اپنا بوریا بستر باندھ لو۔'' وہ نقاہت سے بولی۔

''لیکن کیوں ماما؟ اب میں نے کیا غلطی کردی؟'' اوپرا بوکھلا گئی۔

''تمہیں یہاں سے ہمیشہ کے لیے ورنیتا کے پاس جانا ہوگا۔'' یہ انکشاف کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ ورنیتا سے اس کا تعلق غیر فطری حد تک سرد اور بے نیاز تھا۔ ممتا کی حدت اور گرمجوشی اسے کبھی نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔

''میں یہاں سے نہیں جانا چاہتی ماما!'' اس نے بیمار نانی کو قائل کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ ''میں سارے کام خوشی خوشی کردیا کروں گی۔ ملازمہ بھی بن جاؤں گی۔''

''چل ہٹ!'' بیٹی نے افسردہ مسکراہٹ سے ہاتھ کو جنبش دی۔ ''مجھے کیا بے وقوف سمجھ رکھا ہے تو نے؟ میں جانتی ہوں کہ تمہارے دماغ میں بلند پروازی کی دھن ہے۔ تم کبھی ملازمہ نہیں بنو گی۔''

''جب اتنا کچھ جانتی ہو تو پھر یہ کیوں نہیں جانتی کہ میں ماں کے پاس نہیں رہنا چاہتی۔'' چھ سالہ اوپرا نے پاؤں پٹخے۔

''میری زندگی کا کیا بھروسا پگلی؟ میں جانتی ہوں کہ ورنیتا نے تجھے کبھی محبت اور توجہ نہیں دی لیکن اس میں وہ بے چاری بھی قصوروار نہیں۔ اس نے زندگی میں بہت سی مشکلات دیکھی ہیں۔ وقت سے پہلے کئی ذمّے داریاں نبھاتے ہوئے وہ پتھر دل ہوتی چلی گئی۔'' اس نے بیٹی کی صفائی پیش کی۔ اوپرا کی کوئی بھی دلیل کارگر ثابت نہ ہوئی اور اسے ورنیتا کے پاس 'میلوا کی' جاتے ہی بنی جہاں مشکلات اور آزمائشوں کا ایک عفریت اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

''یہ کیا ردی اور کاٹھ کباڑ پکڑ رکھا ہے تم نے؟'' ورنیتا نے چلّاتے ہوئے بیٹی کو مخاطب کیا۔

''انہیں ردی یا کاٹھ کباڑ نہیں ..... کتابیں کہتے ہیں۔'' اوپرا نے اپنے جذبات پر قابو پایا۔

''ہونہہ کتابیں..... دنیا کے بازار میں سب سے کم قیمت اور کھوٹے سکے۔'' اس نے تنفر سے کہا اور کتب چھین کر ایک جانب پھینک دیں۔

''یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ کتابوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا کرتے۔'' اوپرا صدمہ سے بولی۔ اس کی دھڑکنیں منتشر اور شدت جذبات سے چہرہ سرخ ہوگیا۔

''اب تم بالشت بھر کی چھوکری مجھے سکھاؤ گی کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟'' وہ حلق کے بل چلّائی۔ ''تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟ اپنے دماغ سے برتری اور کتابوں کا خناس نکال دو۔''

اوپرا کی آنکھوں میں بے یقینی اور بے بسی کے آنسو بھر آئے۔ ورنیتا کے ساتھ رہنا اس کے اعصاب کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش ثابت ہو رہا تھا۔ اپنی تمام تر ذہانت اور معاملہ فہمی کے باوجود وہ ماں کی نفسیات اور الجھنیں سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے میلوا کی آمد اور قیام بالکل نہ بھایا تھا۔ سابقہ رہائش کے برعکس میلوا کی ایک صنعتی اور کاروباری شہر تھا۔ مختلف کارخانوں کے باعث یہاں ہمہ وقت ایک شور کی

کیفیت برپا رہتی ۔ روزگار کے اچھے مواقع کی بدولت آبادی بھی قدرے زیادہ تھی ۔ حیران کن پہلو تو یہ تھا کہ ماضی قریب میں کھیل کود اور سماجی روابط کے لیے ترساں کیفیت کا شکار اوپرا یہاں کے ہجوم، افراتفری اور عمومی بے حس و سپاٹ رویّہ سے چند ہی ماہ میں اوب گئی تھی ۔ اسے نانی کی سختی بے طرح یاد آتی ۔ اسکول کے ساتھیوں، چرچ میں ملنے والے لوگوں اور اساتذہ کا شفیق رویّہ وجود میں تشنگی کا احساس پیدا کرنے لگتا ۔ وہ بے بسی اور غصہ سے جھنجلا کر رہ جاتی ۔

ورنیتا 'نائنتھ اسٹریٹ' میں واقع دارالاقامت کے ایک مختصر سے کمرے میں کرائے پر رہتی تھی ۔ کھانے پینے کے اخراجات بھی 'کرائے' کی مد میں ہی شامل ہوتے ۔ علاقے کے سفید فام افراد کے گھروں میں ملازمہ کی ذمے داریاں نبھاتے وہ ہلکان ہو کر رہ جاتی ۔ تنخواہ محنت اور فرائض کے مقابلہ میں اونٹ کے منہ میں زیرہ کے مترادف تھی ۔ یہی مشکلات کم نہ تھیں کہ اس نے 'پیٹریشیا' کو جنم دے کر اپنے مسائل اور بیزاری میں مزید اضافہ کر لیا ۔ تنخواہ سے حاصل شدہ رقم گذربسر کے لیے انتہائی ناکافی ثابت ہو رہی تھی ۔ حکومت کی جانب سے بہبود کی مد میں ملنے والی رقم سے ان کے اخراجات کھینچ تان کر پورے ہونے لگے ۔ پیٹریشیا کے ساتھ اوپرا کو سنبھالنا ورنیتا کے لیے بہت مشکل تھا ۔

''ماں! مجھے بھی نہلا دو ناں ۔'' اوپرا نے حسرت سے ورنیتا کو مخاطب کیا ۔ وہ پیٹریشیا کو نہایت محبت اور احتیاط سے نہلا کر اب اس کے کپڑے تبدیل کر رہی تھی ۔

''کیا؟ تمہارے ہاتھ پاؤں سلامت نہیں ہیں کیا؟ خود نہالو ۔ بلکہ رہنے ہی دو ۔ نہا دھو کر بھی تمہیں کیا فائدہ ہوگا بھلا؟ تم تب بھی اسی طرح کالی کلوٹی ہی رہوگی ۔ خوا مخواہ میرا صابن اور پانی ضائع کروگی ۔'' وہ بے نیازی سے بولی ۔ اوپرا کے دل پر ایک گھونسا لگا ۔

''تم پیٹریشیا سے زیادہ پیار کرتی ہو ناں؟'' وہ سوتیلی بہن کی طرف دیکھتے ہوئے زخمی انداز میں بولی ۔

''ہاں! میں اسی سے پیار کرتی ہوں ۔ اتنی پیاری بچی سے بھلا کوئی کیسے نفرت کر سکتا ہے ۔'' ورنیتا نے اسے بانہوں میں بھرتے ہوئے بوسہ لیا اور اس کے ہلکے سانولے رنگ کی ملاحت کو محبت بھری نظروں سے نہارنے لگی ۔ وہ اوپرا کو مکمل نظرانداز کر رہی تھی ۔ اوپرا خاموشی سے مختصر ڈیوڑھی کی طرف بڑھ گئی جہاں اس کے سونے کا انتظام ہوتا تھا ۔

☆☆☆

ورنیتا کی غیر ذمے دارانہ اور غیر منظم روش یونہی جاری رہی ۔

اس کے لیے نوکری کے ساتھ دونوں بچیوں کو سنبھالنا بے حد مشکل ثابت ہو رہا تھا ۔ سفید فام افراد کے گھروں میں چاکری کرتے اس کے لیے دن اور رات کا فرق ختم ہو چکا تھا ۔ ان حالات میں وہ اوپرا اور پیٹریشیا کو پڑوس والے کمروں کے رہائشی یا نزدیکی علاقہ میں قیام پذیر رشتہ دار کے حوالے کر دیا کرتی ۔

''ورنیتا! اوپرا کا باپ کون ہے؟'' ایک روز دارالاقامت کی پڑوسن نے رازدارانہ انداز میں دریافت کیا ۔

''ورنن...... کم بخت فوج میں بھرتی تھا ۔ میں خوامخواہ ہی اس پہ لٹو ہو گئی تھی ۔'' وہ بیزاری سے بولی ۔

''اوہ...... کیا اس نے تمہیں دھوکا دیا تھا؟'' پڑوسن نے ہمدردی سے پوچھا ۔

''نہیں...... اس نے تو مجھ سے کوئی وعدہ کیا ہی نہیں تھا ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم دونوں ہی شادی یا طویل رشتہ کے لیے سنجیدہ نہ تھے ۔'' ورنیتا نے صاف گوئی سے بتایا ۔

''اب کیا کرتا ہے ورنن؟ تمہاری اس سے کبھی ملاقات ہوئی؟''

''پہلے تو کوئلہ کی کان میں مزدور تھا، پھر فوج میں بھرتی ہوا ۔ آج کل سنا ہے کہ حجام بن گیا ہے ۔ کبھی کبھی بیٹی کی کشش کھینچ لاتی ہے اسے میرے پاس ۔''

''ارے بدھو! تو تم اس موقع سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتیں ۔ اگر وہ بیٹی سے اتنی محبت کرتا ہے تو تم ان جذبات سے فائدہ اٹھا کر اس کی زندگی میں دوبارہ شامل ہو جاؤ ۔ مرد کی کمائی پر عیش کرنے کا لطف ہی اور ہوتا ہے ۔ کیوں اس گھریلو ملازمہ کی نوکری میں اپنی ہڈیاں نچوڑ رہی ہو؟''

''تمہارا کیا خیال ہے اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں خاموش رہتی؟ ورنن شادی شدہ ہے اور وہ اولاد نہ ہونے کے باوجود اپنی بیوی کے ساتھ بہت خوش ہے ۔'' ورنیتا نے حاسدانہ انداز میں کہا ۔

''تم چاہو تو اس صورتِ حال سے بھی فائدہ اٹھا سکتی ہو ۔ اوپرا کو اسی کے پاس بھیج کر اپنی ذمے داریوں میں کمی کیوں نہیں کر لیتیں؟'' پڑوسن نے ایک اور راہ سجھائی ۔

''خیال برا نہیں...... میں بھی چند ایک مرتبہ اس پہلو پر غور کر چکی ہوں ۔'' ورنیتا نیم رضامند تھی ۔

''تو پھر دیر کیسی؟ ابھی اوپرا کی عمر صرف آٹھ سال ہے۔ مستقبل میں اس کی پڑھائی لکھائی اور دیگر اخراجات میں اضافہ ہوگا۔ تم اس معمولی نوکری سے سب کچھ کیسے پورا کروگی؟'' پڑوسن کے منطقی تجزیہ پر وہ خاموش ہوگئی اور کچھ دن سوچ بچار کے بعد ورنن سے معاملات طے کرکے اوپرا کو اس کے حوالے کرنے کی رضامندی دے دی۔

''کیا میرے لیے کہیں کوئی ٹھکانا ہی نہیں؟ پہلے ماما نے یہاں بھیج دیا اور اب تم 'ناشول' روانہ کررہی ہو۔'' اوپرا بے بسی سے بولی۔

''ناشول میں تمہارا باپ رہتا ہے۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔'' ورنیتا نے فوراً ٹوکا۔

''کون سا باپ، شاید کبھی بچپن میں ان سے ملی تھی، اب تو ان کا چہرہ اور نقوش بھی یاد نہیں۔''

''چہرہ یاد نہ رہنے سے تمہارا اس سے رشتہ تو ختم نہیں ہوسکتا ناں۔ وہ ایک اچھا انسان ہے۔ ناشول جیسے بڑے اور منافع بخش شہر میں اچھی کمائی کرتا ہے۔ تم اس کے ساتھ بہت مطمئن رہوگی۔''

''خدا جانے اطمینان اور خوشی کیا ہوتی ہے میں نے تو آج تک اس کی لذت محسوس ہی نہیں کی۔'' اوپرا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''خوامخواہ جذباتیت کا شکار مت بنو! مستقبل میں تمہیں خود ہی اندازہ ہوجائے گا کہ میں نے تمہارے لیے ایک بہترین فیصلہ کیا تھا۔'' ورنیتا نے رکھائی سے کہا۔ اوپرا خاموشی سے اپنے آنسو ضبط کرنے لگی۔ اسے زندگی سے کسی اچھائی یا بھلائی کی کوئی توقع ہی نہ رہی تھی۔ حالات کے تند تھپیڑے برداشت کرتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک ہی بات راسخ ہوچکی تھی کہ زندگی صرف مشکلات اور آزمائشوں ہی کا نام ہے۔ تمام تر خوشیوں' آسائشوں اور محبتوں پر صرف سفید فام افراد کا حق ہے۔ اپنی ذات کی اس کشمکش سے الجھتی وہ 'ورنن ویفری' کے پاس منتقل ہونے کے لیے رضامند ہوگئی۔

ورنن سے پہلی ملاقات اس کے لیے ایک یادگار اور حیران کن تجربہ ثابت ہوئی۔ اس کے لمبے چوڑے وجود سے اٹھتی پسینے کی مہک اوپرا کو بہت جانی پہچانی محسوس ہورہی تھی۔ ورنن نے اسے محبت سے بھینچ کر اپنی بانہوں میں سمیٹا تو وہ اس کے سینے پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

''ارے میری گڑیا! تم رو کیوں رہی ہو؟'' اس نے شفقت سے بیٹی کے سر پر بوسہ دے کر آنسو پونچھے۔

''پتا نہیں ڈیڈ! لیکن دل چاہ رہا ہے کہ بس روتی ہی رہوں۔'' اوپرا اسے بتا ہی نہ پارہی تھی کہ اس کے سینے میں سما کے کسی محفوظ قلعہ سا تحفظ محسوس ہونے لگا تھا۔

''بری بات ہے۔ اچھے بچے بھلا یوں تھوڑی روتے ہیں۔ وہ تو ہر وقت مسکراتے ہیں۔'' والد کی پہلی نصیحت اوپرا کے ذہن میں نقش ہوگئی۔ ورنن اس کے ساتھ اینٹوں سے بنے ایک منزلہ گھر میں چلا آیا۔ دھات سے بنے شٹر نما سفید دروازے والے اس گھر میں اوپرا کو ایک عجیب سا سکون اور سرور نے اپنے حصار میں لیا تھا۔

''آگئی ہماری گڑیا! میں تو کب سے انتظار کررہی تھی۔'' ایک نرم اور شفیق آواز کی مالک خاتون نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری نئی ممی ہیں..... زیلما۔'' ورنن نے تعارف کروایا۔ اوپرا بہت جلد ان دونوں کے ساتھ گھل مل گئی۔

اس گھر میں پرسکون خاموشی' امن اور محبت سانس لیتی تھی۔ ورنن اپنی گذر بسر کے لیے ناشول کے ایک اسپتال اور یونیورسٹی میں چوکیداری کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ ان تھکا دینے والی دونوکریوں کے باوجود وہ اوپرا سے ہمیشہ تازہ دم انداز اور کشادہ دلی سے ملتا۔ زیلما نے بھی روایتی سوتیلی ماؤں کے برعکس اس پر خوب محبت اور توجہ نچھاور کی۔ وہ دونوں اولاد کی نعمت کو ترسے ہوئے تھے اس لیے اوپرا کی آمد سے جب سونی زندگیوں کی تکمیل ہوتی نظر آئی تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔ اوپرا کے لیے یہ محبت' توجہ اور آسائشات بالکل انوکھی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی علیحدہ خوابگاہ میسر آئی۔ ورنن نے بیٹی کو 'وہارٹن ایلمنٹری اسکول' میں داخل کروادیا۔

اسکول کا صحت مند اور پُرسکون ماحول اوپرا کے لیے ایک اور خوشگوار تجربہ ثابت ہوا۔ اس کی ذہانت اور اہلیت نے بہت جلد یہاں بھی اپنا لوہا منوالیا۔ زیلما اور ورنن اس کی خداداد صلاحیتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسے جماعت دوئم میں پڑھنے کی بجائے درجہ سوئم میں بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ دونوں گھر میں بھی کئی گھنٹے زبانداني میں بہتری اور ریاضی کے بنیادی اسباق میں اس کی مدد کیا کرتے۔

ورنن اور زیلما کا مزاج نہایت منظم اور معتدل تھا۔ وہ لاڈ پیار کے باوجود کردار سازی اور پڑھائی میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی برتنے کے قائل نہ تھے۔ ان دونوں ہی کا نظریہ

تھا کہ بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ احمقانہ اور مہلک ہوتا ہے۔ بچوں کی زندگی سنوارنے اور بہترین مستقبل کی جانب پیش قدمی کے لیے رہنمائی صرف والدین ہی کا فرض ہے۔ وہ خود تو اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن بیٹی کی 'بنیاد' مضبوط بنانے کے لیے اپنی استطاعت سے بڑھ کر محنتی اور اہل ثابت ہو رہے تھے۔

اوپرا کی بھنور زدہ زندگی کو ایک پُرسکون جزیرہ میسر آ گیا تھا۔

☆☆☆

''ہم کہاں جا رہے ہیں ڈیڈ؟'' اوپرا نے متجسس انداز میں چوتھی مرتبہ ورنن سے دریافت کیا۔

''ایک ایسی جگہ جہاں تم بہت خوش رہو گی۔'' اس نے معنی خیز انداز میں سابقہ جواب دہرایا۔

''کیا ہم کسی پارک میں جا رہے ہیں؟'' اس نے اندازہ لگایا۔

''نہیں! اس سے بھی زیادہ خوبصورت اور دلفریب جگہ پر۔'' ورنن مسکرایا۔ اوپرا خاموشی سے مزید ذہنی گھوڑے دوڑانے میں مصروف ہو گئی۔ آئسکریم' جوس بار' کھلونے اور پارکس کے نام ذہن میں لاتے ہوئے اس کا ارتکاز 'لائبریری' کو دیکھ کر ٹوٹا۔

''یہ..... یہ تو..... لائبریری ہے۔'' وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

''ہاں! مجھے علم ہے کہ میری بیٹی کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے، اسی لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ اسے لائبریری کارڈ بنوا دوں۔'' ورنن نے محبت پاش لہجہ میں کہا تو اوپرا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دو سال قبل ورنیتا سے ہونے والی جھڑپ اور کتب کے بارے میں اس کے خیالات یاد آتے ہی سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

''شکریہ ڈیڈ! آپ بہت اچھے ہیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں اتنا ہی کہہ سکی۔

ورنن اسے لیے لائبریری کے اندر چلا آیا۔ مخصوص مراحل سے گذرتے چند روز بعد جب رکنیت کا پروانہ اپرا کے ہاتھ میں آیا تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ امریکا میں درجہ اول کی شہری قرار پا گئی ہے۔

''اوپرا میرے بچے! ایک بات یاد رکھنا۔ توازن اس زندگی کی اصل خوبصورتی ہے۔ میں نے تمہارے شوق کے پیشِ نظر لائبریری کارڈ بنوایا ہے لیکن اس نئی سرگرمی کا اثر اپنی

اوپرا وینفری نے بطور معاون مصنفہ پانچ کتابیں تحریر کی ہیں۔ 2005 میں اس نے اپنے ذاتی ٹرینر 'بوب گرین' کے ساتھ وزن کم کرنے کے متعلق ایک کتاب لکھی جس کی پیشگی فیس نے دنیا بھر میں کسی بھی کتاب کی پیشگی فیس وصولی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ اس سے قبل یہ اعزاز سابق امریکی صدر بل کلنٹن کی خودنوشت کے نام تھا۔

☆☆☆

2004 سے 2008 کے دوران اوپرا نے O,The Oprah Magazine کے تحت O At Home کا اجرا کیا۔ اس سے قبل 2002ء میں میگزین اپنے آغاز سفر میں ہی مقبولیت اور کامیابی کے جھنڈے گاڑ چکا تھا۔

☆☆☆

اوپرا وینفری کی کمپنی نے Oprha.com کا اجراء کیا۔ اس ویب سائٹ کا دورہ کرنے والے افراد کی تعداد ستر ملین سے زائد ہے۔ انہیں ماہانہ چھ ملین نئے صارفین ملتے ہیں۔ ہفتہ وار تقریباً بیس ہزار برقی پیغامات موصول ہوتے ہیں۔ اوپرا نے اپنے شو اور ویب سائٹ پر بچوں سے جنسی زیادتی کے متعلق ایک خصوصی 'واچ لسٹ' متعارف کروائی تاکہ متاثرہ بچوں کے مجرمان کو فوری طور پر گرفتار کیا جا سکے۔

☆☆☆

1998 میں اوپرا نے اپنی ذاتی پروڈکشن میں ایک فلم Beloved کا آغاز کیا۔ اس فلم کا مرکزی کردار ایک غلام کا تھا۔ اوپرا نے اس کردار کی اصل روح' جذبات اور احساسات سمجھنے کے لیے اپنی آنکھوں پر پٹی بندھوا کر جنگل میں چھوڑ دیئے جانے کے لیے کہا۔ اس محنت اور بھرپور لگن کے باوجود فلم کامیاب نہ ہو سکی۔

☆☆☆

بچپن میں اپنے گھر کی طلب میں تڑپنے والی اوپرا آج کیلی فورنیا میں سمندر اور پہاڑی نظاروں سے گھرے بیالیس ایکڑ پر محیط گھر The Promised Land اور سترہ بیکٹر پر مشتمل جاگیر میں رہائش پذیر ہے۔ اس کے علاوہ نیو جرسی میں گھر' شکاگو میں اپارٹمنٹ' فلوریڈا میں جاگیر کے علاوہ بھی مختلف امریکی ریاستوں میں شاندار طرز تعمیر پر مشتمل رہائش گاہوں کی مالک ہے۔

پڑھائی پر مت ہونے دینا۔'' ورنن نے تنبیہہ کی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں ڈیڈ! آپ کو پڑھائی میں شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گی۔'' اس نے ایک عزم سے کہا۔

لائبریری کی رکنیت ملتے ہی اوپرا کی زندگی میں ایک نئی اور مثبت تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اسے کتابی دنیا میں رہنا اور اپنے تخیل کی پرواز سے ان کرداروں کو محسوس کرنا بے حد بھانے لگا۔ اس کے ذہن نے اصل زندگی کے بدصورت اور تلخ حقائق کی جانب متوجہ ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے پسندیدہ کرداروں کے ساتھ رہتی کبھی کبھی خود بھی اسی سانچے میں ڈھل جایا کرتی تھی۔ انہی دنوں اس نے 'کیٹی جونز' کے متعلق ایک کتاب پڑھی۔ کیٹی کو لڑکوں سے سخت نفرت تھی۔ اس کے چہرے پر بھریاں تھیں۔ اوپرا کیٹی جونز کے سحر میں مبتلا ہوگئی۔ وہ اپنے چہرے پر انگلیوں کی مدد سے جھریاں بنا کر خوش ہوا کرتی۔ کتب بینی کے اس جنون کے علاوہ اس نے والدین کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے نصابی سرگرمیوں میں بھی کبھی کوئی کوتاہی نہ برتی۔ زیلما اور ورنن کبھی کبھی اس کی صلاحیت جانچنے کے لیے ٹیسٹ کی صورت میں زائد کام بھی کرواتے۔ اوپرا خندہ پیشانی' سنجیدگی اور محنت سے ہر زائد کام مکمل کرتی درجہ چہارم میں چلی آئی جہاں ایک اور اہم ترین کردار 'مسز میری ڈیکن' نے اس کی زندگی میں قدم رکھا۔

☆☆☆

مسز میری ڈیکن درجہ چہارم کی معلمہ تھی۔

پیشہ وارانہ قابلیت اور انسانی ہمدردی سے مالا مال میری جوہر شناس بھی تھی۔ وہ طلبہ میں پوشیدہ خوبیوں کے علاوہ ان کے نفسیاتی خوف اور الجھنیں بھی بہت آسانی سے بھانپ لیتی تھی۔ اوپرا و ینفری کی ذہانت اور خاموشی کا سنگم اس کے لیے بے حد دلچسپ تھا۔

''اوپرا میرے بچے! آپ اس قدر اداس کیوں رہتی ہیں؟'' اس نے حوصلہ افزا مسکراہٹ سے دریافت کیا۔

''مجھے خوش رہنے کا حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے بھلا؟'' اوپرا کو حیرت ہوئی۔

''کیوں نہیں ہو سکتا بھئی؟ آپ اس قدر ذہین ہیں۔ پوری جماعت کے اندر پڑھائی لکھائی میں آپ کا کوئی مقابل نہیں۔ کیا خوش رہنے کے لیے ان نعمتوں کا احساس کافی نہیں؟''

''ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے کے لیے یہ احساس واقعی بہت طاقتور ہو لیکن میں ایک سیاہ فام ہوں' سیاہ فام کو زندگی سے خوشی طلب کرنے کا حق کیسے مل سکتا ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''بالکل غلط۔ آپ کی یہ سوچ بالکل غیر مناسب ہے۔'' میری ڈیکن نے قطعیت سے کہا۔ اوپرا محض خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''کیا سورج نے کبھی آپ کو دھوپ دینے سے انکار کیا؟ کیا بارش نے کبھی صرف سفید فام کے گھر پر برسنے کا اصرار کیا؟ چاند اور تاروں نے کبھی اپنے نور سے آپ کو محروم رکھا؟'' اس کے شفیق انداز پر اوپرا نفی میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر اس کا مطلب یہی ہوا ناں کہ قدرت کے لیے سب برابر ہیں۔ رنگ اور نسل کے درجے انسانوں نے بنائے ہیں۔ ہم اپنی ذہانت' ہمت اور اہلیت سے دنیا میں کوئی بھی باعزت مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ دنیا کی کوئی بیرونی قوت ہم سے وہ عزت نہیں چھین سکتی جو قدرت نے محنت کے بدلے ہماری تقدیر میں لکھ دی ہے۔'' میری نے نرمی اور رسان سے اس کی ذہنی گتھیاں سلجھائیں۔ اس نے اوپرا کی تخلیقی اور فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے صبح سویرے پڑھی جانے والی مناجات کی ذمے داری اسے سونپ دی۔

''میں خداوند کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اور میرے خاندان کو ایک اور روشن صبح دیکھنے کے قابل بنایا۔ اس دنیا میں بہت سے بدنصیب ایسے بھی ہیں جو رات کو نیند کی اندھیری وادی میں پہنچے تو انہیں واپسی نصیب ہی نہ ہو سکی۔''

ہٹی کی سکھائی گئی روانی اور انداز میں بائبل کے اقتباسات پڑھتی اوپرا اپنے اساتذہ اور اسکول انتظامیہ کی منظور نظر بن گئی۔ میری ڈیکن کی اس ترکیب سے اوپرا کا اعتماد تو بحال ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور پریشانی اسے اپنی زد میں لینے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ مسی پی کے ایک غربت زدہ علاقے سے آئی اس لڑکی کی ذہانت اور شہرت نے جماعت کے دیگر طلبہ کے دل میں حاسدانہ جذبات پیدا کر دیے۔ وہ دانستہ طور پر اس سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے۔ اسے نیچا دکھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ ذہانت' قابلیت اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہونے کے باوجود اوپرا و ینفری کے پاس کوئی ایسا کندھا نہ تھا

جس پر سر رکھ کر وہ اپنی کامیابیوں کا احوال یا دلی خدشات بانٹ سکتی۔ اس کی رفیق صرف اور صرف تنہائی تھی۔

ورنن اور زلما اپنی ذمے داریاں مکمل ایمانداری سے نبھا رہے تھے۔ وہ ہر اتوار چرچ جانے کے عادی تھے۔ اوپرا بھی خودکار انداز میں اس معمول کا حصہ بن گئی۔ دھیرے دھیرے اس نے چرچ میں بیٹی کی سکھائی گئی مناجات پڑھنے کا آغاز کردیا۔

''ارے ورنن! یہ گوہر نایاب کہاں چھپا رکھا تھا؟'' ایک مقامی شخص نے حیرانی سے کہا۔

''اتنی سی عمر میں ایسی زباندانی..... بھئی زیلما! تمہاری سوتیلی بیٹی تو واقعی بہت باکمال ہے۔'' کسی خاتون نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''اوپرا میری بیٹی ہے..... سوتیلی یا سگی کا کیا سوال بھلا؟'' زیلما نے سختی سے جواب دیا۔

''ارے جو بھی ہے..... مجھے تو وہ کسی بھی زاویہ سے نو سال کی نہیں لگتی۔''

''خداوند کا بہت شکر ہے کہ اس نے گڈری میں لعل پیدا کیا۔'' وہ دونوں ہی منکسر المزاج تھے۔

''اس خزانہ کو دنیا کی نظروں سے چھپا کر مت رکھنا۔'' کسی دوست نے مشورہ دیا۔ ''اسے ناشول کی دیگر مسیحی عبادت گاہوں میں بھی لے کر جانا۔ میری دلی دعا ہے کہ اس بچی کے ہنر سے سبھی واقف ہوسکیں۔''

''ہاں ضرور! کیوں نہیں۔'' ورنن نے محبت پاش نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اوپرا کی آمد نے اس کی زندگی خوشیوں اور فخر سے لبریز کردی تھی۔ وہ اس نعمت پر خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتا۔ جس نے اوپرا کی زندگی میں اندھیرے مسلط کردیے۔ انہی دنوں سالانہ امتحانات کے بعد اوپرا بالکل فارغ ہوگئی۔

''تمہارے امتحان ختم ہوگئے ہیں اوپرا؟ اب گرما کی چھٹیوں میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''میں لائبریری سے کہانیوں کی کتابیں لاکر پڑھوں گی ڈیڈ!''

''ضرور پڑھنا لیکن ایک ہی سرگرمی سے اوب نہیں جاؤ گی؟''

''نہیں۔ میں وقت گذاری کرلوں گی۔'' وہ مسکرائی۔

''میں تو چاہ رہا تھا کہ تم یہ چھٹیاں ورنیتا کے پاس بسر کرآؤ۔ وہ خوش ہوجائے گی۔'' اس نے خلوص سے کہا۔

''وہ مجھ سے کبھی خوش نہیں ہوسکتیں ڈیڈ! انہیں میرے وجود سے ہی نفرت ہے۔'' اوپرا نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا اوپرا! کوئی بھی ماں اپنی اولاد سے نفرت کر ہی نہیں سکتی۔'' زیلما بے یقین تھی۔

''وہ ایسی ہی ہیں.....'' اوپرا نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں میرے بچے! مائیں اپنی اولاد کے لیے مجسم قربانی ہوتی ہیں۔'' ورنن نے بھی اسے یقین دلایا۔ ''ورنیتا سے تمہارا رشتہ اٹوٹ ہے اور سدا اٹوٹ ہی رہے گا۔ تم ان چھٹیوں میں اس کے ساتھ وقت گذارو۔ اسے اپنی محبت کا یقین دلاؤ۔''

''ہنہہ آپ کہتے ہیں تو یہ کوشش بھی کرکے دیکھ لیتی ہوں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

اگلے روز ورنن اسے میلوا کی چھوڑ آیا جہاں بہت سے انکشافات اور حیرت کا ایک نیا جہان اوپرا کا منتظر تھا۔ اس عرصہ میں ورنیتا کے حالات میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ پیٹریشیا کے بعد جیفری کی پیدائش نے اسے مزید بیزار اور مصروف کردیا تھا۔ اوپرا کے بعد یہ دونوں بچے بھی غیر اخلاقی تعلقات کا شاخسانہ تھے۔ وہ جیفری اور پیٹریشیا کے ساتھ دو کمروں کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوچکی تھی۔

''اس بار میری یاد کیسے آگئی تمہیں؟'' ورنیتا نے تلخی سے پوچھا۔

''ڈیڈی کی خواہش تھی کہ مجھے تمہارے ساتھ بھی وقت گذارنا چاہیے۔'' وہ ہمیشہ ہی سے اس کے ساتھ آداب یا القاب کے بغیر گفتگو کیا کرتی تھی۔

''تمہارے باپ کی دوسری بیوی کیسی ہے؟ تم سے گھر کے کام کاج تو خوب کرواتی ہوگی۔'' وہ اوپرا کا صاف ستھرا لباس اور حلیہ دیکھ کر تنک کر بولی۔

''بالکل نہیں! وہ میری پڑھائی' کھانے پینے اور لباس کا بہت خیال رکھتی ہیں۔'' اوپرا کی صاف گوئی پر ورنیتا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے اس نادیدہ عورت سے شدید جلن محسوس ہوئی تھی۔ اوپرا فوری طور پر سمجھ ہی نہ پائی کی سخت دل اور کٹھور ماں آخر کس بات پر رو رہی ہے۔ کچھ دن سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ محرومیوں اور آزمائشوں سے بھری اس زندگی نے ورنیتا کو کبھی کوئی خوشی نہیں دی لہٰذا وہ بیٹی کی زبان سے خوشیوں بھری زندگی کا ذکر سن کر آبدیدہ ہوگئی کہ وہ خود ایسی سہولیات فراہم کیوں

نہ کرسکی۔ اس لمحہ اوپرا کو اپنی ماں پر بے حد رحم آیا۔ اس نے اپنے دل میں یہ عہد کرلیا کہ اب وہ ورنیتا کو کبھی مایوس نہیں کرے گی اور روزمرہ کے کام کاج میں بھی اس کا خوشدلی سے ہاتھ بٹادیا کرے گی۔ ورنیتا نے بھی وقتی فائدے کے لیے بیٹی کے ان جذبات کا خوب استحصال کیا۔

اس روز کے بعد اوپرا نے خود کو ورنیتا کے معمولات کے مطابق ڈھال لیا۔ ورنیتا دن بھر کام کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتی۔ اس کی غیر موجودگی میں اوپرا اپنی بساط کے مطابق سوتیلے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کیا کرتی۔ اسے ورنن اور زیلما کی توجہ' محبت اور شفقت بے حد یاد آتی لیکن وہ ان کے ساتھ گذارے ہوئے لمحات کا ذکر کرکر کے ورنیتا کو ایک بار پھر اشک زدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ نادان اور معصوم فطرت لڑکی ایک لمحہ کی قیدی بن گئی تھی۔ انہی معمولات میں گرما کی تعطیلات اختتام پذیر ہوگئیں اور ورنن اسے لینے کے لیے چلا آیا۔

''ہم دونوں نے گن گن کر یہ دن گذارے ہیں میرے بچے! بس اب جلدی سے اپنا سامان باندھ لو۔''

''میں نے بھی آپ کو بہت یاد کیا ڈیڈ! لیکن اب میرا واپس جانا ممکن نہیں۔'' اوپرا نے نظریں چرائیں۔

''لیکن کیوں میری بچی؟ کیا ہمارے پیار میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے؟'' ورنن نے بے یقینی سے پوچھا۔

''نہیں! آپ کے ساتھ گذارا ہر ایک لمحہ میرے لیے یادگار ہے۔ اس وقت ماں کو میری بہت ضرورت ہے۔ اسے تنہا چھوڑ کر گئی تو خود کو کبھی معاف نہیں کرپاؤں گی۔''

''ورنیتا کے پاس دو بچے اور بھی تو ہیں اوپرا! ہمارے پاس تمہارے سوا اور کون ہے؟'' ورنن آزردہ ہوا۔

''پلیز ڈیڈ! بس کچھ عرصہ کی بات ہے۔ مجھے مجبور نہ کیجیے۔'' وہ افسردہ تھی۔

''ہمارے گھر اور دلوں کے دروازے تمہارے لیے سدا کھلے رہیں گے اوپرا! تم جب چاہو ہمارے پاس لوٹ آنا۔'' وہ اس کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے مایوسی اور دل شکستگی کے عالم میں واپس لوٹ آیا۔ اس لمحہ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اوپرا کی بچکانہ ضد کے سامنے گھٹنے ٹیک کر وہ ایک بھیانک غلطی کررہا ہے۔ اگر اسے اوپرا کو لاابالی' غیر ذمہ دار' کینہ پرور اور کم فہم ورنیتا کے پاس چھوڑ جانے کے نتائج کی بھنک بھی محسوس ہوجاتی تو وہ لمحہ کے ہزارویں حصہ کی تاخیر کیے بناء بیٹی کو اپنے وجود کے حصار میں لیے بغیر وہاں سے ایک قدم بھی نہ اٹھاتا۔

لیکن یہی تو تقدیر کا کمال ہوتا ہے کہ اس کے ترکش میں موجود تیر کسی بھی انسان کی بصارت سے اوجھل ہی رہتے ہیں۔ ہوش تو اس وقت آتا ہے جب زہر میں بجھے یہ تیر اپنا وجود نیلگوں کردیتے ہیں۔

☆☆☆

میلوا کی میں زندگی ایک بار پھر اسی ڈگر پر رواں دواں ہوگئی۔

ورنیتا کے معمولات میں بھی کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ کولہو کے بیل کی طرح محنت کیا کرتی۔ اوپرا کے ساتھ وقت گذاری اس کے لیے ممکن ہی نہ تھی۔ اس نے اپنے مختصر وسائل کے باوجود ایک ٹیلی ویژن سیٹ خرید لیا تھا۔ اوپرا کا زیادہ تر وقت ٹی وی دیکھنے میں صرف ہونے لگا۔ اسے ہلکے پھلکے اور مزاحیہ پروگرام بے حد بھاتے تھے۔ خوش باش خاندانوں کی زندگی پردہ اسکرین پر دیکھ کر اسے بہت خوشی محسوس ہوتی تھی۔ محبت' چاہت اور ذہنی ہم آہنگی سے مالا مال مرد وزن کا جوڑا اپنے بچوں کو زندگی کی سبھی سہولیات' محبت اور اعتماد فراہم کرتے دکھائی دیتے تو اس کے دل کو بھی گونا گوں اطمینان میسر آنے لگتا۔ ان پروگرامز میں اسے اپنی زندگی کی تمام تر محرومیاں اور خلش تحلیل ہوتی نظر آتیں۔ اس کی آنکھوں میں ایسی زندگی بسر کرنے کے خواب مچلنے لگتے۔ وہ بے اختیار تصور میں اپنی پیدائش' والدین کے حالات اور اب تک کی تمام تر آزمائشوں کا خاتمہ تصور کرکے عجیب سرشاری محسوس کیا کرتی۔

اوپرا کی عمر اب نو سال ہو چکی تھی۔ ورنیتا کی مصروفیات میں غیر معمولی حد تک اضافہ ہونے لگا تھا۔ جس روز اسے رات گئے تک گھر سے باہر رہنا ہوتا وہ تینوں بچوں کو اپنے انیس سالہ ایک رشتہ دار کے پاس چھوڑ دیتی۔ اوپرا کا یہ کزن عاقبت نااندیش ورنیتا کے لیے بے حد قابل بھروسا تھا۔ اس رات بھی وہ بچوں کو اس کے حوالے کیے اپنی سرگرمیوں میں مگن تھی۔ اس کی کم فہمی کو اس بھیانک حقیقت کا ادراک ہی نہ تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے ایک جہنم کا دروازہ کھول گئی ہے۔

''اوپرا! تم ہم سب کو چھوڑ کر ناشول کیوں چلی گئی تھی؟ تمہیں پتا ہے کہ مجھے تمہاری کس قدر یاد آتی رہی۔'' کزن نے اپنے چہرے پر بھولپن سجاتے ہوئے کہا۔

''ماں نے زبردستی بھیجا تھا پھر وہاں جاکے علم ہوا کہ

زندگی میں اس قدر خوبصورتی بھی موجود ہے۔'' اوپرا نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔ اسے ورنن اور زیلما کے گھر میں گذارے گئے شب و روز بے پناہ یاد آتے تھے۔

''اوہ اچھا! کیا کرتی تھیں تم وہاں؟'' کزن نے دانستہ دلچسپی ظاہر کی۔ (اوپرا کے کزن کا نام اس کی خودنوشت میں کہیں بھی درج نہیں ہے۔ تاہم داستان کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے ہم اسے 'جونی' فرض کر لیتے ہیں)

''میں وہاں بہت خوش تھی جونی! ڈیڈی اور ممی میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ تمہیں پتا ہے انہوں نے مجھے لائبریری کی رکنیت بھی دلوادی تھی۔'' اوپرا نے جوش سے بتایا۔ اسے ایک طویل عرصہ بعد کوئی ایسا شخص میسر آیا تھا جس سے وہ بلا جھجک اپنے خوشگوار ماضی کی یادیں بانٹ سکتی تھی۔ اپنی خوشی اور سرشاری میں اسے علم ہی نہ ہوسکا کہ جونی نے کس لمحہ آدمیت کا لبادہ اتار کر بھیڑیئے کا روپ دھارا اور اسے اپنے خونی پنجوں میں دبوچ کر وحشت سے جھنجھوڑ ڈالا۔

کرب' اذیت' جبر اور دہشت سے مچلتی اوپرا کی منت سماجت اور آنسو بھی اس درندے کو اپنے بدارادوں سے باز نہ رکھ سکے۔ اس بھیانک حادثہ سے دوچار ہونے کے بعد اوپرا کے جسم پر لرزش طاری ہوگئی۔ اس کی تڑپ اور آنسو پتھروں کا کلیجہ بھی شق کر رہے تھے۔ جونی ایک لمحہ کے لیے خوف میں مبتلا ہوگیا۔ یہ لمحات اس کے لیے بے حد نازک تھے۔ اسے کسی بھی طرح اوپرا کی زبان بندی کرنی تھی۔ اس کے رونے دھونے سے جیفری اور پیٹریشیا کے اٹھنے کا خدشہ بھی لاحق تھا۔

''ارے میری گڑیا! رو کیوں رہی ہو؟'' جونی نے اسے پیار سے پچکارا۔

''تم بہت گندے ہو جونی!'' وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔ اس کی کپکپاہٹ میں کوئی کمی نہ آرہی تھی۔

''اچھا چلو اٹھو۔ ہم ابھی آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔'' وہ کسی طرح بہلا پھسلا کر اسے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔

''دیکھو اوپرا! تم تو ایک بہادر لڑکی ہو ناں!'' جونی نے آئس کریم کون اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ''یہ وقت تو ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہے۔ اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے بھلا؟ بہادر لڑکیاں اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرتیں ورنہ سب ان کا مذاق اڑانے لگتے ہیں کہ وہ اتنی بزدل ہے کہ اپنی زندگی کے نجی معاملات بھی چھپا کر نہیں رکھ سکتی۔'' جونی نے اس کی نفسیات کو مدنظر رکھتے

دیہاتی علاقہ کے غربت زدہ ماحول میں آنکھ کھولنے والی اوپرا وینفری کی والدہ حکومتی وظیفہ خوار اور گھریلو ملازمہ تھی۔ اس کی محنت اور لگن کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ شخص بتیس برس کی عمر میں ملینئر بن گئی۔ اکتالیس سال کی عمر میں اس کی دولت 340 ملین ہوچکی تھی۔ وہ ٹیلی ویژن کی جانب سے سب سے زیادہ معاوضہ پانے والی واحد ہستی ہے۔ 2008ء میں اس کے اثاثہ جات میں 275 ملین ڈالرز کا مزید اضافہ ہوچکا تھا۔

☆☆☆

سی این این اور ٹائمز میگزین کی جانب سے ایک سروے میں اوپرا وینفری کو بیسویں صدی پر اثر انداز ہونے والی سو طاقتور ترین افراد میں بھی شمار کیا گیا۔ وہ سیاہ فام نسل کی امیر ترین اور سب سے زیادہ بااختیار عورت ہے۔

☆☆☆

2005ء میں اوپرا کو امریکی تاریخ کی مؤثر ترین خاتون قرار دیا گیا۔ مجموعی طور پر اسے امریکی بااختیار افراد میں نواں درجہ ملا۔ اس کی ذاتی مقبولیت میں بھی ہر گذرتے ماہ و سال میں اضافہ ہی ہوتا آیا ہے۔ 2010ء میں اسے پچاس مؤثر ترین عالمی شخصیات میں شمار کیا گیا۔

☆☆☆

اوپرا وینفری شو نے اپنے دور میں مقبولیت کے ریکارڈ خود ہی توڑے۔ 1991/92 کے سیزن میں ناظرین کی مجموعی تعداد 13.1 ملین تک پہنچ گئی۔ 2008ء میں یہ پروگرام ایک سو چالیس ممالک میں نشر ہونے لگا جس سے تقریباً چھیالیس ملین افراد مستفید ہوا کرتے۔

☆☆☆

2004 سے 2010 تک اوپرا وینفری امریکا کی پچاس فیاض ترین شخصیات میں شمار ہوتی رہی۔ 2012ء میں اس نے تعلیمی مقاصد کے لیے چار سو ملین ڈالرز بطور عطیہ پیش کیے۔ اس سال جارجیا میں چار سو سے زائد طلبہ کے لیے وظائف مقرر کروائے۔ 2013 میں اس نے 'اسمتھ سونین نیشنل میوزیم' میں افریقی امریکن تاریخ اور ثقافت کے لیے بارہ ملین ڈالر کے عطیات دیئے۔ اسی سال باراک اوبامہ نے اسے 'پریذیڈینشل میڈل آف فریڈم' کا ایوارڈ پیش کیا۔

ہوئے ایک نیا جواز تراشا۔

''کیا.....؟'' اوپرا ساکت ہوئی۔ ''کیا ایسا وقت ہر لڑکی پر آتا ہے؟''

''ہاں بھئی! اب چھوڑو ان باتوں کو! ہم دونوں اچھے دوست ہیں۔ اور دوستوں کے راز کسی کو نہیں بتائے جاتے۔'' اس نے کم سن اوپرا کو مکمل طور پر اپنے اعتماد میں لے لیا۔ وہ بھی ناسمجھی سے محض سر ہلا کر رہ گئی۔

اس کے بعد اوپرا کی زندگی میں جنسی استحصال کا آسیب مستقل طور پر براجمان ہو گیا۔ اگلے دو سالوں میں جونی کی وحشت کا نشانہ بننے کے بعد خاندان میں نہایت قابل بھروسا اور شریف سمجھے جانے والے خاندانی دوست نے بھی اس کے ساتھ اسی جرم کا ارتکاب کیا۔ اس اذیت کے گھاؤ ابھی مندمل نہ ہو پائے تھے کہ ایک قریبی انکل نے بھی اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا ڈالا۔

اوپرا کی زندگی میں اب یہ بھیانک حادثات ایک معمول بن چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امریکا جیسے ترقی یافتہ معاشرے میں بھی بچوں سے جنسی زیادتی کے متعلق کوئی قانون موجود تھا' نہ ہی آگاہی۔ والدین اپنی اولاد کو اجنبی یا رشتہ داروں سے تحفظ فراہم کرنے کے متعلق کوئی بھی بات کرتے ہوئے ہچکچایا کرتے تھے۔ یہاں تو معاملہ بھی اوپرا کو درپیش تھا جس کی والدہ نے کبھی بھی اپنے فرائض نبھانا تو درکنار' محسوس کرنے کی بھی زحمت نہ کی تھی۔ اوپرا کے لیے آئے روز ان تینوں مردوں کی وحشت کا شکار ہونا ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ ایک روز اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں ورنیتا سے بات کرنے کی ہمت کر لی۔

''ماں! مجھے اسکول آتے جاتے ہوئے ایک لڑکا تنگ کرتا ہے۔''

''ارے! تو اس میں کون سی بڑی بات ہے احمق!'' ورنیتا نے اصل مسئلہ سمجھنے کی زحمت ہی نہ کی۔ اس لمحہ وہ ایک بار اپنی خود ساختہ مظلومیت اور لاابالی پن ترک کرتے ہوئے ماں کی حیثیت سے اوپرا کی آنکھوں میں جھانک لیتی تو اسے بے شمار عذاب لمحات کا کرب واضح طور پر نظر آجاتا لیکن وہ تو ورنیتا تھی۔ جس نے کبھی اپنے منصب کو پہچاننے یا اس سے منسلک ذمے داریاں نبھانے کے بارے میں سنجیدگی سے غور ہی نہ کیا تھا۔

''کیا یہ واقعی ایک معمولی بات ہے؟'' اوپرا نے شدید بے یقینی سے دریافت کیا۔

''ہاں تو اور کیا! یہ وقت تو ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہی ہے۔'' وہ کندھے اچکا کر بولی۔

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' اوپرا الجھ گئی۔

''کچھ بھی نہیں..... وہ جو کر رہا ہے کرنے دو..... تم اپنا کام کرو بس۔'' ورنیتا بیزاری سے کہہ کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اوپرا اب بھی مضطرب تھی۔ اس نے ذہنی طور پر تسلیم کر لیا کہ یہ حادثات ایک معمول اور زندگی کا ناگزیر حصہ ہیں لیکن اس کے باوجود لاشعور میں چھپی کوئی خلش اپنے نوکیلے پنجوں سے ذہن کے دریچوں پر بار بار دستک دے رہی تھی کہ یہ سب کچھ غلط ہے۔

''میرے ساتھ ہونے والے یہ واقعات شاید فطری ہی ہیں مگر مجھے کیوں ایک احساس زیاں پریشان کرتا ہے۔ اس کا تو مطلب یہی ہوا کہ میں ہی ابنارمل ہوں۔ زندگی کے حقائق تسلیم کرنے کی حس سے محروم ہو چکی ہوں۔'' وہ اکثر اسی نہج پر سوچا کرتی۔

انہی الجھنوں اور پریشانی میں مبتلا اوپرا نے اسکول کی پڑھائی میں بہرحال کوئی کمی نہیں رہنے دی تھی۔ وہ دلجمعی سے نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہی' چرچ میں بائبل کے اقتباسات سناتی رہی اور لائبریری سے اپنی پسندیدہ کتابیں لا کر مطالعہ میں پناہ ڈھونڈتی رہی۔

وقت مزید آگے سرکا تو اس نے ''لنکن مڈل اسکول'' میں داخلہ لے لیا جو میلوا کی کے پبلک اسکول سسٹم کا ہی ایک حصہ تھا۔ اوپرا کی ذہانت' کم گوئی' سنجیدگی اور لگن نے بہت جلد یہاں بھی اساتذہ کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اپنے ہم عمر طلبہ کے برعکس وہ دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے الٹی سیدھی حرکات کرتی تھی' نہ ہی جھگڑالو اور تخریب کارانہ مزاج کی مالک تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ کیفے ٹیریا میں بیٹھی اپنی کتابوں میں مگن دکھائی دیتی۔ اس کی یہ خلاف معمول سرگرمی' جین ابرامزنامی استاد سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''اوپرا! تم تفریحی اوقات میں ساتھی طلبہ کے ساتھ کھیل کود یا گپ شپ میں وقت کیوں نہیں گذارتی؟'' ایک روز جین اس سے پوچھ ہی بیٹھا۔

''مجھے کتابوں کی دنیا میں رہنا زیادہ پسند ہے۔ اس دنیا میں مین پسند سکون اور خاموشی ہوتی ہے۔'' اس کا جواب حسب توقع تھا۔

''خوب! میں تمہاری ذہانت اور لگن سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ تم یہاں رہ کر اپنا ہنر ضائع کرنے کی بجائے کسی

بہترین اسکول میں داخلہ کیوں نہیں لیتیں؟''

''میری والدہ سفید فام افراد کے گھروں میں صفائی اور ان کا جھوٹا کھانا ہمارے لیے لانے والی ملازمہ ہے۔ اس کے پاس اتنے وسائل نہیں کہ میری پڑھائی پر پیسا ضائع کر سکے۔'' وہ تلخی سے ہنسی۔

''اتنا مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں اپنا ذاتی اثر ورسوخ استعمال کر کے تمہیں گلینڈیل کے مضافات میں واقع 'نکولیٹ ہائی اسکول' میں منتقل کروا سکتا ہوں۔ اگر تم وہاں بھی اسی لگن اور جذبہ سے پڑھائی کرتی رہیں تو وفاقی تعلیمی وظیفہ کی اہل قرار پا کر اپنے مستقبل کے اخراجات کی فکر سے بھی آزاد ہو جاؤ گی۔'' جین کی پیشکش پر وہ سوچ میں مبتلا ہوگئی۔ کچھ دنوں بعد وہ کلی طور پر سفید فام بچوں کے اس تعلیمی ادارے میں پہلی افریقی نژاد امریکی طالبہ کی حیثیت سے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کر چکی تھی۔

گزشتہ کچھ عرصہ میں تعلیمی اداروں کی اس پے در پے تبدیلیوں نے اسے بیک وقت جوش اور ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیا۔ گلینڈیل کے اس اسکول میں آمد کے لیے اسے تین بار بس تبدیل کرنا پڑتی۔ آمدورفت کے مسائل کے علاوہ اوپرا کا جنوبی خطہ سے تعلق بھی اب تک اس کی زباندانی کے تلفظ سے عیاں ہوتا تھا۔ دیگر طلبہ کا تلفظ البتہ مختلف تھا۔ سفید فام بچوں کا رویہ ابتدا میں عمدہ ثابت ہوا۔ وہ اس سے شائستہ انداز میں بات چیت کرتے۔ جماعت میں اس کی غیر معمولی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اکثر طلبہ نے اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا لیکن اوپرا اپنی ذہنی الجھنوں کے باعث کبھی ان سے گھل مل ہی نہ سکی۔ وہ اب تک اس نتیجہ پر نہ پہنچ سکی تھی کہ طلبہ اس کی ذہانت کے باعث دوستی کرنے کے خواہاں ہیں یا اس کا سیاہ فام نسل سے تعلق ان کے متوجہ ہونے کا سبب بنتا ہے۔

نکولیٹ ہائی اسکول میں داخلہ اوپرا کے لیے پڑھائی لکھائی کے حوالے سے تو بہترین ثابت ہوا لیکن ذاتی تشخص کے لیے بہت سے مسائل پیدا ہونے لگے۔ سفید فام بچوں کا طرز زندگی اور سہولیات کا قریبی مشاہدہ اوپرا کے ذہن میں سوالات کا انبار پیدا کرنے لگا۔ ان کے ساتھ گذارے گئے وقت سے اس کے دل میں بھی عمدہ اور جدید انداز کے ملبوسات پہننے کی خواہش بیدار ہونے لگی۔ اپنے ہم جماعتوں کے وسیع وعریض، تمام تر سہولیات سے آراستہ گھروں کو دیکھ کر ورنیتا کے دو کمروں کے اس اپارٹمنٹ کی طرف دیکھنے کا بھی دل نہیں کرتا تھا۔ اسکول کے طلبہ اپنے گھر میں آئے روز مختلف تقریبات کا انعقاد کرتے۔ ان تقریبات میں اوپرا کی شمولیت اس کے اعصاب اور برداشت کے لیے ایک نیا امتحان ثابت ہونے لگی۔ اس کا کمتر لباس، بدرنگ جوتے اور پژمردہ چہرہ دیکھ کر اکثر انجان لوگ گھریلو ملازمہ تصور کر بیٹھتے۔

''اے لڑکی! ذرا اندر جا کر دیکھو۔ تمہاری والدہ جوس لا رہی ہے کہ نہیں؟'' اہلِ خانہ میں سے کوئی فرد اسے حکم دیتا۔

''اوہ ممی! یہ ملازمہ کی بیٹی نہیں ہے۔'' ہم جماعت فوری طور پر اس کی مدد کو لپکتے۔

''تو پھر کون ہے؟ اور یہاں کیا کر رہی ہے؟'' رعونت اور ناگواری بھرا جواب آتا۔

''ہماری کلاس فیلو ہے۔ اوپرا ونفری۔''

''واٹ ریش..... اب نکولیٹ ہائی اسکول کی انتظامیہ نے ان کیڑے مکوڑوں کو بھی داخل کرنا شروع کر دیا ہے۔'' تذلیل سے تھرتھراتے یہ الفاظ اوپرا کی روح پر گہرے چرکے لگاتے۔

قرب وجوار میں پھیلی ناانصافی اور متعصب رویے دھیرے دھیرے اس کی ہر اُمید اور خواب نگلنے لگے۔ مسز میری ڈنکن کے پڑھائے گئے تمام تر مثبت اسباق نااُمیدی کے ان اندھیروں کی نذر ہونے لگے۔ اس کی زندگی میں کرب، جبر اور استحصال کے سوا کچھ بھی تو نہ تھا۔ ورنیتا ہنوز پیٹریشیا اور جیفری کی طرف مائل بہ کرم تھی۔ اس نے کبھی بھی اوپرا کو قابل توجہ سمجھا ہی نہ تھا۔ غربت اور نظرانداز کے اس دکھ میں آئے روز ہونے والی جنسی زیادتی کا کرب اس کی روح کو گھن کی طرح چاٹنے لگا۔ وہ اپنے زخم کسی کو دکھا ہی نہ پاتی تھی۔ اس غیر فطری زندگی اور دباؤ کے ردِعمل میں اس کے رویہ میں جارحیت پیدا ہونے لگی۔ اس کے وجود میں وحشت اور نفرت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔

☆☆☆

ورنیتا کے پاس منتقلی اور عذاب کا لامتناہی سلسلہ جھیلتے ہوئے اوپرا تیرہ سال کی ہوگئی۔

اسے ورنن اور زیلیا کی محبت اور توجہ بے حد یاد آیا کرتی تھی لیکن اپنی نفسیاتی بُجی کے باعث وہ ان کے پاس لوٹنے کی ہر سوچ خود ہی رد کر دیتی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو چکا تھا کہ ماں کے ساتھ رہنے اور اس جہنم کا حصہ بننے کا فیصلہ اس کی ذاتی خواہش کا نتیجہ تھا لہٰذا اب اسے واپس جانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مسلسل ذہنی دباؤ اور

پریشانیوں نے اسے صحت کے مختلف عارضوں میں مبتلا کر دیا۔ متواتر سردرد اور آنکھوں سے بہتے پانی کے باعث اسے کتابیں پڑھنے میں دشواری ہونے لگی۔ انجام کار ورنیتا اسے لیے ماہر امراض چشم کے پاس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے مکمل معائنہ کے بعد چشمہ لگانے کی تجویز دی۔ اب اگلا مرحلہ وہیں سے فریم کے انتخاب اور چشمہ بنوانے کا تھا۔

''یہ دیکھو اوپرا! یہ فریم تم پر بہت اچھا لگے گا۔'' ورنیتا نے اسے متوجہ کیا۔

''یہ..... اس میں کیا ایسی خاص بات ہے؟'' اوپرا ماں کا منتخب کردہ فریم دیکھ کر غصہ سے بولی۔ ناقص دھات سے بنا بھدا سا وہ چشمہ یقیناً اس قابل بھی نہ تھا کہ اس پر دوسری نظر ڈالی جائے۔

''اس کی خوبصورتی اور دلکشی تو دیکھو ذرا!'' ورنیتا ہار ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔

''یوں کہو ناں کہ اس سے سستا فریم دکان میں اور کہیں نہیں ہے اسی لیے تم اس کی گھٹیا ساخت پر بھی ریجھ گئی ہو۔'' اوپرا نے بدلحاظی سے کہا۔ ''میں اسے اپنے چہرے پر سجا کر کارٹون نہیں بننا چاہتی۔ مجھے اپنی پسند کا معیاری فریم ہی چاہیے۔''

''میں نے پیسوں کا درخت نہیں اگا رکھا جو تمہارے چونچلے پورے کرنے کے لیے رقم اتار کر لٹاتی رہوں۔ اگر تمہیں اپنی پسند پوری کرنی ہے تو چرچ کے سامنے بھیک مانگنی شروع کردو۔'' ورنیتا نے رکھائی سے کہا۔

''تم جیسی ماں کی جگہ خداوند نے مجھے کسی بھکارن کی بیٹی ہی بنا دیا ہوتا تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔'' اوپرا نے بھی دوبدو جواب دیا۔ وہ ناپسندیدہ نظروں سے اس فریم کو دیکھ رہی تھی۔

اس واقعہ کے بعد اس کی جارح مزاجی میں طوفانی رفتار سے اضافہ ہونے لگا۔ غصہ، نفرت، طیش اور انتقامی روش میں ایک روز اس نے ورنیتا کے ملازمت پر روانہ ہوتے ہی اپنے طے شدہ منصوبہ پر عمل درآمد کا آغاز کردیا۔ اوپرا نے چہرے سے فریم اتارا اور لیمپ کی مدد سے چکنا چور کردیا۔ اس کے بعد کھڑکی پر لٹکے پردے کھینچ کر اتارے اور کمرے کا دیگر سامان بھی منتشر کردیا۔ ایک مخصوص منظر نامہ تخلیق کرنے کے بعد اس نے لیمپ اپنے سر کے عقبی حصہ پر دے مارا۔ دھاتی ضرب سے سر فوراً زخمی ہوگیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھی اور اپنی بھرپور قوت مجتمع کرکے چلانے لگی۔

''ہم لٹ گئے..... پلیز مدد کرو..... ہم لٹ گئے۔''

اس کی چیخ وپکار پر پڑوسیوں نے فوری طور پر پولیس کو طلب کرلیا۔ جائے وقوعہ پر پہنچتے ہی پولیس افسران مشکوک ہوگئے۔ ان کی پیشہ وارانہ حس کسی گڑبڑ کا عندیہ دے رہی تھی تاہم فی الوقت کوئی ثبوت میسر نہ تھا۔ اوپرا کو فوری طور پر اسپتال منتقل کرکے ورنیتا کو بھی اس حادثہ سے مطلع کردیا گیا۔ بیٹی پر بیتنے والی اس افتاد کے بعد ورنیتا پہلی مرتبہ اس کے لیے تشویش زدہ نظر آئی۔ اسپتال آمد کے بعد اس کے ذہن میں بھی اس ڈکیتی کی 'صحت' پر شکوک پیدا ہوئے تھے لیکن اوپرا کی حالت نے اسے مزید گہرائی میں سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کے گھر واپس آنے کے بعد ورنیتا نے بیٹی کو نیا اور قدرے بہتر فریم بنوادیا۔ اوپرا اپنے اس 'طرزِ عمل' پر خود کو داد دیتے نہ تھک رہی تھی۔

اوپرا کا مزاج ہر گزرتے دن کے ساتھ ابتر ہوتا جارہا تھا۔ اس نے اپنے اسکول کے کئی لڑکوں سے دوستی گانٹھ لی۔ وہ بلا جھجک ان کے ساتھ آوارہ گردی کے لیے نکل کھڑی ہوتی۔ ذاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے ورنیتا کے پرس سے رقم چوری کرنی شروع کردی۔ ورنیتا اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر متوحش ہونے لگی تھی۔

''اوپرا! کل رات تم کس لڑکے کے ساتھ گھر واپس آئی تھیں؟'' اس نے غصہ سے پوچھا۔

''دوست ہے میرا..... ہم کمبائن اسٹڈیز کرنے گئے تھے۔'' اوپرا نے اطمینان سے جھوٹ ترا شا۔

''مجھے اس لڑکے کے طور طریقے بالکل پسند نہیں آئے۔ وہ اچھے کردار کا لڑکا نہیں ہے۔'' ورنیتا نے سمجھانا چاہا۔

''مجھے اس کے کردار سے کیا لینا دینا؟ میں نے اس کے ساتھ پڑھائی کرنی ہے نہ کہ شادی۔'' وہ ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''تمہیں ابھی سے شادی کے خواب دکھائی دینے لگے ہیں۔ پہلے کسی قابل تو ہو جاؤ۔'' ورنیتا بھڑک گئی۔

''یہ وقت تو ہر لڑکی پر ہی آتا ہے۔ اس میں اتنا غصہ کیسا؟'' اوپرا نے ماں کو اسی کے الفاظ لوٹائے۔ اسے ورنیتا کی حالت دیکھ کر بہت لطف محسوس ہو رہا تھا جسے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ اوپرا کی اس بدلحاظی اور زبان درازی کو کس طرح قابو کرے۔ وہ ایک معمولی سا نکتہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس نے بیٹی کی تربیت اور اپنی ذات سے قربت کا بہترین

وقت خود ہی گنوا دیا ہے۔ گذشتہ تیرہ سال میں بوئی جانے والی فصل کی کٹائی کرتے ہوئے اسے غش آنے لگے تھے۔

ماں کی روک ٹوک اور سمجھانے بجھانے کے باوجود اوپرا کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ رقم کی چوری اور لڑکوں کے ساتھ تعلقات ایک معمول بن چکے تھے۔ ایک روز وہ اپنے ہم جماعت کے ساتھ 'فینسی ہوٹل' کے سامنے موجود تھی کہ اسے لیموزین رکتی نظر آئی۔ اس پر شکوہ گاڑی کے نظارے نے اوپرا کے احساس کمتری کو یکدم ہوا دی۔ باوردی شوفر نے دروازہ کھولا اور بہترین لباس زیب تن کیے مشہور گلوکارہ 'اریتھا فرینکلن' کو نزاکت سے باہر آتے دیکھ کر اوپرا کے دماغ میں ایک نیا منصوبہ پروان چڑھنے لگا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھی اور لیموزین کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''کون ہو تم؟'' گلوکارہ اس کے چہرے پر طاری مظلومیت اور بے چارگی دیکھ کر پسیج گئی۔

''ایک دھتکاری ہوئی نفرت زدہ لڑکی۔ جس کے پاس خودکشی کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔'' اوپرا نے گلوگیر انداز میں کہا۔

''اوہ..... ایسا کیا ہوا تمہارے ساتھ؟ مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔''

''میرے والدین نے مجھے دھکے مار کر گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ میرا بوجھ اٹھانے سے انکار کر چکے ہیں۔''

''تو تم کسی رشتہ دار کے گھر چلی جاؤ ناں۔''

''رشتہ دار نیویارک میں رہتے ہیں۔ وہاں تک جانے کے لیے میرے پاس کرایہ نہیں۔ جسم فروشی کے سوا اب اور کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی۔ ایسی زندگی کا بوجھ اٹھانے سے بہتر ہے کہ میں موت کو ہی گلے لگا لوں۔'' اوپرا زاروقطار رونے لگی۔

''زندگی اتنی ارزاں نہیں ہوتی کہ اسے یوں ضائع کر دیا جائے۔'' گلوکارہ نے رسان سے کہا۔ غالباً اپنے ارد گرد ہجوم کو دیکھ کر اس کے دل میں بھی 'ذاتی نمود' کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ ''تم یہ پیسے رکھو اور اپنے رشتہ داروں کے پاس چلی جاؤ۔'' اس نے سو ڈالر اوپرا کو تھمائے۔

رقم دیکھتے ہی اوپرا کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ اس نے چیل کی طرح نوٹ جھپٹ لیا۔ وہ ان پیسوں کا مصرف پہلے ہی سوچ چکی تھی۔ چند دن ایک عمدہ ہوٹل میں قیام اور بھرپور عیاشی کرتے ہوئے وہ ورنیتا کی حالت کا تصور کر کے محظوظ ہوتی رہی جسے علم ہی نہ تھا کہ اوپرا گھر سے غائب ہو کر کہاں موجود ہے؟

''اب آئے گا مزہ! پولیس میں رپورٹ درج کرواؤ یا سڑکوں کی خاک چھانو۔ میں تو فی الحال بہت سکون میں ہوں۔'' اس نے ہوٹل کے بستر کے نرم گدے پر خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اوپرا کا اندازہ بالکل درست تھا۔ اس کے غیاب نے ورنیتا کو ایک نئی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

''کیا مصیبت ہے بھئی! یہ لڑکی تو دن بدن ایک عذاب بنتی جا رہی ہے۔'' وہ جھنجلا کر سوچتی۔ اس وقت اسے زیلما سے حسد اور نفرت میں اوپرا کو اپنے پاس روک لینے کا فیصلہ احمقانہ محسوس ہو رہا تھا۔

''میں نے خوامخواہ اس مصیبت کو اپنے گلے باندھ لیا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ باپ کے پاس ہی رہتی۔ کم از کم میری زندگی ان پریشانیوں سے تو محفوظ رہتی۔ اب کہاں سے جا کر ڈھونڈوں اسے؟'' وہ عاجز آ چکی تھی۔ اسے سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ کچھ سال پہلے تک خاموش' دھیمے مزاج اور سلجھے ہوئے مزاج کی اوپرا کہاں کھو گئی ہے۔ اس کی وحشت' بیزاری' نفرت اور جارح مزاجی کا پس منظر ہنوز پوشیدہ تھا۔ چند دن بعد اوپرا خود ہی گھر چلی آئی۔

''کہاں مر گئی تھیں تم؟ تمہیں ذرا بھی احساس ہے کہ میں کس قدر پریشان رہی ہوں۔'' ورنیتا چلا اٹھی۔

''اپنی محنت کی کمائی پر عیش کر رہی تھی۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''کمائی..... کیسی کمائی..... تم نے کہیں جسم فروشی کا دھندا تو شروع نہیں کر دیا۔'' اس نے دہل کر کہا۔

''نہیں..... ابھی ایسی کوئی نوبت نہیں آئی۔ ہاں البتہ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

اوپرا کا یہ انداز ورنیتا کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ اس نے بیٹی کے نفسیاتی معالجہ کے لیے خصوصی نگہداشت کے مقامی مرکز سے بھی رابطہ کیا لیکن وہاں پہلے ہی اس قدر مریض موجود تھے کہ کسی نئے فرد کی گنجائش ہی نہ تھی۔ تھک ہار کر اس نے اوپرا کو ورنن کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

ورنن اور زیلما نے خوشدلی اور محبت سے بیٹی کا استقبال کیا۔ گذشتہ پانچ برس میں وہ جو پل اس کی کمی محسوس

کرتے رہے تھے۔ اس کے ساتھ بیتے لمحات میں اپنے وجود کی تشنگی بھول جاتے تھے لیکن انہیں اندازہ ہی نہ تھا کہ اس بار وہ ان کے لیے ایک صبر آزما آزمائش بن کر لوٹی ہے۔

''تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے اوپرا؟'' ورنن نے محبت سے پوچھا۔

''ٹھیک ہی چل رہی ہے پوپس!'' وہ بے زاری سے بولی۔

''کیا گریڈز آتے رہے ہیں میری بچی کے؟'' زیلما نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''میں اس وقت بہت تھکی ہوئی ہوں۔ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے قطع کلامی کی اور بدتہذیبی سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ اوپرا کی اس حرکت پر زیلما حیرانی سے ورنن کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ انہیں علم ہی کہاں تھا کہ یہ صرف آغاز تھا۔ اوپرا نے انہیں حیرت اور صدمہ کے بہت جھٹکے دینے تھے۔ کچھ دن مزید گزرے تو ورنن اس کے ملبوسات دیکھ کر چیں بہ چیں ہونے لگا۔

''اوپرا! یہ تم کیسے کپڑے پہننے لگی ہو؟ شریف گھرانوں میں ایسے لباس مناسب نہیں لگتے بیٹا!'' وہ اس کی منی اسکرٹ سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

''اس میں کیا خرابی ہے پوپس؟ سب لڑکیاں ایسے ہی لباس تو پہنتی ہیں۔ اوپرا نے کندھے اچکائے۔

''اب میں پوپس کیسے ہو گیا بھئی؟'' وہ مزید حیران ہوا۔ ''مجھے تو یہ انداز تخاطب بالکل پسند نہیں۔ پہلے کی طرح ڈیڈ کہا کرو بس!''

''او کے ڈیڈ! میں کوشش کروں گی۔'' اس نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔

''گڈ گرل! اب ان کپڑوں کی بجائے اچھے اور مہذب لباس استعمال کرنا شروع کرو، اور اپنے بالوں کا انداز بھی تبدیل کرو۔'' ورنن نے محبت سے کہا۔

''میں کوشش کروں گی ڈیڈ!'' اوپرا باپ کی شفقت پر پلٹ کر کوئی جواب نہ دے سکی اور خاموشی سے کمرے میں چلی گئی۔

''بہت بدل گئی ہے یہ۔ پہلے تو ایسی بالکل نہ تھی۔'' زیلما نے تاسف سے کہا۔

''ہاں! اس کی بیزاری، غصہ اور انداز و اطوار دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ ورنیتا نے اسے بالکل توجہ نہیں دی۔ اس نے بیٹی کو کسی خودرو جھاڑی کی طرح پروان چڑھایا ہے۔'' ورنن بھی دکھی تھا۔

''آپ کی بات بالکل درست ہے لیکن مجھے کچھ اور بھی محسوس ہو رہا ہے۔ اوپرا اپنی ذات سے بالکل لاتعلق ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی خود انتقامی میں مبتلا ہے۔'' زیلما کی بصیرت اسے کسی گہری گڑبڑ کا عندیہ دے رہی تھی۔

''ہاں! مجھے اس کے تیور بدلے بدلے نظر آتے ہیں لیکن سمجھ ہی نہیں آتی کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟'' ورنن نے تشویش سے کہا۔ اگلے کچھ ہفتوں میں وہ دونوں محبت اور توجہ سے اوپرا کی ذہنی کیفیت معتدل کرنے کی تراکیب پر عمل کرنے لگے۔ ان کے لیے خوش آیند بات یہ تھی کہ اوپرا نے مختصر لباس پہننا ترک کر دیا تھا۔

''کھلے لباس میں میری بیٹی بہت باوقار نظر آتی ہے۔'' ورنن نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

''لیکن اتنا کھلا لبادہ پہننے کی بھی کیا ضرورت ہے بیٹا! قمیص کو تھوڑی سی سلائی سے تنگ کیا جا سکتا ہے۔'' زیلما نے تجویز دی۔

''میں انہی لبادوں میں خود کو زیادہ آرام دہ محسوس کرتی ہوں۔'' اوپرا نے نظریں چرائیں۔ وہ ان دنوں شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ اسے اپنی جسمانی ساخت میں ہونے والی تبدیلیوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بہت جلد ایک اور 'آزمائش' میں مبتلا ہونے والی ہے۔

اوپرا ونفری کی اس داستان کو پڑھتے ہوئے ممکن ہے کہ آپ سب کے ذہن میں کئی الجھن آمیز سوالات پیدا ہوں۔ اپنے ساتھ ہونے والی جنسی زیادتی پر اس کی خاموشی، کسی کو بھی اعتماد میں نہ لے پانے کی غلطی اور اب تخلیق کے مرحلہ کو سب سے پوشیدہ رکھنے کی احمقانہ کوشش موجودہ وقت میں تو ناقابل یقین محسوس ہو سکتی ہیں لیکن ساٹھ کی دہائی کے امریکی معاشرے کی استحصال زدہ لڑکی سے یہی توقع کی جا سکتی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب بچوں کو مناسب جنسی شعور دینا ایک اخلاقی جرم تصور کیا جاتا تھا۔ انہیں کبھی اتنا اعتماد ہی فراہم نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے والدین سے ہراسانی کے معاملات پر کھل کر گفتگو کر سکیں۔ مناسب رہنمائی اور شعور کی عدم فراہمی کے باعث ہی اوپرا کو اپنی اس 'تبدیلی' کا اس وقت اندازہ ہوا جب جسمانی ساخت میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی اور پھر اس بھیانک آگہی کے بعد بھی اس میں اتنا اعتماد و حوصلہ نہ تھا کہ وہ زیلما ہی کو اپنا مسئلہ بتا سکے۔ اسے

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حقیقت سے آگاہی کے بعد وہ دونوں اس سے نفرت کرنے لگیں گے۔ اوپرا کی بے خواب راتیں بے حد کربناک ہوتیں۔ اسے اپنے وجود میں سانپ اور بچھو رینگتے ہوئے محسوس ہوا کرتے۔ وہ اذیت اور تڑپ سے اپنا پیٹ نوچ دیتی لیکن یہ ہولناک احساس کم ہوکے ہی نہ دیتا۔ اس کشمکش اور جبر کا خاتمہ بھی قدرت کی طرف سے اچانک ہی ہوگیا۔ ایک روز اوپرا کمرے میں کپڑے تبدیل کررہی تھی کہ زیلما بے دھیانی میں اندر چلی آئی۔ وہ لمحہ ان دونوں ہی کے لیے دہشت ناک تھا۔ زیلما کے قدموں تلے حقیقی معنوں میں زمین کھسکی تھی۔ اسے ورنن کو بھی اس بھیانک حقیقت سے آگاہ کرنا پڑا۔

''اوپرا! میری بچی...... تم نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' ورنن سسک اٹھا۔

''کیا بتاتی ڈیڈ؟ کس طرح بتاتی؟ گزشتہ پانچ سال میں میرے اپنوں کے دیئے گئے زخم آپ کو کیسے دکھاتی؟ میں تو خودکشی کرنے کا ارادہ تک کرچکی تھی۔'' اوپرا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ اس انکشاف پر زیلما اور ورنن ششدر رہ گئے۔

''کون تھا وہ؟ میں اسے دوسرا سانس نہیں لینے دوں گا۔'' ورنن کی آنکھوں میں لہو چھلکا۔

''ہر وہ اپنا جس پر والدین ہمیشہ اعتبار کیا کرتے ہیں اور پھر ایسا وقت تو ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہے ناں۔'' اوپرا سادگی سے کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''غلط...... بالکل غلط...... یہ فضول نظریہ کس نے ٹھونسا ہے تمہارے ذہن میں؟'' ورنن شدت حیرت سے چلاّ اٹھا۔

''ماں نے بتایا تھا۔'' وہ الجھی۔ اسے باپ کا انداز دیکھ کر اپنا احساس جرم اور خلش بالکل درست ثابت ہوتی نظر آرہی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوتا میری بچی! ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اور کسی بھی لڑکی کی زندگی میں یہ وقت شادی کے بعد آتا ہے۔ اس سے پہلے ایسا ہونا غلط ہے۔'' زیلما بھی اشک زدہ تھی۔

''مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔'' اوپرا پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

''مجھے اپنی بچی کے گناہ گار کا علم ہوجائے تو میں اسے پل لمحہ بھی مزید جینے نہیں دوں گا۔''

اوپرا کو والد کی حالت دیکھ کر خوف محسوس ہونے لگا۔ اگر وہ کوئی انتہائی قدم اٹھالیتا تو قانون کی گرفت میں جکڑے جانے کے بعد اوپرا ایک بار پھر بھیڑیوں سے بھری اس دنیا میں اکیلی رہ جاتی۔ اوپرا نے اسی لمحہ اپنی زبان بندی کا عزم کرلیا۔

ذہنی اور اخلاقی دباؤ نے اسے مقررہ وقت سے بہت پہلے دردزہ میں مبتلا کردیا۔ والدین نے کسی بھی تاخیر کے بغیر اسے اسپتال منتقل کردیا جہاں اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ بچہ بے حد کمزور اور مختلف بیماریوں کا شکار تھا۔ اوپرا گھنٹوں اس کی طرف خالی نظروں سے دیکھتی رہتی۔ وہ اس وقت دہری اذیت میں گرفتار تھی۔ مامتا کے جبلی جذبات سے مغلوب ہوکر بیٹے کو گود میں اٹھاتی تو اس کی تخلیق سے وابستہ بدبودار اور اذیت ناک لمحات یاد آنے لگتے۔ وہ نومولود کو فوری طور پر واپس پٹخ کر اپنے ہاتھوں سے نادیدہ سانپ اور بچھو جھاڑنے لگتی۔ قدرت کو بھی اس کی حالت پر رحم آگیا اور اس دنیا میں بچے کی سانسیں دو ہفتے بعد ہی پوری ہوگئیں۔

اولاد سے محرومی نے اوپرا کو دہرے جذبات میں مبتلا کردیا۔ ان چاہے وجود سے خلاصی سکون بخش احساس تو تھا لیکن زخمی مامتا کو ایک پل کے لیے بھی چین نصیب ہوکے ہی نہ دے رہا تھا۔ اسے اپنے وجود میں نادیدہ خلا کا احساس مضطرب رکھتا۔ اوپرا کے جذبات بے حد منتشر رہنے لگے۔

''اوپرا! میری بچی! خود کو سنبھالو۔ اس طرح ہمت ہار دینے سے کیا ہوگا؟'' زیلما نے اسے تسلی دی۔

''مجھے اپنی کیفیات سمجھ ہی نہیں آتیں ممی! ایک لمحہ کے لیے بے حد اطمینان محسوس ہوتا ہے لیکن پھر احساس زیاں ڈنک مارنے لگتا ہے۔ میں کیا کروں؟ شاید ماں ٹھیک ہی کہا کرتی تھی کہ میں ایک ایب نارمل ہوں۔'' اس کے انداز میں صدیوں کی تھکاوٹ تھی۔

''ورنیتا بالکل غلط کہتی تھی۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''میری بیٹی ناکام ہے نہ ہی ایب نارمل۔ وہ ایک ذہین اور مکمل انسان ہے۔ اس کی زندگی میں اذیت کا ایک وقتی پڑاؤ آیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد اپنی فطری کیفیات پر قابو پالے گی۔''

''مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میری زندگی میں اندھیروں کے سوا اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔'' اوپرا بے حد مایوس تھی۔

یہ اندھیرا ہمیشہ یونہی تو مسلط نہیں رہے گا میری بچی!

قدرت کا قانون بھی یہی ہے کہ ہر رات کے بعد روشن سویرا ضرور آتا ہے۔ تمہاری زندگی میں بھی بہت سی کامیابیاں منتظر ہیں۔ ورنن نے سب انتظامات کر لیے ہیں۔ 'ایسٹ ہائی اسکول' میں دسویں درجے کی پڑھائی کا آغاز کرو اور اپنے لیے ایک بہترین مستقبل تراشو۔'' زیلما نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔

ستمبر 1968 میں بہت سی تسلی تشفی کے بعد اوپرا کو اسکول بھیج دیا گیا۔ وہ اپنی جماعت میں کم عمر ترین لڑکی تھی۔ اس کی ذہانت وقابلیت میں کوئی دورائے نہ تھی لیکن ماضی میں ہونے والے پے در پے سانحات نے اس کے اعصاب ہنوز منتشر کر رکھے تھے۔ وہ نصابی معاملات پر مکمل توجہ مرکوز کر ہی نہ پا رہی تھی جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ امتحان میں 'سی گریڈ' ملنے لگے۔

''اوپرا! یہ کیسا نتیجہ ہے بھئی؟'' ورنن نے حیرت سے ابرو اچکائے۔ ''سی گریڈ میری بیٹی اس قدر معمولی لڑکی تو نہیں کہ ایسا نکما نتیجہ میرے سامنے لا کر رکھ دے۔'' وہ دانستہ طور پر ناراضگی جتانے لگا۔

''مجھ سے پڑھا ہی نہیں جاتا ڈیڈ! کیا کروں میں؟''

''کیوں نہیں پڑھا جاتا؟ میری بیٹی اتنی بزدل ہے کیا جو اپنے ماضی میں ہی قید ہو کر رہ جائے۔ تمہیں ہر اس شخص کو کامیاب ہو کر دکھانا ہے جو ماضی میں تکلیف اور دکھ کا باعث بنتا رہا ہے۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکیں تو میں سمجھوں گا کہ وہ لوگ اپنی وحشت اور درندگی میں جیت گئے اور میری بیٹی اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود ہار گئی۔''

''نہیں! میں ہار نہیں مانوں گی ڈیڈ! میں اس بار انہیں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔'' اوپرا نے بلبلا کر کہا۔

''زندگی نے تمہیں سر اٹھا کر جینے کا ایک اور موقع دیا ہے میری بچی! اسے ضائع نہ ہونے دینا۔'' زیلما نے بھی خلوص سے سمجھایا۔

اوپرا نے اپنی تکالیف اور روح پر لگے زخموں کو زادِ راہ بنائے کمر کس لی۔ ذہنی کشمکش سے نجات پانے کے لیے اس نے ایک بار پھر لائبریری کا رخ کر لیا۔ کتب بینی میں اس کا رجحان ایسی خواتین کی خودنوشت تلاشنا تھا جنہیں زندگی میں بہت سی کٹھنائیوں کا سامنا رہا۔ اس ضمن میں اسے سب سے پہلے 'این فرینک' کے حالاتِ زندگی جاننے کا موقع ملا۔ این ایک یہودی لڑکی تھی جس نے اپنے والدین کے ساتھ ہٹلر اور نازیوں سے روپوش رہ کر بدقت تمام زندگی بسر کی۔ اس اذیت بھرے شب و روز میں این اپنی کیفیات ڈائری میں لکھا کرتی۔ اسی ڈائری کے مندرجات اوپرا کے لیے بھی مثبت تحریک بننے لگے۔

این فرینک کے بعد اس نے 'ہیلن کیلر' کا زندگی نامہ پڑھا۔ ہیلن بینائی' بصارت اور سماعت سے محرومی کے باوجود ذاتی جدوجہد کے باعث ایک شاندار اور پُرتعیش زندگی بسر کر رہی تھی۔

سولہ سال کی عمر میں اوپرا نے 'مایا اینجلو' کی خودنوشت پڑھی اور کچھ لمحوں کے لیے حقیقتاً ساکت رہ گئی۔ مایا اور اوپرا کی زندگیاں گویا 'جڑواں' تھیں۔ مایا کے والدین بھی علیحدہ ہو چکے تھے۔ وہ پہلے والدہ اور پھر والد کے ساتھ رہتی تھی۔ مایا کے ساتھ بچپن میں ہونے والے جنسی زیادتی کے واقعات پڑھ کر اوپرا کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

''مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ یہ حادثہ صرف مجھ سیاہ نصیب کے ساتھ ہی ہوا تھا لیکن اتنی بڑی شاعرہ نے بھی یہی کرب اور اذیت برداشت کی۔ اس نے بھی وہی مسائل جھیلے۔ جب وہ اس سانحہ سے سنبھل کر کامیابی کی منازل طے کر سکتی ہے تو پھر میں کیوں نہیں؟ میں بھی اس دنیا کو بتا دوں گی کہ عورت اس قدر کمزور نہیں ہوتی کہ اس کی زندگی اتنی آسانی سے برباد کر دی جائے۔'' اس کے وجود میں عزم کروٹیں لینے لگا۔ اس نے کئی ایک بار مایا اینجلو کی سوانح پڑھی اور ہر مرتبہ ایک نئی تقویت محسوس کی۔

ورنن اور زیلما نے بیٹی کو کسی بھی لمحہ تنہائی کا احساس نہ ہونے دیا۔ وہ اس کی خداداد صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے ہر ممکن مواقع فراہم کرتے رہے۔ ہر اتوار Faith Missionary Baptist Church میں عوام کے سامنے بائبل کے اقتباسات پڑھ کر سنانے کا معمول دوبارہ شروع ہو گیا۔ اگلے دو سال میں علاقے کے تمام گرجا گھروں میں اوپرا کے ہنر کی شہرت پھیل گئی۔

1970 کا وہ سال اوپرا کے لیے کافی خوش قسمت ثابت ہوا۔ وہ Elks Club میں ہونے والے تقریری مقابلہ میں فاتح قرار پائی۔ اس روز اوپرا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انتظامیہ کی جانب سے انعام کے علاوہ کالج میں پڑھائی کے لیے چار سالہ وظیفہ نے اس کی سرشاری اور اعتماد میں مزید اضافہ کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی سابقہ ڈگر پر لوٹنے لگی۔ امتحانات میں اچھے گریڈز ملنے سے اساتذہ اور طلبہ

میں مقبولیت بھی بڑھنے لگی۔ یہ وہ دور تھا جب وہ اپنے ہم جماعت 'انتھونی اوٹے' کے لیے بہت انوکھے جذبات محسوس کررہی تھی۔

اوپرا کی زندگی میں اب تک ورنن کے علاوہ ہر مرد ہی ایک بھیانک تجربہ بن کر آیا تھا لیکن انتھونی کے لیے پیدا شدہ جذبات اسے گدگدانے لگے تھے۔ انتھونی کا خیال رکھنا' اس کے حالاتِ زندگی' مسائل' خواب اور مستقبل کے ارادوں کی بابت گھنٹوں گفتگو سننا بھانے لگا۔ اس رشتہ میں ایک معصوم سی کشش تھی۔ انہیں ایک دوسرے سے بات چیت کرنا دنیا کے کسی بھی کام سے زیادہ اہم محسوس ہوتا۔ اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے اوپرا اسے محبت نامے لکھا کرتی۔ بہت جلد حلقہ احباب میں یہ بات زبان زدِعام ہوگئی کہ اوپرا اور انتھونی شادی کرلیں گے لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس سال ویلنٹائن ڈے پر انتھونی نے اس سے حتمی بات چیت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''اوپرا! تم جانتی ہو کہ میں نے اپنی زندگی میں تم سے زیادہ محبت کسی لڑکی سے نہیں کی۔''

''میں نے بھی تم سے پہلے کسی لڑکے کے لیے ایسے بے ریا جذبات محسوس نہیں کیے۔'' اس نے سچائی سے کہا۔

''اس رشتہ کا کیا مستقبل ہوگا اوپرا؟ کیا ہم یونہی ملتے جلتے اور باہمی گفتگو کرتے رہیں گے؟'' انتھونی مضطرب تھا۔

''پتا نہیں..... البتہ تم چاہو تو ہم ایک مستقل رفاقت میں بھی بندھ سکتے ہیں۔''

''میں بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اوپرا! لیکن میرا دل کہتا ہے کہ تمہیں اپنے نام اور رشتہ سے نتھی کرنا ایک بہت بڑی زیادتی ہوگی۔'' انتھونی نے اپنی الجھن بیان کی۔

''اوہ! یعنی تم یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہو؟'' اوپرا نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''تم شاید میرا یقین نہ کرو لیکن تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم بہت آگے جاؤ گی اور ایک بات کہوں! میں تمہیں ہمیشہ یاد کرتا رہوں گا۔'' انتھونی جذبوں سے بوجھل تھا۔ اوپرا نے خاموشی سے اپنی راہیں الگ کرلیں۔ اس کی روح پر لگے زخموں میں ایک اور گھاؤ کا اضافہ ہوگیا تھا۔

☆☆☆

اگلے سال 1971ء اسے 'اسٹوڈنٹ کونسل' کے وائس پریذیڈینٹ کے انتخابات میں کھڑا کردیا گیا۔ طلبہ کے ووٹ اور توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی منفرد رستہ اختیار کرنا چاہتی تھی۔ سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن نے اچھوتا خیال پیش کیا۔ وہ ناشول کے کانسرٹ ہال Grand Ole Opry کی طرز پر Vote For Grand Ole Oprah کا نعرہ بلند کرکے مرکزِ نگاہ اور محورِ گفتگو بن گئی۔ انتخابات میں فتح اوپرا کی زندگی کے لیے ایک نیا موڑ ثابت ہوئی۔

اسی سال اسکول انتظامیہ کی جانب سے اوپرا کے علاوہ ایک اور ذہین طالب علم کو وائٹ ہاؤس میں نوجوانوں کے لیے منعقدہ خصوصی کانفرنس میں 'ریاست تینوسی' کی نمائندگی کے لیے بھیجا گیا۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے ملک بھر سے تیرہ تا انیس سالہ (ٹین ایجر) لڑکے اور لڑکیاں آئے تھے۔ مختلف ریاستوں سے تعلق رکھنے والے ان ہم عمر افراد سے گپ شپ ایک یادگار تجربہ ثابت ہوئی۔

ناشول واپسی کے بعد تقدیر اوپرا کے لیے ایک اور 'حیرت' کا انتظام کیے کھڑی تھی۔ ان دونوں طلبہ کو WVOL نامی ریڈیو اسٹیشن کی جانب سے کانفرنس میں اپنے تجربات ومشاہدات بیان کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس پروگرام کے بعد اوپرا ایک بار پھر اپنی پڑھائی میں مگن ہوگئی۔ کچھ ماہ بعد ریڈیو اسٹیشن کے عہدیدار 'جان ہیڈلبرگ' نے اسے دوبارہ مدعو کرلیا۔

''مس اوپرا! مجھے تمہارے انداز گفتگو اور شخصیت نے بہت متاثر کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم Miss Fire Prevention Contest میں ریڈیو اسٹیشن کی نمائندگی کرو۔''

''کیسی نمائندگی؟'' وہ حیران ہوئی۔

''دراصل یہ ٹین ایجرز کا مقابلۂ حسن ہے۔ تم اس میں حصہ لینے کی بالکل اہل ہو۔'' ہیڈلبرگ کی وضاحت پر اوپرا ہمدردانہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''سوچ رہی ہوں کہ اتنی شاندار اور پروقار شخصیت 'کلر بلائنڈ' ہے۔ اف! آپ کی خانگی زندگی میں تو بے شمار الجھنیں اور جھگڑے ہوتے ہوں گے۔'' اوپرا نے شرارت سے کہا۔ گزرے وقت کے ساتھ اس نے اپنے مسائل اور پریشانیاں مسکراہٹ کے پردے میں پوشیدہ رکھنا سیکھ لیا تھا۔ اس فن نے اس کی شخصیت مزید پرکشش بنادی تھی۔

''کیسے جھگڑے بھئی؟ میری زندگی مثالی ہے اور تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں کلر بلائنڈ ہوں؟''

''اب دیکھیے ناں! آپ نے ایک سیاہ فام کو مقابلہ حسن میں شرکت کی پیشکش کی ہے۔ اسی طرح آپ اپنی سرخ وسفید اہلیہ کو کسی اور رنگ میں دیکھتے ہوں گے۔ وہ بے چاری تو خوخوار انداز میں آپ کے پیچھے پڑ جاتی ہوگی۔'' اس کے معصومیت بھرے انداز پر ہیڈلبرگ نے بے ساختہ قہقہہ بلند کیا۔

''میرے پاس تمہارے اس سوال کا ایک ہی جواب ہے کہ اس مقابلۂ حسن میں حصہ لو۔ میری بصارت کبھی دھوکا نہیں کھا سکتی۔'' اس نے ہر ایک لفظ پر زور دیا۔ اوپرا نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکا دیئے۔ اسے اس مقابلہ میں حصے کا خیال ہی بہت بچگانہ محسوس ہو رہا تھا۔

''تو پھر تم تیار ہو؟'' وہ پُرجوش ہوا۔

''ہاں! ایک ایڈونچر ہی سہی۔'' اوپرا بے نیازی سے بولی۔

مقابلے کا دن آپہنچا۔ ورنن اور زیلما نے اسے اپنی بھرپور محبت کا یقین دلایا۔ ورنن نے اوپرا کا ہاتھ تھاما اور شفقت سے تھپکتے ہوئے کہنے لگا۔ ''زندگی میں فتح اور شکست سے زیادہ انسان کا ظرف اور رویہ اہم ہوتا ہے میری بچی! مسکراہٹ اور اعتماد کو اپنے ہتھیار بنالو۔ ناکامی کبھی تمہارے قریب بھی نہ پھٹکے گی۔''

''شکریہ ڈیڈ! میں آپ کے یہ الفاظ ہمیشہ یاد رکھوں گی۔'' اوپرا نے محبت بھری نظروں سے والد کو دیکھا۔ وہ اس کی دشوار ترین زندگی میں مضبوط' سایہ دار شجر ثابت ہوا تھا۔

مقابلہ حسن میں تمام اُمیدوار سفید فام تھیں۔ حسن اور نزاکت کے کیل کانٹوں سے لیس ان لڑکیوں کے مابین واحد سیاہ فام اوپرا تھی۔ وہ گاؤن میں ملبوس پُراعتماد اور باوقار انداز میں ججز کے سامنے کھڑی رہی۔ اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔

اس مقابلے کا ایک حصہ سوال جواب پر مبنی تھا۔ تمام لڑکیاں اسٹیج پر ایک قطار میں کھڑی ہوگئیں۔ ججز نے سب سے مشترکہ طور پر ایک سوال پوچھا ''اگر آپ کو کہیں سے ملین ڈالرز مل جائیں تو آپ اس رقم سے کیا کریں گی؟''

اُمیدواروں سے ذہانت اور گہرائی پر مبنی منفرد جواب دینے کی توقع کی جارہی تھی۔ پہلی اُمیدوار نے چند لمحے سوچنے کے بعد نزاکت سے کہا۔ ''میں اپنے پوپس کے لیے ایک ٹرک خریدوں گی۔''

''میں اپنے بھائی کے لیے موٹر سائیکل اور ماں کے لیے ریفریجریٹر خریدوں گی۔'' دوسرا جواب آیا۔ اس کے بعد اوپرا کی باری تھی۔ اس کے ذہن میں صرف شرارت تھی۔

''اگر مجھے ملین ڈالرز مل جائیں تو میں انہیں خرچ کروں گی، پھر خرچ کروں گی، پھر تھوڑا تھوڑا اور خرچ کروں گی۔'' اوپرا کے بے ساختہ انداز اور صاف گوئی نے ججز کو مسکرانے پر مجبور کردیا۔ انجام کار اوپرا وینفری اس مقابلہ حسن کی فاتح قرار پاگئی۔ یہ سفر یہیں ختم نہ ہوا۔ اس کے بعد 'مس بلیک ٹینیسی'، 'مس بلیک ناشول' اور 'مس بلیک امریکا' کے اعزازات بھی اوپرا کا مقدر بن گئے۔ وہ اپنی قسمت کی اس کایا پلٹ پر بہت حیران تھی۔

☆☆☆

مقابلۂ حسن میں کامیابی کے بعد مقامی ٹی وی اسٹیشن CBS (کولمبیا براڈکاسٹنگ سسٹم) نے اوپرا کو شام کے اوقات میں نیوز اینکر متعین کردیا۔ وہ ناشول ٹی وی پر اس عہدے تک پہنچنے والی پہلی افریقی نژاد امریکی تھی لہٰذا اس کی کارکردگی کو جانچنے کے لیے سخت ترین معیار مقرر کیے گئے۔ اس وقت غالباً اوپرا بھی گردش زوال کا شکار تھی۔ وہ اپنی صلاحیتوں کا کھل کر مظاہرہ نہ کرسکی۔ کیلیفورنیا کے ساحلوں سے ٹکرانے والے سمندری طوفان کی تباہ کاریوں کی خبر سناتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہی غلطی کیا کم تھی کہ وہ اسٹاک ایکسچینج میں مندی کی خبر سناتے ہوئے پریشانی سے اپنے اعصاب پر قابو کھو بیٹھی اور بری طرح لرزنے لگی۔

اس کی مخلص اور ہمدردانہ طبیعت ہی اس کی دشمن ثابت ہو رہی تھی۔ ان 'پیشہ وارانہ کوتاہیوں' کی پاداش میں نو ماہ بعد ہی اسے ملازمت سے برخاستگی کا پروانہ تھما دیا گیا۔ چینل انتظامیہ جان گئی تھی کہ اوپرا میں خبریں سنائے جانے کے لیے مشینی اور سپاٹ انداز پروان چڑھنا مشکل ہے۔

''اس نوکری کے ختم ہونے سے کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی ناں میری بیٹی کو؟'' زیلما نے استفسار کیا۔

''نہیں! پریشانی کیسی؟ اگر میرا ہنر اور صلاحیت سلامت رہیں تو ایسی ایک نہیں ہزار نوکریاں میرے قدموں میں خود بخود آگریں گی۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔ ورنن کی نصیحت آج بھی اس نے اپنے ذہن میں روزِ اوّل کی طرح نقش کر رکھی تھی۔

ان دنوں 'محبت' ایک دفعہ پھر اس کی زندگی میں دستک دے چکی تھی۔ 'بوبا ٹیلر' اس کے حواس پر مکمل غلبہ پا چکا تھا۔ جذبات کی شدت کا یہ عالم تھا کہ اوپرا نے اسے اپنے تعلقات کی بنیاد پر ریڈیو اسٹیشن پر ملازمت دلوادی۔ ٹیلر کے ساتھ گذارے گئے وقت میں اسے کائنات بھر کی خوشیاں اپنی دسترس میں محسوس ہوتیں۔ پانچ سال تک چاہت اور جذبات کی بارش میں بھیگتے اوپرا کو زندگی نے ایک اور جھٹکا اس وقت دیا جب گریجویشن کی ڈگری ملنے سے قبل ہی اسے WJZ-TV میں چھ بجے خبرنامہ پڑھنے کے لیے نوکری کی پیشکش کی۔ اوپرا نے بلا تامل اقرار کرلیا۔

''آج میں بہت خوش ہوں بوب! بہت ہی زیادہ خوش۔'' اس نے اپنے دونوں بازو فضا میں پھیلا کر خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

''ایسا کیا ہوگیا بھئی؟'' بوبا ٹیلر نے پوچھا۔

''مجھے بالٹی مور میں خبرنامہ پڑھنے کے لیے معاون اینکر کی نوکری مل گئی ہے۔'' وہ پُرجوش تھی۔

''تو ٹھیک ہے..... شوق سے جاؤ بالٹی مور!'' ٹیلر نے رکھائی سے کہا۔

''میں اکیلی بھلا کیسے جاؤں گی؟ تم بھی تو میرے ساتھ جاؤ گے ناں؟'' اوپرا بے یقینی سے بولی۔

''نہیں! میں ناشول نہیں چھوڑ سکتا۔ میں یہیں نوکری کروں گا۔'' اس نے یکدم ہی کینچلی بدل لی تھی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بوب! یاد نہیں کہ ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ تم ہمیشہ میرا ساتھ دو گے۔'' اوپرا کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔

''مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ جھٹک کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تو کیا تمہیں یہ بھی یاد نہیں کہ ہم نے مستقبل کے لیے شادی اور محبت کے بہت سے خواب دیکھے تھے۔'' وہ سسک اٹھی۔ اس کا دل خون ہو رہا تھا۔

''نہیں! مجھے تو ایسا کچھ بھی یاد نہیں۔ اگر تم نے اپنی نادانی میں ایسا کوئی خواب دیکھا بھی تھا تو اسے اپنی یادداشت سے کھرچ دو۔''

''پلیز بوب! تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟'' اوپرا گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی۔ ''میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ ہاتھ جوڑ اٹھی۔

قارئینِ بیرون ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ **بیرون ملک ڈاک خرچ** پر تقریباً **200 سے 250 فیصد** اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کر رہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ نومبر 2020 سے لاگو ہوگا جس کی تفصیل تمام رسائل میں فراہم کر دی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

''تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہو سکتا ہے۔ میرے دل میں اب ایسی کوئی خواہش نہیں۔ بہتر ہے کہ ہم اپنی راہیں جدا کر لیں۔'' ٹیلر مکمل طور پر بدلحاظ ہو چکا تھا۔ اوپرا بے یقینی اور صدمہ سے ساکت رہ گئی۔ اس لمحہ اسے یقین ہو گیا کہ بوبا ٹیلر سے محبت اور خوابوں سے وابستہ یہ رشتہ اپنی مدت ختم کر چکا ہے۔ اس کی عزت نفس کو شدید ٹھیس پہنچی تھی۔ لہولہو دل اور ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں سمیٹے وہ خاموشی سے بالٹی مور روانہ ہو گئی جہاں تسخیر کا ایک نیا جہان اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

بالٹی مور پہنچتے ہی ذاتی زندگی کی خلشیں اور مسائل پس پشت ڈال کر اوپرا نے ایک نئی لگن سے اپنی نوکری کا آغاز کر دیا۔

اگلے دو سال تک معاون اینکر کے فرائض سرانجام دینے کے بعد اسے WJZ کی جانب سے 'ٹاک شو' People Are Talking کی میزبانی کے لیے مدعو کیا گیا۔ یہ ایک بالکل نیا تجربہ ثابت ہونا تھا۔ وہ فطری طور پر کچھ گھبراہٹ اور خوف میں مبتلا ہونے لگی۔

''اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے اوپرا؟ مجھے یقین ہے کہ تم اس ذمے داری کو بھی بہترین انداز میں نبھا لو گی۔'' اس کی بہترین دوست 'گیل کنگ' نے خلوص سے سمجھایا۔ گیل کالج کے دنوں سے ہی اس کے ساتھ تھی۔

''پریشانی یہ ہے کہ لوگ ایک فربہ اندام اور سیاہ فام میزبان کو کس طرح برداشت کریں گے؟''

''کیوں نہیں کریں گے؟ تمہیں پتا نہیں ہے کیا کہ امریکی قوم کی نفسیات بہت عجیب ہے۔ یہ کسی کی شخصی اور منفرد خوبی سے متاثر ہو کر اسے سر آنکھوں پر بٹھانے میں ایک پل نہیں لگاتے۔'' گیل نے سمجھایا۔ ''بے فکر ہو کر آن ایئر جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری شخصیت کا جادو سر چڑھ کر بولے گا۔''

''شکریہ گیل! تم واقعی ایک بہترین دوست ہو۔'' اوپرا ممنون تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم جان کے ساتھ خوش ہو ناں؟'' گیل نے ٹٹولا۔ سنہری بالوں، چوڑے شانوں، چوڑے ہی دہانے اور پتلے ہونٹوں والے جان ٹیش کا رجحان پیانو اور پاپ میوزک کی طرف تھا۔ وہ ریڈیو اور ٹی وی سے بھی منسلک تھا۔

''میرے نصیب میں محبت کی خوشی لکھی ہی نہیں گئی۔'' اوپرا نے مایوسی سے کہا۔ ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے ربڑ سے محبت میں ملنے والے سکھ چین کی لکیریں مٹا دی ہیں۔''

''اب کیا ہوا ہے؟ تم دونوں میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟''

''نہیں! جھگڑا کیسا؟ بس ہوا یہ ہے کہ میرے ساتھ ڈھیروں وقت گذارنے اور وعدے وعید کے بعد جان نے اپنے اہل خانہ اور احباب کے مطالبہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ انہیں جان کے ایک سیاہ فام عورت سے تعلقات پر شدید تحفظات تھے۔'' اوپرا کی تلخ ہنسی پر گیل تاسف میں مبتلا ہو گئی۔ اس کے پاس اپنی سہیلی کو دلاسہ دینے کے لیے الفاظ ہی نہ تھے۔

ٹاک شو کے آغاز میں اوپرا کے خدشات باطل ثابت ہوئے۔ عوام نے کشادہ دلی سے اس کا استقبال کیا۔ اوپرا کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ ستم گر تقدیر کے پاس اسے ناکام کرنے کے لیے اس بار ایک نیا عذر موجود تھا۔ اوپرا کے بال 'پرمنگ' کروانے کے دوران اس قدر خراب ہوئے کہ کچھ ہی دنوں میں اس کا سر صفاچٹ ہو گیا۔ ایک عام عورت کی طرح بال اس کی بھی شدید کمزوری تھے۔ اوپرا کا اعتماد اور حوصلہ ڈگمگانے لگا جس کا نتیجہ پروگرام کے دوران بے در پے غلطیوں کی صورت میں رونما ہونے لگا۔

''مس وینفری! تم ناقابل تلافی غلطیاں کرنے لگی ہو۔'' انتظامی عہدیدار نے اسے طلب کر کے درشتی سے کہا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔'' وہ بے بسی سے سر جھکا کر بولی۔

''آن ایئر پروگرام میں کسی بھی قومی یا سماجی المیہ پر آنسو بہانا تمہاری ذمے داری نہیں ہے۔'' عہدیدار نے طنز کیا۔ ''تم اپنے جذبات پر قابو پانا آخر کب سیکھو گی؟''

''میں کوشش کروں گی کہ خود کو ایک مشین کے سانچے میں ڈھال لوں۔'' اوپرا تلخ ہونے لگی۔

''مشین کے سانچے میں ڈھالنا تو دور کی بات ہے۔ تم پہلے اپنے جسم کو تو متناسب بنا لو۔ دن بہ دن پھیلتی ہی جا رہی ہو۔ عوام کی جمالیاتی حس پر پوری اتر نا اب تمہارے بس کی بات نہیں رہی۔''

اس تذلیل اور ذاتی تشخص کی نفی پر اوپرا کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ تنہائی اور اداسی اس کی روح کو گھن کی طرح چاٹنے لگیں۔ زندگی کے اس نازک موڑ پر وہ بے

اختیار ٹی وی رپورٹر 'لائیڈ کریمر' کی طرف متوجہ ہونے لگی۔ لائیڈ نے مخلصانہ انداز میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

''اوپرا! مایوس کیوں ہوتی ہو؟ تمہارے بال جلد ہی اپنی اصل حالت میں لوٹ آئیں گے۔ بس کچھ ہی عرصہ کی تو بات ہے۔'' اس نے آئینے کے سامنے خود کو دل شکستگی کے عالم میں دیکھتی اوپرا کو تسلی دی۔

''وہ کہتے ہیں کہ اوپرا! اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھو! آنسو نہ بہاؤ۔ میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ ایک انسان کبھی اپنے جذبات سے نجات نہیں پاسکتا۔ انسان کے لیے مشینی احساسات کے ساتھ جینا کیسے ممکن ہے؟'' وہ چلا اٹھی۔ اس کے دل و دماغ پر مایوسی اور خودترسی غالب آنے لگی تھی۔

''اوپرا! میں نے تم جیسی حسین عورت آج تک نہیں دیکھی۔ جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ تمہارا دل بہت خوبصورت ہے۔ حساس، نازک، محبت بھرا اور سب سے منفرد.....''

''سب یہی کہتے ہیں..... سب اسی طرح میرے جذبات سے کھیلتے ہیں اور پھر اپنے رستے الگ کر لیتے ہیں، سب جھوٹ ہے..... سب جھوٹ ہے۔'' وہ جذباتیت پر قابو نہ پاسکی۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو! ہم نیویارک چلتے ہیں۔ وہ ایک بڑا اور مصروف شہر ہے۔ تمہارا دل بہل جائے گا اور بہت جلد کوئی نہ کوئی نوکری بھی مل جائے گی۔'' اس تجویز پر وہ خاموش ہوگئی۔

نیویارک آکر اپرا ایک شادی شدہ مرد پر فریفتہ ہو گئی (اس شخص کا نام بھی اوپرا نے کبھی ظاہر نہیں کیا۔ داستان کی روانی برقرار رکھنے کے لیے ہم اس کا نام پال فرض کر لیتے ہیں) اپنے جذبات کی شدت خود اس کی سمجھ سے بھی بالاتر تھی۔ پال نے کبھی اپنی شادی کے حقائق اوپرا سے پوشیدہ نہ رکھے۔ اپنی بیوی کو چھوڑ کر اس سے مستقل رشتہ قائم رکھنا پال کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ وہ اوپرا کے ساتھ مختصر وقت گذار کر اپنے اہلِ خانہ کے پاس واپس چلا جاتا۔ گیل ان تمام تر جذبات سے باخبر تھی۔ وہ اوپرا کو مخلصانہ انداز میں سمجھایا کرتی۔

''اس رشتے کا کوئی مستقبل نہیں ہے پیاری! وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔''

''میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی گیل! اس سے دور ہونے کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی ہے۔''

''کیونکہ تم یہ کوشش دل سے نہیں کرتیں۔ اچھی خاصی سمجھدار اور باشعور انسان ہو۔ خوامخواہ جذباتیت کا شکار کیوں ہو رہی ہو؟ کوئی کسی کے بغیر ادھورا نہیں ہوتا۔'' گیل کی منطق سمجھنے کے باوجود اوپرا شدید بے بسی کا شکار تھی۔ پال جتنی بار اسے دھتکارتا' وہ مزید جنون میں مبتلا ہو جاتی۔

''مجھ میں ایسی کیا کمی ہے آخر؟ وہ صرف اور صرف میری طرف متوجہ ہو کر کیوں نہیں رہ سکتا؟ اسے اپنی بیوی سے زیادہ محبت کیوں ہے؟ وہ مجھ سے ویسی محبت کیوں نہیں کرتا؟'' اوپرا ہسٹریا کی حدود چھونے لگی۔ چار سال بیت جانے کے بعد بھی وہ پال کو اپنا نہ بنا سکی۔ اداسی احساس شکستگی میں ڈھل کر اسے مزید ذہنی دباؤ میں مبتلا کرنے لگی۔ اور پھر وہ لمحہ بھی چلا آیا جب پال نے اس سے رشتہ توڑنے کا اعلان کر دیا۔

''تمہیں خداوند یسوع مسیح کا واسطہ پال! میرے ساتھ ایسا نہ کرو۔ مجھے مت چھوڑ کر جاؤ!'' وہ وحشت زدہ تھی۔

''میں آئے روز کی چخ چخ برداشت نہیں کر سکتا اوپرا! میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بیوی سے الگ نہیں ہو سکتا۔'' پال بیزاری سے بولا۔

''ٹھیک ہے! مت چھوڑو۔ میں اس کے بارے میں آئندہ کوئی بات نہیں کروں گی لیکن مجھے بھی اپنائے رکھو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔'' وہ اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''ہٹ جاؤ پاگل عورت! مجھے تمہارے وجود سے وحشت ہونے لگی ہے۔ تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پاگل کر دو گی۔'' پال اسے جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے بولا۔ اوپرا وہیں فرش پر لیٹی اپنی بے بسی اور تذلیل پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس تشنہ لب کو علم ہی نہ تھا کہ مرد ہمیشہ ایسی عورت کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اسے خود سے دور رکھنے اور تڑپانے کا فن جانتی ہو۔ پکے ہوئے پھل کی طرح آغوش گیر ہونے والی عورت ازل سے اسی طرح دھتکاری جاتی رہی ہے۔ اوپرا کا المیہ یہ تھا کہ اس نے زندگی کے مختلف پڑاؤ گذارنے کا فن ان لمحات کے بیت جانے کے بعد سیکھا۔ اس کے اندر جینے کی تمنا ختم ہونے لگی تھی۔ اپنے جذبات سے الجھتے، سسکتے اس نے موت سے بغلگیر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ گیل کو لکھے گئے 'آخری خط' میں اس نے خود پر بیتنے والی تمام تر قیامت بتا دی۔ وہ لمحات اس کے لیے بہت کٹھن تھے۔ موت کی آرزو کرتی اوپرا کو اس بھیانک حقیقت نے خود سے

نظریں چرانے پر مجبور کردیا کہ زندگی سے بے تحاشا نفرت ہونے کے باوجود اس کی جبلی محبت سے فرار ممکن نہیں۔

''لعنت ہے تم پر اوپرا وینفری! لعنت ہے۔ تم اس قدر بزدل نکلی کی کہ خودکشی جیسا معمولی کام بھی نہیں کر سکتیں۔'' وہ اپنے بال نوچنے لگی۔ ''مرجاؤ تم! مر کیوں نہیں جاتیں؟ تمہارے جینے کا آخر کیا فائدہ ہے؟''

وہ وقت بے حد اذیت ناک تھا۔ اوپرا کے اعصاب مکمل طور پر منتشر ہو چکے تھے۔ ذہنی دباؤ اور اعصابی شکستگی نے اس کے وزن میں کئی گنا اضافہ کردیا۔ وہ خود احتسابی کے کڑے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر وہ اپنی زندگی کی ان ناکامیوں کا احتساب کیا کرتی۔

''آخر ہر بار میرے ساتھ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے؟ میں نے مختلف مردوں کے ساتھ تعلقات قائم کر کے خود کو اتنا ارزاں کیوں کرلیا ہے؟'' وہ اپنے عکس سے پوچھنے لگی۔ ان الجھنوں اور سچائیوں کا سامنا کرتے بالآخر اس پر آشکار ہوا کہ اسے کسی بھی حال میں خود ستائشی کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا کندھا ہمہ وقت درکار ہے جو اسے سہارا دیتا رہے۔ اس نے ہر ایک رشتہ میں ورژن جیسی بے لوث محبت تلاشی تھی۔ لیکن یہ تو ناممکن سی بات تھی اور اس سے بھی مشکل بات یہ تھی کہ وہ حقیقت سے آگہی کے باوجود اس شخصی کمزوری سے نجات حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ اوپرا کی یہ حالت مزید جانے کتنا عرصہ برقرار رہتی لیکن تقدیر کو بالآخر اس پر ترس آ گیا۔ اوپرا وینفری کو شکاگو میں نصف گھنٹا پر محیط ایک نئے مارننگ ٹاک شو کی میزبان بننے کی پیشکش ہوئی۔ وہ ستمبر 1983ء میں شکاگو چلی آئی۔

☆☆☆

Am Chicago نامی اس پروگرام کی ریٹنگ نہایت ابتر تھی۔

اوپرا وینفری کے ساتھ کیے گئے چار سالہ معاہدہ میں مبلغ دو لاکھ سالانہ معاہدہ مقرر ہوا۔ شکاگو پہنچتے ہی اوپرا کے سابقہ خدشات ایک بار پھر لوٹ آئے۔ سیاہ فام میزبان کا خاطر خواہ استقبال اب بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔ اس سے بڑی پریشانی تو یہ تھی کہ اس کے مارننگ شو کے اوقات امریکا کے مقبول ترین پروگرام The Phil Donahue Show سے متصادم تھے۔ مذکورہ پروگرام کا میزبان سفید فام' تجربہ کار' با اعتماد اور قومی سطح پر پسندیدہ شخص تھا۔ اوپرا کے ذہن میں وسوسوں کے ناگ کلبلانے لگتے کہ وہ ایک مستحکم حیثیت کے حامل فرد کا مقابلہ کیسے کر پائے گی؟ ناظرین کی توجہ اپنی جانب مرکوز رکھنے کے لیے ایسی کون سی راہ تلاش کرے کہ وہ ٹی وی چینل تبدیل کر کے فل کا شو نہ دیکھیں۔

اس بار خوش قسمتی اوپرا کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ تھی۔ 'ایم شکاگو' کی نشریات نے ایک ماہ میں ہی ریٹنگ کے گذشتہ ایک سال کے ریکارڈ توڑ دیئے۔ اگلے دو ماہ میں یہ صورت حال مزید بہتری کی طرف گامزن نظر آئی۔ اس موقع پر فل نے نیویارک منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے تجربہ اور بصیرت نے یہ حقیقت بھانپ لی تھی کہ اوپرا وینفری کا مقابلہ ممکن نہیں رہا۔ وہ اپنے ریکارڈ خود ہی توڑا کرے گی۔ اگلے ایک سال میں اوپرا کی مقبولیت میں پچاس فیصد مزید اضافہ نے اس کا ذاتی اعتماد مستحکم کرنا شروع کردیا۔

سیاہ فام اوپرا وینفری بہت جلد امریکی گھریلو خواتین کی بہترین دوست بن گئی۔ امریکی عوام اس کی ساحرانہ قوت گویائی کے گرویدہ ہو چلے تھے۔ ایم شکاگو کے بعد اس کی فلم The Color Purple بھی باکس آفس پر کامیاب ثابت ہوئی۔ اس فلم کی کہانی افریقی نژاد امریکی خواتین کے متفرق مسائل پر محیط تھی۔ زنا' محرم' گھریلو تشدد' غربت' تعصب' نسل پرستی اور بچوں کے جنسی استحصال پر مبنی کہانی میں اوپرا نے ایک پریشان حال گھریلو خاتون صوفیہ کا کردار اس خوبصورتی سے نبھایا کہ اسے اکیڈمی ایوارڈز کے لیے منتخب کرلیا گیا۔

ان پیشہ وارانہ کامیابیوں کے باوجود اوپرا کے وجود میں صحرا پنہاں تھا۔ محبت کی تشنگی اور سہارا تلاشنے کی جذباتی کمزوری اسے ہنوز بھٹکا رہی تھی۔ انہی دنوں اس کی زندگی میں ایک ایسے شخص کی آمد ہوئی جو 'کوکین' کے نشے کا عادی تھا۔ اوپرا کی دولت اور معاشرتی حیثیت دیکھ کر اس کی رال ٹپک اٹھی۔ اس نے نہایت مہارت سے اوپرا کو بھی اس لت میں مبتلا کردیا تاکہ وہ اپنے ساتھ اس کی ضروریات بھی پوری کرتی رہے۔ اوپرا کی جذباتی شکستگی اور مایوسی نے بہت جلد مدافعت ترک کردی۔ اسے کوکین میں اپنی محرومیوں اور تشنہ لبی سے فرار حاصل ہوا تو وہ انجام کی پروا کیے بغیر اس راہ پر سرپٹ بھاگتی چلی گئی۔ اس نشہ باز شخص سے تعلقات ختم ہوتے ہی 'رینڈلف کک' نے اسے منشیات کی فراہمی کا

آغاز کردیا۔ اوپرا اپنے سود وزیاں سے بے نیاز ہونے لگی تھی۔

نشہ کی سرور بخش کیفیت کا خاتمہ ہوتا تو وہ اکثر اپنی ذات میں الجھ کر خود سے ایک سوال کرنے لگتی کہ انسانی زندگی میں محبت کی طلب زیادہ ہولناک ہے یا منشیات کی لت؟ اس طویل کشمکش اور خود احتسابی کا نتیجہ یہی برآمد ہوتا کہ محبت سے محرومی اور نفرت کی زہریلی ہوا کسی بھی دوسری اذیت سے زیادہ کربناک اور لاعلاج ہوتی ہے۔

اوپرا وینفری پیشہ وارانہ اہلیت کے باوجود اپنی ذاتی زندگی میں تنہائی اور خود اذیتی کے اندھیروں میں بھٹک رہی تھی۔

☆☆☆

''تم اپنی صلاحیتیں ضائع مت کرنا اوپرا! تمہارا ہنر حقیقتاً لاجواب ہے۔'' اس کے سامنے بیٹھے 'راجر البرٹ' نے کہا۔ وہ ایک فلمی نقاد اور اوپرا کی اہلیت کا بے پناہ قائل تھا۔

''میں اپنی صلاحیتیں پہچان چکی ہوں۔ اب میں اسی راہ پر گامزن رہوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔'' وہ مسکرائی۔

''نہیں! تم اب بھی درست سمت سے دور ہو۔ اپنے شو کی ہیئت تبدیل کرو۔ اسے سنڈیکیٹ (شرکت تجار۔ جس کے تحت مختلف ڈسٹری بیوٹرز کو پروگرام کے حقوق حاصل ہوجاتے ہیں) میں دھوے سے کہتا ہوں کہ تم امریکی تاریخ میں ایک نیا انقلاب پیدا کردوگی۔'' البرٹ کی سنجیدگی اور دلچسپی اوپرا کے ذہن میں بھی کھلبلی مچانے لگی۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' اوپرا نے مکمل رضامندی ظاہر کی اور پھر 8 ستمبر 1986 کو The Oprah Winfrey Show کا آغاز ہوا۔ اوپرا کی صلاحیتوں نے ناظرین کو ایسا گرویدہ بنایا کہ 'ٹائم میگزین' لکھنے پر مجبور ہوگیا؛

''اوپرا وینفری کے شو نے مقبولیت کے نئے جھنڈے گاڑ کر اپنی اہلیت کا لوہا منوالیا ہے۔ ٹیلی ویژن انڈسٹری ایک ایسی جگہ ہے جہاں سفید فام مردوں نے ہمیشہ راج کیا ہے۔ ان حالات میں ایک فربہ اندام سیاہ فام عورت نے لاکھوں' کروڑوں افراد کے دل جیت کر ایک غیر معمولی کام کیا ہے۔ اس کی سادہ گفتگو' کسی بھی مصنوعی آلائش سے پاک برجستہ انداز' لطیف حس مزاح' مضبوط اور مخلص ہمدردانہ انداز ہر بوڑھے' بچے' مرد اور عورت کے دل میں گھر کر گیا ہے۔ شو میں آئے مہمانوں کی افسردہ کہانیاں اوپرا کی آنکھوں میں جو آنسو لاتی ہیں ان کی سچائی کی مہک ہر ناظر اپنی حس شامہ سے محسوس کرتا ہے۔ اس صورت حال میں وہ اپنی روح کے ایسے ناسور بھی عیاں کرتے چلے جاتے ہیں جنہیں کوئی بھی قومی ٹی وی پر نوک زبان پر لانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ کبھی کبھی یہ شو محض ایک پروگرام نہیں بلکہ 'تھراپی سیشن' محسوس ہونے لگتا ہے۔''

مداحوں کے علاوہ مختلف ناقدین نے تنقید کے کوڑے بھی خوب برسائے۔ وہ اس کے انداز' اعتماد' جسمانی ساخت کو رگیدتے ہوئے شو کے دوران جذبات میں مبتلا ہو جانے کو ڈھکوسلا قرار دیا کرتے لیکن حقیقت تو یہ تھی اس بے رحم تنقید کے باوجود شو کی مقبولیت میں کوئی کمی نہ آئی۔ بچپن میں آلو کے تھیلے زیب تن کرنے والی اوپرا دولت کی بارش میں بھیگ رہی تھی۔

شو کا پہلا سیزن کامیاب ثابت ہوا تاہم اسی سال 'رچرڈ رائٹ' کے ناول 'Native Son' پر بنی فلم سینما گھروں میں ناکام رہی۔ اس ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کی بیس سالہ اوپرا کو فلم میں مرکزی کردار دیا گیا۔ دکھیاری ماں کے اس کردار میں خود کو ڈھالنا آسان نہیں تھا۔ ان پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کے ساتھ اس کی انفرادی زندگی کا انتشار بھی جوں کا توں برقرار تھا۔ امریکی باسکٹ بال کھلاڑی 'مائیکل جورڈن' اور اداکار و ہدایت کار 'ڈینی گلوور' کے بعد محبت کی یہ تلاش 'اسٹیڈمین گراہم' تک منتج ہوئی۔ اسٹیڈمین گراہم ایک معلم' مصنف اور کاروباری فرد تھا۔ اس سے رشتہ قائم ہوتے ہی اوپرا کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ اور توازن پیدا ہوگیا تاہم سابقہ ہولناک تجربات کے پیش نظر وہ شادی میں کسی بھی عجلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

نوے کی دہائی اوپرا کے لیے مقبولیت اور کامیابیوں کا نیا دور ثابت ہوئی۔

1993 میں مائیکل جیکسن کے ساتھ کیا گیا پروگرام امریکی ٹی وی کی تاریخ میں سب سے زیادہ دیکھا جانے والا چوتھا پروگرام تھا۔ اس سے قبل کسی بھی مشہور شخصیت کے انٹرویو پر عوام اس طرح کبھی نہ ٹوٹی تھی۔ مائیکل جیکسن کا یہ انٹرویو 36.5 ملین ناظرین نے دیکھا۔

اوپرا کی شہرت اور عوام کی جانب سے ملنے والی پذیرائی میں ہر گزرتے ماہ وسال میں بے پناہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی زبان سے ادا شدہ ہر ایک لفظ عوام الناس کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتا۔ وہ لوگوں کی نبض دبانے کا فن جان گئی تھی۔ 1996 کے اواخر میں اس نے اپنے پروگرام میں جزوی طور پر ایک نیا حصہ 'اوپرا بک کلب' متعارف کروایا۔ اس حصہ میں نئی کتب کے تعارف کے علاوہ کلاسیک ادب اور کچھ غیر مقبول ناولز عوام کے سامنے لائے جاتے۔ کتب کے اس تعارفی سلسلے نے امریکا میں ایک نیا انقلاب برپا کر دیا۔ اوپرا کے اس شو میں دکھائی گئی ہر کتاب چند ہی دنوں میں 'بیسٹ سیلر' کا درجہ پا لیتی۔

1998 میں اوپرا کے تخلیقی دماغ میں ایک اور نادر خیال ابھرا۔ اس نے Oprah's Angel Network نامی ایک خیراتی ادارے کا افتتاح کیا۔ اس ادارے کا مقصد دنیا بھر میں منافع بخش تنظیموں کو امدادی رقوم فراہم کرنا تھا۔ اوپرا کے اینجل نیٹ ورک نے 80,000,000 سے زیادہ رقم جمع کر لی۔ اس نیٹ ورک کے انتظامی معاملات براہِ راست اوپرا ہی کے ہاتھ میں تھے۔ سمندری طوفان سے پیدا ہونے والی تباہ کاریوں کے بعد تعمیراتی کاموں کے سلسلہ میں وہ اپنے ادارے میں جمع شدہ رقم کے علاوہ ذاتی طور پر بھی کئی ملین ڈالرز خیرات کر دیتی۔

بیسویں صدی کے اختتام تک اوپرا وینفری امریکا کی ہی نہیں بلکہ سیاہ فام نسل کی طاقتور ترین خاتون قرار دے دی گئی۔

☆☆☆

ستمبر 2001 امریکی قوم کے لیے بھیانک خواب بن کر سامنے آیا تھا۔

نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد بین الاقوامی منظر نامہ مکمل طور پر تبدیل ہو کر رہ گیا۔ اس حملے کے گیارہ دن بعد نیویارک شہر کے 'یانکی اسٹیڈیم' میں خصوصی دعائیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں سابقہ صدر بل کلنٹن اور نیویارک سینیٹر ہیلری کلنٹن بھی شریک ہوئے۔ میئر نے اس تقریب کی میزبانی کے لیے اوپرا کو مدعو کیا۔

ان حملوں کے ایک ماہ بعد ہی افغانستان پر حملہ کر دیا گیا۔ حیران کن طور پر اوپرا نے Islam 101 نامی شو آن ایئر کر دیا جس میں اسلام کی آفاقی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اس کی بابت بین الاقوامی تعصب پر بے باک و نڈر انداز میں روشنی ڈالی۔ دنیا کے تین بڑے مذاہب میں اسلام ہی کے بارے میں سب سے زیادہ منفی تاثر پر اوپرا کے اٹھائے سوالات میں سیاسی ایوانوں میں ایک کہرام برپا کر دیا۔

اوپرا کی یہ بے باکی اور دلیری محض ایک شو یا شہرت کو چار چاند لگانے کے لیے نہ تھی بلکہ وہ اپنے نظریات پر سختی سے کاربند رہی۔ 2002 میں امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے اسے افغانستان میں طالبات کی اسکول واپسی اور تعلیم نسواں کے احیاء پر جشن منانے کے لیے شو منعقد کرنے کی تجویز دی لیکن اوپرا نے نہایت آرام و تحمل سے یہ پیشکش مسترد کر دی۔ وہ ذاتی طور پر جنگ اور دیگر ممالک میں دخل در اندازی کی مخالف تھی۔ عراق پر کیے جانے والے امریکی حملے کو بھی اس نے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ Is War the Only Answer پر ایک مخصوص طبقہ اور نظریات کے حامل افراد نے خوب تنقید کی۔ اپنے مکمل پیشہ وارانہ سفر میں اوپرا کو پہلی بار نفرت انگیز برقی پیغامات موصول ہونے لگے۔

''تم افریقا واپس کیوں نہیں چلی جاتیں؟''

''تو بالآخر تم نے یہ ثابت کر ہی دیا کہ تمہیں امریکی قوم کا کوئی درد نہیں کیونکہ تم امریکی ہی نہیں۔''

''تمہیں اس مشکل وقت میں امریکی نظریات کا پرچار کرنا چاہیے۔''

اوپرا وینفری کے لیے وہ وقت بہت مشکل تھا۔ اس موقع پر فلمی صنعت سے وابستہ افراد اس کی اخلاقی مدد کے لیے آگے بڑھے۔ جنگی جنون میں مبتلا امریکی میڈیا میں اوپرا وینفری کی واحد احتجاجی صدا باضمیر اور غیر متعصب افراد کے لیے بہت مثبت تحریک تھی۔

2004 میں اوپرا نے اپنی ٹیم کے ساتھ جنوبی افریقا کا رخ کیا۔ وہ ان پسماندہ علاقوں میں Oprah's Christmas Kindness کے ذریعہ مقامی بچوں کی عسرت اور ایڈز زدہ عبرتناک زندگی عالمی ایوانوں کے سامنے عیاں کرنا چاہتی تھی۔ جنوبی افریقا میں اکیس روزہ قیام کے دوران اس نے مختلف نام نہاد تعلیمی اداروں اور یتیم خانوں میں پچاس ہزار بچوں میں کرسمس تحائف تقسیم کیے۔ لڑکوں کو سوسر گیند اور لڑکیوں کو رنگ برنگی خوبصورت گڑیائیں دیتے ہوئے اسے اپنے بچپن میں بیٹی کی دی گئی وہ بھدی اور بے نقوش گڑیا بہت یاد آئی جو اس کے لیے

کائنات کی حسین ترین شے تھی۔اس شو کے دوران وہ اپنے ناظرین سے دل کھول کر عطیات بھیجنے کی التجا کرتی رہی۔اس واحد شو میں اسے دنیا بھر سے 7,000,000 ڈالرز کے عطیات موصول ہوئے جن میں سے چالیس ملین ڈالرز کو فوری طور پر جوہانسبرگ کے جنوبی علاقوں میں 'اوپرا وینفری لیڈرشپ اکیڈمی فار گرلز' کے قیام کے لیے مختص کر دیا گیا۔جنوری 2007 میں بائیس ایکڑ پر محیط اس اسکول میں 'ڈیڑھ سو' طلبہ کا داخلہ ہوا۔یہ تعداد کچھ ہی دنوں میں ساڑھے چار سو تک جا پہنچی۔آرٹ کلاس رومز' کمپیوٹر و سائنس لیبارٹریز' لائبریری' تھیٹر اور بیوٹی سیلون پر مشتمل اس اسکول کی ہر ایک اینٹ میں اسے اپنی عسرت زدہ زندگی اور کربناک مسائل کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا۔نیلسن منڈیلا کی ستائش اور احسان مندی کے جواب میں اس کے پاس آنسو بہانے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

اس موقع پر بھی کئی ناقدین عسرت زدہ علاقوں میں ایک پُرتعیش تعلیمی ادارہ بنانے پر اس کے لتے لینے لگے۔ اوپرا وینفری نے اپنے مخصوص انداز میں ان سب کو بھرپور جواب دیا۔

''انسان جبلی طور پر حسن پرست اور لطیف جذبات کا مالک ہوتا ہے۔اگر آپ کے اردگرد خوبصورتی بکھری ہو تو خود کار طور پر سوچ و کردار بھی نکھرنے لگتے ہیں۔کیا ان غریب' لاچار' ایڈز زدہ بچوں کو صرف اس لیے جمالیاتی حس کو تسکین دینے کی اجازت نہیں کہ وہ تاریک براعظم میں پیدا ہوئے ہیں؟''

اوپرا کے اس دوٹوک مؤقف کے بعد ان سبھی کی بولتی بند ہو گئی۔

☆☆☆

تعصب اور نسل پرستی کے آسیب میں جکڑا امریکی معاشرہ ایک بہت بڑی تبدیلی کی زد میں تھا۔

جارج بش کی صدارتی مدت ختم ہونے کے قریب تھی۔اس بار صدارتی انتخابات میں ایک سیاہ فام شخص 'باراک اوبامہ' بھی اپنی قسمت آزمانے کے لیے تیار تھا۔ اوپرا وینفری اس موقع پر اس کی مدد اور حوصلہ افزائی کے لیے کمر کسے میدان میں اتر آئی۔اس نے اوبامہ کے مختلف عوامی جلسوں میں شرکت کی۔انتخابات کے بعد اقتدار کا ہما باراک اوبامہ کے سر پر بیٹھا۔ماہرین کی رائے اور تجزیہ نگاری سے یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ اوبامہ کو ٹیکساس' مشی گن' شمالی ڈیکوٹا' کینساس اور الاسکا میں کئی لاکھ ووٹ صرف اوپرا ہی کی حمایت کے باعث حاصل ہوئے تھے۔ اوپرا وینفری کی طاقت اور اختیارات میں اب کوئی دورائے نہ رہی تھی۔

وقت اپنی مخصوص چال چلتا ہوا سالوں پر مشتمل پڑاؤ عبور کرتا رہا۔اوپرا فلم' ٹی وی اور ریڈیو میں 'برانڈ' کی حیثیت حاصل کر گئی۔اس کی دولت کا کوئی شمار نہ تھا۔ان پیشہ وارانہ فرائض کو نبھاتے ہوئے وہ سیٹلائٹ پر جنوبی افریقا میں قائم اسکول میں لڑکیوں کو خود پڑھانے لگی۔

''یہ دنیا بہت عجیب گورکھ دھندا ہے میری بچیو! یہاں خاموشی سب سے بڑا جرم اور بزدلی سب سے بڑی لعنت ہے۔اپنا مقام اور منصب خود پہچانو۔کسی کو اتنی جسارت ہی نہ دو کہ وہ تمہارا استحصال کر سکے۔اپنے خلاف ہونے والی زیادتیوں کے خلاف مجرم کی فوری نشاندہی کرنا۔'' وہ انہیں سمجھاتے ہوئے اشک زدہ ہو جاتی۔

''میں بھی بڑی ہو کر آپ جیسی ہی بنوں گی میڈم!'' کوئی بچی خوابناک انداز میں کہتی۔

''نہیں! خدارا نہیں! مجھ جیسی بننے کی تمنا کبھی نہ کرنا۔ تمہیں علم ہی نہیں کہ میں نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے اذیت اور کرب کے کتنے سمندر پار کیے ہیں۔میری تشنہ لبی کا تو یہ عالم ہے کہ میں آج بھی مامتا کو تسکین دینے سے محروم ہوں۔میری اولاد صرف تم لوگ ہی ہو۔تم نے اپنا ذاتی تشخص خود بنانا ہے اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھنی ہے۔ عورت کھلونا نہیں۔عورت تسکین کا سامان نہیں۔عورت کمزور نہیں۔عورت بادشاہ نہیں۔''

''تو پھر عورت کون ہے میڈم؟''

''وہ بادشاہ گر ہے۔عورت اس کائنات کی مضبوط ترین مخلوق ہے۔وہ آہن ہے۔تم بھی مضبوط بنو۔ظلم اور جبر کو اپنی ٹھوکروں میں اڑا دو۔اس دنیا کو بتا دو کہ عورت کے بغیر ترقی ممکن ہی نہیں۔''

جنوبی افریقا کے اس دور افتادہ کونے میں بیٹھی بچیاں اپنے وجود میں توانائی اور ہمت کی نئی لہریں سرایت ہوتی محسوس کرنے لگیں۔

ماخذات:

۱۔وکی پیڈیا.....۲۔اوپرا وینفری گلوبل میڈیا لیڈر۔از۔کیتھرائن کروھن

نور و نار

زین مہدی

انسان دوراہے پر کھڑا ہے، ذرا سی کجی اسے راندۂ درگاہ کر سکتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا کہ اسے شیطان ورغلا سکتا تھا لیکن اس نے بروقت خود کو سنبھال لیا اور آج وہ مرجع خلاق عالم ہے۔

اس کے سامنے دنیا تھی۔ بے کراں دنیا۔ اس دنیا کے آرام و آسائش کے لوازمات کیا ہیں اس کی بھی اسے کوئی خبر نہ تھی کیونکہ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی؟ ابھی تو جوانی کی آمد آمد تھی۔

کندھوں کو چھوتی ہوئی کاکل، جسے بار بار ہوائیں چھیڑ رہی تھیں اور وہ اڑ اڑ کر چہرے پر پھیل رہی تھیں۔ انھیں سنبھالنے کے لیے سر پر ٹوپی تھی مگر اس وقت وہ بھی ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ مسیں بھی بھیگ رہی تھیں جو بہ

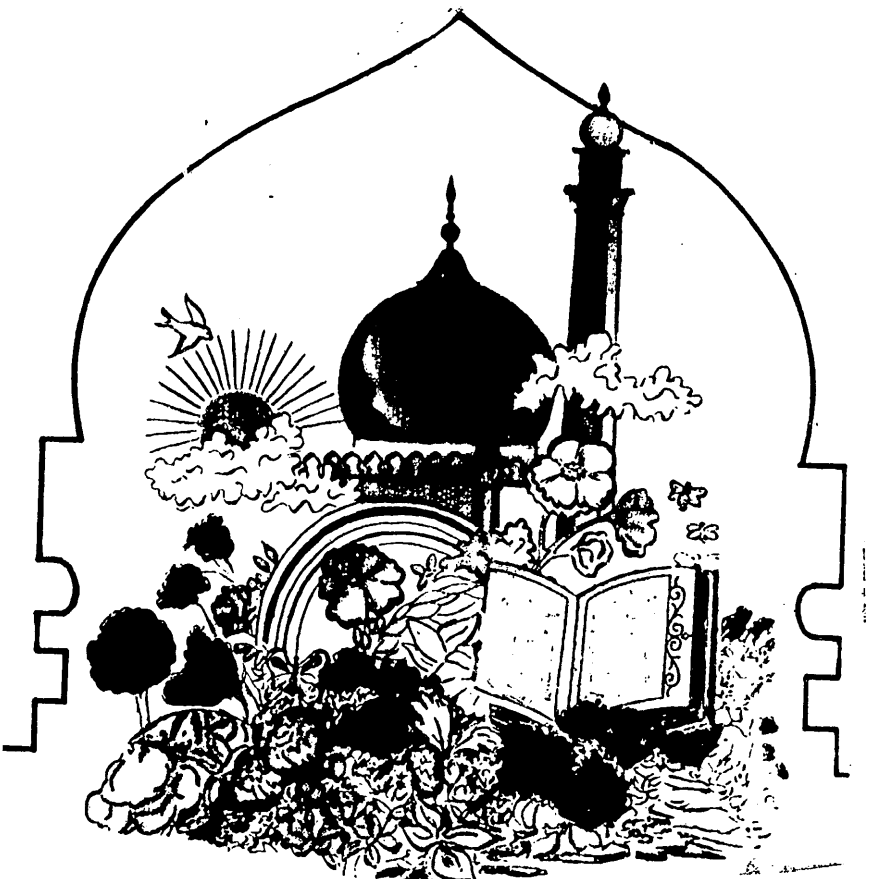

زبان خموشی اعلان کررہی تھیں کہ ابھی وہ جوانی کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ چہرے پر حد درجہ معصومیت تھی جیسے کھلتا ہوا گلاب جو پہلی ہی نظر میں اپنی پاکیزگی کا اعلان کررہا ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور ان چمکدار آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ وہ مرکزی رہگزر سے نکلی ایک چھوٹی سڑک کے کنارے کھڑا تھا اور بڑی دلچسپی سے مشرق کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ یہ بات غلط نہ تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ادھر ہی سے اس کا مطلوب آنے والا ہے۔ وہ کون ہے، کہاں سے آئے گا اس کی اسے خبر نہ تھی پھر بھی اسے انتظار تھا۔ کبھی تو وہ ہر روز اسی وقت یہاں آکر کھڑا ہو جاتا تھا۔

اس نے اب تک نظر بھر مطلوب کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ جبکہ مطلوب کئی بار گزرا تھا۔ جب بھی وہ آتا اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی اور نظریں خود بخود جھک جاتیں اس کے حصے میں صرف ایک جھلک آتی پھر بھی۔ اسے وہی ایک جھلک کی کسک کھینچ لاتی تھی۔ اس ایک جھلک نے اسے پاگل کردیا تھا۔ حقیقت میں دیوانہ بنا دیا تھا جبکہ اس کے مطلوب کو اس بے لوث چاہت کی مطلق خبر نہ تھی۔ وہ چاہنے والوں کے جھرمٹ میں آتا اور گزر جاتا۔ اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر بھی نہیں ڈالتا تھا مگر اس نوجوان کو اس کی پروا کب تھی۔ اسے تو مطلوب کے دیدار سے مطلب تھا۔ آج بھی وہ اسی لیے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مؤذن نے خوش الحانی سے پکارا۔ ''اللہ اکبر۔''

نوجوان نے زیر لب کہا۔ ''بے شک اللہ بہت بڑا ہے۔'' ابھی اللہ تعالیٰ کی بڑائی کے اقرار کی گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نوجوان کے چہرے پر شادابی چھا گئی۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ تنفس کی رفتار بڑھ گئی... کیونکہ اسے نکڑ پر مطلوب نظر آ گیا تھا۔ وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے اردگرد اور لوگ بھی تھے، وہ سب اس کے چاہنے والے تھے۔ ان چاہنے والوں نے اس کے مطلوب کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا پھر بھی اسے اس کا مطلوب صاف نظر آرہا تھا۔ نوجوان نے اس پر نظر گڑاتے ہوئے بے ساختہ کہا۔ ''سبحان اللہ'' نوجوان کی محویت کا یہ عالم تھا کہ مطلوب گزر گیا مگر اس کی پلکیں نہ جھپکیں، وہ ایک ٹک اسی جانب دیکھتا رہا۔

اس نوجوان کا نام سید محمد تھا۔ وہ شہر کے مشہور تاجر کا نواسہ تھا۔ اس کے والد سید یوسف حسینی منصب دار تھے سلطان محمد تغلق نے جب اپنا دارالخلافہ دہلی سے دولت آباد (دیوگیر) منتقل کیا تو دہلی کے باشندوں نے بھی وہاں منتقل ہونا شروع کردیا۔ سید یوسف حسنی بھی 1329ء میں وہاں منتقل ہو گئے۔ وہ صوفیوں کی صحبت پسند کرتے تھے۔ ان دنوں دولت آباد حضرت شیخ بابو کا شہر تھا۔ ان کے معتقدین ہزاروں کی تعداد میں تھے ان کی خانقاہ میں ہر روز سینکڑوں کی تعداد میں لوگ جاتے۔ انھی میں ایک سید یوسف حسینی بھی تھے۔ وہ جب بھی حضرت شیخ بابو کی خدمت میں حاضر ہوتے ان کے ساتھ سید محمد بھی چلا جاتا۔ اس وقت سید محمد کی عمر صرف چار سال تھی اتنی کچی عمر میں صوفیوں کی صحبت! آہستہ آہستہ صوفیوں کی چھاپ اس کے ذہن پر ثبت ہونے لگی۔ اسے ایسا پاک و طاہر ماحول اچھا لگنے لگا۔ وہ جب بھی جاتا اٹھنے کا نام نہ لیتا... مگر قسمت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس کے والد نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ اس خبر کو سن کر دہلی سے اس کے ماموں دیوگیر جا پہنچے اور انھوں نے بہن سے واپس دہلی چلنے کی استدعا کی۔ بہن کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا وہ دہلی لوٹ جانے کو راضی ہو گئی۔ بچوں کو ساتھ لیا اور بھائی کے ساتھ نکل پڑی۔ یتیمی کا داغ اٹھائے ہوئے سید محمد بھی ماں کے ساتھ واپس دہلی آ گیا۔ اب اس کی کفالت کی ذمے داری اس کے نانا کے سر تھی۔

دہلی جو اس وقت دارالسلطنت تھا۔ آسائشوں سے بھرا شہر تھا۔ خوب چہل پہل والا رونق افروز۔ اس شہر میں آکر اس کی بے چینی سوا ہو گئی۔ ایک عجیب سی بے چینی نے اسے گھیر لیا۔ کسی پل اسے آرام نہ تھا' کچھ بھی اچھا نہ لگتا تھا۔ اسے بار بار صوفیوں کی صحبت یاد آتی۔ دہلی بھی صوفیوں کا شہر تھا۔ یہ شہر بختیار کاکی کا شہر تھا نظام الدینؒ اولیاء کا شہر تھا۔ ہر گلی ہر کوچے میں صوفیوں کا ڈیرا تھا مگر اسے کسی کی طرف کھنچاؤ محسوس نہ ہوتا تھا۔ جذبیت ذرا کی ذرا نہ تھی' کوئی بھی گرویدہ نہ کرسکا تھا۔

اس نے بے کلی کے اوقات سے فرار کے لیے فطرت کا نظارہ کرنا شروع کردیا۔ وہ شہر سے باہر نکل جاتا ویرانے میں گھنٹوں بیٹھا رہتا' چڑیوں کی چہچہاہٹ سنتا اور اپنے رب کو یاد کرتا۔ اس دن بھی وہ ویرانے سے ہی لوٹ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ کوئی اللہ والا تھا۔ جو سر جھکائے چل رہا تھا۔ اس کے گرد حلقہ بگوشوں کا گھیرا تھا۔ بس اسی ایک جھلک نے اسے ہر روز کا طالب

دیدار بنا دیا۔ وہ اذان سے پہلے آ کر سڑک پر کھڑا ہو جاتا اور اس وقت تک کھڑا رہتا جب تک کہ اس کا مطلوب گزر نہ جاتا۔ یہ بات اس کے نانا سے چھپی نہ رہ سکی اور انھوں نے ایک روز کہا۔ ''بیٹے! باشعور ہو، اچھا برا سمجھتے ہو پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ ہر بات کو عقل کے میزان پر پرکھنا۔''

سید محمدؒ نے نانا کی بات سن کر سر جھکا لیا۔ بڑوں کو جواب نہیں دیتے اس لیے خاموش رہا مگر وہ اپنے دل کو کیسے سمجھاتا۔ اپنی بے کلی کو چھپانے کے لیے ہی تو وہ ویرانے کا رخ کرتا تھا۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ پنجگانہ نماز میں وہ جماعت کی پابندی نہیں کرتا تھا۔ کبھی جماعت سے پڑھ لی کبھی گھر میں فرداً پڑھ لی لیکن جمعہ کی نماز کے لیے جماعت ضروری تھی اس لیے وہ سلطان قطب الدین ایبک کی مسجد کی طرف چل پڑا۔ وہاں شہر کے عمائدین آتے تھے اس لیے جماعت بڑی ہوتی تھی۔ وہ بھی وہیں نماز جمعہ پڑھنے پہنچا۔ پہلی بار وہ جمعہ کی نماز پڑھنے اتنی دور اس مسجد میں آیا تھا۔ اس مسجد کی امامت کے فرائض حضرت نظام الدینؒ اولیاء کے خلیفہ اکبر نصیر الدین چراغؒ دہلی کے ذمے تھی... اسی لیے اس کی کوشش تھی کہ وہ پہلی صف میں جگہ بنا لے۔ پہلی صف میں شامل ہونے کے لیے وہ وقت سے پہلے ہی مسجد میں پہنچ گیا تھا اور اب پہلی صف میں کھڑا تھا۔

نماز شروع ہوئی تو اس کی کیفیت ہی اسے الگ محسوس ہوئی۔ آج نماز کا وہی لطف آیا تھا جس کا وہ متمنی تھا۔

دہلی میں حضرت نظام الدینؒ اولیاء کے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ہر گلی و کوچے میں ان کے جانثار موجود تھے اور جو ان کے چاہنے والے تھے وہ حضرت شیخ نصیر الدین محمد چراغؒ دہلی کے معتقد تھے کیونکہ انھیں سلطان المشائخ حضرت نظام الدینؒ محمود اور امیر خسروؒ سے تقرب خاص اور اجازت حاصل تھی۔ آپ جب بھی چاہتے تھے سلطان المشائخ کی خدمت میں بے دھڑک چلے جاتے تھے۔

حضرت نصیر الدین محمودؒ چراغ دہلی نے سلطان المشائخ کے پاس پیغام بھیجا کہ شہر میں اب دل جمعی سے عبادت نہیں ہوتی، اگر حکم ہو تو میں کسی ویرانے میں، پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر خدائے تعالیٰ کی عبادت مطمئن ہو کر اور دل بھر کر کروں۔

امیر خسرو کا معمول تھا کہ جب وہ جماعت خانے میں ہوتے تو نماز عشا سے آرام کرنے تک سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر رہتے اور ہر قسم کی حکایت بیان کرتے۔ ایک ایسے ہی موقع پر امیر خسروؒ نے شیخ نصیر الدینؒ محمود کی گزارش سلطان المشائخ کی خدمت اقدس میں بیان کر دی۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء نے مسکراتے ہوئے فرمایا' ان سے کہو کہ تمہیں لوگوں کے درمیان میں رہنا چاہیے' لوگوں کی جفا اور ناگوار باتیں برداشت کرنی چاہئیں۔ ان کی تلافی' فیاضی' ایثار و دہش سے کرنی چاہیے۔''

اسی حکم پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے اپنا خیال رد کر دیا اور شہر دہلی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اسی وجہ سے آپ کا لقب چراغ دہلی یعنی شہر دہلی کو روشنی بخشنے والا پڑ گیا۔ دہلی کے عام لوگ بھی اس حکم سے باخبر تھے بھی تو چراغؒ دہلی سے اپنے دل کو منور رکھنے کے لیے ان کے آستانے پر صبح سے شام تک جمگھٹا لگا رہتا۔ ہر وقت خانقاہ عالیہ کھچا کھچ بھرا رہتا لیکن یہ وہ لوگ ہوتے جو عمر کے آخری حد پر کھڑے تھے لیکن اس دن ایک عجیب بات نظر آئی۔ ان کہن سالہ افراد کے درمیان ایک بچہ بیٹھا تھا۔ بوڑھوں کے درمیان بچہ' عجیب لگنا ضروری ہے۔ وہ ان میں منفرد لگ رہا تھا۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی نے اتنی دور بیٹھے بچے پر نظر ڈالی اور ایک اسرار بھری مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر کھیل گئی۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ کچھ دیر تک اس نو عمر کو دیکھتے رہے پھر انہوں نے اسے قریب آنے کو کہا۔ وہاں بیٹھے تمام کے تمام لوگ حیران رہ گئے اس لیے کہ حضرت جی کسی کو بلاتے نہیں تھے۔ معتقد خود ان کے پاس جاتا تھا۔ اسے قریب بلا کر کچھ پوچھا نہیں۔ صرف سر پر ہاتھ پھیر کر اعلان کر دیا کہ وہ سید محمدؒ کو بیعت سے مشرف کر رہے ہیں۔

یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ وہ اتنے کم عمر نوجوان کو بیعت سے سرفراز کر رہے ہیں۔ لوگ حیران حیران سے محفل میں پہنچے۔ ان میں کئی ایسے لوگ بھی تھے جو چراغؒ دہلی کے بیعت کی محفل میں شریک ہو چکے تھے۔ انھیں وہ وقت یاد آ رہا تھا۔

جس طرح سید محمدؒ ایک نظر میں اپنا وجود بھول بیٹھے تھے اسی طرح حضرت نصیر الدین بھی ایک ہی نظر میں

گھائل ہوگئے تھے۔ سدھ بدھ کھو بیٹھے تھے۔ اور خود کو بھول کر اللہ سے لو لگانے کے لیے ایک نئی زندگی کی ابتدا کے لیے حضرت نظام الدینؒ اولیاء کے دربار میں پہنچ گئے تھے۔

وہ وقت دوپہر کا تھا۔ ہر طرف کڑی دھوپ تھی۔ طیور بھی سائے ڈھونڈ رہے تھے۔ اس گرمی میں وہ گھر سے نکل آئے تھے اور اب وہ بڑ کے پیڑ کے نیچے کھڑے تھے۔ سلطان المشائخ نے محفل کا اختتام کیا اور جماعت خانے سے نکلے بالا خانے سے نیچے تشریف لائے تاکہ حجرہ میں جاکر قیلولہ کرسکیں۔ تبھی ان کی نظر بوڑھے پیڑ پر پڑی اور وہ ٹھٹک گئے۔ جب انھوں نے چراغؒ دہلی کو کھڑے دیکھا تو... انہوں نے حجرے میں تشریف لے جانے کا ارادہ موقوف کیا اور وہیں دہلیز پر بیٹھ گئے پھر خادم خاص خواجہ نصیر کو بلا کر کہا۔ ''وہ سامنے پیڑ کے سایہ میں کھڑے شخص کو بلا لاؤ۔ خادم نیچے آیا۔ نصیرالدین محمود کو سلطان المشائخ کا حکم سنایا۔ حکم سنتے ہی آپ فوراً حضرت نظام الدینؒ اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔

''اتنی دھوپ میں کیوں گھر سے نکلے؟'' آپ نے پوچھا۔

''میں درویشوں کی جوتیاں سیدھی کرنا چاہتا ہوں۔''

حضرت چراغؒ دہلی نے بھی سید محمدؒ کو بیعت سے سرفراز کرنے سے پہلے یہی سوال کیا تھا اور اتفاق ہے کہ انھوں نے وہی جواب دیا تھا۔ اس جواب نے ہی بیعت میں لے لینے پر مجبور کردیا تھا۔

بیعت کے بعد سید محمد میں ایک بہت بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ انہوں نے ایک طرح سے دنیا داری سے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ یا تو ذکر الٰہی کرتے یا پھر حضرت نصیر الدین محمود چراغؒ دہلی کی خدمت۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے خود کو حضرت کی خدمت کے لیے.... وقف کردیا ہے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ حضرتؒ کے تمام کام وہ خود کریں۔ یہاں تک کہ جب حضرت نصیر الدین کسی جگہ جاتے تو آپ پالکی اٹھانے میں بھی پیش پیش رہتے۔ ایک بار آپ حضرتؒ کی پالکی اٹھائے چلے جارہے تھے۔ آپ کا کل رکھنے کے شوقین تھے۔ ان لمبے لمبے گیسوؤں کو سنبھالنے کے لیے آپ ٹوپی کو اچھی طرح سے سر پر جمائے رکھتے مگر اس دن ہوا کچھ تیز تھی۔ گیسو سنبھل کے نہ دے رہے تھے۔ یکبارگی ہوا چلی تو گیسو اڑ کر پالکی کے چول میں اٹک گئے۔ آپ از حد تکلیف محسوس کررہے تھے' تکلیف کی شدت سے آنسو بہنے لگے تھے مگر آپ نے پالکی نہ روکی کہ حضرتؒ کا وقت کوتاہ ہوگا اور اسی حالت میں چلتے رہے۔ اس درجہ ایثار کی خبر حضرتؒ تک پہنچی تو حضرت نے برجستہ شعر کہا۔

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد
اللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

(جو کوئی سید گیسو دراز کا مرید ہوگیا خدا کی قسم وہ بغیر کسی اختلاف کے عشق باز بن گیا)

اسی دن سے سید محمدؒ ''گیسو دراز'' کے لقب سے مشہور ہوگئے۔ اس صغیر سنی میں بیعت اور پھر یاد الٰہی میں ڈوب جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یاد الٰہی میں محو ہونے کا حاصل کیا ہے۔ یہ سوال سید محمدؒ نے حضرت چراغ دہلیؒ سے اسی دن کیا تھا۔ جس دن محفل میں مولانا بدر الدین مولانا منہاج الدین اور دوسرے مریدین بھی حاضر تھے۔ حضرت نصیر الدین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اے درویش' سالک کو یہی سمجھنا چاہیے کہ اصلی زندگی وہی ہے جو یاد حق تعالیٰ میں گزرے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ بمنزلہ موت ہے۔'' پھر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں' جو دم یاد الٰہی کے بغیر گزرے وہ مردہ ہے۔ زندگی وہی ہے جو یاد حق میں گزرے۔ یاد حق سے کبھی غافل نہ رہنا چاہیے بلکہ ہر وقت اور ہر مقام میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا چاہیے... چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اٹھتے' بیٹھتے اور لیٹتے وقت یاد کرو' پس اے درویش! دن رات دم بدم یاد حق میں مشغول رہو اور کوئی دم بھی غفلت سے بسر نہ کرو۔ اگر کچھ نہ آتا ہو تو لا الہ اللہ محمد رسول اللہ کا ہی ورد کرو۔ پس انسان کو سانس لیتے وقت اور باہر نکالتے وقت ذکر باری تعالیٰ کرنا چاہیے۔ کچھ نہ ہو تو خدا کا کوئی ایک نام ہی لیا کرو۔''

اس دن سے سید محمدؒ نے یاد حق کو اپنا شیوا بنالیا۔ ہر لمحہ یاد الٰہی میں بسر ہونے لگا۔

عمر کی منزلیں طے ہورہی تھیں۔ آل اولاد والے ہوچکے تھے مگر عشق الٰہی سے تائب نہ ہوئے اسی شد و مد سے ذکر باری تعالیٰ جاری تھا۔ اسی دوران انھیں دق کا عارضہ ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر سینتیس سال تھی۔ اس دور میں ٹی بی سب سے بڑا اور لاعلاج مرض تصور کیا جاتا تھا۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ ان کا آخری وقت آچکا ہے اس لیے کہ تھوک سے وافر مقدار میں خون جاری تھا۔ طبیب بھی

مایوس ہو چکے تھے۔

اس عارضہ کی خبر حضرت نصیرالدینؒ چراغ دہلی تک پہنچی اور آپ عیادت کے لیے خود تشریف لے آئے۔ آپؒ کے ساتھ مریدین کی ایک جماعت تھی۔ سب کے سب ادب سے سر جھکا کر سید محمدؒ کے بستر کے گرد کھڑے ہو گئے۔

سید محمدؒ پر غشی طاری تھی نقاہت کا یہ عالم تھا کہ چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے قریب پہنچ کر سید محمد کا شانہ ہلایا۔ سید نے پہلی آواز پر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلتے ہی انھوں نے اپنے مرشد کو سرہانے کھڑا دیکھا۔ سید محمدؒ نے چاہا کہ مرشد کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جائیں مگر نقاہت نے اجازت نہ دی اور پھر سے غشی طاری ہو گئی۔ دوبارہ ہوش آیا تو مرشد سے بولے۔

''میں بھی کتنا بدنصیب ہوں آپ کی تعظیم کے لیے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔'' اس وقت ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برس رہا تھا۔

حضرت چراغ دہلی نے ان کی مجبوری سمجھ لی اور سرہانے بیٹھ گئے پھر آپ نے آہستہ آہستہ ان کے جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ عجب اعجاز مسیحائی تھی۔ کئی ماہ کی نقاہت ایک پل میں دور ہو گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور کچھ ہی دنوں میں اتنی قوت آ گئی کہ مرشد سے ملنے خانقاہ تک اپنے پیروں پر چل کر پہنچ گئے۔

بیماری سے افاقہ کے کئی ماہ بعد کا ذکر ہے، سید محمدؒ حضرت چراغ دہلی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ محفل ذکر عروج پر تھی۔ آپ ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ پند و نصائح کے بعد جب محفل کا اختتام ہوا تو حضرت چراغؒ دہلی نے آپ کو قریب بلایا اور اپنا کمبل ان کے کندھے پر رکھ دیا۔ سید محمدؒ کانپ اٹھے۔ ان کا سر مزید جھک گیا۔ اس مرحمت کے پیچھے کیا منشا ہے۔ وہ سمجھ گئے تھے۔ انھیں خاموش دیکھ کر حضرت چراغؒ دہلی نے پوچھا۔ ''کیوں محمد! کیا یہ تحفہ تمہیں پسند نہیں آیا ہے؟''

''تحفہ کسے پسند نہیں آتا مگر میری اتنی اوقات کہاں، آپ کا تحفہ اتنا گراں بار ہے کہ اس کا بوجھ مجھ سے اٹھایا نہ جائے گا۔''

''کوشش انسان کرتا ہے کامیابی وہ دیتا ہے۔''

حضرت نے انگلی اٹھا کر اوپر کی جانب اشارہ کیا۔

یہ کمبل دراصل خرقۂ خلافت تھا۔ انھوں نے اشارۃً جتا دیا تھا کہ میرے بعد تم ہی میرے جانشین ہو گے۔

سید محمدؒ اس کمبل کو چوم رہے تھے کہ حضرتؒ نے فرمایا۔ ''انسان کے ہر اعضاء میں شہوت اور حرص ہے جو آدمی کے لیے حجاب کے سبب ہوتے ہیں جب تک ان شہوتوں اور حرصوں سے توبہ نہیں کرتا اور اعضاء کو پاک نہیں کرتا۔ وہ ہرگز ہرگز کسی مقام تک نہیں پہنچتا۔ وہ اعضاء یہ ہیں۔ اوّل آنکھ جس میں بینائی کی شہوت ہے دوسرے ہاتھ جس میں چیز کو چھونے اور پکڑنے کی خاصیت ہے۔ تیسرے کان جس میں سننے کی خاصیت ہے چوتھے ناک جس میں سونگھنے کی صفت ہے پانچویں حلق جس میں چکھنے نگلنے کی صفت ہے۔ چھٹے زبان جس میں کہنے کی صفت ہے۔ ساتویں بدن جس میں چھونے کی صفت ہے۔ آٹھویں ہوش و عقل جس میں نیک و بد کی تمیز کی صفت رکھی گئی ہے۔ تو بہ وہی اچھی ہے جو موت سے پہلے کی جائے۔''

یہ خرقہ کی تعلیم تھی۔ انھوں نے دل پر نقش کر لیا۔ شاید جان گئے تھے کہ سلسلہ چشتیہ میں ایک بہت بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔ ایک ایسی بات ہونے والی ہے جو بالکل نئی ہوگی۔ کسی بھی بزرگان چشت نے ایسا نہیں کیا ہے۔

سید محمدؒ نے جس دن سے کمبل لیا تھا اس دن سے ان کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ اب وہ اپنا زیادہ وقت وظائف و ذکر باری تعالیٰ اور تلاوت قرآن پاک میں صرف کرتے۔ یہ تعلیم ان کے مرشد کی تھی۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حجتہ السلام میں لکھا دیکھا ہے کہ جس دل میں قرآن شریف آتا ہے وہ گناہ اور حرص سے پاک ہو جاتا ہے۔ میرے مرشد حضرت سلطان المشائخ نظام الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز فرمایا کرتے تھے کہ قرآن شریف کی تلاوت میں دو فائدے ہیں۔ ایک حظ چشم یعنی آنکھ کی روشنی کبھی کم نہیں ہوتی اور نہ آنکھ درد کرتی ہے بشرط کہ کلام اللہ صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھا جائے۔ دوسرے ہر وقت کی تلاوت سے ہزار سالہ عبادت کا ثواب اعمالنامے میں لکھا جاتا ہے اور اس قدر بدیاں دور کی جاتی ہیں۔''

سید محمدؒ جب بھی تلاوت کرتے بڑے اہتمام سے کرتے۔ مصلیٰ بچھا کر، تجوید وضو کے بعد قرآن المجید کھول کر ہر ہر حرف پر انگلیاں رکھتے ہوئے صحیح قرأت سے تلاوت کرتے۔ اس بارے میں ان کا کہنا تھا کہ میں نے اپنے مرشد حضرت نصیرالدینؒ قدس سرہ سے سنا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن دیکھ کر پڑھو تا کہ غلطی کا احتمال نہ ہو۔

اس میں آنکھوں کو بھی حظ حاصل ہوتا ہے اور ہر حرف کے بدلے سو سال کی عبادت کا ثواب نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔ میں نے دلیل السالکین میں لکھا دیکھا ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ مجھے حفظ نصیب ہو تو اسے سورہ یوسف ہمیشہ پڑھنی چاہیے اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے حفظ اس کے نصیب میں کرتا ہے۔

سید محمدؒ کو قرآن حفظ تھا پھر بھی وہ قرآن دیکھ کر پڑھتے اور ہر روز کئی کئی بار آخری آیت تک تلاوت کرتے۔

ہر بار قرآن المجید فرقان الحمید کی آخری آیت ختم کرنے کے بعد ہر فرد و بشر کے لیے دعائیں کرتے۔ آخری دعا یہ ہوتی کہ میرے مالک میرے مرشد کی عمر کو دراز کر دے اگر یہ تیری منشا ہو! اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ آپ نے کمبل لیتے وقت ہی سمجھ لیا تھا کہ حضرت نصیر الدینؒ چراغ دہلی کا سفر آخرت قریب ہے۔ بالآخر عہد غیاث الدین بلبن میں 675ھ مطابق 1277ء کو اودھ میں پیدا ہونے والے حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے 18 رمضان المبارک 757ھ مطابق 1356ء بہ عہد فیروز شاہ تغلق اس دنیائے پُرفریب سے منہ موڑ لیا اور سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اتفاق ہے کہ تین سال قبل 18 رمضان کو ہی جب آپ جماعت خانے میں اپنے حجرۂ خاص میں مصروف عبادت تھے کہ ایک نابکار قلندر جسے لوگ ترالی کے نام سے پکارا کرتے تھے' حجرۂ خاص میں گھس آیا تھا اور آپ پر چھری کے گیارہ وار کیے تھے۔ چونکہ آپ پر استغراق کا عالم طاری تھا اس لیے زخموں کی ٹیس محسوس نہ کی' اسی طرح عبادت میں غرق رہے۔ اس حجرے میں پانی کی نکاسی کے لیے جو نالی تھی اس سے خون بہہ کر جب باہر نکلا تو ایک مرید نے دیکھ لیا۔ اس نے کئی دوسرے مریدوں کو جمع کیا پھر سب اندر داخل ہوئے۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی سب پر غیض طاری ہو گیا اور انھوں نے اس نابکار قلندر کو دبوچ لیا اس کی مشکیں کسنے کے بعد آپ کے استغراق کو توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ کافی دیر بعد عبادت الٰہی کا یہ مرحلہ ختم ہوا اور آپ نے سلام پھیرا تب آپ کو خبر ہوئی کہ زخموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جراح کو طلب کیا گیا۔ مرہم پٹی کی گئی اور اس نابکار نعلی قلندر کو آپ کے حضور پیش کیا گیا۔ آپ نے حضرت قاضی عبدالمقتدر تھانسریؒ اور حضرت شیخ صدر الدین طیب کو حکم دیا کہ اس قلندر کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ شاید یہ مجھے کسی خاص بات کی سزا دینے آیا ہو' کوئی کام بھی اللہ کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں۔ یقیناً مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو گی۔ اس قلندر کو مبلغ بیس ٹنکے ادا کیے جائیں تاکہ اس کا یہ احسان میری گردن پر نہ رہے اور اسے فوراً آزاد کر دیا جائے۔ قلندر نے رہائی پاتے ہی شہر دہلی کو چھوڑ دیا۔ اس واقعے کے بعد آپ کی عبادت میں فرق نہیں آیا تھا۔

تین سال بعد ٹھیک اسی تاریخ کو آپ کا انتقال ہوا۔

آپ نے ایک ایسی وصیت کی تھی جو سلسلہ چشتیہ میں بالکل نئی تھی۔ آج تک تمام بزرگان چشت اپنا خرقہ اور دیگر تبرکات چشت اپنے نائب' اپنے خلیفہ کے لیے چھوڑ گئے تھے لیکن آپ نے وصیت کر دی تھی کہ خواجگان چشت کے تمام تبرکات جو میرے مرشد حضرت نظام الدین شیخ المشائخ نے میری تحویل میں دیے تھے میرے ساتھ دفن کر دیے جائیں۔

آپ کی وصیت کو پورا کرنا ضروری تھا۔ غسل کے فرائض حضرت سید محمد گیسو درازؒ خلیفہ اعظم نے انجام دیئے پھر آپ کا جسد خاکی دفنانے کے لیے لوگ لے کر چلے۔ ایک عجیب منظر تھا۔ جنازہ میں بادشاہ وقت فیروز شاہ تغلق کے علاوہ تمام شہزادے بھی شریک تھے۔ شہر کے امیر الامراء کے علاوہ غربا کی ایک کثیر تعداد تھی۔

آپ کا جسد خاکی قبر میں اتارا گیا' خرقہ مبارک کو آپ کے سینے پر' عصا مبارک کو برابر میں' تسبیح انگشت شہادت' کاسہ چوبیں آپ کے سر مبارک کے نیچے اور نعلین چوبی آپ کے آغوش میں رکھ دی گئی تھیں۔ پہلی مٹی کی مٹھی خود فیروز شاہ تغلق نے ڈالی تھی۔ اسی فیروز شاہ نے جو سلطان محمد تغلق کا جانشین تھا اور سلطان محمد تغلق کی آپ سے دشمنی اظہر من الشمس ہے۔ سیر الاولیاء کے مصنف امیر خورد رقم طراز ہیں کہ جب ہندوستان کی سلطنت وسیع ہو گئی تو اس نے شیخ نصیر الدین محمود کو جو تمام عالم کے متفقہ شیخ العصر تھے اور تمام لوگ ان کے مرید و معتقد تھے تکلیفیں دینا شروع کیں اور ان بزرگ نے اپنے پیروں کی اتباع کرتے ہوئے ان تکالیف کو برداشت کیا اور کبھی اس سے بدلہ لینے کی کوشش نہ کی۔ یہاں تک کہ آخر عمر میں طغی کے مہم میں اس کا تعاقب کرتے ہوئے ٹھٹھہ سندھ تک جا پہنچا۔ وہ گونڈل میں ہی بیمار ہوا تھا اور اسے بخار آ گیا تھا اس لیے وہ گونڈل ہی میں کچھ دن ٹھہرا رہا۔ یہیں اس نے مخدوم زادوں' مشائخ و علماء' اکابر و معارف اور امراء و سلوک کے اہل و عیال اور سواروں' پیادوں کو طلب کیا۔

چنانچہ یہ سب گونڈل میں آکر سلطان سے ملے۔

سلطان محمد کو جب مرض سے افاقہ ہوا تو وہ لشکر کے ساتھ ٹھٹھہ کی طرف بڑھا۔ ٹھٹھہ سے تین کوس کے فاصلے پر پہنچا تو عاشورہ کا دن تھا۔ اس نے روزہ رکھا اور افطار کے وقت مچھلی کھائی۔ مچھلی کا کھانا اس کو مواقع نہیں ہوا اور اس کا مرض عود کر آیا۔

ٹھٹھہ پہنچنے سے پانچ دن پہلے اس نے دہلی حکم نامہ بھیج دیا تھا کہ (حضرت) نصیرالدین (چراغ دہلی) کو فوراً روانہ کر دیا جائے۔ دہلی اور ٹھٹھہ کے درمیان ایک ہزار کوس کا فاصلہ تھا آپ کو وہاں پہنچنا پڑا۔ جس وقت آپ پہنچے تو اس نے مطلق تعظیم نہ دی۔ دوستوں نے سوال کیا کہ یہ بادشاہ آپ کی ایذارسانی کے درپہ کیوں رہتا ہے۔ آپ نے جواب دیا میرے اور اللہ میاں کے درمیان ایک معاملہ ہے تکالیف امتحان ہے اور دنیا امتحان گاہ۔

سلطان محمد تغلق نے آپ کی شان میں جو گستاخی کی اس کی سزا بھی اسے جلد مل گئی۔ صرف چار دن بعد وہ مر گیا۔ اسی کا جانشین فیروز شاہ تغلق آپ کا معتقد بن گیا۔ اللہ کی شان نرالی ہے کہ اسی فیروز شاہ نے آپ کی قبر اطہر کی مٹی خود اپنے ہاتھوں سے برابر کی۔

حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کے انتقال کا سب سے زیادہ صدمہ سید محمدؒ کو پہنچا تھا۔ ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ قبر کے سرہانے ایسے بیٹھے کہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے۔ آنکھوں سے آنسو رواں رہتے۔ قبر پر پھول چڑھانے' فاتحہ پڑھنے والوں کا اژدھام رہتا مگر وہ کسی کی جانب متوجہ نہ ہوتے۔ اپنے آپ میں گم بے خود سے بیٹھے رہتے۔ اگر کوئی سلام کر دیتا تو جواب دے دیتے ورنہ کلام نہ کرتے۔ اسی عالم میں تین دن گزر گئے۔ چوتھے روز وہ قبر کے پاس سے اٹھے۔ یہ قبر حضرت چراغؒ دہلی کے آنگن میں تھی۔ اس جگہ کو حضرت نے اپنی حیات میں ہی پسند کر لیا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر سید محمدؒ اس چارپائی کے پاس پہنچے جس پر حضرت کو غسل دیا گیا تھا اور پھر دیوانوں کی طرح اس کے بان کی رسیاں کھول کر انھوں نے اپنی گردن میں ڈالی اور ایک زوردار نعرہ مارا پھر کہنے لگے۔ ''اے لوگو! دیکھ لو میں نے خرقہ پہن لیا۔ اب یہی میری مرشد کی نشانی ہے پھر وہ اسی حالت میں دہلی شہر سے نکل گئے۔ گوالیار' بہاندیر' ایرچہ' چندیری' بڑودہ' کھمبات' سلطان پور ہوتے ہوئے خلد آباد پہنچے۔

سلطان فیروز شاہ بہمنی اولیاؤں کا قدردان تھا۔ اسے جب خبر ملی کہ آپ کے قدم مبارک سرزمین دکن پر پہنچ چکے ہیں تو وہ آپ کی زیارت کا مشتاق ہوا اور اس نے پیغام بھیجا کہ اگر آپ کو گراں نہ گزرے تو گلبرگہ تشریف لے آئیں۔ کئی بار کی التجا کے بعد آپ نے درخواست قبول کر لی اور مع اہل وعیال کے آپ گلبرگہ تشریف لے گئے۔

سلطان آپ کے استقبال کے لیے شہر کے دروازے پر موجود تھا۔ اس نے نہایت عزت و تکریم کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ اس عزت و تکریم کی خاص وجہ آپ کی شہرت تھی۔ قیام دہلی کے دوران ہی آپ کی کرامات کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی۔

دہلی کے علماء میں مولانا محمد حسین نامی ایک بزرگ تھے۔ انھوں نے حضرت سید محمد گیسودراز کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی تھی۔ ہر روز آپ کے درس میں شامل ہوتے تھے لیکن جب بھی وہ جانے کی تیاری کرتے ان کی بہن کا داماد آوازے کسنا شروع کر دیتا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ اسے جھڑک دیتے مگر دامادی کا رشتہ نازک ہوتا ہے اس لیے خاموش رہ جاتے۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے مگر منہ سے کچھ نہ بولتے لیکن ایک دن ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس دن داماد مزاحیہ اڑانے میں بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ مولانا حسین نے تنبیہہ کی۔ ''بیٹے! ان اللہ والوں کو برا نہ کہو۔ تم اگر ان کی عزت نہیں کرتے تو برا بھی نہ کہو۔''

''میں ان ڈھونگیوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ سب خانقاہ بنا کر' دنیا کو تج کر کے اسلامی اصولوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔''

''بیٹے! ایسا نہ کہو' یہ بظاہر دنیا سے منہ موڑ کر بیٹھے ہوتے ہیں مگر ان کی نظریں ساری دنیا پر رہتی ہیں' یہ باطن کی آنکھوں سے سب کو دیکھتے ہیں۔ کبھی تاریخ اٹھا کر دیکھو حضرت رابعہ بصری' حسن بصری کی زندگی اس کی گواہ ہے۔''

''یہ تجرد زندگی گزارنا کس حکم کے تابع ہے؟''

''حضرت سلمان فارسی حضور اکرمؐ کے صحابیوں میں ایک اہم مقام رکھتے تھے ان کے بارے میں حضورؐ نے کہا تھا کہ سلمان میرے اہلبیت میں ہیں' کیا انھوں نے شادی کی تھی؟''

''آپ جو بھی کہیں میں ان مصنوعی بزرگوں کو نہیں مانتا' ان کی خانقاہیں لوگوں کو دین سے بے بہرہ کر رہی

ہیں۔''

''کیا یہ لوگ نماز' روزے اور تلاوت پر زور نہیں دیتے؟ رہ گیا سماع وغیرہ تو ایسی ایک بھی روایت نہیں ملتی کہ اس سے منع کیا گیا ہو' خود چراغ'' دہلی بھی سماع کی عام محفل سے گریز کرتے تھے مگر انھوں نے بھی اسے خلاف شرع قرار نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے' سماع کے قوانین ہیں اسے بجالائے بغیر سماع کی ساعت ممنوعی ہے پھر یہ بھی تو سوچو اہل ہنود گانے بجانے کے شوقین ہیں۔ انھیں اپنی جانب راغب کرنے کے لیے انہی کا انداز اختیار کرنا ہوگا۔ قرآن شریف اگر عام انداز میں پڑھی جائے تو صرف ان کے دلوں پر اثر کرتی ہے جو سمجھنے کی طاقت رکھتے ہیں مگر لحن میں پڑھی جائے تو ہر کس و ناکس کو متوجہ کر لیتی ہے اسی سے سبق حاصل کر کے اگر منقبت سوز و گداز کے ساتھ گائی جائے تو کیا برا ہے... پھر بھی اگر تم کو شک شبہہ باقی ہے تو ایک بار میرے پیر مرشد سید گیسو دراز سے مل لو۔ میرا دعویٰ ہے کہ ان سے مل کر تمہارا دل صاف ہو جائے گا۔''

''آپ اپنی اس حسرت کو بھی پورا کر لیجیے۔'' اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ ''میں بھی دیکھ لوں کہ آپ کے وہ ڈھونگی پیر کتنے پانی میں ہیں۔''

اپنے مرشد کے بارے میں ایسی بے ادبی! وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے مگر کچھ بولے نہیں۔ کافی دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ دراصل وہ نہیں چاہتے تھے کہ غصے کا اظہار ہو... کیونکہ غصہ حرام ہے اور اہل سلوک کو اس سے دور رہنے کا حکم ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب انھوں نے خود پر قابو پالیا تو نرم لہجے میں بولے۔ ''شام میں تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔''

وہ بے ادب ہنستے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے میں چلوں گا لیکن وہاں بھی میری زبان پر یہی الفاظ ہوں گے۔''

مولانا حسین کو یقین کامل تھا کہ ان کے پیر مرشد کی ایک نگاہ اس گستاخ کے خیالات کو بدل دے گی۔ وہ مطمئن ہو کر وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ شام کے وقت وہ اس سرکش داماد کو لے کر خاندان چشتیہ کے چشم و چراغ'' حضرت نصیر الدین چراغ'' دہلی کے خلیفہ اکبر کی خدمت میں پہنچے۔

حضرت گیسو دراز اپنا دربار سجائے بیٹھے تھے۔ ان کے سر پر سبز عمامہ تھا اور ہاتھوں میں سرخ چمڑے کا پنکھا۔

کیسیس لونگینس

(Cassius Longinus)(42 ق م)

رومن جنرل جو جولیس سیزر کو قتل کرنے کی سازش کا سربراہ تھا۔ 53 ق م میں سیزر کا مقابلہ کیا لیکن ناکام رہا۔ پاپے اور سیزر کی خانہ جنگی میں پاپے کا ساتھ دیا۔ پاپے کے فرار ہونے پر سیزر نے اسے معاف کر دیا اور 44 ق م میں اسے ایک اعلیٰ عدالتی عہدے پر مامور کیا۔ اس نے اپنے ساتھ روم کے ساٹھ بااثر شرفاء کو ملا لیا اور مارچ 44 ق م میں سینیٹ کی عمارت میں سیزر کو قتل کر کے شام بھاگ گیا پھر بروٹس سے مل کر انتونی کے خلاف میدان جنگ میں اترا اور شکست کھانے پر تلوار پر گر کر خودکشی کر لی۔

کیف (Kiev)

یوکرین کا دارالحکومت اور بڑا شہر۔ دریائے ڈنیپر کے کنارے آباد ہے اور ایک اہم صنعتی اور ثقافتی مرکز ہے۔ چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں اس شہر کی بنیاد پڑی اور اسے ریاست سلاوک کا دارالحکومت بنایا گیا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں سلطنت سلاوک کو منگول حملہ آوروں نے تباہ کر دیا۔ کیف کے شہزادے شمالی روس کے جنگلوں میں فرار ہو گئے اور انہوں نے اس علاقے میں ریاست مسکوی کی داغ بیل ڈالی، جس نے بالآخر عظیم روسی سلطنت کی شکل اختیار کر لی۔ 1654ء میں منگولوں کے اخراج کے بعد کیف روس میں شامل ہو گیا۔ 1908ء میں یہاں مسیحت کو فروغ حاصل ہوا۔ 1934ء میں یوکرین کا دارالحکومت بنا۔ دوسری جنگ عظیم میں یہاں بہت تباہی مچی۔ بڑا صنعتی، تجارتی اور ثقافتی شہر ہے۔ یونیورسٹی 1834ء میں قائم ہوئی تھی۔

مرسلہ: نادر فیاض لاہور

مولانا حسین کے داماد کی نظر ان کے چہرے پر پڑی' پتا نہیں اس نے کیسا محسوس کیا کہ اس کی نظریں جھک گئیں۔ اس پر ہیبت سی چھا گئی تھی۔ زبان پر گویا قفل پڑ گیا تھا مگر ذہنی بجی اسے بہکا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی جملہ گونج رہا تھا کہ ان بزرگ کو آزمانا چاہیے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کشف باطن کا دعویٰ کرتے ہیں اگر یہ بزرگ مجھے اپنا عمامہ اور پنکھا دے دیتے ہیں تبھی میں سمجھوں گا کہ درویشوں میں کرامت ہوتی ہے ورنہ یہ مجلس بھی ایک فریب ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت گیسودرازؒ نے مولانا حسین کو مخاطب کر کے کہا۔ ''مولانا! شہر بغداد میں ایک بازیگر رہتا تھا اس کے پاس ایک گدھا تھا۔ وہ گدھا ایسا تربیت یافتہ تھا کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ وہ اس گدھے کو بازار میں لے کر کھڑا ہوتا تو ایک مجمع سا لگ جاتا۔ اسی بازیگر کا دعویٰ تھا کہ یہ گدھا چور کو پہچان لیتا ہے ثبوت کے طور پر وہ گدھے کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا پھر کسی شخص کو کسی دوسرے شخص کی کوئی چیز چرا لینے کو کہتا۔ وہ شخص جب چوری کر لیتا تب وہ بازیگر گدھے کی آنکھوں سے پٹی ہٹا کر گدھے کو حکم دیتا کہ وہ چور کو پہچان لے۔ گدھا مجمع میں کھڑے ہوئے لوگوں کو سونگھتا ہوا آگے بڑھتا اور اس شخص کو جو چور ہوتا اس کے کپڑے کو دانتوں سے پکڑ لیتا اور کھینچتا ہوا اپنے مالک کے پاس لے آتا۔'' حضرت گیسودراز حکایت بیان کر رہے تھے محفل پر سکون چھایا ہوا تھا۔ ہر شخص گوش برآواز تھا۔ مولانا حسین کا داماد بھی ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا کہ حضرت گیسودراز نے کہا۔ ''مولانا حسین! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک شخص جو کرامت دکھائے وہ گدھے کی مانند قرار پائے اور اگر نہ دکھائے تو بے ہنر کہلائے۔''

گیسودراز کے اس جملے نے مولانا کے داماد پر ایک عجیب اثر دکھایا' وہ سمجھ گیا کہ یہ اسی کے بارے میں کہا گیا ہے۔ وہ خود سے بھی شرمسار ہو گیا تھا۔ اس کا پورا جسم عرق ندامت سے تر ہو گیا تھا۔ تبھی حضرت گیسودرازؒ نے اپنا عمامہ اتارا اور اس نوجوان کی جانب بڑھاتے ہوئے بولے۔

''صاحب زادے تمہیں عمامہ اور پنکھے کی طلب ہے لو یہ ایک بے کرامت درویش کی جانب سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔''

نوجوان پر گویا گھڑوں پانی گر گیا تھا۔ وہ ندامت سے سر نہیں اٹھا رہا تھا تبھی حضرت گیسودرازؒ نے کہا۔

''صاحبزادے آگے بڑھو!''

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے آگے بڑھ کر حضرت گیسودرازؒ کے پیروں کو پکڑ لیا۔ ''حضرت اب آپ ہی مجھے راہ ہدایت دکھائیں۔ میں واقعی اب تک بھٹکا ہوا تھا۔ اب بیعت کر کے صراط مستقیم پر آنا چاہتا ہوں' میں دنیا کو ترک کرنا چاہتا ہوں۔''

حضرت گیسو دراز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ انھوں نے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنے مرشد اور انھوں نے اپنے مرشد حضرت سلطان المشائخ 'نظام الحق والدین سے سنا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ترک دنیا کے یہ معنی نہیں ہے کہ کپڑوں سے آزاد ہو جائے۔ ننگا ہو کر لنگوٹ باندھ کر کسی گوشے میں بیٹھ جائے بلکہ ترک دنیا کا یہ مطلب ہے کہ دنیا کی برائیوں سے خود کو دور کر لے۔ خود جو کھائے وہ دوسروں کو بھی کھلائے خود جو پہنے وہ دوسروں کو بھی پہنائے۔ خلق خدا کی جہاں تک ممکن ہو حاجت روائی کرے' انھیں خوش رکھے۔ اپنے دل کو دنیا کی آلائشوں سے پاک رکھے اور شہرت کا خیال چھوڑ دے بلکہ اسی طرح شہرت سے دور بھاگے جیسے شیر کو دیکھ کر بھاگنا چاہیے۔ میں نے افضل الفوائد جلد اول میں ایک حکایت دیکھی ہے کہ شیخ علی ترمذی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رابعہ بصریؒ نے مکے کا رخ کیا اور سات سال تک پہلو کے بل لڑھک لڑھک کر عرفات پہنچیں عرفات میں پہنچتے ہی غیب سے آواز آئی کہ اے مدعی! یہ کیسی خواہش دامنگیر ہوئی ہے اگر تو ہمیں طلب کرتی ہے تو ہم ایک ہی تجلی سے تیرا کام سنوار دیتے۔ رابعہؒ نے عرض کی یارب العزت! مجھے اس درجے کا سرمایہ حاصل نہیں۔ میں فقط فقیری چاہتی ہوں۔ آواز آئی' اے رابعہ سر جھکا لے کیونکہ یہاں پر یہ معاملہ ہے کہ جو لوگ ہمارا وصال چاہتے ہیں اور اس قدر قریب ہو جاتے ہیں کہ بال برابر کا بھی فرق نہیں رہتا تو پھر کام دگرگوں ہو جاتا ہے اور وصال فراق سے بدل جاتا ہے۔ تو تو ابھی ستر پردوں میں ہے جب تک تو ان پردوں کو پھاڑ کر ہماری راہ میں قدم نہ رکھے گی فقر حاصل نہیں ہوگا۔ ذرا نگاہ اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھ۔ رابعہ بصریؒ نے اوپر نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ ہوا میں خون کا دریا موجزن ہے۔ تب آواز آئی۔ ''اے رابعہ! یہ میرے ان عاشقوں کی آنکھ کا خون ہے جنھوں نے اس راہ میں قدم

بڑھایا اور پہلی ہی منزل میں ایسے فرد ہوئے کہ دونوں جہان میں ان کا نام ونشان نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت گیسو دراز کچھ دیر کے لیے رکے اور پھر بولے۔ ''صاحبزادے یہ درویشی کی منزل اتنی آسان نہیں ہے۔''

''مجھے حلقہ ارادت میں لے کر تو دیکھیں!''

اس کے اصرار کو دیکھ کر حضرت گیسو درازؒ نے بیت کرالیا۔ یہی بیعت قیام دہلی کی آخری بیعت تھی۔ اس کے کچھ ہی روز بعد حضرت چراغؒ کا انتقال ہوگیا تھا اور آپ نے دہلی کو خیر باد کہہ دیا تھا اور دکن کی جانب چل پڑے تھے۔ مشہور مورخ قاسم فرشتہ نے اپنی مستند تاریخی دستاویز میں آپ کی ایک ایسی کرامت کا ذکر کیا ہے جسے پڑھ کر عقل انسانی عاجز آجاتی ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے۔

''یہ نویں صدی کے آغاز کا واقعہ ہے۔ اس وقت فیروز شاہ بہمنی دکن کا حکمران تھا۔ ۸۱۵ھ میں فیروز شاہ بہمنی شکار کا بہانہ کر کے گونڈواڑھ پہنچا اور باغی اہل ہنود کو گھیر کر ان کے علاقے کو تباہ' برباد کر ڈالا۔ تقریباً تین سو ہاتھی اسے مال غنیمت کے طور پر ملے۔ وہ دارالحکومت واپس آیا تھا کہ اسے خبر ملی کہ دہلی کا ایک مشہور درویش ولی کامل سید محمدؒ گیسو دراز گلبرگہ آچکا ہے۔ علم دوست بادشاہ نے جوں ہی اس خبر کو سنا' پھر رخت سفر باندھا اور فیروز آباد سے گلبرگہ آگیا۔ اپنے عزیز واقارب کو اس نے بندہ نواز کے استقبال کے لیے بھیج دیا اور ان سے کہا کہ وہ بندہ نواز گیسو دراز کو یہیں لے آئیں۔ حضرت شیخ جس وقت شہر میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر ان کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی کہ بڑے بڑے عمائدین سلطنت ہاتھ باندھے قطار میں کھڑے ہیں۔ خود فیروز شاہ بہمنی بھی ان میں شامل ہے۔ اس نے حضرت نصیر الدین چراغؒ دہلی کے خلیفہ اکبر کو دیکھا تو وقتی طور پر آپ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا لیکن چند ملاقاتوں کے بعد فیروز شاہ کی عقیدت کم ہوگئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فیروز شاہ ظاہری علوم و فنون کا دلدادہ تھا اور حضرت گیسو دراز ان چیزوں سے زیادہ شغف نہیں رکھتے تھے۔

نتیجہ فیروز شاہ بہمنی حضرت سید محمدؒ گیسو دراز کے حضور کوئی خاص عقیدت ظاہر نہ کرسکا۔ اس کے برعکس فیروز شاہ کا چھوٹا بھائی احمد خان حضرت کا اس قدر معتقد ہوگیا کہ خود کو آپ کا خادم کہہ کر پکارنے لگا۔ احمد خان نے حضرت کے لیے دلکش دیوار و در کی ایک خانقاہ بنوادی اور خود بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ سید محمدؒ گیسو دراز کو سماع (قوالی) کا بے حد شوق تھا۔ احمد خان بھی حضرت شیخ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پابندی سے سماع کی محفلوں میں شریک ہوتا تھا اور ان قوالوں کو' شعرا کو جن کے منقبت اعلیٰ پائے کے ہوتے تھے انعام و کرام سے نوازتا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت گیسو دراز کی خانقاہ میں ٹھہرے ہوئے درویشوں کو بھی بیش قدر انعامات سے نوازنے لگا۔ اس پر جوش عقیدت کے سبب حضرت گیسو دراز بھی برسر مجلس احمد خان پر شفقت فرماتے تھے۔

اسی دوران ۸۱۸ھ میں فیروز شاہ بہمنی نے اپنے بیٹے اکبر حسن خان کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا اور تمام ارا کین سلطنت سے اس کے لیے بیعت لے لی۔ پھر چند معتبر درباریوں کے ہاتھ سید محمدؒ گیسو دراز کی خدمت میں یہ عرضداشت بھیجی کہ حضرت گیسو دراز اکبر حسن خان کے حق میں دعائے خیر کریں۔

حضرت گیسو درازؒ نے شاہی قاصدوں کی بات کو بغور سنا اور پھر مختصر سے سکوت کے بعد فرمایا۔ ''اپنے بادشاہ سے کہو کہ جب اکبر حسن خان کے سر پر تاج رکھ ہی دیا ہے تو پھر دنیا میں اسے کس چیز کی ضرورت؟ اس جواب سے ہی اہل مجلس نے اندازہ لگا لیا کہ آپ اکبر حسن خاں کے حق میں دعائے خیر کرنا نہیں چاہتے ہیں۔

شاہی قاصد ناکام و نامراد لوٹ گئے اور بادشاہ کے حضور پہنچ کر حضرت کا جواب سنا دیا۔ بادشاہ اہل نظر تھا وہ پریشان ہوا اٹھا اور بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ کافی دیر بعد اس نے پھر انھی لوگوں کو بلایا اور حکم دیا کہ تم سب پھر ان کی خدمت میں جاؤ اور دعائے خیر کی التجا کرو اور اگر پھر بھی دعا نہ کریں تو اس وقت تک استدعا کرتے رہو جب تک وہ اپنی زبان سے دعائے خیر نہ کردیں۔

فیروز شاہ بہمنی کا پیغام لے کر قاصد پھر آپ کے حضور پہنچے اور دعا کے لیے التجا کی۔ حضرت پھر پہلے کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ انھیں خاموش دیکھ کر قاصدوں نے پھر التجا کی۔ ان کے اصرار دیکھ کر حضرت سید محمد گیسو دراز کو جلال آگیا اور انھوں نے بلند آواز میں کہا۔

''یہ فیروز شاہ کا فیصلہ تھا کہ اس نے اکبر حسن خان کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا مگر قدرت کے فیصلے سے اہل زمین بے خبر ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ مشیت الٰہی نے دکن کی حکمرانی کے لیے احمد خان کا انتخاب کیا ہے۔ آسمان بھی خدا کا ہے

اور زمین کی مملکت بھی اسی کی ہے اور تاج وتخت بھی۔ وہ جسے چاہتا ہے سرفراز کرتا ہے۔ اگر ساری دنیا بھی اکبر کے پرچم تلے جمع ہو جائے تو احمد خان کے اقتدار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ بحکم خدا شاہ دکن ہے۔ اب اگر کوئی خدا سے جنگ کرنا چاہتا ہے تو درویش اس کی ذہنی روش کو بدلنے سے قاصر ہے۔'' حضرت نے شاہی قاصدوں کو آخر کار وہ عبارت پڑھ کر سنا دی جو لوح محفوظ پر درج تھی۔ ایک مرد قلندر کے لہجے کی حرارت سے فیروز شاہ کے نمائندے لرزنے لگے اور پھر گردنیں جھکائے غم..... کے ساتھ واپس چلے گئے۔

جب فیروز شاہ نے اپنے قاصدوں کی زبانی حضرت کے فرمودات سنے تو اسے شدید اذیت پہنچی۔ بیٹے کی محبت نے اسے جنون میں مبتلا کر دیا تھا اور پھر یہی جنون گستاخانہ رنجش میں بدل گیا۔ اب کی بار فیروز شاہ نے قاصدوں کی بجائے چند فوجی سرداروں کو حضرت سید محمدؒ گیسو دراز کے پاس بھیجا۔ پہلے قاصد نیاز مہندی کا پیغام لے کر پہنچے تھے لیکن فوجی سرداروں نے آمرانہ لہجہ اختیار کیا۔ ''شاہ دکن کا حکم ہے آپ اپنی خانقاہ کسی اور مقام پر منتقل کر لیں۔''

''آخر کیوں؟'' گیسو دراز نے زیر لب تبسم کے ساتھ سوال کیا۔

''آپ کے مریدین رات کا اندھیرا پھیلتے ہی اللہ ہُو اللہ ہُو کی گردان شروع کر دیتے ہیں۔ اتنا زیادہ شور ہوتا ہے کہ سرکاری کاموں میں خلل پڑنے لگتا ہے۔'' فوجی سرداروں کے انداز گفتگو میں طاقت واقتدار کا زعم تھا۔ وہ کس سے مخاطب ہیں انھیں اس کی بھی پروا نہ تھی۔

''پہلے بھی خانقاہ یہیں تھی اور یہی مریدین کا ہاؤ ہو تھا۔ اس وقت شاہ دکن کا امور سلطنت متاثر نہیں ہو رہا تھا اب ایسا کیوں ہوا؟'' حضرت نے اتمام حجت کے لیے کہا۔

''ہمیں تفصیلات کا علم نہیں۔'' فوجی سردار نے کہا۔

''حاکم وقت کی منشا کسی وضاحت کی پابند نہیں ہوتی۔ یہی آپ پر بھی لازم ہے کہ اپنی خانقاہ یہاں سے اتنی دور لے جائیں کہ کسی دوسرے حکم کی ضرورت نہ پڑے۔'' حاکمیت کا مکروہ چہرہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔

''لوح تقدیر میں جو لکھا ہے اسے کوئی بھی مٹا نہیں سکتا۔ ہم درویش ہیں راز دوں کے امین ہیں لیکن انسان ہیں غلطیوں کے پتلے ہیں۔ میں نے بھی غلطی کی تھی کہ راز سے پردہ اٹھا دیا یہ ضروری ہے۔'' گیسو دراز کے لبوں پر ہنوز تبسم رقصاں تھا۔ وہ اسی ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بول رہے تھے۔ ''حالانکہ میں اسی دن سے پشیمان ہوں مگر بالغ کی غلطی نابالغ سے زیادہ بڑی ہے سو سزا بھی کڑی ہے۔ میں تو اسی دن سے سزا کے انتظار میں تھا۔ اپنے بادشاہ سے کہہ دینا وہ لوح محفوظ کی تحریر کو مٹا نہیں سکتا۔ جو لکھا گیا وہ ہو کر رہے گا۔'' پھر آپ نے مریدین و درویشوں کو حکم دیا۔ ''آپ سب جلد از جلد منتقلی کی تیاری کریں اب بغیر انتقال کے چارہ نہیں۔''

درویشوں کے پاس اسباب کیسا؟ سب نے اپنے اپنے خرقے کندھے پر ڈالے عصا لیا اور کشکول اٹھا کر چل پڑے۔ ان سب میں اگر کسی کے ساتھ کچھ اسباب تھا تو وہ حضرت سید محمدؒ گیسو دراز تھے۔ انھوں نے اپنے سر پر ایک بڑی سی گٹھڑی اٹھا رکھی تھی۔ اس سے کچھ چھوٹی چھوٹی دو گٹھڑیاں سید محمدؒ اکبر حسینی اور سید محمدؒ اصغر حسینی اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ دونوں سید محمدؒ گیسو دراز کے فرزند تھے اور انھوں نے اپنے والد کی طرح کتابوں کی گٹھڑی اٹھا رکھی تھی۔ اس گھر کا یہی اثاثہ تھا۔ ایک وقت سے زیادہ کا غلہ رکھنا انھیں پسند نہ تھا اس لیے گلہ گھر میں تھا ہی نہیں۔ کپڑے ہر ایک کے صرف ایک جوڑے بنتے تھے جب ان کپڑوں میں پیوند لگنے کی بالکل جگہ نہ بچتی اور ستر پوشی میں ناکام رہتے تبھی انھیں گھر کے کسی دوسرے کام میں لایا جاتا۔ اسی وجہ سے گھر میں کپڑے بھی نہ تھے۔ ایک ایک کمبل جسے وہ اوڑھتے بھی تھے اور بچھاتے بھی اسی میں انھوں نے کتابوں کو باندھ رکھا تھا۔ ان کے ساتھ رہنے والے دیگر درویشوں کے پاس تو صرف خرقہ عصا اور عبا تھا۔ انھوں نے بچوں کی گٹھڑیاں ان سے لے کر اپنے سروں پر اٹھانے کی پیشکش کی تھی مگر گیسو دراز نے صاف انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا۔ ''دنیا میں جن کے پاس جتنا اسباب ہے روز حشر اتنا ہی وزن اس کے کندھوں پر ڈالا جائے گا تو کیوں نہ میں خود سر پر لاد کر دیکھ لوں کہ روز حشر یہ بوجھ اٹھا سکوں گا بھی یا نہیں۔''

ان درویشوں میں کچھ وہ تھے جو دہلی سے آپ کی اقتدا میں چلے تھے اور کچھ وہ تھے جو راستے میں آپ کا نام سن کر شریک سفر ہو گئے تھے۔ وہ سب شہر کے باہر ایک کھلے میدان میں پہنچے جہاں پہاڑیاں تھیں یا پانی کی نہر۔ سڑک بھی وہاں سے کافی دور تھی۔ گیسو دراز نے انھیں اسی

میدان میں پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ درویش حیران تھے کہ جب حاکم وقت دشمنی پر آمادہ ہے تو عقل یہی کہتی ہے کہ اس کی حدود سلطنت سے نکل جانا بہتر ہے۔ انھی میں سے کسی نے یہ سوال کیا بھی تھا' حضرت گیسو دراز اس کی بات سن کر مسکرا کر شفقت بھرے لہجے میں بولے تھے۔ ''ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ میں یہاں پر کیوں پڑاؤ ڈال رہا ہوں یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ کیوں کہ آسمانی فیصلوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔''

سب نے اسی جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ وہ لق و دق میدان ان درویشوں کے دم سے آباد ہوگیا۔

حضرت گیسو دراز کی خانقاہ خالی ہوگئی۔ وہاں کی در و دیوار سے یاس ٹپکنے لگی تھی مگر فیروز شاہ بہمنی خوش تھا۔ اس نے آپ کو دشمن سمجھ لیا تھا اور دشمن کو ایذا پہنچانے سے راحت ملتی ہے وہ بھی راحت کے احساس سے سرشار تھا وہ محل کے چوبارے میں کھڑا ان درویشوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کے لیے خوشی کی بات تھی کہ اس کے ناپسندیدہ عناصر جا رہے تھے مگر اس کا دل خوش نہ تھا۔ اسے عجیب سے احساس نے گھیر رکھا تھا۔ رہ رہ کر اسے حضرت گیسو دراز کی پیش گوئی یاد آرہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر دہل رہا تھا۔

درویشوں کو خانقاہ خالی کیے ہوئے کئی ماہ گزر گئے تھے۔ اس دوران اس نے کئی بار کوشش کی کہ بیٹے کی رسم تاجپوشی ادا کردے مگر ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوجاتی کہ اسے مہم پر نکلنا پڑجاتا۔ اس تمام عرصے میں اسے حضرت گیسو دراز کی پیش گوئی دہلاتی رہی۔ اس فکر نے اسے بیمار ڈال دیا۔

ولی عہد اکبر حسن خان ایک ناتجربے کار نوجوان تھا۔ باپ کی علالت نے اسے کھل کھیلنے کا موقع دے دیا۔ اسے مفاد پرستوں نے اپنے حلقے میں لے لیا تھا۔ اسے سیاست اور حکومت کے گر سکھانے کی بجائے رقص و سرور کی محفلوں میں کھینچا جا رہا تھا۔ وہ بھی ایسی ہی بے ہودہ محفلوں کا رسیا بن چکا تھا۔

اکبر حسن خان کا امور سلطنت سے آنکھیں چرانے کا فائدہ غلاموں نے خوب خوب اٹھایا فیروز شاہ بہمنی کے دو غلام خاص' عین الملک اور بیدار الملک نے تو متوازی حکومت قائم کرلی تھی۔ وہ مکمل طور پر سیاہ سفید کے مالک بن چکے تھے۔ انھوں نے محل کے تمام غلاموں کو اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ ان دونوں کو امید تھی کہ بادشاہ دو چار دن کا مہمان ہے اس کے مرتے ہی وہ دکن کے فرمانروا بن جائیں گے کیونکہ اکبر حسن خان پوری طرح عیش و طرب میں ڈوب چکا تھا۔ مگر انھیں احمد خان کا ڈر تھا کہ کہیں وہ دعویٰ نہ کردے۔ اس خوف سے ہمیشہ کے لیے نجات کی خاطر انھوں نے فیروز شاہ کو ورغلانہ شروع کردیا۔ انھیں جب بھی موقع ملتا وہ بادشاہ کے کان بھرنے لگے کہ احمد خان بغاوت کی تیاری کررہا ہے۔ ایسے وقت میں فیروز شاہ کے کانوں میں حضرت گیسو دراز کی پیش گوئی گونجنے لگتی کہ تخت حکومت تو احمد خان کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔

فیروز خان کے دل میں بھائی کے خلاف تو بہت پہلے ہی کینہ بھرا ہوا تھا۔ اس اطلاع نے اسے حتمی فیصلہ دینے پر مجبور کردیا اور اس نے نہایت ظالمانہ حکم صادر کردیا مگر یہ بات چھپی نہ رہ سکی اور احمد خان تک پہنچ گئی۔

فیروز شاہ کے کارندے احمد خان تک پہنچتے کہ وہ فرار ہوگیا۔ اس نے اپنے ساتھ بڑے بیٹے علاؤ الدین خان کو بھی لے لیا تھا۔ وہ محل سے فرار ہوکر سیدھا سید محمد گیسو دراز کے پاس پہنچا اور ان کے قدموں میں سر رکھ کر زار زار رونے لگا کہ میں نے کب تخت و تاج کی خواہش کی تھی۔ میں تو آپ کی خدمت کو ہی اپنا مقصدِ حیات سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے دیں۔ میں باقی عمر یہیں درویشوں کی خدمت میں گزارنا چاہتا ہوں۔

''مگر احمد خان!'' گیسو دراز نے کہا۔ ''تمہاری قسمت میں تو حکومت لکھ دی گئی ہے اور قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔''

''آپ کی بات سچ ہے مگر میں کیا کروں فیروز شاہ میرا سگا بھائی ہے پھر بھی میری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ میری آنکھیں نکال لی جائیں۔''

تم فکر نہ کرو اللہ مسبب الاسباب ہے وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔'' پھر انھوں نے جلال میں آکر کہا۔ ''احمد خان جو لوگ خود اندھے ہوں وہ دوسروں کی بینائی کیا چھینیں گے' تمہاری آنکھوں میں سلائی پھروانے سے پہلے ہی ان کی بینائی ختم ہوجائے گی۔'' پھر انھوں نے اپنا دستار اتارا اور اس کے دو ٹکڑے کردیے۔ ایک ٹکڑا احمد خان کے سر پر اور دوسرا علاؤ الدین خان کے سر پر باندھا پھر پرجلال لہجے میں بولے۔ ''احمد خان' اب یہی تمہاری دستار فضیلت ہے اور یہی تمہارا تاج تم بہت جلد بادشاہ ہوگے۔'' احمد خان وہاں کچھ دیر ٹھہرا اور پھر لشکر جمع کرنے

کے لیے نکل پڑا۔

پھر ایک طویل خونریزی کے بعد احمد خاں کو فتح حاصل ہوئی اور حضرت گیسودراز کا یہ عقیدت مند شان کے ساتھ فتح کا پرچم اٹھائے قلعہ میں داخل ہوا۔ محل میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھا اپنے بڑے بھائی فیروز شاہ بہمنی کے کمرے میں داخل ہوا اور جاتے ہی اس نے اپنا سر بھائی کے قدموں میں رکھ دیا۔ چھوٹے بھائی کی عالی ظرفی نے فیروز شاہ بہمنی کو رولا دیا۔ دونوں بھائی کافی دیر تک گلے لگ کر روتے رہے۔

احمد خان فاتح بن کر آیا تھا۔ تخت حکومت پر اس کا حق تھا۔ 825ھ میں وہ احمد شاہ بہمنی کے نام سے تخت دکن پر جلوہ افروز ہوا' بارہ سال تک اس نے حکومت کی اور 838ھ میں اس نے انتقال کیا' اس کے بعد علاؤ الدین شاہ تخت نشین ہوا اور تقریباً چوبیس سال تک ایک مطلق العنان شہنشاہ کی طرح اس نے بھی حکمرانی کی اور 862ھ میں انتقال کیا۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے ہر ایک کو موت آنی ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ احمد خان کو ابدی نیند آ گئی۔ علاؤ الدین نہ خاک سو گیا مگر خدا نے انہیں اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھایا جب تک سید محمد گیسودراز کی پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت نہ ہو گئی۔ یہ کوئی فرضی قصہ کہانی نہیں ہے ایک مرد مومن کا یادگار واقعہ ہے جسے کسی ایسے ویسے قلم کار نے بیان نہیں کیا ہے۔ محمد قاسم فرشتہ کی تاریخ دانی معتبر ہے۔ تاریخ فرشتہ سے مستند کوئی دوسری تاریخ نہیں' اس نے بیان کیا۔ ایسے عظیم مورخ محقق نے رقم کیا ہے۔

حضرت گیسودراز بائیس سال گلبرگہ (دکن) میں مقیم رہے اس تمام عرصے میں آپ نے صرف ایک کام کیا اور وہ تھا تبلیغ دین حق۔ آپ نے اخوت و بھائی چارے کا پیغام عام کیا محبت و شفقت کی تعلیم دی کیونکہ یہی اسلامی درس کا پہلا نکتہ ہے۔ اسی نکتے نے ہندوؤں کے دلوں پر صدیوں سے پڑا قفل توڑ دیا تھا اور وہ جوق در جوق دین مبین میں آنے لگے تھے۔ آج بھی گلبرگہ کا علاقہ بھارت کے مسلم اکثریت علاقوں میں سے ایک ہے۔

آپ نے 16 ذی قعد 825ھ مطابق 1422ء (عہد مبارک شاہ سادات دہلی) کو گلبرگہ میں 105 سال کی عمر میں اس دنیائے فانی سے منہ موڑا۔ سلطان احمد خان نے آپ کے وصال کے بعد آپ کے مرقد منور پر ایک عالی شان روضہ تعمیر کرایا۔ آپ کے مزار مقدس پر اورنگ زیب نے بھی کئی بار حاضری دی تھی اور خدام درگاہ عالیہ کو بیس بیس ہزار روپے نذر کیے تھے۔

آپ کی تصانیف 105 کے قریب بتائی جاتی ہیں جن میں شرح فصوص الحکم' شرح رسالہ قشریہ' شرح فصوص الحکم' شرح در... قشریہ' شرح مشارق الانوار' تفسیر قرآن المجید۔ معارف شرح عوارف (عربی) ترجمہ طوارف (فارسی) الاسماء۔ شرح تعرف۔ شرح آداب المریدین (عربی) شرح آداب المریدین (فارسی) شرح تمہیدات عین القضاء ہمدانی' رسالہ عشقیہ' شرح فقہ اکبر' اسماء الاسرار' حدائق الانس۔ استقامت الشریعت حواشی قوت القلوب۔ شرح الہامات حضرت غوث الاعظم' ان میں اسماء الاسرار حضرت سید گیسودرازؒ کی مشہور کتاب ہے اس تصنیف کے بارے میں خود حضرت شیخ فرماتے تھے۔ ''میری کتاب اسماء الاسرار میں باطل کو نہ آگے سے آنے کا موقع نہ عقب سے۔'' اس کتاب کے متعلق اکثر بزرگوں کا خیال ہے کہ تصوف کے موضوع پر ہندوستان میں اس سے بہتر کوئی تصنیف موجود نہیں ہے۔

آپ کے دو صاحبزادے حضرت سید حسین عرف سید محمد اکبر حسینی اور حضرت سید محمد یوسف عرف سید محمد اصغر حسینیؒ تھے۔ تین صاحبزادیاں تھیں۔ آپ کے بعد حضرت سید اصغرؒ سجادہ نشین بنے کیونکہ آپ کے بڑے بھائی انتقال کر چکے تھے۔ آپ کے ملفوظات کے دو مجموعے ''سید محمدی'' مرتبہ محمد علی سامانی اور ''جوامع الکلم'' مرتبہ محمد اکبر حسینی شائع ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

تحریر کی تیاری میں ان کتابوں سے مدد لی گئی

تاریخ فرشتہ' محمد قاسم فرشتہ۔ سیر الاولیاء' امیر خورد۔ تاریخ فیروز شاہی' برنی۔ مفتاح العاشقین' محبت اللہ۔ دلیل العارفین' قطب الدین بختیار کاکی۔ انیس الارواح' خواجہ معین الدین چشتی۔ اللہ والے' شوکت اللہ فہمی۔ سلسلہ چشتہ کے گر' حبیب احسن نظامی۔ چشتی خانقاہیں' میاں محمد کلیم۔ سربراہان ہند اور خانقاہی نظام' صاحب زادہ مصطفیٰ حسن گیلانی۔ کشکول' مولانا مفتی محمد شفیع۔ مرشد سجدہ تعظیم خواجہ حسن نظامی

پہلا مہم جو

فرزانہ نگہت

وہ ایک ایسا کارنامہ انجام دینے نکلا تھا جس کا انجام موت پر منتج تھا لیکن اس نے بیڑا اٹھایا، اپنے مہم کو انجام دینے کے لیے برصغیر آگیا کہ وہ موت کو شکست دے گا۔

ایک مہم جو کی خطرناک ترین مہم کا تذکرہ

یہ 1993ء کا ذکر ہے وہ گرمیوں کی ایک خشک اور بیزار کن شام تھی۔ ہیسٹس ائرپورٹ تقریباً ویران پڑا تھا۔ وہاں اکّا دکّا مسافر یا اخباری نمایندے نظر آرہے تھے، جو مورس ولسن کے احمقانہ مشن کا ذکر کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑا رہے تھے اور خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ سر پھرا شخص جسے کوہ پیمائی کا کوئی تجربہ نہ تھا دنیا کی سب سے بلند چوٹی ایورسٹ کو فتح کرنے کے ارادہ سے نیپال جا رہا تھا۔

مورس ولسن اس زمانے میں بھی گمنام تھا آج بھی اس کے نام سے کوئی واقف نہیں لیکن دوسری جنگ عظیم سے پہلے اس نے جو کارنامہ انجام دیا وہ ایورسٹ کی تسخیر کی ابتدائی

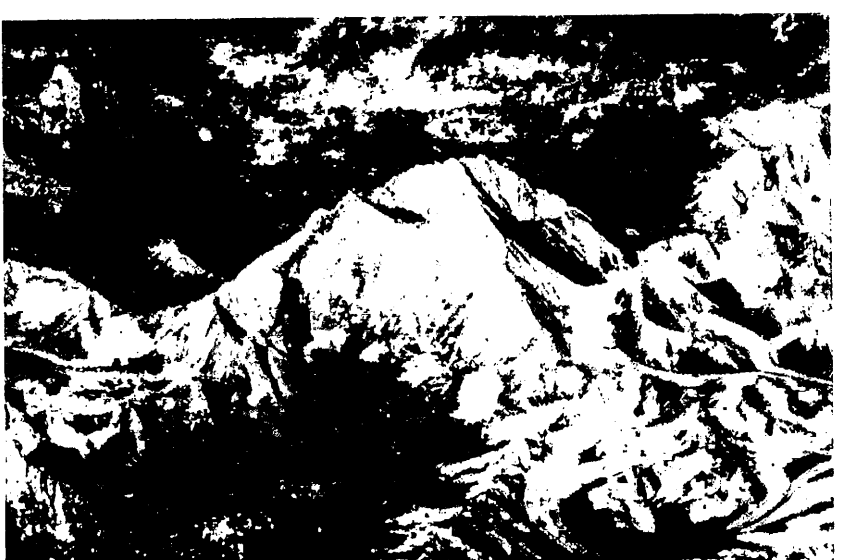

کوششوں میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

مورس ولسن وقت مقررہ پر ائرپورٹ پہنچ گیا۔ سب اخباری نمایندے اس کی طرف متوجہ ہوگئے لیکن اس نے کسی سے بات نہ کی اور سیدھا اپنے جہاز ''چیسی موتھ'' کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اس کی مشینری کا جائزہ لیا اور کاک پٹ میں جا بیٹھا۔ چند منٹ بعد اس نے ہاتھ کے اشارے سے الوداعی سلام کیا۔ انجن اسٹارٹ کیے پھر اس کا چھوٹا سا جہاز رن وے پر دوڑنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہونے لگا، مغرب کی سمت پرواز کرنے لگا اور تھوڑی دیر میں نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

جہاز کے نظروں سے اوجھل ہوجانے کے بعد ڈیلی میل لندن کے نمایندے نے قریب کھڑے ایک بوڑھے آدمی سے پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ مورس ولسن تن تنہا دنیا کی بلند ترین چوٹی سر کرنے کا خیال رکھتا ہے یا اس کی شہرت حاصل کرنے کی کوئی چال ہے؟''

''شہرت حاصل کرنے کی چال؟'' بوڑھے نے حیرت سے کہا۔ ''میں ذاتی طور پر مورس ولسن کو جانتا ہوں وہ بڑا عالی حوصلہ اور بہادر آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور اپنی مہم میں کامیاب ہوگا۔''

بوڑھے کی اس بات پر دوسرے اخباری نمایندے مسکرانے لگے۔ انہیں مورس ولسن انتہائی احمق اور بے عقل شخص معلوم ہو رہا تھا جو کوہ پیمائی کا کوئی تجربہ نہ رکھنے کے باوجود دنیا کی بلند ترین چوٹی سر کرنے چل نکلا تھا۔ برطانوی حکومت اسے اس خطرناک مہم سے باز رکھنا چاہتی تھی لیکن وہ ہر قیمت پر اس مہم پر روانہ ہونا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مشکلات کا مقابلہ کرنے میں ''غیبی قوتیں'' اس کی مدد کریں گی۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جب مورس فوج سے سبکدوش ہو کر گھر آیا تو اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ اپنی ٹیکسٹائل مل میں کام کرے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ مل میں بیٹھ کر کپڑا بننا پسند نہیں کرتا۔ اس پر اس کے باپ نے سوچا شاید جنگ کی ہولناکیوں کے سبب اس کا دماغ کچھ پراگندگی کا شکار ہو چکا ہے کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ خود مورس کو بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی اس دماغی کیفیت کا کیا سبب تھا۔ وہ اپنی ذہنی و جسمانی صحت و تندرستی کے لیے یورپ کی سیاحت پر روانہ ہوگیا۔ اس دوران وہ کئی حادثات کا شکار ہوا لیکن ہر جگہ غیر مرئی قوتیں اس کی حفاظت کرتی رہیں۔ ایک روز وہ مایسیلز کی ایک بیکری کے دروازے پر بے ہوش پایا گیا۔ اسپتال میں جب اسے ہوش آیا تو وہ بری طرح سے کانپ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹروں کو بے ہوش ہوجانے کی کوئی وجہ نہ بتا سکا۔ اسی طرح وہ روم میں آوارہ گردی کرتے ہوئے گرفتار ہوا اور جیل بھجوا دیا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد وہ سیدھا لندن جا پہنچا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ گھر میں ہر طرح کا عیش و آرام مہیا تھا مگر اس کی ذہنی الجھنیں جوں کی توں تھیں۔ دماغی خلفشار بے سکونی اور بے آرامی نے اس کے لیے زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ وہ کئی ماہرین نفسیات اور مشہور ڈاکٹروں کے پاس گیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک روز اس کی ملاقات لندن کے مشہور محلے چیلسی کے رہنے والے ایک شخص ایگرٹس سے ہوئی۔ وہ روحانی علاج معالجے میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اس نے مورس ولسن کی کہانی بڑی توجہ سے سنی اور بولا۔ ''میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں لیکن تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا پڑے گا۔''

''میں تم پر بھروسا کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' ولسن بولا۔ ''تم سے پہلے میں بہت سے ڈاکٹروں کے پاس جا چکا ہوں مگر وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکے۔ میں ذہنی طور پر اس قدر پریشان ہوں کہ اکثر اوقات مجھے یہ بھی معلوم نہیں رہتا کہ میں کون ہوں۔ آپ مجھے بتایئے میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟''

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں..... تمہیں صرف ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں اسے حاصل کرنے کا طریقہ بتاؤں گا۔'' ایگرٹس نے اسے تسلی دی۔

ایگرٹس کی ہدایات اور توجہ کے زیر اثر تین ماہ کے اندر اندر ولسن ذہنی طور پر بالکل تندرست و توانا ہوگیا۔ اس کے چہرے کی رونق اور آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس نے پہلی مرتبہ زندگی کی قدر و قیمت کو سمجھا ہے۔ ایک دن اس نے ایگرٹس سے پوچھا۔ ''ہماری دنیا اتنی دکھی کیوں ہے؟ یہاں ہر شخص افسردہ اور زندگی سے بیزار نظر آتا ہے کیا ہم دنیا کو خوشیاں نہیں دے سکتے؟''

ایگرٹس نے چند لمحوں تک آنکھیں بند رکھیں گویا کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہو پھر وہ بولا۔ ''ہماری دنیا اس لیے دکھی ہے کہ وہ خوشیاں قبول کرنے کو تیار نہیں۔''

''میرے اندر سوئی ہوئی قوتیں اب بیدار ہو چکی ہیں۔'' ولسن ایک جذبے سے بولا۔ ''اب میں چاہتا ہوں کہ

لوگوں کو زندگی کے راز سے آگاہ کروں۔ اگر میں تبلیغ کرتا ہوں تو لوگ ہنسی اڑائیں گے لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے تو کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جو پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔ کوئی شاندار اور یادگار کارنامہ جس سے دنیا انگشت بدنداں رہ جائے۔''

جواباً ایگرٹس کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر وہ خاموش ہی رہا۔ ولسن پھر بولا۔ ''ہاں میں ضرور ایک ایسا کارنامہ انجام دوں گا جسے دنیا برسوں تک نہ بھلا سکے گی۔''

ولسن نے جو کچھ کہا تھا وہ شیخی بازی یا لفاظی نہیں تھی بلکہ وہ دل ہی دل میں عزم صمیم کر چکا تھا کہ وہ ضرور کوئی محیر العقول کارنامہ انجام دے گا ورنہ خودکشی کر لے گا۔ بھلا ایسی زندگی کس کام کی جو حیوانوں کی طرح گزاری جا رہی ہو۔

1933ء میں دنیا بھر کی نظریں ماؤنٹ ایورسٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ کئی ملکوں کے کوہ پیماؤں کی جماعتیں اس چوٹی کو سر کرنے میں ناکام ہو چکی تھیں اور کئی مہم جو اس مہم پر روانہ ہونے والے تھے۔ انہی دنوں ہیوج وٹلچ ٹیم بھی اس مہم سے واپس آ چکی تھی۔ بے نیل و مرام۔ ایک روز مورس نے لیے کوئی محیر العقول کارنامہ انجام دینے کے بارے کرسی پر بیٹھا غور و فکر میں مشغول تھا کہ اس کے ذہن میں دم ہی ماؤنٹ ایورسٹ کا خیال آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی نے اپنے اندر عجیب سی خوشی و جذبہ امڈتے محسوس کیا وہ نظر بانہ کرسی سے اٹھ گیا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے ۔اس نے سوچا مجھے یہ کارنامہ انجام دینا چاہیے۔ اگر میں نے ایورسٹ کی چوٹی کو سر کر لیا تو یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا جو را نام زندہ جاوید بنا دے گا۔ میں اپنے جہاز پر ماؤنٹ رسٹ کی طرف پرواز کروں گا اور کسی مناسب جگہ پر جہاز رکر تن تنہا چوٹی سر کرنے روانہ ہو جاؤں گا۔ میرا یہ کارنامہ ا کو تحیر کر دے گا۔

چنانچہ اگلے دن سے اس نے ہوائی جہاز اڑانے کی یت حاصل کرنی شروع کر دی۔ وہ ہفتوں کی تربیت ں میں ہی حاصل کر لینا چاہتا تھا اور ایسی ایسی حرکتیں نے لگتا تھا کہ دوسرے زیر تربیت ہوا باز اور رکٹر اسے پاگل سمجھنے لگتے تھے۔ اس سے خوف کھانے تھے۔ ایک روز اس کا جہاز دوران پرواز گرتے گرتے انسٹرکٹر نے زمین پر قدم رکھتے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتے ئے اس سے کہا۔ ''میری توبہ جو میں آئندہ تمہارے ساتھ پرواز کروں۔ تم ضرور کسی نہ کسی دن مرو گے۔''

انسٹرکٹر کی شکایت پر برطانوی فضائیہ نے ولسن کی مشکل اور خطرناک پروازوں پر پابندی لگا دی۔ اس کے والدین اور دوستوں کو کچھ اطمینان ہوا لیکن ولسن نے اخبارات کے ذریعے اعلان کروا دیا کہ وہ تن تنہا ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس طرح اس نے لوگوں کی تحسین و آفرین اور ہمدردیاں حاصل کر لیں۔ انہوں نے اس کی خوب حوصلہ افزائی بھی کی۔ اس کے جوش و جذبے اور ارادے کو بے حد سراہا اور حکومت کو مجبور کیا کہ وہ اسے مشکل اور پُرخطر پروازوں کی اجازت دے دے۔ ایک اخبار نے تو ولسن کے یہ الفاظ جلی حروف میں شائع کر دیئے کہ ''حکومت مجھے نہیں روک سکتی!'' اور ایسا ہی ہوا۔ حکومت نے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کے سفری کاغذات تیار کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا۔ جہاز کے لیے پیٹرول دینے سے انکار کیا۔ طویل سفر کے لیے درکار نقشے بھی اسے مہیا نہ کیے۔ موسم کی رپورٹ تک نہ دی۔ ولسن ان تمام رکاوٹوں کو اپنی بے ساختہ مسکراہٹ اور فولادی عزم سے دور کرتا رہا۔ ایورسٹ کی تسخیر اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکی تھی۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب وہ اپنی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو پھلانگتا ہوا اپنے جہاز میں سوار ہو کر نیپال روانہ ہو گیا۔ وہ خلیج فارس کے راستے پورنیا تک پہنچنا چاہتا تھا جو ریاست بہار کا ایک چھوٹا سا شہر اور لندن سے پانچ ہزار میل کی دوری پر تھا۔ وہاں سے نیپال کی سرحد قریب تھی۔ اس کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے کہ جب وہ وہاں پہنچا تو برطانوی حکام وہاں پہلے سے ہی موجود تھے۔ وہ ولسن کو ہر قیمت پر اس جان جوکھوں کی مہم پر جانے سے روکنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اسے سمجھایا بجھایا۔ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے، مشکلات کھڑی کیں لیکن ولسن نے ہر موقع پر انتہائی ضبط و تحمل سے کام لیا اور مخالفت مول لینے سے بچتا رہا۔ اسے اُمید تھی کہ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا لیکن جب کئی مہینے گزر گئے اور اس کے پاس روپیہ پیسا ختم ہونے لگا تو وہ سخت بددل ہوا۔ بہت سوچ و فکر کے بعد اس نے حکام سے کہا کہ اگر وہ اپنا جہاز فروخت کر دے اور ہندوستان کی سیاحت پر نکل جائے تو ان کے نزدیک یہ کوئی قابلِ اعتراض بات تو نہ ہوگی؟ حکام کو اس پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا چنانچہ اس نے اپنا جہاز فروخت کر دیا اور دارجیلنگ کی

طرف روانہ ہوگیا۔ اس کا ارادہ دارجیلنگ کے راستے ایورسٹ پر چڑھنے کا تھا۔

دارجیلنگ سے کوہ ہمالیہ تک تین سو میل کا دشوار گزار راستہ طے کرنے کے بعد اسے اب اپنے لیے کچھ راہنماؤ کی ضرورت تھی۔ اسے وہاں سے بہت سے شرپا اور خچر مل سکتے تھے لیکن اس اکیلے اور ناتجربہ کار آدمی کے ساتھ جانے کے لیے کوئی شرپا تیار نہ ہوتا تھا، نہ ہی خچر والے حامی بھرتے تھے۔ وہ کافی عرصے تک شرپاؤں کو روپے پیسے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کرتا رہا ساتھ ہی ان سے کوہ پیمائی کے طریقے بھی سیکھتا رہا۔ یہ بات واقعی حیرت ناک ہے کہ مورس ولسن تاریخ کا وہ پہلا شخص تھا جس نے کوہ پیمائی کے مشکل فن میں بغیر کسی راہنمائی کے تربیت حاصل کی اور تین ہفتے کی جانفشل محنت و مشقت کے بعد وہ بالآخر اس قابل ہوگیا کہ وہ پہاڑوں پر چڑھ سکے لیکن اب بھی کوئی شرپا اس کے ساتھ جانے کو تیار نہ ہوا تھا۔ اگر خود اسے ہمالیہ کے راستوں کا علم ہوتا تو وہ تنہا ہی اپنی مہم پر چل دیتا لیکن وہ مجبور تھا۔

ایک دن اسے تین ایسے شرپا ملے جو ہیوج وٹلیج مہم کے ارکان کے ساتھ ایورسٹ کی مہم پر جا چکے تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہی لالچی تھے کیونکہ جونہی ولسن نے انہیں نوٹوں کی گڈیاں دکھائیں وہ فوراً ہی اس کے ساتھ جانے پر تیار ہوگئے۔ ولسن کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اس کے پاس ضرورت کا تمام سامان پہلے سے ہی موجود تھا۔ اب اس نے دیر نہ کی اور فوراً ہی اپنی مہم پر روانہ ہوگیا۔

21 مارچ 1934ء کو پو پھٹنے سے پہلے وہ چاروں افراد دارجیلنگ سے ہمالیہ جانے والی مشرقی سڑک پر نکل آئے۔ شرپاؤں کے سردار کا نام داؤ تھا۔ اس نے تبتی طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ ولسن کے لیے تین سو میل کا یہ سفر لندن سے پورنیا تک کے سفر سے زیادہ کٹھن اور پُرصعوبت تھا۔ ایسی مشکلات اور رکاوٹیں اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ جب وہ برف کے طوفان میں پہاڑی ڈھلوانوں پر ہاتھوں اور پیروں کے بل رینگ رینگ کر آگے بڑھتا تو اس کی ہڈیاں فریاد کرنے لگتیں اور موت منہ پھاڑے سامنے دکھائی دینے لگتی۔ اسے یہ خیال ہر دم ستاتا رہا تھا کہ وہ حکومت کو دھوکا دے کر اس مہم پر روانہ ہوا تھا شاید حکومت اس کی گرفتاری کے لیے اس کے پیچھے پولیس بھیج دے چنانچہ اس خدشے کے پیشِ نظر اس نے تاریک اور سرد راتوں میں بھی سفر جاری رکھنا شروع کر دیا۔ اس کا یہ عزم و حوصلہ دیکھ کر شرپا انتہائی حیرت زدہ اور کچھ خوف زدہ بھی ہوتے تھے اور اس سے بار بار سنبھل سنبھل کر آہستہ پیش قدمی کی درخواست کرتے تھے جس پر وہ بھنّا کر کہتا۔

''کیوں؟ کس لیے؟''

ایک دن ان کا سفر اس طرح تیز رفتاری سے جاری تھا کہ برفانی طوفان کی آمد کے آثار دکھائی دینے لگے۔ شرپا داؤ نے ولسن سے پیش قدمی کی رفتار آہستہ کرنے کو کہا۔

''صاحب۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ برفانی طوفان بھی برپا ہونے کو ہے اس لیے احتیاط سے کام لیں۔''

''نہیں..... میں ایسا نہیں کر سکتا۔ سردی اور طوفان کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر ہمیں اس سے بھی زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ میں آہستہ چل کر اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ میں مون سون شروع ہونے سے پہلے پہلے اپنا مقصد حاصل کر لینا چاہتا ہوں۔''

پچیس دن بعد یہ مختصر سا قافلہ رونگ یک کی خانقاہ تک پہنچ گیا۔ ہیوج مہم وہاں پینتیس دنوں میں پہنچی تھی۔ بدھ مت کی یہ مشہور خانقاہ سطحِ سمندر سے سولہ ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور یہاں بدھ بھکشو رہتے ہیں۔ ولسن اور اس کے ہمراہیوں نے وہاں تین دن قیام کیا پھر بارہ اپریل کو ولسن تن تنہا اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ وقت رخصت خانقاہ کے بڑے لامانے جس کی بھنویں پلکیں سب سفید تھیں اپنی تبتی زبان میں اسے وہی دعا دی جو وہ ایورسٹ فتح کرنے کے لیے آنے والے ہر مہم جو کو دیا کرتا تھا۔

''اوم مانی پدم ہم''

بارہ اپریل کو جب اس کا سفر شروع ہوا تو ہوا پُرسکون تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ وہ خانقاہ کے باہر کھڑا تھوڑی دیر آسمان کو دیکھتا رہا۔ دور دھند میں ملفوف ایورسٹ کی چوٹی گہرے سرمئی رنگ کی دکھائی دے رہی تھی۔ 1924ء کو ایک کوہ پیما مالدی اس چوٹی کے قریب پہنچتے پہنچتے موت کا شکار ہوگیا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے جو الفاظ کہے تھے وہ ولسن کے ذہن میں تازہ تھے۔

''ہمیشہ یاد رکھو کہ پہاڑوں کی بلندیاں نہایت بے رحم اور ظالم ہوا کرتی ہیں، اتنی بے رحم اور ظالم کہ ایک حساس اور ذی فہم آدمی ان کے تصور سے ہی کانپ اٹھتا ہے۔''

شرپاؤں نے پینتالیس پاؤنڈ وزنی سامان اس کی

پشت پر باندھا اور اسے وہاں سے رخصت کیا۔ وقت رخصت داؤ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کہا۔ ”میرے پاس ایک آئینہ ہے چوٹی پر پہنچ کر میں اس کی مدد سے تمھیں اشارہ کروں گا۔“

اس کی اس بات پر تینوں شرپا مسکرا دیے۔ ولسن ان کی مسکراہٹوں کا مفہوم سمجھ گیا۔ شاید وہ اس کے اس طرح کہنے کو اس کی خوش فہمی سے تعبیر کر رہے تھے، پھر داؤ نے کہا۔ ”جوتوں کی کیلیں کوہ پیمائی کے لیے ضروری ہوتی ہیں اور یہ آپ کے پاس نہیں۔“

”میں جانتا ہوں لیکن میں کوئی تجربہ کار کوہ پیما نہیں ہوں۔ میں دوسرے کوہ پیماؤں کی طرح صرف ایورسٹ تسخیر کرنے کے لیے نہیں نکلا بلکہ کچھ اور بھی کرنا چاہتا ہوں وہ عزم و ارادے سے ہی ہوگا۔ جوتوں کی کیلوں سے نہیں۔“

”چومولنگھا ہمیشہ انسانوں کو ہلاک کرنا جانتی ہے۔“ داؤ نے تبتی زبان میں ایورسٹ کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس سے مقابلے کے لیے کوئی شخص سامنے آئے تو وہ اسے مار ڈالتی ہے۔“

”کچھ بھی ہو چومولنگھا مجھے شکست نہیں دے سکتی۔“ ولسن اک عزم صمیم سے بولا۔

شرپاؤں سے رخصت ہو کر وہ اکیلا اپنی مہم پر روانہ ہوگیا۔ اس کے پاس کوہ پیمائی کا پورا سامان نہ تھا لیکن اعتماد اور حوصلے کی دولت اس کے ساتھ تھی اور اس کے سہارے وہ اپنی مہم کو کامیاب بنانا چاہتا تھا۔ وہ جس راستے پر چلا جا رہا تھا اس کی نشاندہی ہیوج ولیٹج مہم کے ارکان پہلے سے ہی کر چکے تھے۔ موسم پُرسکون تھا اور برف باری ابھی شروع نہیں ہوئی تھی وہ آسانی سے پہلے کیمپ تک پہنچ گیا۔ اس نے وہاں گھوم پھر کر اس جگہ کا جائزہ لیا اور ایک مناسب جگہ پر اپنا چھوٹا سا خیمہ نصب کر دیا۔ اپنی اس پہلی کامیابی پر وہ بے حد خوش تھا اور منزل تک پہنچنے کے لیے اسے نیک شگون سمجھ رہا تھا۔

17 اپریل کا دن اس کے لیے خاصا تکلیف دہ ثابت ہوا مگر وہ حوصلہ ہارے بغیر مسلسل آگے بڑھتا رہا لیکن جب وہ مغربی رونگ بک گلیشیئر پر پہنچا، اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ یہاں قدم قدم پر برفانی ڈھلوانیں اور کھائیاں پھیلی ہوئی تھیں پھر ایک دم ہی برف کا طوفان آگیا اور اس کی نظروں سے راستہ غائب ہوگیا۔ تیز ہوا سے برستے برف کے گالے اسے تیروں کی طرح لگتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ دیر تک گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہا پھر جب برفانی

دوسرا فائر
آخری صفحات پر **نشور ھادی** کے قلم سے محبت کی زنجیروں میں قید ایک خوب صورت رشتے کی عبرت اثر داستان

نفس گزیدہ
گمشدہ تاریخی گوشوں پر ایک گہری نظر...... ابتدائی صفحات پر **زویا اعجاز** کے قلم کا جادو

شه زوز
عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال **اسما قادری** کے قلم کا کمال

ساشا
کبھی پر خطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان...... **عمر عبدالله** کے قلم کا شاہکار

اس کے علاوہ
تنویر ریاض، کاوش صدیقی، منظر امام، اعتزاز سلیم وصلی، ظفر اقبال ظفر، غوثیہ شبیر، شاکر لطیف، شاہ زین رضوان اور صبا مغل کی خوب صورت تحریریں

طوفان کا زور ٹوٹا تو وہ آہستہ آہستہ راستہ تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

مڑتی بل کھاتی اور انتہائی خطرناک بلندیوں پر چڑھتے ہوئے جب وہ اپنے دائیں بائیں نظر دوڑاتا تو اس کا سر چکرانے لگتا۔ تھوڑی دیر میں اس کا سانس پھولنے اور اس پر نقاہت طاری ہونے لگی۔ پشت پر بندھا ہوا معمولی سا وزن بھی اب اسے نہایت بھاری اور ناقابلِ برداشت معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کے قدم من من کے ہو رہے تھے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ وہیں برف پر لیٹ جائے اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلے۔ اس جگہ رک کر اس نے پشت پر بندھا ہوا سامان کھولا۔ اس کا جائزہ لیا اور خوراک کے ڈبوں اور رسیوں کے علاوہ تمام فالتو چیزیں پھینک دیں۔ اسے اُمید تھی کہ وہ جلد ہی دوسرے کیمپ تک پہنچ جائے گا لیکن آہستہ آہستہ شام کے اندھیرے گہرے ہونے لگے اور کائنات پر تاریکی کی گہری چادر تن گئی۔ دوسرا کیمپ ہنوز بہت دور تھا۔ اس نے ایک کھوہ تلاش کی اور اس کے اندر داخل ہوکر اپنے تھیلے نما بستر میں گھس کر سو گیا۔

18 اپریل کو جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو اس کے جسم کا جوڑ جوڑ شدید درد کر رہا تھا۔ چند قدم چل کر اس کا سانس پھول گیا۔ پاؤں سن ہونے لگے۔ وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ اسے اپنی قوت و توانائی زائل ہوتی معلوم ہو رہی تھی اور قوت ارادی دم توڑتی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتا شاید یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ اپنی ان کیفیات کی وجہ وہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔ بہت زیادہ بلندی پر پہنچنے کے سبب اس کے پھیپھڑے آکسیجن کی خاطر خواہ مقدار حاصل نہ کر پا رہے تھے۔ اسے انجانے خدشات نے ستانا شروع کر دیا۔ فضا میں برفانی کھڈوں اور کھائیوں سے نکلنے والی عجیب سی بو رچی ہوئی تھی۔ اس نے ایورسٹ کی چوٹی پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور نئے عزم و حوصلے کے ساتھ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ سورج چند لمحوں کے لیے دھند کی چادر چیر کر نمودار ہوا پھر غائب ہوگیا۔ اس روز شام تک اسے کسی برفانی طوفان کا سامنا نہ کرنا پڑا اور وہ گرتا پڑتا ہانپتا انیس ہزار آٹھ سو فٹ کی بلندی پر واقع کیمپ نمبر دو تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

19 اپریل کو جب وہ اس دوسرے کیمپ سے آگے بڑھا تو اس وقت تک حالات نہایت ابتر ہو چکے تھے۔ جونہی وہ آگے بڑھنے کے لیے برف پر قدم رکھتا پھسل کر کئی فٹ پیچھے تک جا گرتا۔ ایک مرتبہ تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ایک کھڈ میں گرتے گرتے بچا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی نادیدہ قوت اسے بار بار پیچھے کی طرف دھکیل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کئی خراشیں آگئی تھیں اور دایاں بازو شدید درد کرنے لگا تھا۔ اس نے ایک جگہ رک کر صورتِ حال کا جائزہ لیا اور ارد گرد کی برف چھو کر دیکھی، اسے معلوم ہوگیا کہ یہاں سے ایسا خطہ شروع ہو جاتا ہے جہاں برف پتھر کی طرح سخت ہوتی تھی۔ اس کے بار بار پھسل جانے کی یہی وجہ تھی۔ سانسیں اعتدال پر آنے کے بعد وہ اٹھا اور تیزی سے محتاط قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایسی جگہ جا نکلا جہاں ہر طرف برف کی چٹانیں دیواروں کی صورت میں کھڑی تھیں۔ موسم لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتا جا رہا تھا۔ نادیدہ بلندیوں سے برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پتھروں کی طرح برس رہے تھے۔ ہر سو ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے اور برف گرنے سے نچلی وادیوں میں شور محشر سا برپا تھا۔

72 گھنٹے تک برف کا یہ طوفان پورے غیظ و غضب کے ساتھ برپا رہا اور ولسن خیمے میں بیٹھا اپنی قسمت کی نارسائی پر جلتا کڑھتا رہا۔ برفانی ہوائیں مسلسل چیخ چنگھاڑ رہی تھیں اور برف کے تودے ٹوٹ ٹوٹ کر زبردست دھماکوں کے ساتھ نیچے نامعلوم گہرائیوں میں گر رہے تھے۔ اس شور محشر میں وہ ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکا۔ یخ بستہ سردی اس کی ہڈیوں میں اتر گئی تھی۔ اس نے بمشکل تمام اپنے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ کھولے اور انہیں باہم رگڑنے لگا تاکہ کچھ تو گرمی پہنچے لیکن اس کی یہ کوشش بے کار ثابت ہوئی۔ رات ہوتے ہوتے جب طوفان کا زور ٹوٹا تو اس کے حواس بجا ہوئے وہ دعا کرنے لگا کہ صبح تک موسم بالکل ٹھیک ہو جائے۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو برف کا طوفان اور ہواؤں کے جھکڑ پھر چلنا شروع ہو چکے تھے۔ وہ شدید غصے میں آگیا اور فضا میں ہاتھ بلند کر کے چلایا۔

''اے واہیات طوفان! تو رک کیوں نہیں جاتا!''

اس کی مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ بس یہ سفر اب اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس دوپہر اس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

''اس طوفان نے میری کمر و ہمت توڑ دی ہے۔ مجھے آگے بڑھنے کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔ میری آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا ہے۔ گلا سوکھ گیا ہے۔ سخت کوشش کے باوجود میں اس موسم میں آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں شاید اگلے کیمپ تک نہ پہنچ پاؤں۔ خوراک کے اضافی

خوب صورت و مسحور کن تحریروں سے سجا نومبر 2020ء کا دلہن نمبر......

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

افشاں آفریدی، نایاب جیلانی اور **سعدیہ رئیس** کی کہانیوں کی چونکا دینے والی نئی اقساط

دُردانہ نوشین خان کی دردانگیز تحریر...... **کا ہے کو بیاہی بدیس**

شبینہ گُل کی دلوں کو گدگداتی دلکش تحریر... مکمل ناول کی صورت **لاک ڈاؤن لڈو**

فرحین اظفر کے ماہرانہ قلم سے نکلی ایک اور عورت کی روداد

روحیلہ خان کا دل گداز ناولٹ **بوجھ**

شمع ہدایت میں پڑھیے

اختر شجاعت کا ایمان افروز مقالہ

نیّت...... مقبولِ الٰہی

نامور ڈراما نگار

فصیح باری خان

انداز نو میں **بنتِ زیب** کے روبرو

اس کے علاوہ

نئی اور پرانی رائٹرز کی کہانیوں کا امتزاج جس میں **فرحت جبین، فصیحہ آصف خان، حرا احمد، نظیر فاطمہ، قرۃ العین سکندر، مریم شہزاد، عذرا فردوس و عائشہ تنویر** کی متاثر کن تحریریں شامل ہیں۔

آپ جیسے باذوق قارئین کے مطالعے کے لیے شعروشاعری، خوش ذائقہ، حسن نکھاریے، معلومات سے پُر تراشے اور گوشۂ ظرافت جیسے خوب صورت سلسلے......

ڈبے اس نے راستے میں پھینک دیئے تھے۔ بس چند ایک ڈبے ساتھ تھے جو ختم ہونے والے تھے۔ ان ڈبوں کا ذکر کر کے وہ آگے لکھتا ہے۔ کل تک یہی حال رہا تو مجھے واپس جانا پڑے گا۔ موسم کی خرابی میری بدقسمتی بن چکی ہے۔

21 اپریل کو طوفان کی شدت میں کچھ کمی واقع ہوئی لیکن برف باری بدستور جاری تھی۔ پیش قدمی کی راہیں مسدود تھیں۔ احساس شکست نے ولسن کے جوش و جذبے کو ختم کر دیا تھا۔ اس نے واپسی کا ارادہ کیا۔ برفانی ڈھلوانوں سے اترنا بھی انتہائی کٹھن اور خطرناک کام تھا۔ واپسی کے اس سفر سے اسے انتہائی دکھ محسوس ہو رہا تھا اس کے قدم بار بار رک جاتے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ واپسی کے ہر قدم کے ساتھ ہی طوفان کا زور بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ کہیں قدرت نے اسے واپس بھیجنے کے لیے تو نہیں یہ کھیل کھیلا۔ اس سوچ نے اسے واپسی پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنے جسم کو گھسیٹتے ہوئے نیچے اترنے لگا۔

خانقاہ تک پہنچتے پہنچتے اس کے ہاتھ پاؤں سوج چکے تھے اور بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا چند دن آرام کرنے کے بعد ایک بار پھر قسمت آزمائی کی کوشش کروں گا۔ مشن کے کامیابی کی ایک موہوم سی اُمید اب بھی اس کے دل میں موجود تھی۔

تینوں شرپا نے اسے سہارا دے کر ایک کمرے تک پہنچایا۔ اس کے ہاتھ گرم پانی سے دھوئے اور اسے بستر پر لٹا دیا۔ اسے کتنے دنوں بعد ایک گرم اور آرام دہ بستر نصیب ہوا تھا وہ فوراً ہی گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ وہ مسلسل چودہ گھنٹے تک سوتا رہا۔ جب وہ بیدار ہوا تو اس کی طبیعت کافی حد تک بہتر ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

''داؤ میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میرا راستہ برفانی طوفانی اور تیز و تند ہواؤں نے روک لیا تھا۔ میرے پاس اشیائے خورونوش ختم ہو رہی تھیں۔ میرے پاس جلانے کے لیے بھی کچھ نہ رہا تھا اس لیے میرے لیے سوائے لوٹ آنے کے کوئی چارہ نہ رہا۔''

''اچھا!'' داؤ نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ کوہ پیماؤں کو ایسے صبر آزما حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ''چوملونگھا تک پہنچنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔''

''داؤ اگر تم میرا ساتھ دو تو یقیناً تنہا چوٹی پر پہنچ جاؤں گا۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟''

تجربہ کار شرپا نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ یہ دھن کا پکا شخص اپنی جان ہلاکت میں ڈالے بغیر نہ مانے گا۔ اسے روکنا فضول تھا۔ اس نے اسے دوبارہ بستر پر لٹا دیا اور بولا۔ ''صاحب تم ایک بے حد عالی حوصلہ اور بہادر آدمی ہو۔ دوبارہ کوشش کرو۔ ہم کیمپ نمبر دو تک تمہارے ساتھ جا سکتے ہیں لیکن اس سے آگے نہیں جا سکتے۔''

یہ سنتے ہی ولسن کے رگ و پے میں گویا بجلی سی دوڑ گئی۔ وفورِ جوش سے وہ ایک دم بستر سے اٹھ گیا مگر لڑکھڑا کر گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

''داؤ..... تم کیمپ نمبر دو تک ضرور میرے ساتھ چلنا..... میں اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤں گا..... ہاں ضرور..... میں اپنے وطن ناکام واپس نہیں جانا چاہتا..... میں..... ایورسٹ.....''

12 مئی 1934ء کو وہ پھر نئے عزم و حوصلے کے ساتھ شیر پاؤں کے ساتھ ایورسٹ کی چوٹی کی طرف روانہ ہوا۔ خلاف معمول اس دن موسم خوشگوار تھا اور انہیں کیمپ نمبر دو تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ وہاں تک پہنچنے کے بعد اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ قدرت اس کی مدد کر رہی تھی۔ وہ بار بار چوٹی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے بعض اوقات چوٹی اپنے بے حد قریب دکھائی دیتی اور کبھی کبھی اس کے کانوں میں ایسی آوازیں آتیں جن کا مطلب اس کے نزدیک یہ ہوتا تھا کہ ایورسٹ کی چوٹی اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ اس نے داؤ سے کہا۔

''میرے دوست..... صرف ایک دن کی چڑھائی ہے پھر میں چوٹی پر جھنڈا گاڑ دوں گا اور اس کامیابی پر تمہیں دولت سے مالا مال کر دوں گا۔''

شرپا کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔ وہ بولا۔

''چوملونگھا پر اعتبار کرنا ٹھیک نہیں صاحب۔ وہ تو یوں ہی صدیوں سے ہر ایک کو بے وقوف بناتی چلی آ رہی ہے۔''

''خیر..... تم دیکھ لینا۔ اگر موسم نے ساتھ دیا تو وہ مجھے بے وقوف نہ بنا سکے گی۔'' ولسن نے کہا۔

سورج غروب ہونے کے بعد وہ اگلے روز کا پروگرام بنا کر سو گیا لیکن آدھی رات کو نہایت بھیانک اور لرزہ خیز شور سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ برفانی طوفان ان پر حملہ آور ہو چکا

تھا۔ کئی کئی من وزنی برف کے تودے روئی کے گالوں کی طرح اڑتے ہوئے اِدھر اُدھر گر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ولسن کے اوسان خطا ہوگئے لیکن شرپا بڑے آرام وسکون سے اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے اٹ گیا۔ ولسن کی ذہنی حالت ابتر ہوتی جارہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ برف کے ان تودوں کے ساتھ لڑھکتا ہوا کہیں دور چلا جائے۔ بار بار کی ناکامی اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ اس کا خیال تھا طوفان چند گھنٹوں میں ختم ہوجائے گا لیکن وہ ایک ہفتہ تک پورے زور وشور سے جاری رہا۔ 21 مئی کو اس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

''چھ روز ہوچکے ہیں۔ طوفان پہلے جیسے جوش وخروش سے جاری ہے۔ اس کی شدت میں ذرا بھی کمی واقع نہیں ہوئی اور مجھے یوں محسوس ہورہا ہے جیسے میں کبھی ایورسٹ کو فتح نہ کرپاؤں گا اور ضرور کسی تودے کی زد میں آکر ہلاک ہوجاؤں گا۔''

22 مئی کی دوپہر کو بالآخر طوفان تھم گیا مگر آسمان پر ہنوز گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ولسن نے اپنا سامان کمر پر لادا اور سفر کے لیے تیار ہوگیا۔ شیر پا تھوڑی دور تک راستے کی نشاندہی کے لیے اس کے ساتھ گئے پھر اسے الوداع کہہ کر واپس ہوئے۔

اس سفر میں ولسن کو ایسی جان لیوا اور ناقابل عبور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا کہ اسے افسوس ہونے لگا کہ وہ خوا مخواہ اس مہم پر آنکلا تھا۔ دنیا میں بہت سے ایسے کام تھے جنہیں انجام دے کر وہ اپنے لیے عزت اور شہرت کما سکتا تھا۔ ایورسٹ کی چوٹی تسخیر کرنا تو کوئی ایسا ضروری نہ تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا رہا۔ اس سے پہلے وہاں پہنچنے والے مہم جوؤں کی نشاندہی اس کی نظروں سے گزرتی رہیں۔ ان برف کے تودوں میں جانے کتنے بہادر اور بلند حوصلہ مہم جوؤں کی لاشیں دبی ہوئی تھیں جو ایورسٹ فتح کرنے کا عزم لے کر وہاں پہنچے تھے پھر یہیں گم ہوگئے۔ اس سوچ نے اسے کپکپا دیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بڑے عزم وحوصلے سے اپنے آپ سے کہا۔ ''میں ہر قیمت پر چوٹی سر کرکے رہوں گا۔ میرے لیے اب واپسی کی کوئی راہ نہیں!''

22 ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر اسے ایک دم ہی احساس ہوا کہ اس کا جسم بے حد ہلکا پھلکا ہوچکا تھا۔ یہ ایک دوسری ہی دنیا تھی۔ پُراسرار اور ویران سی دنیا۔ جہاں گنتی کے چند ہی افراد قدم رکھنے کی جرأت کرسکتے تھے۔ چوٹی اب بھی سات ہزار فٹ دور تھی اور صاف نظر آرہی تھی۔ اسے سانس لینے کے لیے پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ دمے کے مریض کی طرح ہانپنے لگتا اور سانس گھٹنے لگتا۔ اب اس کی منزل کا سب سے دشوار گزار مشکل اور آخری مرحلہ شروع ہوگیا تھا۔ اس کے راستے میں بالکل عمودی اور نوّے درجے کا زاویہ بناتی ہوئی چٹانیں ہر جگہ کھڑی تھیں۔ وہ کئی بار ان پر چڑھنے کی کوشش میں پھسل کر نیچے گرا لیکن ہر بار نئے حوصلے اور ہمت سے اٹھ کر چڑھنے کی کوشش شروع کردیتا۔ کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد وہ چند ہی فٹ آگے بڑھ سکا۔ اس نے مختلف چٹانوں کو آزمایا مگر سب ایک ہی جیسی تھیں اور اپنی خاموش زبانوں سے اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ ''پاگل کوہ پیما..... ہمیں تسخیر کرنے آیا ہے۔''

یہ جملہ بار بار اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں تھا؟ کیا چٹانیں بھی بولتی ہیں؟ وہ ان کی آواز سن رہا تھا۔ وہ اس پر ہنس رہی تھیں۔ اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ وہ دور دور تک مسلسل ان چٹانوں سے سر ٹکراتا رہا مگر ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ تیسری رات درجہ حرارت صفر سے بھی پچاس درجے نیچے چلا گیا۔ اس کا جسم برف کی طرح جم گیا۔ ہاتھوں کی انگلیاں اکڑ گئیں۔ وہ حرکت کرنے سے معذور ہوگیا لیکن خوش قسمتی سے اگلے روز تھوڑی دیر کے لیے سورج نکل آیا۔ اس کے ٹھٹھرے ہوئے جسم میں جان آئی۔ اس نے جلدی سے آگ جلائی اور اپنے ہاتھوں پیروں کو گرمی پہنچانے اور ان کا ٹھٹھراؤ دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس روز راستے کی تلاش میں اس کے سامنے ایک نئی برف کی چٹان آگئی۔ یہ چٹان اتنی بلند تھی کہ وہ مبہوت سا ہوکر رہ گیا۔ اسے اللہ تعالیٰ کی صفت وکبریائی کا احساس ہونے لگا۔ وہ دیر تک گھوم پھر کر اس چٹان کا جائزہ لیتا رہا مگر اسے اس پر چڑھنے کی کوئی راہ نہ دکھائی دی۔ اسے اپنی کلہاڑی کا خیال آیا۔ اس نے اسے اپنے سامان سے نکالا اور برف کھود کھود کر پیر رکھنے کی جگہ بناتا ہوا چٹان پر چڑھنے لگا۔ سات گھنٹے تک وہ چٹان پر چڑھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ وہ درد، سردی اور تکلیف کے احساس سے عاری ہوچکا تھا لیکن تھکاوٹ نے اسے ایسا ادھ مرا کردیا تھا کہ اسے جان جسم سے نکلتی محسوس ہورہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے ہچکیاں سی آنے لگیں اور کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ

غش کھا کر گر پڑا۔ کافی دیر بعد اسے ہوش آیا تو وہ حرکت کرنے سے معذور تھا۔ اس کا خیمہ پاس ہی پڑا تھا مگر اس میں اسے نصب کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ رات بھر برف گرتی رہی اور وہ کسی بے جان لاش کی طرح زمین پر پڑا رہا۔

اگلی صبح اسے ہوش آگیا اس وقت سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور دور ایورسٹ کی چوٹی دھوپ میں جگمگاتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ منظر ایسا مسحور کن اور دلکش تھا کہ وہ اپنی تمام تکلیفیں بھول گیا۔ مسحور سا چوٹی کو دیکھنے لگا پھر اسے اپنے دائیں پھیپھڑے میں درد کا احساس ہوا۔ اس نے بڑی مشکل سے خیمہ لگایا تاکہ یخ بستہ ہواؤں سے کچھ بچاؤ ہو سکے پھر اس نے آگ جلائی اور اپنے جسم کو گرم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے خشک گوشت کے چند ٹکڑے حلق سے اتارے۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ اپنی صورت دیکھتے ہی اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس کا چہرہ زرد اور رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ کتنی ہی دیر تک روتا رہا پھر اس کے کانوں میں کوئی غیبی آواز یہ کہتی سنائی دینے لگی۔

''چوٹی کی طرف جاؤ ولسن..... وہ تمہیں بلا رہی ہے..... اٹھو آگے بڑھو!''

وہ ہانپتے کانپتے خیمے سے نکل کر چٹان کی طرف بڑھ گیا اور اس پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا پھر نڈھال ہو کر گر پڑا اور حسرت بھری نظروں سے ایورسٹ کی چوٹی کو دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اسے شرپا داؤ کے الفاظ یاد آگئے۔

''چومولنگھا پر اعتبار کرنا ٹھیک نہیں صاحب۔ وہ تو صدیوں سے ہر ایک کو بے وقوف بنا رہی ہے۔''

''نہیں! ہرگز نہیں!'' وہ پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔ ''مجھے کوئی بے وقوف نہیں بنا سکتا۔'' جوش و جذبے کی ایک نئی لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اس نے کلہاڑی اٹھائی اور لڑکھڑاتا ہوا چٹان کی طرف بڑھ گیا۔ ''میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دوں گا! میں تجھے تباہ کر دوں گا!''

وہ جنونی انداز میں چٹان توڑنے میں مصروف ہو گیا لیکن جلد ہی اس کے بازو شل ہو گئے اور حوصلہ جواب دے گیا۔ اگلے روز وہ پھر چٹان کو توڑنے کی کوشش کرنے لگا اور برف توڑ کر اس میں پاؤں رکھنے کی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا مگر اب اس میں مزید پیش قدمی کی ہمت نہ تھی۔ وہ شدید تھکاوٹ سے چور بے حد کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار تاریکی کی چادر تن رہی تھی خیمے میں واپس آگیا اور بے جان سا وہاں لیٹ گیا۔ چند گھنٹے تک وہ مسلسل آرام کرتا رہا۔ جب اس کی قوت و توانائی کچھ بحال ہوئی تو وہ پھر کلہاڑی سنبھالے چٹان کی طرف بڑھ گیا۔ دس بارہ فٹ کی بلندی تک وہ بہ آسانی پہنچ گیا لیکن پھر اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ توازن کھو دینے سے منہ کے بل نیچے جا گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ رات کے کسی وقت اس کی روح اس کے جسم سے جدا ہو گئی۔ اس کی منزل اب بھی سات ہزار فٹ کی دوری پر متکبرانہ سر اٹھائے دھند میں ملفوف کھڑی تھی۔

ایک سال بعد معروف کوہ پیما ایرک شپٹن کی سربراہی میں جب کوہ پیماؤں کی ایک جماعت اس چٹان کے قریب پہنچی تو انہوں نے وہاں ولسن کی لاش برف میں دبی ہوئی پائی۔ اس کے ایک ہاتھ نے اس وقت بھی مضبوطی سے کلہاڑی پکڑ رکھی تھی۔ اس کے چمڑے کے تھیلے میں ان لوگوں کو تلاشی کرنے کے بعد اس کی ڈائری مل گئی جس میں اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے لکھا تھا۔

''برف باری اور طوفان کی شدت میرے عزم و استقلال کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ اس وقت رات بہت تاریک ہے۔ برفانی طوفان شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ میں تاریکی میں بیٹھا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ میری حالت اس وقت بہت خستہ ہو رہی ہے۔ مجھ میں ہلنے جلنے کی ہمت نہیں۔ وطن سے ہزاروں میل دور اب موت ہی میری ہمسفر ہے لیکن مجھے اپنی موت کا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ میں اس پر بہت خوش ہوں کہ بائیس ہزار فٹ کی بلندی پر ایک مقصد کی خاطر جان دے رہا ہوں۔ دکھوں اور آلام سے بھری دنیا سے بہت دور..... ہو سکتا ہے کہ میں کل سورج کی روشنی نہ دیکھ سکوں لیکن دنیا کے لوگوں کے لیے میں یہ پیغام چھوڑے جا رہا ہوں کہ وہ اپنے لیے کسی بہتر نصب العین کا انتخاب کریں۔ زندگی کی معراج یہی ہے.....''

یہ تحریر پڑھتے پڑھتے ایرک شپٹن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس نے کہا۔ ''بہادر ولسن! تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔ تمہارا یہ پیغام ضرور لوگوں تک پہنچے گا۔''

مورسن ولسن اس وقت ایورسٹ سے سات ہزار فٹ دور ہمالیہ کی کسی برفانی چٹان کے سائے میں دفن ہے۔ جس روز سر ایڈمنڈ ہلیری اور شرپا تن سنگھ نے ایورسٹ کی چوٹی سر ہوگی تو اس کی بے چین روح کو واقعی ابدی سکون مل گیا ہوگا۔

-+

باغی

بیبرک کارمل جمالی

وہ بیس سال تک محل سے باہر نکل نہیں پائی، اس نے کسی نوجوان کا چہرہ تک نہیں دیکھا تھا کیونکہ باپ نے اسے سورج کی کرنوں سے بھی مخفی رکھا تھا۔ وہ اتفاقاً محل سے باہر نکل آئی اور اسے ایک جواں مرد نظر آگیا۔

تاریخ کے اوراق سے [illegible] ایک باغی کا [illegible]

وہ ایک منفرد محل تھا جو پہاڑوں کو چیر کر بنایا گیا تھا۔ اتنا وسیع و عریض کہ انسانی تصور میں نہ سمائے۔ اس محل کے اندر سیکڑوں کمرے موجود تھے۔ ان کمروں کے مکین شاید ہی کبھی باہر نکلتے ہوں بچپن سے لڑکپن، اور لڑکپن سے عہد جوانی تک اس نے صرف عورتوں اور خواجہ سراؤں کو دیکھا تھا، کبھی کبھار کوئی مرد نظر آتا تو وہ بھی بڑھاپے کی آخری حد پر کھڑا۔ پہلی بار اس نے کسی نوجوان کو دیکھا تھا۔ وہ بھی بیس سال کی عمر میں پہلی بار اس عظیم الشان محل سے باہر نکلی تھی۔ محل سے نکلتے ہی

اس کی نظریں ایک نوجوان پر جم گئیں۔ نوجوان انتہائی حسین و جمیل تھا۔ اسے شاید اسی لیے دیکھتے ہی وہ اپنا دل ہار بیٹھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے وجیہہ نوجوان دیکھا تھا۔ اسے لگا کہ یہ وجاہت کا دیوتا ہے۔ اس نے نوجوان پر نظریں جمارکھی تھیں مگر نوجوان کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ اس لڑکی سے بے خبر ٹہل رہا تھا۔ سر پر پگڑی بغل میں تیز دھاری تلوار اک شان بے نیازی سے وہ چہل قدمی کررہا تھا۔

محل سے باہر آنے والی دوشیزہ حاکم قندھار سردار زنون کی اکلوتی بیٹی تھی۔ زنون اسے دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے بیٹی کی آنا کو پابند کردیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کو محل تک محدود رکھے گی۔ یہی ہوا اس کی بیٹی پیدائش سے بیس سال تک محل کے اندر رہی اور جب اتفاقاً باہر نکلی تو اس کی نظر نوجوان سے ٹکرا گئی۔

☆☆☆

سردار زنون انتہائی سخت مزاج تھا مگر بہادر سردار تھا۔ وہ حاکم قندھار تھا مگر ترکوں پر بھی حکمرانی کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی فوج تھی۔ سولہویں صدی میں اس کے فوج کی تعداد پچاس ہزار سے زائد تھی۔ اس کے پاس ہر قسم کی آسائش موجود تھی پھر بھی اسے اولاد نرینہ کا غم تھا۔ قدرت نے اسے صرف ایک بیٹی عطا کی تھی جس کا نام اس نے گرانا زرکھا تھا۔ وہ اسم بہ اسمی تھی۔ اتنی بھولی، اتنی معصوم ایسی پیاری تھی کہ جو بھی دیکھتا اس کے دل میں شفقت و محبت کے سوتے پھوٹ پڑتے، خود زنون بھی بیٹی کو بہت چاہتا تھا۔

سردار زنون نے پانچ شادیاں کی تھیں لیکن اولاد ایک ہی بیوی سے ہوئی تھی... اور وہ بھی بیٹی۔ اس دور میں بیٹوں کی اہمیت تھی، خاص کر تلوار چلانے والے بیٹے کی، اسی وجہ سے بیٹوں کی ولادت پر خوب خوشیاں منائی جاتیں لیکن سردار زنون نے بیٹی کی پیدائش پر زکوٰۃ، خیرات امداد کی طرح ڈالی۔ وہ افغانستان کا پہلا سردار تھا جس نے بیٹی کی پیدائش پہ عوام کے لیے خزانوں کے دروازے کھول دیے تھے۔

سردار زنون بیٹی سے بہت شفقت رکھتا تھا اور اس محبت میں وہ حصے دار نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بیٹی کو تمام دنیا سے چھپا کر رکھنے کا اہتمام کیا تھا۔ سب سے بڑی پہاڑی کا سینہ چیر کر اس نے ایک وسیع و عریض محل کی تعمیر شروع کرادی تھی تاکہ کوئی مرد اسے دیکھ نہ سکے۔ ابتداء میں یہ ناممکن کام لگا مگر سردار نے خزانے کا منہ کھول دیا تھا۔ مزدور دن رات کام کرنے لگے تھے۔

کئی سال بعد محل تعمیر ہوا۔ محل بھی ایسا کہ سینکڑوں کمرے، پچاسوں غلام گردشیں کہ آنے والا باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتا رہ جائے۔ ایسا عظیم الشان محل صرف بیٹی کی محبت میں بنایا کہ اس پر سورج کی کرنوں کی بھی نظر نہ پڑے۔ گرانا ز بڑی ہوتی رہی۔ سردار نے جان لیا تھا کہ بڑھتے قد کے ساتھ اس کی عقل بھی تیز ہورہی ہے یہی وجہ تھی کہ سردار زنون کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے مشورہ ضرور لیتا۔ گرانا ز اس کی نظر میں نہایت عقل مند لڑکی تھی۔ حکومتی امور میں بھی وہ اپنی بیٹی سے مشورہ لینا لازم سمجھتا تھا۔ گرانا ز کے مشورے کے بغیر وہ کوئی بھی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔

گرانا ز کے حسن کا دیدار صرف محل کی کنیزیں ہی کرتی رہی تھیں۔ جب وہ دوپٹا پہن کر کمرے سے برآمد ہوتی تو عورتیں کہتیں۔ ''گرانا ز جنت کی حور بن کر نکلی ہے۔ کسی روز ایک شہزادہ آئے گا اور یہ حسن ہم سے چھین لے جائے گا۔

گرانا ز ہنس دیتی۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ وہ اس محل کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے۔ رنگ دودھ میں سرخ گلاب جیسا آبرو کمان جیسی۔ گول گول آنکھوں کی سیاہی اتنی گہری کہ ہر کنیز کو تیر بن کر چبھتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ناک میں کوکا پہنی تو تمام لڑکیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ گرانا ز کی تعریف صرف عورتیں ہی کرتی تھی۔ مرد گرانا ز کے دیدار سے بھی دور تھے۔ سردار زنون نے گرانا ز پر بیس سال کی تک اتنی پابندیاں لگا رکھی تھیں کہ وہ محل سے چار قدم بھی باہر نہ رکھ سکی تھی۔ پہلی بار جب باہر نکلی تو بلوچ شہزادے بیبرگ کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔

بیبرگ، چاکر رند کا سفیر بن کر قندھار آیا تھا۔ چاکر رند نالی کی جنگ لاشاریوں سے ہار گیا تھا۔ اگلی جنگ میں شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا اس لیے اس نے مدد مانگنے بیبرگ قندھار بھیجا تھا۔ سردار زنون نے مدد کی یقین دہانی کرادی تھی۔ بیبرگ اس دن سیوی واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ چاکر رند کو خوشخبری سنانے کے لیے بیتاب تھا لیکن رات کے اندھیرے کی وجہ سے اس نے فیصلہ کیا کہ اگلی صبح کو سفر کرے گا۔ بیبرگ سفر کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ اسے متعلق خبر نہ تھی کہ قسمت اس کے ساتھ کیسا کھیل کھیلنے والی ہے۔

☆☆☆

بیبرگ مہمان خانے میں گہری نیند سو رہا تھا کہ اچ

اس کے شانے کو ہلایا۔ اس نے آنکھیں کھول
... کھلتے ہی وہ سکتے میں آ گیا۔ ایسا حسن گویا حور
... وہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا اور نہ ہی وہ کچھ سن پا رہا
... تیز حسن نے اس کی قوت گویائی چھین لی تھی۔
... بھی قوت نہ تھی کہ وہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹا
... صرف حسن کی دیوی بول رہی تھی اور سننے والے
... گئے تھے۔ بیبرگ نے بڑی مشکل سے استفسار کیا

...شیزہ نے دھیمی لیکن شیریں آواز میں جواب دیا۔
... بنجر پہاڑوں، تپتے صحراؤں اور تاحد نگاہ پھیلے
...لی باسی ہوں۔"

...گ نے چھوٹے بچوں کی طرح ہچکچاتے ہوئے
...ہارا رنگ اتنا سنہرا کیوں ہے؟"

اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کے دیکھا اور مسکراہٹیں
...ہوئے بولی۔ "میرا خمیر یہاں کے صحراؤں کی تپش،
...اس کی بلندیوں سے اٹھا ہے۔"

"واہ زبردست تو تمہارا یہ رنگ اس لیے سنہرا ہے۔"

...شیزہ نے پہلی بار اسے صبح دیکھا تھا دوبارہ دیکھنے
...وہ رات کے اس پہر آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر یہ
اس کے باپ تک پہنچ گئی تو اس کی خیر نہیں، لیکن
...، اس کے سینے میں دھڑکتا دل اب اس کا نہیں رہا
...اسے دغا دے گیا تھا اسی لیے وہ اس سے ملنے آئی
...اس کی جان بچا سکے۔ اسے ہوشیار کرسکے۔ بالآخر
...زبان کھولی۔ "میرے بابا نے تمہیں قتل کرانے کا
...بنالیا ہے۔"

بیبرگ چونک اٹھا، اس نے کہا۔ "ایسا کیسے ہوسکتا
؟"

پھر لمحے بھر کے توقف کے بعد کہا: "سردار زنون نے
وعدہ کیا ہے کہ وہ سردار چاکر رند کی مدد کریں گے۔"

"ابا جان قول و فعل کے کچے ہیں۔ جہاں پر سری (جو
...طاقتور) ہو اس جانب جاتے ہیں۔ چاکر رند کی مدد
...کے بجائے بابا جان نے ان کو لاشاریوں کے ہاتھوں
...پہنچانے کا منصوبہ بنایا ہے۔"

"تم یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہی ہو۔" بیبرگ بولا۔

"بیبرگ میں تمہارے عشق میں مبتلا ہوگئی ہوں۔ میری
...اب تمہاری جان ہوگئی ہے اور یہ جان میں نہیں کھونا
...تم چاہو تو اس چاکر رند کے تیز دھاری چاقو سے مجھے قتل
کر کے اپنے تیز رفتار گھوڑے پہ واپس بھی جاسکتے ہو گراناز نے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

☆☆☆

بیبرگ کو یقین نہیں آرہا کہ کوئی دوشیزہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جائے گی۔ کہتے ہیں کہ یکطرفہ محبت تو یکطرفہ تماشا ہی ہوتی ہے۔ مگر یہاں محبت کا شعلہ دونوں طرف بھڑک رہا تھا۔ نرم اور مضبوط ہاتھ ایک دوسرے کو چھو رہے تھے۔ گراناز اور بیبرگ کی محبت ریگستانوں اور پہاڑوں کو چیر کر باہر آ گئی تھی۔

بیبرگ بچپن سے جوانی تک بلوچی گیت گاتا رہا تھا۔ جب وہ گاتا تو اس کے لفظوں سے شیریں آواز نکلتی تھی۔ اس کی آواز میں بلا کی مٹھاس تھی۔ لوگ اس کی آواز سننے کے پیاسے بن چکے تھے جبکہ لڑکیاں اس کے حسن و جمال پہ فدا ہوتی تھیں۔ مگر اس کو تلاش تھی ایسی محبت کی کہ جس کا ذکر وہ اپنی شاعری میں کیا کرتا تھا۔

(ترجمہ اردو)

میں آدھی رات کو حسینوں کی دنیا سے حسین ترین دوشیزاؤں کو جگا لیتا ہوں۔

ان کے احمریں ہونٹوں کے رنگین بوسوں سے لطف اندوز ہوتا اور ان کی گمبھیر زلفوں میں گندھے ہوئے پھول جیسے زیورات توڑ لیتا ہوں۔

میں نے ایک دوشیزہ دیکھی ہے جوانی میں مست تھی۔ جس کے گلے میں زیورات میرے لیے آتش بن کر دل میں چبھ رہے تھے۔ اس کی جوانی شباب و حسن کی ترجمان تھی۔

☆☆☆

بیبرگ نے جب گراناز کے ہاتھوں کی لرزش دیکھی تو سمجھ گیا کہ اب یہ دوشیزہ محبت کی آگ پہ جل رہی ہے اور جوانی مجھ پر فدا کرنے پر اتر آئی ہے پھر ہوا بھی کچھ ایسا، وہ ایک سردار کے ہاتھوں لٹ گئی۔ اندھیری رات تماشا دیکھتے دیکھتے سو گئی۔ بیبرگ وہ بلوچ سردار تھا جس نے بھری جوانی میں آنسوؤں سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا۔ نالی کی جنگ میں بڑے بھائی کے مرنے پہ بھی دو آنسو اس کی آنکھوں سے نہ ٹپکے تھے۔

بیبرگ کے والد میر بہادر خان بلوچ فوج کے سپہ سالار تھے۔ وہ میر چاکر خان رند کے بہنوئی تھے اور نالی کی جنگ سے افسردہ تھے۔

سولہویں صدی کے ابتداء میں بیبرگ نے سردار چاکر

رند کے سفیر کے طور پر کام شروع کردیا تھا۔ اس وقت تمام بلوچ اقوام بیبرگ کی ذہانت پہ حیران تھے۔ بیبرگ کسی بھی جنگ کے اعلان سے پہلے ہار جیت کا بتا دیتا تھا۔ جیسے وہ ٹیلی پیتھی کے ماہر ہوں۔ وہ ہر سردار اور اس کی فوج کے ممبران کا دماغ چہرہ پڑھ لیتے تھے۔ اس کی ہر پیشگوئی سچ ثابت ہوتی تھی۔ اس لیے سردار چاکر رند نے اسے اپنا سفیر بنالیا تھا۔

☆☆☆

بیبرگ سردار چاکر رند کی غلطیوں کی بھی نشاندہی کردیتا تھا۔ بلکہ ان کو حل کرنے کی ترکیب بھی بتا دیتا تھا۔ مگر نالی کی جنگ کے دوران بیبرگ کی ایک نہ سنی گئی اور لاشاری سے جنگ کے لیے رند قوم کے سر پھرے نوجوان تیار ہو گئے۔ نوجوانوں اور سرداروں نے بیبرگ کا خوب مذاق اڑایا تھا۔ اور کہا تھا کہ آپ جنگ میں نہ آئیں ہم جنگ جیت کر دیکھائیں گے۔ تب بیبرگ نے تمام سرداروں کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ میں اس جنگ میں اپنے سردار کو بچانے کے لیے صف اول پر تلوار لے کر کھڑا ملوں گا۔

نالی کی جنگ شروع ہوئی لاشاریوں کی بڑی تعداد میدانِ جنگ میں اتری اور رند قوم کے سینکڑوں نوجوانوں کو شہید کردیا۔ پچاسوں مرد ہاتھ پاؤں سے معذور بن گئے۔ شکست کے بعد میر چاکر خان رند نے سیکڑوں نوجوانوں کو خود کفن پہنایا۔ جنگ میں بہت زیادہ نقصان ہوا تھا۔ سات سو رند لاشاریوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ سردار چاکر رند اور کچھ دوسرے ساتھیوں نے میدانِ جنگ سے فرار ہونے میں عافیت سمجھی۔ بیبرگ سے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے تو بیبرگ نے قندھار کے سردار زنون سے مدد کی خواہش کا اظہار کردیا۔ جس پر چاکر رند نے منظوری دے کر اسے قندھار جانے کا مشورہ دیا۔

☆☆☆

سردار شجاع الدین زنون بلوچ سرداروں کا سخت مخالف تھا۔ وہ ان کے حسن و جمال سے جلتا تھا۔ اپنے لوگوں کو کہتا تھا۔ ''میں اپنی قوم کی حسیناؤں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اپنی پاک دامنی کی حفاظت کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حسین بلوچ انہیں اپنے لمبے خوبصورت بالوں اور صاف لباس کی وجہ سے فریب دے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو آپ کے بھائیوں کا سر شرم سے ڈوب جائے گا۔''

☆☆☆

سردار شجاع الدین زنون اپنے محل میں اپنے سپہ سالاروں کو سمجھا رہا تھا کہ میر گوہرام لاشاری کا سفیر بالاچ سردار زنون کے پاس پہنچ گیا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد بالاچ اور سردار زنون ایک الگ کمرے میں اٹھ آئے۔ زنون نے پوچھا کہ آپ لوگوں کی مدد کر کے ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔

''بالاچ جلدی بولا ہارے ہوئے سپاہیوں کا ساتھ دینا مناسب نہیں ہے یہ سردار زنون کو زیب بھی نہیں دیتا۔'' پھر اس نے کمر سے پیش قبض نکال کر دونوں ہاتھوں پر رکھ کر بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ چاکر رند کا ہے ہندوستانی چاقو جس پہ اسے رشک تھا، اس نے یہ تحفہ آپ کے لیے بھیجا ہے۔

سردار زنون نے سوچ بچار کے بعد سردار گوہرام کا تحفہ قبول کرلیا۔ اسی وقت گوہرام کا سفیر واپس چلا گیا۔ اتفاق سے یہ ساری باتیں گراناز نے سنی تو وہ حیران رہ گئی۔ اس وقت قندھار فوج کا کوئی بھی سپاہی یہ نہیں جانتا تھا کہ سردار زنون رنگ بدل لے گا۔

☆☆☆

اس روز سردار زنون گہری نیند میں سو رہے تھے کہ گراناز چاقو چرا کر بیبرگ کے پاس پہنچ گئی۔ اسے ساری داستان سنا دی۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی تمام باتیں دو سپاہیوں نے سن لی تھیں۔ انہوں نے اسی وقت یہ باتیں سردار زنون کو سنا دیں۔ یہ سنتے ہی سردار نے اسی وقت کچھ سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً بیبرگ کو جا کر گرفتار کرلیں۔

سپاہیوں نے حکم پر فوراً عمل کیا اور بیبرگ کو ایک کمرے میں قیدی بنادیا۔ بیبرگ کا جسم قید تھا دماغ نہیں، وہ قید تنہائی کی اذیت بھلانے کے لیے شاعری کرنے لگا۔

اس وقت بلوچوں میں تعلیم کا فقدان تھا۔ شاعر اپنی شاعری کو گیت کی شکل میں اتار لیتے تھے۔

(بلوچی)

سردار کہ دزء یار بیث

ناموس ننگ گار بیث

(ترجمہ)

اگر سردار چوروں کا دوست ساتھی بن جائے۔

تو اس کی عزت شان وشوکت خاک میں مل جاتی ہے۔

بیبرگ کمرے میں بند تھا مگر اس کی آواز مقید نہ تھی۔ کمرے کے بند دروازوں سے گزرتی ہوئی گراناز کی سماعت سے ٹکراتی اور اسے بے چین کردیتی۔ باپ کے ڈر سے اس نے بیبرگ سے رابطہ توڑ رکھا تھا مگر دل کو کیسے سمجھاتی کہ وہ

بیرگ سے دور نہیں رہ سکتی۔ تب اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ باپ کے پاس پہنچ گئی۔ ''میں اس بلوچ سردار کی آواز سے تنگ آچکی ہوں۔ اس کے گیتوں نے میری زندگی اجیرن کردی ہے۔ نیند حرام کردی ہے۔ اسے اس قید سے آزاد کردیا جائے تاکہ میں آرام سے سوسکوں۔''

سردار نے بیٹی کی بات مان کر بیرگ کو آزاد کردیا تھا تاکہ بیٹی سکون کی نیند سوسکے۔

☆☆☆

بیرگ آزادی کے بعد بھی واپس نہیں گیا۔ محل کے ارد گرد گھومتا رہا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کرلیا تھا کہ وہ محبوبہ کے بغیر سیوی واپس نہیں جائے گا۔ بلوچ مرتے دم تک وعدہ فراموش نہیں ہوتے، مگر یہاں بھی وعدہ فراموشی کو توہین سمجھا جا رہا تھا۔

سردار زنون بیرگ کی حرکتوں سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے اسے زندان میں ڈال دیا تاکہ باقی زندگی وہاں گزارے۔

بیرگ زندان میں بھی گرا ناز کے گیت گاتا رہتا تھا۔ اس کے گیت ہوا کے دوش پر سوار ہوکر گرانا ز کی سماعت تک پہنچ جاتے اور وہ بے چین ہوا ٹھتی اپنے بے قرار دل کو قرار دینے کے لیے وہ ایک دن زندان میں آپہنچی اسے دیکھ کر وہ بولا۔ ''آخر تم یہاں کیسے پہنچی؟ تمہارے بابا تمہیں مار دیں گے۔''

''نہیں۔ بیرگ نہیں تم نہیں جانتے۔ بابا نے کل تمہیں مارنے کا سوچا ہے اور تمہاری لاش کو ہرات کے بازار میں لٹکانے کا بھی سوچ رکھا ہے۔''

''آج تک کسی ماں نے ایسا بیٹا پیدا نہیں کیا ہے جو میرا سر کاٹ کر ہرات کے بازار میں میری لاش کو لٹکا دے۔''

''نہیں بیرگ نہیں۔ تم جذبات میں آکر مجھے بھی کھو دو گے۔ مجھے پانا ہے تو یہاں سے فرار ہونا ضروری ہے۔ گوہرام کے پاس چلتے ہیں۔ سردار چاکر حمایتی ہے، اب گوہرام لاشاری بھی حمایتی بن گیا تو دونوں مل کر ابا جان اور اس کی ترک فوج کو شکست دے دیں گے۔''

☆☆☆

''ارے واہ، مشورہ تو اچھا ہے۔ مگر میں سردار گوہرام کے بھائی کونالی کی جنگ میں قتل کرچکا ہوں۔ وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔''

''وہ معاف کردے گا اور پناہ بھی دے گا۔ وہ سچا بلوچ ہے۔''

رات کا آخری پہر تھا جب بیرگ اور گرانا ز نے تیز رفتار گھوڑے پر بیٹھ کر قندھار کو الوداع کہا۔ بیرگ اور گرانا ز خوفزدہ تھے۔ اندھیری رات میں وہ دونوں بولان کی طرف بھاگتے رہے۔ آدھی رات کو بولان کے پہاڑوں تک پہنچے وہاں رک کر دونوں نے اپنی تھکاوٹ ٹھنڈے پانی سے دور کی اور پھر سفر آگے شروع کیا۔

☆☆☆

بلوچ سرداروں کے گھوڑے دنیا بھر میں مشہور تھے ان کی تیز رفتاری کا کوئی..... ثانی نہ تھا۔ اگر کوئی سردار (مادہ) گھوڑی پہ سوار ہوتا تھا، تو اس گھوڑی کو اس سردار کی بیوی جتنا درجہ دیا جاتا تھا۔ وہی سردار جب انتقال کر جاتا تو اس کی گھوڑی کو بھی اس کے ساتھ دفنا دیا جاتا تھا تاکہ سردار کی گھوڑی پہ کوئی اور سواری نہ کرسکے۔ حتیٰ کہ کچھ سرداروں کی وفات پہ ان کے کھانے پینے کی اشیاء برتن سونے چاندی کے زیورات سمیت ان کو دفنایا جاتا تھا۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ سردار جتنی کوئی بھی شخص حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

☆☆☆

گاجان کی سرزمین پر پہنچتے ہی بیرگ اور گرانا ز لاشاریوں سے بضد تھے کہ وہ صرف سردار گوہرام سے ملاقات کریں گے۔ اور اس کے سامنے اپنا چہرہ دکھائیں گے۔ جب یہ پیغام سردار گوہرام کو ملا تو پہلے وہ حیران رہ گیا پھر اس نے ملاقات کے لیے مہمانوں کو اپنے مہمان خانے میں بلالیا جہاں پر بیرگ اور گرانا ز نے اپنا چہرہ گوہرام کو دکھایا، بیرگ کو دیکھتے ہی سردار گوہرام نے میان سے تلوار نکال لی مگر فوراً ہی اسے میان میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''بیرگ تم نے میرے شیر دل بھائی کونالی کی جنگ میں قتل کیا تھا۔ اب مجھ سے پناہ کی اُمید کیسے لے کر یہاں آئے ہو اور یہ کس کی لڑکی کو لے کر آئے ہو۔''

''سردار یہ حاکم قندھار زنون کی بیٹی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ زنون کو ہماری محبت کا علم ہوا تو وہ مجھے مارنا چاہتا تھا اس لیے رات کے اندھیرے میں ہم دونوں قندھار سے بھاگ کر آپ کے پاس آگئے ہیں۔ سردار زنون بہت طاقتور ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے طاقتور قبیلے کی ضرورت ہے اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اس وقت آپ بلوچوں میں سب سے زیادہ طاقتور

سردار ہیں۔"

سردار نے گراناز سے پوچھا کہ تم واقعی بیبرگ سے محبت کرتی ہو تو گراناز نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ بیبرگ کو سردار گوہرام نے اپنے خصوصی مہمان خانے بھیج دیا اور مہمان نوازی کا حکم دے دیا۔

☆☆☆

سردار زنون بیٹی کے اغوا کے بعد ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا اس نے فوج کو حکم دیا کہ بلوچوں سے جنگ کا اعلان کر دیا جائے۔ سب بولان کے پہاڑوں کا رخ کریں۔

پچاس ہزار کا لشکر لے کر سردار زنون بلوچوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے بولان کی طرف بڑھنے لگا۔

ترک فوج دریا بولان کو عبور کر کے ایک وسیع میدانی علاقے میں خیمہ زن ہوگئی۔ سردار زنون کے سفیروں نے جا کر گوہرام کو اطلاع دی کہ سردار زنون کو بیبرگ اور گراناز ہر قیمت پر چاہییں مگر سردار نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ بلوچ مہمانوں کی خاطر جان بھی دینے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ سردار زنون نے چیخ کر کہا کہ اب بلوچوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے اور بلوچوں کی فوج کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

جب یہ خبر چاکر رند کو ملی تو چاکر رند سردار گوہرام کے پاس پہنچ گیا اور اعلان کیا کہ مل کر دونوں سردار زنون کا مقابلہ کریں گے کیونکہ یہ بلوچ قوم کو مٹانا چاہتا ہے۔ دونوں طرف جنگ کی تیاری عروج پر تھی۔ ہندوستانی تلواریں منگوائی گئیں۔ سیوی سے بولان تک صرف جنگ کی باتیں ہونے لگیں۔ سینکڑوں بلوچ دور دور سے اپنے بلوچ بھائیوں کی حمایت میں پہنچ گئے پھر بھی بلوچوں کا لشکر تیس ہزار تک بمشکل پہنچ سکا تھا۔ دوسری جانب سردار زنون پچاس ہزار فوجیوں کے ساتھ دریائے بولان کی سرزمین پر خیمہ زن ہو کر چودھویں کے چاند کے اگلے دن اعلانِ جنگ کا اعلان کر چکا تھا۔

☆☆☆

سردار زنون نے اپنا مسکن وادی بولان کو اس لیے بنایا تا کہ فوج کے لیے پانی کا انتظام ہر وقت موجود ہو۔ وہ ہر قیمت پر بیبرگ کو قتل کرنے اور اپنی بیٹی کو واپس قندھار لے جانا چاہتا تھا۔

اس روز بیبرگ سخت پریشان تھا۔ وہ اس جنگ کو روکنا چاہتا تھا۔ اس نے گراناز سے اجازت مانگی اور کہا کہ آپ کے والد کیسے یہ جنگ ختم کریں گے۔

گراناز نے کہا۔ "اگر تم کسی طرح میرے والد کے پاس پہنچ جاؤ تو وہ مجھے اور آپ کو معاف کر دیں گے۔ یہ ہم قندھار کے باسیوں کی رسم اور قول بھی ہے۔"

"پھر تو یہ کام آسان ہوگا تا کہ بلوچ اقوام اور سینکڑوں ترک فوجیوں کا خون اس دھرتی پر میری وجہ سے نہ بہہ سکیں۔"

☆☆☆

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ بیبرگ نے گراناز کو گلے لگا کر الوداع کیا اور کہا۔ "جیت گیا تو تجھے پاؤں گا اور اگر ہار گیا تو تم مجھے کھو دو گی۔"

"میرے شیر دل جوان تمہاری اس تیز دھاری تلوار کی قسم دیکھنا تم جیت کر آؤ گے... اور یہ جنگ یہیں پہ ختم ہوگی۔"

بیبرگ گھوڑے پر سوار ہوا اور دریائے بولان کا رخ کیا۔ اس نے سردار زنون کے قافلے کے قریب پہنچ کر اپنے گھوڑے کو باندھ دیا... اور سردار کے خیمہ کی جانب چل پڑا۔ راستے میں بیبرگ نے کئی ترک فوجیوں کی گردنیں سر سے جدا کر دیں۔ اس کو صرف یہ خیال تھا کہ کسی طرح یہ جنگ ختم ہو جائے۔ وہ انتہائی چابکدستی سے ترک فوجیوں کو قتل کرتا ہوا خیمے کے قریب پہنچا۔ اب وہاں صرف زنون کے خاص سپاہی تھے۔ اس نے پیش قدمی جاری رکھی اور اس دستے کو بھی تہ تیغ کرتا ہوا شاہی خیمہ میں داخل ہو گیا۔

اس وقت زنون اس طرح بستر پر دراز تھا جیسے محل میں سو رہا ہو۔ بیبرگ نے اندر پہنچتے ہی زنون کے شانے کو ہلایا تھا۔ زنون نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو محافظوں کو آواز لگائی۔ تب بیبرگ نے کہا۔ "تمام محافظ مر چکے ہیں" پھر اس نے خنجر اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ "یہ لو چاکر رند کا خنجر اگر اس دنیا میں محبت کرنا جرم ہے تو میرا سر قلم کر دو۔"

سردار زنون نے کچھ پل سوچا پھر اسے گلے لگا کر کہا۔

"مجھے اپنی بیٹی کے لیے تم جیسے محافظ کی ضرورت تھی۔ جا میں نے تمہیں اور اپنی بیٹی کو معاف کیا۔ تم سے اچھا محافظ میری بیٹی کو اس دنیا میں اور کوئی نہیں مل سکتا۔

ایک خطرناک جنگ جو چھڑنے والی تھی وہ ختم ہوگئی اور سردار زنون نے اسی وقت بولان کی وادیوں کو الوداع کہا اور قندھار کی جانب واپس ہوگیا۔ سردار چاکر اور سردار گوہرام کو جب اس بات کا علم ہوا تو دونوں سردار بیبرگ کی عقلمندی پر حیران رہ گئے۔

++

نگینے

انور فرہاد

پاکستانی فلمی صنعت کے وہ نگینے جن کے دم سے بہار تھی، ان کا تعلق کراچی کی فلم نگر سے تھا لیکن ہم انہیں بھولتے جارہے ہیں۔ کبھی وقت ملے تو غور کریں کہ یہ سب کتنے قیمتی ہیرے تھے اور انہوں نے مسلسل محنت سے یہ مقام بنایا تھا۔

اللہ کی شان، کہ کراچی کو ایسے ایسے..... فنکار اور ہنرمند ملے کہ پاکستان کے دوسرے شہر اس پر رشک کرتے ہیں۔ شاید آپ یہ سوچنے لگیں کہ کیا کراچی اور اس کی فلم انڈسٹری کا بیان ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے.....؟ تو دوستو! سمندر کے ساحل پر آباد کراچی بھی ایک سمندر ہے اور اس کی فلمی دنیا بھی کبھی سمندر کی طرح بیکراں تھی۔ بے شک آج وہ قصہ پارینہ بن گئی ہے۔ مگر بقول شاعر

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

یعنی اس پرانے قصے کو دہراتے رہنا چاہیے کہ پتا چل سکے..... ہم کیا تھے..... اور اب کیا ہو گئے ہیں۔ ابھی بہت سے

قابل ذکر لوگ رہ گئے ہیں جن کے بارے میں آج کی نئی نسل کو بتانا ضروری ہے۔

آج کی پہلی شخصیت ایک ایسے ہدایت کار کی ہے جس نے کراچی کی فلمی دنیا سے ابھر کر پورے پاکستان کا نام روشن کیا۔ آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن اپنی فلموں کے حوالے سے وہ پاکستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ میں اقبال یوسف کی بات کر رہا ہوں۔ جو نہ صرف ایک ذہین اور باصلاحیت ہدایت کار تھے بلکہ ایک اچھے اداکار بھی تھے۔ انہوں نے بطور فلمساز بھی فلمیں پروڈیوس کیں اور دوسرے پروڈیوسروں کی دعوت پر ان کے لیے بھی فلمیں بنائیں۔ وہ اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے دوسرے ہدایت کاروں سے قدرے مختلف تھے جن کے بارے میں اس تحریر کے حوالے سے آپ کو معلوم ہوتا رہے گا۔

اقبال یوسف کا اصل نام شیخ محمد اقبال تھا جو 20 دسمبر 1939ء کو بمبئی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ایس، ایم، یوسف انڈین فلم انڈسٹری سے وابستہ تھے۔ بمبئی کی کئی فلموں میں انہوں نے اداکاری بھی کی اور بطور ہدایت کار فلمیں بھی بنائیں۔ ان کے صاحبزادے نے بطور چائلڈ اسٹار 1947ء میں بننے والی ایک فلم ''سماج'' میں اداکاری سے اپنے فنی کیریئر کا آغاز کیا۔ علاوہ ازیں اسی دور میں اپنے والد محترم کی فلم ''پاک دامن'' میں بھی اداکاری کی۔ پھر جب ایس ایم یوسف بھارت سے ہجرت کر کے اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آئے تو انہوں نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور کراچی ہی سے اپنی نئی فنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کیا۔ ایس ایم یوسف صاحب اپنے کام اور نام کے حوالے سے پاکستان میں جانی پہچانی شخصیت کے مالک تھے اس لیے یہاں قدم جمانے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

کراچی میں سکونت حاصل کرنے کے بعد شیخ محمد اقبال نے جہاں اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھیں وہیں والد کے ساتھ رہ کر فلموں میں اداکاری بھی کی اور ہدایت کاری کی تربیت بھی حاصل کی۔ ابھی ان کی عمر صرف 21 برس تھی کہ انہیں ایک فلم کی ڈائریکشن کا چانس مل گیا۔ کراچی کے ایسٹرن اسٹوڈیو کے معروف ساؤنڈ ریکارڈسٹ اقبال شہزاد نے انہیں اپنی فلم ڈائریکٹ کرنے کی دعوت دی۔

''اقبال یوسف! میں چاہتا ہوں کہ تم میری فلم ڈائریکٹ کرو۔''

اس وقت تک شیخ محمد اقبال نے اپنا فلمی نام اقبال یوسف رکھ لیا تھا۔ انہوں نے چونک کر کہا ''آپ! ابا جی سے کیوں نہیں کہتے.....؟''

''نہیں، ان سے نہیں، میں تم جیسے ٹیلنٹڈ نوجوان سے فلم بنوانا چاہتا ہوں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ تمہارے اندر ایک بڑا ڈائریکٹر موجود ہے۔''

''اگر آپ مجھ پر یہ ذمے داری سونپتے ہیں تو.....''

''میں تم پر مسلط نہیں ہوں گا۔ گھبراؤ مت..... تمہیں فری ہینڈ دوں گا۔ تم اپنی پسند سے، اپنی سوچ اور وژن سے جس طرح چاہو..... فلم بناؤ۔''

اقبال یوسف نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ تو میں اپنے طور پر اس کی ابتدائی تیاری شروع کرتا ہوں مگر اس میں آپ کی رضامندی بھی شامل ہوگی اور تعاون بھی۔ جہاں آپ سمجھیں کہ میرا فیصلہ درست نہیں ہے۔ وہاں میری رہنمائی بھی کر سکتے ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ تم ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرو گے جو غلط ہو۔''

چند روز بعد اقبال یوسف نے ایک پرچی اقبال شہزاد کو دی۔

''یہ کیا ہے.....؟''

''میں نے ان لوگوں کا انتخاب کیا ہے جن سے کام لوں گا۔''

''اچھا.....'' کہہ کر اقبال شہزاد نے اس رقعے پر نظر ڈالی۔ لکھا تھا

مصنف..... ابراہیم جلیس

نغمہ نگار..... فیاض ہاشمی

موسیقار..... اے۔ حمید

ستارے..... کہانی ٹائٹل ہونے کے بعد منتخب کیے جائیں گے۔

''ٹھیک ہے.....'' اقبال شہزاد نے اس تحریر کو پڑھنے کے بعد کہا۔ ''میں ان سے تمہاری موجودگی میں معاہدے کر لوں گا۔'' پھر ذرا رک کر بولے۔ ''کیا کہانی ابراہیم جلیس صاحب کی ہوگی.....؟''

''جی نہیں۔ اس کی کہانی کا تھیم میرا اپنا ہے۔ اس پر میں ان سے اسکرپٹ لکھواؤں گا۔ جلیس صاحب کا نام مکالمہ نویس کے طور پر دیا جائے گا۔''

''تمہاری سوچی ہوئی کہانی ہے تو یقیناً اچھی ہوگی۔''

''اتنا آپ کو بتا سکتا ہوں کہ یہ ایک جاسوسی اور ایکشن مووی کی کہانی ہے۔'' اور یہ فلم تھی ''رات کے راہی'' جو مکمل ہوکر 1960ء میں نمائش کے لیے پیش کردی گئی۔ اس کی کاسٹ درپن اور ریحانہ (جو بھارت سے آئی تھیں) شمیم آرا، ابراہیم نفیس، لہری، نرالا، نذر، فیضی، ساقی، احمد رشدی، رخسانہ، طالش اور علاؤالدین پر مشتمل تھی۔ جاسوسی سبجکٹ پر بنائی ہوئی فلمیں ذرا مشکل ہی سے کامیاب ہوتی ہیں مگر نوجوان ہدایت کار اقبال یوسف نے جس خوبی اور مہارت سے اسے پیش کیا تھا۔ اس نے اسے ایک دلچسپ اور خوبصورت فلم بنادیا تھا۔ اس کی موسیقی اور گیتوں نے بھی تماشائیوں کو متاثر کیا جبکہ جواں سال ہدایت کار نے اپنی عمر سے بہت بڑے فنکاروں سے بھی کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق اچھی اداکاری کروائی تھی۔ گلوکارہ زبیدہ خانم کا گایا ہوا یہ نغمہ

کیا ہوا دل پہ ستم، تم نہ سمجھوگے بلم
بیوفا ہیں نہیں ہم اس محبت کی قسم

بہت مقبول ہوا۔ دیگر گیت بھی پسند کیے گئے۔ مجموعی طور پر یہ فلم ''رات کے راہی'' کامیاب ہوئی اور اس نے سلور جوبلی کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

اسی سال ان کے والد ایس ایم یوسف کی فلم ''سہیلی'' نے بھی زبردست کامیابی حاصل کی اور انہوں نے اپنا قدم فلمی صنعت میں مستحکم کرلیا۔ اس طرح دونوں باپ بیٹے کو کامیاب ہدایت کار کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ اگلے سال اقبال یوسف نے دوسری فلم ''زمانہ کیا کہے گا'' بنائی یہ بھی موضوع کے اعتبار سے جاسوسی کہانی پر بنائی گئی تھی جس میں کمال، شمیم آرا، ساقی، فیضی، ایس گل، لہری، سکندر، رضیہ اور رخسانہ نے اداکاری کی تھی۔ یہ فلم سپرہٹ ہوئی اور 1961ء میں بطور ہدایت کار اپنی کامیابی کا جھنڈا لہرادیا۔ اس فیلڈ میں سب سے زیادہ نوعمر ہونے کے باوجود اپنے سے بڑے سینئر ہدایت کاروں کی صف میں شامل ہوگئے۔ کراچی فلم انڈسٹری کے ہونہار ہدایت کار کے طور پر اپنی جگہ بنالی۔ ''زمانہ کیا کہے گا'' کے لیے انہوں نے پہلی بار مصلح الدین کو موسیقار لیا اور پھر ان کی کمپوزیشن سے ایسے متاثر ہوئے کہ اپنی اگلی چار فلموں میں انہی کو موسیقار کے طور پر کاسٹ کیا۔

اپنی ابتدائی فلموں کی عوامی مقبولیت اور باکس آفس پر کامیابی سے وہ اس قابل ہوگئے کہ اپنی ذاتی فلم اگلے برس 1962ء میں شروع کردی۔ جس کے وہ خود ہدایت کار بھی تھے۔ فلم کا نام ''دال میں کالا'' تھا۔ یہ بھی سبجکٹ کے لحاظ سے جاسوسی فلم تھی جس میں بہار اور کمال نے لیڈنگ رول کیے تھے جبکہ محمد علی سے انہوں نے ولن کا کردار کروایا تھا۔ ناصرہ اور ادیب نے بھی اس فلم میں اہم کردار ادا کیے تھے۔ ادیب کی پاکستان میں یہ پہلی فلم تھی۔ دیگر ستاروں میں رخسانہ، ساقی، فیضی اور نرالا شامل تھے۔ موسیقی مصلح الدین نے ترتیب دی تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس فلم کی تکمیل کے دوران فلم کی ہیروئن بہار جواں سال اقبال یوسف کو کچھ ایسی بھائیں کہ انہوں نے اسے اپنی حقیقی زندگی کی ہیروئن بنالیا۔ بہار ان کی زندگی میں بہار بن کر آئی تو ان کے آنگن میں دو پھول کھلے۔ ایک کا نام ان دونوں نے عمران رکھا اور دوسرے کا سلمان۔

زندگی نامہ

اصل نام: شیخ محمد اقبال۔

فلمی نام: اقبال یوسف

والد: ایس۔ ایم۔ یوسف۔ پیدائش: 20 دسمبر 1939ء (بمبئی)

پہلی فلم بطور اداکار: بطور چائلڈ اسٹار پہلی فلم ''سماج'' تھی جو 1947ء میں بمبئی میں ریلیز ہوئی۔ دوسری فلم اسی زمانے میں ان کے والد کی ''پاک دامن'' تھی۔

تعلیم و تربیت: کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فلم میکنگ کی تربیت بھی حاصل کرتے رہے۔

پہلی فلم بطور ہدایت کار: عمر 21 برس تھی ''رات کے راہی'' ڈائریکٹ کی۔

بطور فلمساز پہلی فلم: ''دال میں کالا'' تھی۔

شادی: پہلی شادی انہوں نے بہار بیگم سے کی۔

اولاد: بہار نے ان کے دو بیٹوں کو جنم دیا۔

دوسری اور تیسری شادی: دوسری شادی اداکارہ ماہ پارہ سے کی جبکہ تیسری شادی ایک غیر ملکی خاتون سے کی۔

انتقال: 1995ء میں فلم ''خواہش'' کی انگریزی میں ڈبنگ کے سلسلے میں لندن گئے۔ وہیں انہیں دل کا دورہ پڑا اور انتقال ہوگیا۔

دوستو! ان کا بیٹا عمران آج کل ایک ٹیلی ویژن چینل میں بطور پروڈیوسر کام کررہا ہے۔ جبکہ سلمان کو اقبال یوسف نے اپنی ایک فلم ''کالا بازار'' میں بطور چائلڈ اسٹار پیش کیا تھا لیکن یہ فلم کسی وجہ سے مکمل نہ ہوسکی۔ ''دال میں کالا'' معیار اور کاروبار کے لحاظ سے ان کی دونوں پچھلی فلموں کی طرح ثابت نہ ہوسکی۔ یہ چونکہ ان کی اپنی ذاتی فلم تھی، اس لیے اس کا اثر ان کے فنی کیریئر پر کم پڑا۔ اس فلم کا ایک نغمہ جسے مصلح الدین نے کمپوز کیا تھا اور ناہید نیازی نے گایا تھا بہت مشہور ہوا تھا۔ جس کے بول تھے

سمجھ میں نہ آئے دل کو کہاں لے جاؤں

شنید ہے کہ اس کا چربہ ایک بھارتی فلم ''راجا'' میں بھی کیا گیا تھا۔

اقبال یوسف کی اگلی فلم ''نہلے پہ دہلا'' تھی۔ جس کے فلمساز و ہدایت کار وہ خود تھے۔ یہ بھی جاسوسی فلم تھی جو 1964ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے موسیقار بھی مصلح الدین تھے جبکہ اس کے ستارے نیلو، کمال، ساقی، ساون، حنیف، لہری، اسد جعفری، فیضی اور ناصرہ تھے۔ یہ اقبال یوسف کی پہلی فلم تھی جو باکس آفس پر ناکام ہوگئی تھی۔ اقبال یوسف کو اس کے دوستوں اور بہی خواہوں نے سمجھایا۔

''یار! تم جاسوسی فلم کے چکر سے باہر نکلو۔''

''ہاں یار! جاسوسی فلموں کو تماشائی دوبارہ سہ بارہ نہیں دیکھتے۔''

''کیا تم کسی اور موضوع پر فلم نہیں بنا سکتے؟''

اس کے بجائے دوسرا دوست بولا۔ ''کیوں نہیں بنا سکتا۔ ضرور بنا سکتا ہے۔''

اب اقبال یوسف خود اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ خود کوئی فلم شروع کرتے اس لیے ان کے دوست اداکار کمال نے ان سے کہا۔ ''یار اقبال یوسف! تو میری ایک فلم ڈائریکٹ کر، مگر یہ جاسوسی نہیں ہوگی۔''

یاد رہے کہ سید کمال اقبال یوسف کی دوسری، تیسری اور چوتھی فلم میں متواتر ہیرو کے طور پر کام کرتا رہا تھا۔ دونوں میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔

اقبال یوسف مسکرائے۔ ''مجھے معلوم ہے تو کوئی جاسوسی فلم نہیں بنوائے گا۔''

دوستو! کمال چونکہ بھارتی اداکار و ہدایت کار راج کپور سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا تھا اور فلموں میں پاکستانی راج کپور کے طور پر ہی متعارف ہوا تھا اس لیے اس نے راج کپور کی طرح جوکر کے روپ میں فلم بنانے کا مشورہ اقبال یوسف کو دیا۔

''میری یہ فلم ہلکی پھلکی اور تفریحی ہو۔''

''یعنی تو بھی جوکر بن کر تماشائیوں کے پیٹ میں بل ڈالنا چاہتا ہے؟''

مگر ہنسی مذاق کے ساتھ ساتھ فلم میں رومانس بھی ہو۔ عشق و محبت کی چاشنی بھی ہو۔ فلم کا نام بھی ''جوکر'' رکھا گیا۔ کہانی کا تھیم کمال کا ہی تھا۔ کاسٹ میں کمال کے مقابل اداکارہ زیبا تھیں۔ رانی اور ریحان نے بھی کلیدی کردار کیے تھے۔ یہ فلم مکمل ہونے کے بعد فروری 1966ء میں سینماؤں کی زینت بنی اور اس نے سلور جوبلی کامیابی حاصل کی۔ اس کی کاسٹ میں دیگر ستارے یہ تھے۔ نرالا، لطیف چارلی، ساقی، طالش، اسد جعفری، فیضی اور آزاد، ''جوکر'' کی موسیقی بھی مصلح الدین کی تھی۔ ان کے کمپوز دھنوں میں گیت مقبول بھی ہوئے۔

''جوکر'' کی کامیابی سے یہ ہوا کہ اقبال یوسف کے بارے میں یہ خیال غلط ثابت ہوگیا کہ وہ صرف جاسوسی فلمیں ہی بنا سکتا ہے۔ اس ہلکی پھلکی مزاحیہ اور رومانی فلم کی کامیابی سے اسے یہ فائدہ ہوا کہ دوسرے فلمساز اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرنے لگے۔ اس سلسلے میں معروف فلم تقسیم کار غفار دانے والا نے پہل کی اور اس سے کہا۔

''اقبال یوسف! تم میرے لیے ایک ایسی فلم بناؤ جو عام فلموں سے ذرا مختلف ہو۔ مگر ایسی ہو جو یادگار ہو۔''

''ایسی کسی فلم کے لیے تو سر جی! پیسے کچھ زیادہ ہی خرچ ہوں گے۔''

''تم سرمائے کی فکر نہ کرو..... تمہیں ایسی فلم کے لیے جتنے پیسوں کی ضرورت ہوگی میں فراہم کروں گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔'' اقبال یوسف نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ انشاء اللہ میں آپ کے لیے ایک ایسی منفرد فلم بناؤں گا جو آپ کے لگائے ہوئے سرمایہ سے کئی گنا زیادہ آپ کو کما کر دے گی۔ یہی نہیں، یہ فلم اپنی انفرادیت کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔''

''گڈ..... مجھے تم سے اسی بات کی توقع ہے۔''

نوجوان اقبال یوسف کا ذہن بہت زرخیز تھا۔ فلم میکنگ کے لیے وژن کا وسیع سے وسیع تر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ وہ مکھن پر مکھن رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ ''جوکر'' کی

کامیابی سے اس میں یہ اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ہر سبجیکٹ اور ہر موضوع پر فلم بنا سکتا ہے۔ اس نے غفار دانا والے کے لیے ایک ایسی فلم بنانے کی منصوبہ بندی کی جو ہر اعتبار سے یونیک ہو۔ یہ فلم ''جوش'' تھی۔ فلموں میں عام طور پر ایک ہیرو، ایک ہیروئن ہوا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ہیرو یا ہیروئن کے کردار ڈبل ہوتے ہیں لیکن اقبال یوسف نے پہلی بار کسی پاکستانی فلم میں پانچ ہیرو اور پانچ ہیروئن پر فلم بنا کر ایک تاریخ رقم کی۔ یہ پانچ رومانی جوڑی انہوں نے کچھ اس طرح بنائی۔ سدھیر اور زیبا، وحید اور روزینہ، اقبال یوسف اور رخسانہ، حنیف اور نفیسہ نور، اسد جعفری اور ترانہ۔

پانچ رومانی جوڑوں کو ساتھ لے کر کسی فلم کہانی میں توازن برقرار رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ مگر آفرین ہے ہدایت کار اقبال یوسف پر کہ اس نے پانچ ہیرو کو ساتھ لے کر نہ صرف فلم کا توازن برقرار رکھا بلکہ فلم کی دلچسپی اور خوبصورتی میں بھی کوئی آنچ آنے نہیں دی۔ ہر جوڑے کی نوعیت دوسرے جوڑے سے مختلف تھی۔ کریکٹر اور رول الگ الگ تھے۔ جس نے تماشائیوں کو اکتانے یا بور ہونے نہیں دیا۔ فلم اپنی تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ شروع ہوئی اور اس کے اختتام پر فلم بین خوش خوش سینما گھروں سے باہر نکلے۔ ہر ایک کی زبان پر اس فلم کے لیے تعریفی کلمات تھے اور اقبال یوسف کو عام لوگوں کے علاوہ فلم کے اسرار و رموز سے واقف فلم والوں اور نائدین اور مبصرین کی نگاہوں میں قابلِ تحسین قرار دیا گیا۔ ''واہ وا! کیا خوبصورت فلم بنائی ہے۔''

اس فلم میں فیضی، رجنی، ساقی اور ادیب نے بھی اہم کردار نبھائے۔ اس فلم کے موسیقار بھی مصلح الدین تھے۔ یہ فلم بھی 1966ء میں ریلیز ہوئی اور کامیاب ثابت ہوئی۔ ''جوش'' میں اقبال یوسف اور رخسانہ پر فلمایا گیا یہ گیت بہت مقبول ہوا جسے احمد رشدی کی آواز میں صدا بند کیا گیا تھا۔

تجھ کو بھی بنایا اللہ نے مجھ کو بھی بنایا اللہ نے
تجھے حسن دیا مجھے عشق دیا
سب کھیل رچایا اللہ نے

اسی طرح وحید مراد اور روزینہ پر پکچرائز ہونے والا نغمہ بھی اپنی مثال آپ ثابت ہوا۔ جو آج بھی شوق سے سنا جاتا ہے۔

رات چلی ہے جھوم کے، آ بھی جا

دوستو! آپ اقبال یوسف کے بطور ہیرو کے اداکاری پر سوچ رہے ہوں گے کہ چونکہ اس فلم کے ہدایت کار وہ خود تھے، اس لیے خود کو بھی ہیرو کی صف میں شامل کر دیا۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ہدایت کاری کے ساتھ ساتھ وہ اداکاری بھی کرتے رہے تھے۔ سال بھر پہلے یعنی 1965ء میں نمائش پذیر ہونے والی فلم ''عید مبارک'' میں بھی انہوں نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ جوان کے والد محترم ایس ایم یوسف صاحب کی فلم تھی اور جس نے بہت پسندیدگی حاصل کی تھی۔ ''عید مبارک'' میں وحید مراد اور اقبال یوسف پر ایک مزاحیہ ڈوئٹ بھی فلمایا گیا تھا جسے منیر حسین اور احمد رشدی نے گایا تھا۔ ''لپک جھپک شمپک شو۔ چکر میں ہے دنیا ساری۔''

اداکاری کے ضمن میں یہ بتانا ضروری ہو جاتا ہے کہ ''جوش'' سے پہلے اور بعد میں اقبال یوسف نے ان فلموں میں بھی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ''زندگی ایک سفر ہے''، ''سہاگن''، ''تم ملے پیار ملا''، ''اک سپیرا''، ''شریک حیات''، ''پھر صبح ہوگی''، ''ہل اسٹیشن''، ''جواب دو''، ''مسٹر چار سو بیس'' (پرانی)، ''آگ کا سمندر'' اور ''ہیرو'' فلم ''سہاگن'' میں اقبال یوسف پر قلمبند ہونے والا یہ گیت پسند کیا گیا تھا جسے احمد رشدی نے گایا تھا۔

''میں ہوں مسٹر بالا۔ آئس کریم والا۔''

''مسٹر 420'' ہدایت کار اسماعیل جیلانی کی فلم تھی۔ اس کی نمائش 1970ء میں ہوئی تھی۔ اس فلم میں اقبال یوسف نے رانی کے ساتھ اداکاری کی تھی۔ جبکہ کاسٹ کے دیگر ستارے روزینہ، حنیف اور آزاد تھے۔ یہ فلم کامیابی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ ''زندگی ایک سفر ہے'' ایس ایم یوسف کی فلم تھی۔ اقبال یوسف نے اس فلم میں وحید مراد، شمیم آرا، اعجاز اور دیبا کے ساتھ اداکاری کی تھی۔

''جواب دو'' جعفر شاہ بخاری کی فلم تھی۔ اس فلم میں اقبال یوسف نے درپن، زمرد، یوسف خان اور منور ظریف کے ساتھ پرفارم کیا تھا۔

''پھر صبح ہوگی'' رفیق رضوی کی فلم تھی۔ ''شریک حیات'' ایس ایم یوسف کی فلم تھی جو 1968ء میں نمائش پذیر ہوئی تھیں۔

دوستو! اس تفصیل سے آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ اقبال یوسف نے صرف اپنی فلموں میں اداکاری نہیں کی۔ دوسرے ہدایت کاروں نے بھی اپنی فلموں میں ان سے اداکاری کروائی۔

اقبال یوسف کی ہدایت کاری میں بننے والی ساتویں فلم ''تم ملے پیار ملا'' تھی۔ جس کے فلمساز قدیر خان تھے۔ یہ ایک نغمہ بار فلم تھی۔ اس کے موسیقار ناشاد تھے۔ اس کے کئی گیت مقبول ہوئے۔ اس کے ستارے محمد علی، زیبا، حنیف اور آزاد تھے۔ یہی وہ فلم تھی جس کی شوٹنگ کے دوران محمد علی اور زیبا ازدواجی رشتے میں منسلک ہوئے تھے۔ اتفاق دیکھیے کہ اس فلم میں ایک گیت بھی ایسا تھا جو محمد علی پر پکچرائز ہوا تھا اور اسے احمد رشدی نے اپنی آواز سے سجایا تھا اور اسے اس فلم کا مقبول ترین نغمہ تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے بول تھے۔ ''گوری کے سر پر سج کے۔ سہرے کے پھول کہیں گے۔ تم ملے، پیار ملا رے۔''

اسی طرح محمد علی اور زیبا پر فلمائے گئے ڈوئٹ کے بول تھے۔ ''آپ کو بھول جائیں ہم۔ اتنے تو بے وفا نہیں۔''

اسے مہدی حسن اور نور جہاں نے گایا تھا۔ اس فلم میں اقبال یوسف نے بھی ایک رول ادا کیا تھا۔ اس پر زیبا کے ہمراہ یہ گیت بھی فلمبند ہوا تھا۔ جسے احمد رشدی اور آئرن پروین نے صدا بند کرایا تھا۔ گیت کے بول تھے۔ ''دلربا دلربا کیسا یہ جادو کیا۔''

یہ فلم تاخیر سے مکمل ہوئی اور 1969ء کے اوائل میں منظر عام پر آئی۔ اس کے باوجود اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

اگلے برس 1970ء میں معروف گلوکارہ مالا نے اپنی ذاتی فلم ''نائٹ کلب'' کی ڈائریکشن کے لیے اقبال یوسف کا انتخاب کیا۔ یہ بطور ہدایت کار اقبال یوسف کی آٹھویں فلم تھی۔ اس کی موسیقی مالا کی بہن شمیم نازلی نے ترتیب دی تھی۔ اس کی کاسٹ میں شمیم آرا، کمال، عالیہ، زمرد، رنگیلا، ادیب اور طالش قابلِ ذکر ستارے تھے۔ ''نائٹ کلب'' 1971ء میں سینماؤں کی زینت بنی۔ اس فلم نے باکس آفس پر اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی۔ اس کی کہانی جاسوسی نوعیت کی تھی۔

اسی سال 1971ء میں ریلیز ہونے والی اقبال یوسف کی نویں فلم ''اک سپیرا'' تھی۔ جو سانپوں کے موضوع پر بنائی گئی تھی اور اقبال یوسف کی ذاتی فلم تھی۔ اس فلم میں وہ عالیہ اور ماہ پارہ کے مقابل بطور ہیرو پیش ہوئے تھے۔ اس فلم کا یہ نغمہ ''وعدہ کر کے صنم کیوں نہ آئے۔'' جسے رونا لیلیٰ نے گایا تھا۔ امر سنگیت کی حیثیت ثابت ہوا تھا اس کے موسیقار ناشاد تھے۔ اس فلم کو متوقع کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

1972ء میں بطور ہدایت کار ریلیز ہونے والی اقبال یوسف کی دسویں فلم ''ہل اسٹیشن'' تھی جس کے وہ فلمساز بھی تھے۔ اس کی کہانی کا سبجکٹ پُراسرار تھا۔ سسپنس سے بھری اس کہانی کا اسکرپٹ مقبول نغمہ نگار تسلیم فاضلی سے لکھوایا گیا تھا۔ اس فلم میں وحید مراد نے ڈبل رول کیا تھا۔ ان کی ہیروئن شمیم آرا تھیں۔ اس فلم میں اقبال یوسف اور اداکارہ ماہ پارہ کا ایک مزاحیہ پیٹر بھی تھا۔ یاد رہے کہ سندھی فلموں کی اداکارہ ماہ پارہ اس وقت ان کی حقیقی بیگم بن چکی تھی۔ ''ہل اسٹیشن'' کے دیگر ستاروں میں آزاد، نرالا، فیضی، سنتوش ریسل، چن چن اور حنیف کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ فلم بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ البتہ ناشاد کی دھنوں پر تسلیم فاضلی کے تحریر کردہ یہ نغمے بہت مقبول ہوئے جنہیں گلوکار بشیر احمد نے گائے تھے۔

☆ میرا دل نہ جانے کب سے تیرا پیار ڈھونڈتا ہے
جو خزاں میں کھو گئی ہے وہ بہار ڈھونڈتا ہے

☆ میرے سینے پہ سر رکھ دو میرے دل میں سما جاؤ
میری آنکھوں میں اے جانِ جاں پیار بن کر اتر جاؤ

کئی سال کے وقفے کے بعد 1975ء میں اقبال یوسف کی گیارہویں فلم ''صورت اور سیرت'' ریلیز ہوئی۔ جو باکس آفس پر سپر ہٹ ہوئی اور اس نے گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ اس فلم کے فلمساز مشتاق ظفر تھے۔ یہ ایک ایکشن مووی تھی۔ جس میں لالہ سدھیر نے محمد علی اور وحید مراد کے باپ کا کردار کیا تھا۔ دیگر آرٹسٹوں میں نیر سلطانہ، ممتاز، نشو، الیاس کشمیری، مصطفیٰ قریشی اور لہری نمایاں تھے۔ ایم اشرف ''صورت اور سیرت'' کے موسیقار تھے۔ ان کی مسحور دھنوں پر کئی گیت مقبول ہوئے جن میں یہ حمدیہ کلام خاص طور پر بہت مقبول ہوا۔

☆ بندے پہ کرم کرنا تیری شان ہے مولا
☆ دنیا میں ہم کو غم کے سوا کچھ نہیں ملا

یہ دونوں نغمے مہدی حسن نے گائے تھے۔ اس سپر ہٹ فلم نے اقبال یوسف کی گزشتہ ناکامیوں کے داغ دھو دیئے تھے اور ان کا فنی گراف بلند کر دیا تھا۔

1976ء میں اقبال یوسف کی فلمی زندگی کی سب سے بڑی فلم ''ان داتا'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم نے معیار اور کاروبار دونوں طرح سے اپنے آپ کو منوایا۔ گولڈن جوبلی

کامیابی ہی حاصل نہیں کی فلمی پنڈتوں کو بھی متاثر کیا اور اس دور کے صف اوّل کے ہدایت کاروں میں انہیں کھڑا کر دیا۔ سدھیر نے ٹائٹل رول میں سپر درجے کی اداکاری کی۔ اس کے علاوہ محمد علی، ممتاز، سلطان راہی، مصطفیٰ قریشی، لہری، نجمہ محبوب اور طالش سے بھی اقبال یوسف نے بہترین اداکاری کروائی۔ یہ ایک ایکشن مووی تھی اور بطور ہدایت کار اقبال یوسف کی بارویں فلم تھی۔ کمال احمد ''ان داتا'' کے موسیقار تھے۔ ان کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر اس کے گیت بھی مقبول ہوئے۔

☆ نہ دو گے اگر تم وفا کو سہارا
☆ یوں ہی چلتے چلتے راہوں میں
☆ تیرے میرے لڑ گئے نین

دوستو! قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس فلم ''ان داتا'' کا اقبال یوسف نے دوسرا پارٹ بھی بنایا جو ''سن آف ان داتا'' کے نام سے 1987ء میں ریلیز ہوئی۔ اس سے قبل وہ اپنی کامیاب فلم ''جوش'' کو بھی 1978ء میں دوبارہ بنا کر پاکستانی فلمی صنعت میں ایک نئی روایت کی طرح ڈال چکے تھے ایک ہی نام کی دو فلمیں بنانے اور سیکنڈ پارٹ کی داغ بیل ڈالنے والے کی حیثیت سے اقبال یوسف کو ہمیشہ یاد رکھا جائے۔ 1966ء میں پہلی بار جو ''جوش'' بنائی تھی وہ بلیک اینڈ وائٹ تھی جبکہ اس کے 31 سال بعد 1979ء میں بننے والی فلم ''جوش'' رنگین تھی۔ اس کے پروڈیوسر اجمل بٹ اور اسلم بٹ تھے۔ کاسٹ میں محمد علی، رانی، شاہد، بابرہ، ساقی، حنیف، ادیب اور اسلم پرویز شامل تھے۔ یاد رہے کہ ان دونوں ''جوش'' میں ساقی، حنیف اور ادیب نے اداکاری کی تھی۔

فلموں کے موسیقار طافو تھے۔ ان کی موسیقی میں ترتیب دیئے ہوئے اس نغمہ کی گائیکی میں اے نیر کا ساتھ بابرہ شریف نے بھی دیا تھا۔

''اک لڑکی تم جیسی خوابوں میں آتی ہے۔'' یہ گیت فلم ''خدا اور محبت'' کا ہے۔

رنگین ''جوش'' جو 1979ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اس نے کامیابی کے جھنڈے لہراتے ہوئے گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا تھا اقبال یوسف کی 17ویں فلم تھی۔ یہ بھی ایکشن مووی تھی۔ اس کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے۔ اس فلم میں ان کی کمپوز کی ہوئی موسیقی میں ناہید اختر کے گیتوں نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کی کاسٹ میں محمد علی، رانی، شاہد، بابرہ شریف، شاہنواز، خالد سلیم موٹا، ساقی، کمال ایرانی، اختر شاد، حنیف، ادیب اور اسلم پرویز شامل تھے۔

1980ء میں ریلیز ہونے والی اقبال یوسف کی 18ویں فلم ''بدنام'' تھی یہ بھی رنگین فلم تھی۔ یہ ایک اصلاحی نوعیت کی فلم تھی۔ اس فلم کے دو موسیقار تھے ناشاد اور ایم اشرف۔ واضح رہے کہ ناشاد کی یہ آخری فلم تھی۔ اس فلم میں محمد علی، وحید مراد، رانی اور بابرہ شریف نے کلیدی کردار کیے تھے۔ یہ فلم توقعات کے مطابق کامیابی حاصل نہ کر سکی تھی۔

اقبال یوسف کی ڈائریکشن میں اگلے سال 1981ء میں تین فلمیں ''گھیراؤ''، ''سنگرام'' اور ''گن مین'' ریلیز ہوئیں۔ یہ اقبال یوسف کی بطور ہدایت کار 19ویں، 20ویں اور 21ویں فلمیں تھیں۔ تینوں ہی فلموں میں محمد علی نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ ان میں سنگرام کے ٹائٹل رول میں محمد علی کی کردار نگاری عروج پر تھی۔ یہ فلم سپرہٹ کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ ''گھیراؤ'' میں اداکارہ شبنم نے وحید مراد کے ساتھ رومانوی جوڑی کے طور پر کام کیا تھا۔ جبکہ ''گن مین'' میں وحید مراد کی جوڑی بابرہ شریف کے ساتھ بنائی گئی تھی۔ اس میں دوسرا ہیئر ممتاز اور آصف خان کا تھا۔ تینوں ایکشن مووی تھیں۔ ''گن مین'' اور ''گھیراؤ'' کے موسیقار طافو تھے۔ جبکہ سنگرام کی موسیقی کمال احمد نے ترتیب دی تھی۔ ''سنگرام'' نے گولڈن جوبلی.... ''گن مین'' اور ''گھیراؤ'' نے سلور جوبلی منائی تھی۔

1982ء میں نمائش پذیر ہونے والی اقبال یوسف کی ہدایات میں بنائی گئی فلم ''پاسبان'' تھی۔ اس کے فلمساز اداکار قوی خان تھے۔ یہ قومی یکجہتی کے موضوع پر بنائی گئی فلم تھی۔ غلام محی الدین، آصف خان، بابرہ شریف، نجمہ، چکوری، قوی خان، سلطان راہی، مصطفیٰ قریشی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ نذر علی اس فلم کے موسیقار تھے۔ یہ اقبال یوسف کی 22ویں فلم تھی جو باکس آفس پر کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اقبال یوسف کی ڈائریکشن میں بننے والی فلم ''آگ کا سمندر'' ان کی 23ویں فلم تھی۔ اس کے فلمساز احمد ملک تھے۔ اس کی کاسٹ میں محمد علی، رانی، شاہد، صاعقہ، اسلم پرویز، ادیب اور شاہنواز شامل تھے۔ یہ ایک ایکشن مووی تھی۔ اس کے موسیقار امجد بوبی تھے۔ 1984ء میں ریلیز ہونے والی اس فلم نے سلور جوبلی کامیابی حاصل کی تھی۔

وحید مراد کی آخری ذاتی فلم ''ہیرو'' کے ہدایت کار

بھی اقبال یوسف تھے۔ جو ان کی 24 ویں فلم تھی۔
1985ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ یہ ندیم اور اقبال یوسف کی واحد مشترکہ فلم تھی۔ اس فلم میں ندیم نے بطور مہمان اداکار کے اداکاری کی تھی۔ ان پر ایک گیت کی عکس بندی کرائی گئی تھی۔ "ہیرو" میں وحید مراد نے بابرہ شریف اور ممتاز کے مقابل ڈبل رول کیا تھا۔ وحید مراد کے بیٹے عادل مراد نے بطور چائلڈ اسٹار وحید مراد کے بچپن کا کردار کیا تھا۔ اس کے موسیقار ایم اشرف تھے۔ یہ ایک تفریحی نوعیت کی فلم تھی۔ یہ فلم کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔

وحید مراد کی بطور اداکار آخری فلم "زلزلہ" کے ہدایت کار بھی اقبال یوسف تھے۔ یہ ان کی بطور ہدایت کار 25 ویں فلم تھی جو ایک ایکشن مووی تھی۔ وجاہت عطرے "زلزلہ" کے موسیقار تھے۔ اس کی کاسٹ میں لالہ سدھیر، وحید مراد، رانی، آصف خان، مسرت شاہین، الیاس کاشمیری، ادیب، ہمایوں قریشی اور سلطان راہی نمایاں فنکار تھے۔ یہ فلم بھی کامیاب نہیں ہوسکی تھی یہ فلم 1987ء میں ریلیز کی گئی تھی۔

اقبال یوسف کی فلم "سن آف ان داتا" بھی 1987ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ یہ ان کی مشہور زمانہ فلم "ان داتا" کا سیکنڈ پارٹ تھی۔ اس فلم میں لالہ سدھیر، آغا طالش، سلطان راہی، بابرہ شریف، غلام محی الدین، عارفہ صدیقی، بابرہ منی، زمرد، آصف خان کے علاوہ گلوکار محمد علی شہکی نے بھی بطور اداکار اداکاری کی تھی۔ اس کی موسیقی بھی کمال احمد نے ترتیب دی تھی۔ یہ سیکنڈ پارٹ مجموعی طور پر پہلے پارٹ "ان داتا" کے معیار سے بہت کم تر تھی۔ لہٰذا اسے متوقع کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اس کی موسیقی بھی کمزور رہی۔ بس لالہ سدھیر اور طالش کی کردار نگاری برقرار رہی۔ یہ فلم اقبال یوسف کی 26 ویں فلم تھی۔ جس کے کریڈٹ میں بس یہ بات تھی کہ یہ ان کی ایک پرانی فلم "ان داتا" کا اگلا حصہ تھی۔

کئی برسوں کے وقفے کے بعد اقبال یوسف کی 27 فلم 1992ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ یہ غفار دانا والا کی فلم تھی اور اس کا نام "راز" تھا۔ یہ فلم اقبال یوسف کی زندگی میں ریلیز ہونے والی آخری فلم تھی۔ اس میں بابرہ شریف، محسن خان، چاندنی، لطیف چارلی، گلاپ چانڈیو، جہاں زیب اور معین اختر نے اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اقبال یوسف نے اس فلم کی موسیقی کے لیے بھارتی موسیقار بابل بوس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ جس نے کمار سونو، انورادھا، کویتا کرشنا مورتی، الکایاگنک جیسے مقبول بھارتی سنگر کی آوازوں میں نغمات کمپوز کیے۔ اس کے باوجود کوئی گیت کلک نہ کرسکا اور یہ فلم ناکامی سے ہمکنار ہوگئی۔

دوستو! یہ تو تھیں اقبال یوسف کی ہدایات میں بننے والی 27 فلمیں جو سینماؤں کی زینت بنیں جبکہ ان کی ایک فلم جو مکمل ہونے کے باوجود ریلیز نہ ہوسکی "ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں" تھی۔ اس کی کاسٹ میں وحید مراد، شمیم آرا، صوفیہ بانو، حنیف اور عندلیب شامل تھے۔ اس فلم کے فلمساز اور مصنف صبا فاضلی تھے۔ اس فلم کی نمائش نہ ہونے کی وجہ معلوم نہ ہوسکی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ فلم اوورسیز میں نمائش پذیر ہوچکی ہے۔

جبکہ اقبال یوسف نے کالا بازار کے نام سے ایک فلم شروع کی تھی جو ادھوری رہ گئی۔

دوستو! اقبال یوسف نے اپنے 32 سالہ فلمی کیریئر میں 28 فلموں کی ہدایات دیں جن میں 27 سینما گھروں کی زینت بنیں۔ ایک بوجہ ریلیز نہ ہوسکی۔ انہوں نے 1960ء میں جس سفر کا آغاز کیا تھا وہ 1992ء میں اختتام پذیر ہوا۔ ان کے والد محترم ایس ایم یوسف کی بھی بڑی فلمی خدمات ہیں۔ انہوں نے بھی کامیاب فلمیں بنا کر پاکستانی فلمی صنعت کو بڑی تقویت پہنچائی ہے مگر مبصرین اور ناقدین کی اجتماعی رائے یہ ہے کہ اقبال یوسف نے اپنے والد سے زیادہ مقبولیت اور کامیابی حاصل کی۔ ان کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ان کے کریڈٹ میں "ان داتا" اور "سنگرام" ایسی شاہکار فلمیں ہیں جو ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ اقبال یوسف کو جاسوسی فلمیں بنانے پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایکشن فلموں کے بھی ماسٹر ڈائریکٹر تھے۔ ایک وقت تھا جب ان کی ایکشن فلمیں ریلیز ہوتیں تو سینماؤں میں کھڑکی توڑ رش ہوتا تھا۔ ان کی ایکشن فلمیں "ٹکراؤ" بیک وقت تین مین تھیٹر میں ریلیز ہوئی تھی کوہ نور، لیرک اور اوڈین میں۔ جو ایک دوسرے سے قریب قریب تھے۔ ان کے علاوہ بھی دیگر سینماؤں میں فلم لگی تھی۔ اس کے باوجود ابتدائی دنوں میں اس کے ٹکٹ کا حصول بہت دشوار تھا۔ کئی کئی گھنٹے لائن میں لگ کر اس کا ٹکٹ حاصل ہوتا تھا۔ ایسا ہی کچھ ان کی دوسری ایکشن فلموں کی نمائش کے وقت ہوتا تھا۔ انہوں نے رومانوی، مذہبی اور قومی یکجہتی کے موضوع پر بھی فلمیں بنائیں مگر ایکشن

فلم کی میکنگ پر انہیں زبردست مہارت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ہدایت کاری کے شعبے میں نمایاں مقام حاصل ہوا۔ ان کا شمار مقبول ترین ہدایت کاروں میں ہوتا تھا۔ انہیں اس بات کا اعزاز بھی حاصل تھا کہ انہوں نے اپنی ایک فلم ''جوش'' اسی نام سے کئی برس بعد بھی بنا کر ایک نئی طرح ڈالی جبکہ اپنی ایک فلم ''ان داتا'' کا سیکنڈ پارٹ بھی بنایا۔

اقبال یوسف کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہدایت کاری کے ساتھ ساتھ اداکاری بھی کرتے تھے۔ انہوں نے چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے اداکاری شروع کی تھی۔ جبکہ بڑے ہونے کے بعد ثانوی کرداروں کے علاوہ بطور ہیرو بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ہمارے ہاں ایسے کئی ہدایت کار ہیں جنہوں نے ایک دو فلموں تک ہی اداکاری کی جیسے خلیل قیصر، انور کمال، مسعود پرویز اور نذر الاسلام وغیرہ جبکہ اسلم ڈار نے کئی فلموں میں زبردست اداکاری کی۔ سید کمال، سنگیتا، رنگیلا، شمیم آرا ایسے ہدایت کار ہیں جو بنیادی طور پر اداکاری سے وابستہ تھے۔ اپنی کامیابی کے بعد انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو ہدایت کاری کے شعبے سے وابستہ کیا۔ جبکہ دلجیت مرزا ابتداء ہی سے اداکاری کے ساتھ ہدایت کاری کرتے رہے۔

اقبال یوسف نے کراچی سے اپنے فنی کیریئر کی ابتداء کی اور ان کے کیریئر کا اختتام بھی کراچی ہی میں ہوا۔ ان کے ریکارڈ میں یہ بات بھی ہے کہ ان کی تمام فلمیں قومی زبان اردو میں ہیں۔ ان کی پہلی اور آخری فلم کراچی میں بنائی گئی تھی جن میں کراچی کے فنکاروں نے کام کیا تھا۔ وہ فلمسازوں کی ڈیمانڈ کی وجہ سے کچھ عرصہ تک لاہور میں رہے اور وہاں فلمیں بنائیں۔ مگر جب فلمی دنیا سے کنارہ کش ہوئے تو واپس کراچی آگئے۔ کراچی ہی میں اقبال یوسف نے اداکار بہار سے شادی کی۔ کراچی میں بننے والی ان کی تیسری فلم ''دال میں کالا'' کی تکمیل کے دوران انہوں نے اس فلم کی ہیروئن سے شادی کرلی۔ اگرچہ ان کے والد نے ان کے اس انتخاب کی مخالفت کی تھی۔ یہ شادی زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوئی۔ انہوں نے دوسری شادی سندھی فلموں کی اداکارہ ماہ پارہ سے کی جبکہ اپنے آخری دور میں ایک غیر ملکی خاتون سے شادی کی۔

ہدایت کار نذرالاسلام نے ایک فلم ''خواہش'' بنائی تھی۔ اس کے فلمساز معین الرحمن نے بعد میں اسے انگریزی زبان میں ڈب کروایا۔ ڈبنگ کے سلسلے میں انہوں نے اقبال یوسف کی خدمات حاصل کی تھیں۔ یہ 1995ء کی بات ہے اقبال یوسف اس ڈبنگ کے سلسلے میں لندن گئے اور اس کام کی تکمیل کے دوران اچانک انہیں دل کا دورہ پڑا اور اسی ہارٹ اٹیک کی وجہ سے وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ اللہ تبارک تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

☆☆☆

واہ! کیا گیت ہے۔

دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں
اک دلربا ہے دل میں جو حوروں سے کم نہیں

یہ پیار بھرا ترانہ کل بھی مقبول عام تھا اور آج بھی اس کی تروتازگی پہلے کی طرح برقرار ہے۔ اسے سن کر آپ کو اس کے گانے والے گلوکار مہدی حسن کی یاد آتی ہے۔ اس کے گیت نگار دکھی پریم نگری کو آپ داد دیتے ہیں کہ واہ وا کیا شاعری کی ہے۔ کبھی اس گانے کی دھن اور لے بنانے والے موسیقار کے بارے میں بھی آپ نے سوچا.....؟ آپ میں سے بہتوں کو اس بات کا بھی علم ہے کہ یہ ہدایت کار شیخ حسن کی فلم ''جاگ اٹھا انسان'' کا نغمہ ہے... مگر اس کی مسحور کن موسیقی کس نے ترتیب دی؟ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ تو آیئے! میں بتاتا ہوں۔ اس گیت کو ہمیشہ زندہ رکھنے والی موسیقی کے کمپوزر کون تھے۔ ان کا نام لعل محمد اقبال تھا۔ یہ ایک نہیں دو موسیقار تھے۔ ایک کا پورا نام لعل محمد تھا دوسرے کا پورا نام بلند اقبال تھا۔ ان کا تعلق کراچی کی فلم انڈسٹری سے تھا۔ انہوں نے اس فلمی صنعت کو اس کے ابتدائی دور میں بہت سہارا دیا۔ دونوں نے مل کر متعدد فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔

موسیقاروں نے جوڑی کی صورت میں برصغیر میں بہت سی فلموں کی موسیقی کمپوز کی ہیں۔ پاکستان میں اصغر علی محمد حسین، غلام نبی عبداللطیف، سلیم اقبال، بخشی وزیر افضل اور ہندوستان میں پنڈت حسن لال بھگت رام، شنکر جے کشن، کلیان جی آنندجی، لکشمی کانت پیارے لال کی جوڑیاں فلموں کی موسیقی ترتیب دیتے رہے ہیں۔ انہی کی طرح لعل محمد اقبال کی موسیقاروں کی جوڑی تھی، جس نے کراچی کی فلموں اور فلم انڈسٹری کی بقا اور استحکام کے لیے بھرپور کردار ادا کیا۔

آیئے! آج اس جوڑی کے بارے میں آپ کی

معلومات میں اضافہ کروں۔ لعل محمد 1923ء میں اودے پور (راجستھان۔انڈیا) میں پیدا ہوئے تھے۔ مارچ 1951ء میں پاکستان آئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ اودے پور (راجستھان) سے میٹرک پاس کیا۔ کراچی آئے تو بطور اسٹاف آرٹسٹ ریڈیو پاکستان کراچی میں ملازمت کی۔ ان کی اولادوں میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔

بلند اقبال، برصغیر کے نامور سارنگی نواز استاد بندو خان کے فرزند ارجمند تھے جبکہ استاد امراؤ بندو خان کے بھائی تھے جو کلاسیکی گائیک تھے۔ بلند اقبال غالباً 1921ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم کلاسیکی موسیقی تک محدود تھی۔ وہ بھی ریڈیو پاکستان کراچی کے اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے ملازم تھے۔

ان دونوں کا آپس میں ملاپ ہوا تو انہوں نے مل کر موسیقی ترتیب دینے کا پروگرام بنایا اور اپنا مشترکہ نام لعل محمد اقبال رکھا۔ ان کی پہلی فلم جس کی موسیقی انہوں نے ترتیب دی وہ فلم ''12 بجے'' تھی۔ جو کراچی کی فلم تھی اور 1961ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ان دونوں نے مل کر تقریباً 35 فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ جن میں اردو، پشتو، سندھی، گجراتی اور بنگالی فلمیں شامل ہیں۔ ان دونوں کی آخری فلم فلمساز سید کمال کی ''سیاست'' تھی جس کی نمائش 1986ء میں ہوئی تھی۔

لعل محمد صاحب چھریرے بدن کے مالک تھے۔ نہایت بذلہ سنج، خوش مزاج اور بہت زیادہ بولنے والے تھے۔ مگر ان کا مخاطب کبھی ان کی گفتگو سے اکتاتا نہیں تھا، بور نہیں ہوتا تھا۔ بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے باوجود ان کی یادداشت قابلِ رشک تھی۔ انہیں اپنے ابتدائی دور سے ہی بنسری بجانے کا شوق تھا۔ جب وہ راجستھان کے شہر اودھے پور میں تھے تو ہندو عورتیں ان سے بہت متاثر تھیں۔ وہ اپنے عقیدے کے مطابق ہاتھ باندھ کر کھڑی رہتیں اور ان کی بانسری کی دھن پر کھوسی جاتیں۔ جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے تو ایک فلم کو دو تین بار دیکھ کر اس کے سارے گانے یاد کر لیتے اور اسکول میں انہیں گا کر ساتھی طالب علموں سے خوب داد وصول کرتے تھے۔

بھارت سے پاکستان وہ کئی قسطوں میں آئے۔ آپ مسکرانے کیوں لگے.....؟ قسطوں والی بات میں نے یوں کہی ہے کہ 11 اگست 1947ء کو وہ پہلی بار اکیلے ہی آئے (یاد رہے کہ پاکستان 14 اگست کو وجود میں آیا تھا)۔ یہاں آ کر انہیں کچھ اچھا نہیں لگا اور وہ کھوکھرا پار کے راستے واپس انڈیا چلے گئے۔ دوسری بار ایک سال کے بعد آئے۔ اس بار بھی یہاں ان کا دل نہ لگا اور وہ پھر راجستھان لوٹ گئے۔ تیسری مرتبہ مارچ 1951ء میں اپنی والدہ اور چار بہنوں کے ساتھ مستقل طور پر پاکستان آ گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کے آنے کے 15 روز بعد سرحد بند ہو گئی اور پھر واپس جانے کا گویا دروازہ ہی بند ہو گیا۔ پاکستان آنے سے پہلے وہ اکثر بمبئی میں اپنے ماموں کے پاس جایا کرتے تھے۔ جہاں کی فلمیں اور فلم اسٹوڈیوز کو دیکھ کر ان کا دل چاہتا تھا کہ کاش میں بھی فلموں اور نگار خانوں سے کبھی رشتہ استوار کر سکوں۔

پاکستان آئے تو انہیں سخت بے کاری اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی ڈیڑھ سال تک ان کی بے کاری اور بے روزگاری برقرار رہی۔ کوئی کام نہ مل سکا.. مگر ایک روز قسمت مہربان ہو گئی۔ ہوا یوں کہ پاکس بے کے سمندری ساحل پر موسیقی کی ایک محفل جاری تھی جس کا انعقاد کراچی کے ایک پارسی سیٹھ ورجینیا نے جرمنوں کے اعزاز میں کیا تھا۔ وہاں لعل محمد کو بانسری بجانے کا موقع ملا۔ انہوں نے بانسری پر اپنے مقبول دھن چھیڑے تو انہیں خوب داد ملی۔ اب اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہاں ریڈیو پاکستان کے معروف براڈ کاسٹر، شاعر اور ڈائریکٹر سجاد سرور نیازی بھی اس محفل میں موجود تھے۔ (ناہید نیازی اور نجمہ نیازی کے والد) انہوں نے اس بانسری نواز نوجوان سے متاثر ہو کر اس سے ملاقات کی اور کہا۔ ''میاں صاحبزادے! کل ریڈیو پاکستان آؤ اور مجھ سے وہاں ملو۔''

''جی.....آپ.....!''

''میرا تعلق ریڈیو پاکستان سے ہے اور میرا نام سجاد سرور نیازی ہے۔ تم وہاں کسی سے بھی کہنا ''مجھے نیازی صاحب نے بلایا ہے۔'' وہ تمہیں میرے پاس پہنچا دے گا۔''

دوسرے دن اللہ کو یاد کرتے ہوئے لعل محمد ریڈیو پاکستان گئے اور نیازی صاحب سے نیاز حاصل کیا۔

سجاد سرور نیازی صاحب لعل محمد کو اپنے قریب دیکھ کر خوش ہوئے۔ ''گڈ! تم آ گئے۔''

''آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔''

''میاں میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے۔'' نیازی

صاحب بولے۔ ''کہ ہمارے ہاں موسیقی کے شعبے میں کوئی بانسری بجانے والا نہیں ہے۔ بولو! ریڈیو کی ملازمت کرو گے؟''

''جناب! ضرور کروں گا۔'' بانسری نواز لعل محمد نے بصد احترام جواب دیا اور اس طرح اتنے دنوں کی بے روزگاری کے بعد انہیں ایک سرکاری نوکری مل گئی۔

نیازی صاحب نے انہیں خوش خبری سنائی۔ ''میاں! تمہیں ماہانہ تنخواہ کے طور پر 12 روپے ملیں گے۔''

''شکریہ۔'' ان سے اس وقت اتنا ہی کہا گیا... کیونکہ اتنے دنوں کی بے روزگاری کے بعد اتنی بڑی تنخواہ پر انہیں ملازمت ملی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر نیازی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ ان کا جی تو چاہتا تھا کہ وہ اور بھی بہت کچھ کہیں۔ بارہ روپے اس دور میں بہت بڑی رقم تھی۔ ان کے لیے یہ بات بھی بہت اچھی تھی کہ ان سے ریڈیو کی روایت اور اصول کے مطابق کوئی آڈیشن نہیں لیا گیا تھا۔ انہوں نے یہ سرکاری ملازمت اس وقت بھی برقرار رکھی جب وہ فلموں کے موسیقار بن گئے تھے۔ ریڈیو میں ترقی کرتے کرتے وہ گروپ نمبر 7 میں سینئر اسٹاف آرٹسٹ کے طور پر ریٹائر ہوئے۔

ریڈیو پر ان سے بانسری بجانے کی ذمے داری کچھ دنوں تک ہی لی گئی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد انہیں بچوں کے پروگراموں میں گیت بنانے کا موقع دیا گیا۔ یہ ان کے لیے آگے بڑھنے کا گویا پہلا قدم تھا۔ اس طرح کمپوزیشن کے میدان میں ان کا داخلہ ہوگیا۔ دوستو! اس زمانے میں وہاں بڑے بڑے فنکار موجود تھے۔ جن میں نہال عبداللہ، رفیق غزنوی اور بعد میں خلیل احمد جیسے بڑے نام شامل ہوئے۔ لعل محمد نے ان بڑے فنکاروں سے بھی بہت کچھ سیکھا اور اپنی فنی صلاحیتوں کو جلا بخشی، استاد بندو خان، امراؤ بندو خان سے انہوں نے کسب فیض کیا۔ استاد بندو خان کے صاحبزادے بلند اقبال سے جو ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ تھے ان سے لعل محمد کی ملاقات ہوئی اور پھر جلد ہی دونوں دوست بن گئے۔

ایک دن یوں ہوا کہ ریڈیو کے ایک سینئر افسر حمید نسیم صاحب ثریا حیدر آبادی کو لے کر آئے اور لعل محمد سے کہا۔ ''یہ ایک گیت ہے۔ اس کی دھن بناؤ اور ثریا حیدر آبادی سے گواؤ۔''

لعل محمد نے ان کے ہاتھ سے وہ پرچی لی جس میں گیت لکھا ہوا تھا اور بصد احترام کہا۔ ''شکریہ! جناب کی توقعات پر کام کرنے کی کوشش کروں گا۔''

لعل محمد اقبال نے اپنے ریڈیو کے دوست بلند اقبال کے ساتھ مل کر اس گیت کی کمپوزیشن کی۔ جس کے بول تھے۔

''مورا دھڑکن لاگا جی۔'' یہ پہلا گیت تھا جس کی مدھر دھنوں کی کمپوزیشن بلند اقبال کی معاونت سے کی تھی جس کے بعد ان کا ایسا جوڑ بنا کہ پھر کبھی نہ ٹوٹا۔ آخری دم تک قائم رہا۔

ثریا حیدر آبادی سے صدا بند کرانے کے لیے لعل محمد اقبال نے جو دھن تیار کی تھی اس کی پسندیدگی پر انہیں مزید گیتوں کی دھنیں تیار کرنے کا موقع فراہم کیا جانے لگا۔ انہی گیتوں میں ایک گیت

زندگی نامہ:

لعل محمد + بلند اقبال۔ مشترکہ نام: لعل محمد اقبال

ولادت: لعل محمد 1923ء میں اودے پور (راجستھان۔ انڈیا) میں پیدا ہوئے تھے اور بلند اقبال 1921ء میں پیدا ہوئے تھے۔

تعلیم: لعل محمد نے اودے پور کے قیام کے دوران میٹرک پاس کیا تھا۔ بلند اقبال کی تعلیم کلاسیکی موسیقی تک محدود تھی۔

ملازمت: لعل محمد مارچ 1951ء میں پاکستان آنے کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی اور ریڈیو پاکستان کراچی میں ملازمت اختیار کی۔

بلند اقبال کراچی ہی کے رہنے والے تھے اور وہ بھی ریڈیو پاکستان کراچی میں بطور اسٹاف آرٹسٹ ملازم تھے۔

پہلی فلم: اس جوڑی کی پہلی فلم ''12 بجے'' تھی۔

فنی سرگرمیاں: ریڈیو کی ملازمت کے ساتھ ساتھ دونوں نے مل کر 35 فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔

آخری فلم: ''سیاست'' تھی جو 1986ء میں ریلیز ہوئی تھی جبکہ ایک فلم ''ہم سب کے باپ'' مکمل ہونے کے باوجود ریلیز نہ ہوسکی۔

اولاد: تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں لعل محمد کی جبکہ بلند کی بھی بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔

نہیں جینے کا یارا، تجھے نہیں گوارا
مجھے دے نہ سہارا، مجھے آوارہ رہنے دے

تھا۔ جس کی دھن بنا کر دونوں موسیقاروں نے اپنے ایک ساتھی انجینئر اختر عباس سے گوایا۔ یہ گیت بے حد مقبول ہوا۔ اس زمانے میں لتا، رفیع اور طلعت محمود جیسے بڑے سنگرز کے فلمی گیتوں کے مقابلے میں نشر ہوتا تھا۔ سینکڑوں فرمائشی خطوط اس گیت کو سننے کے لیے موصول ہوتے تھے۔

ایک دن اسٹیشن ڈائریکٹر زیڈ اے بخاری نے اس بات پر بہت ناراضگی کا اظہار کیا کہ فلمی فرمائش میں ایک غیر فلمی گانے کو کیوں ڈال رکھا ہے؟ تم لوگ ہر روز اسے بجاتے ہو۔ کیا ہے یہ سب کچھ؟ اس زمانے میں وہاں یونس سیٹھی پروڈیوسر تھا۔ اس کا تعلق پشاور سے تھا۔ اس نے پشتو زبان میں ہی بخاری صاحب کو کھری کھری سنادی پھر خطوں کی ٹوکری بخاری صاحب کی میز پر انڈیل کر اس میں مذکورہ گیت کے فرمائشی خط نکالنے شروع کردیئے۔ بخاری صاحب زچ ہوکر بولے۔ ''بابا میری جان چھوڑو اور سناؤ اس گیت کو۔''

دوستو! لعل محمد اور ان کے دوست بلند اقبال ریڈیو کے گیتوں اور غزلوں کی خوبصورت دھن ترتیب دے کر اچھے خاصے مقبول ہوگئے۔ عام لوگوں کے علاوہ شوبز سے تعلق رکھنے والے بھی لعل محمد اور بلند اقبال کی کمپوز کردہ دھنوں کو پسند کرنے لگے۔ اس سلسلے میں اختر عباس کے گیت نے سونے پر سہاگا کا کام کیا تھا۔

1961ء کی بات ہے ایک روز لعل محمد گلوکار احمد رشدی کے ساتھ کراچی کے صدر کے علاقے میں آوارہ گردی کررہے تھے کہ اچانک ان کی ملاقات باقر رضوی سے ہوگئی۔ ابھی علیک سلیک اور خیر خیریت تک ہی بات پہنچی تھی کہ پھوار پڑنے لگی۔ یہ تینوں بھاگ کر ایرانی کے ہوٹل میں داخل ہوگئے۔ ابھی ''ویٹر نے ان کی فرمائش پر چائے نہیں پہنچائی تھی کہ باقر رضوی بولے۔ ''بھائی رشدی! میں ایک فلم بنا رہا ہوں۔''

''گڈ! یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ کیا نام ہے اس فلم کا۔''

''12 بجے۔''

احمد رشدی مسکرائے۔ ''بڑا اچھا اور معنی خیز نام ہے۔ اس کے لیے موسیقار کسے لیا ہے؟''

''ابھی تک تو کسی کو نہیں لیا ہے۔ آپ مشورہ دیں کون بہتر رہے گا؟''

''میرا تو یہی مشورہ ہوگا کہ آپ انہیں (لعل محمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) اپنی فلم کے لیے موسیقار لیں۔ یہ ریڈیو کے مشہور کمپوزر ہیں لعل محمد، آپ نے ان کے ترتیب دیئے ہوئے نغمے نہیں سنے.....؟''

''برابر سنتا ہوں۔ تم کہتے ہو تو میں اپنی فلم ''12 بجے'' کے لیے انہی کو موسیقار لے لوں گا۔''

''رضوی صاحب! آپ کی اطلاع کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ اپنے ایک دوست بلند اقبال کے ساتھ مل کر گیتوں کی کمپوزیشن کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ دونوں مل کر میری فلم کی موسیقی ترتیب دیں۔''

اس طرح اس ملاقات کے بعد لعل محمد اور بلند اقبال نے مشترکہ طور پر باقر رضوی کی فلم ''12 بجے'' کی موسیقی ترتیب دینا شروع کردیں، اور ان کا پہلا فلمی سفر اس فلم کے حوالے سے شروع ہوا۔ اس فلم کے لیے لعل محمد اقبال نے جس گیت کی دھن تیار کی ان کے بول تھے۔ ہار گئی تو سے دل لگا کے (آواز۔ نشی کماری)

بلما جیا ہے ویران (آواز۔ نشی کمار)

اور اپنا یہ پہلا فلمی گیت دونوں نے نشی کماری کی آواز میں ریکارڈ کرایا۔ نام سے تو یہ گلوکارہ ہندو لگتی ہے لیکن حقیقتاً ہندو نہیں مسلمان تھی۔ الہ آباد کے ایک مسلمان مجسٹریٹ کی صاحبزادی تھی جو کراچی یونیورسٹی میں ایم اے اردو میں کررہی تھی۔ اس کا اصل نام نازش خان تھا۔ موسیقاروں کی اس جوڑی نے اس سے دو گیت گوائے تھے۔ اسے گانے کا شوق تھا اور آواز بہت اچھی تھی۔ وہ ایم اے کرنے کے بعد بھارت واپس چلی گئی۔ پھر اس کی شادی کینیڈا میں ہوگئی اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔

نشی کماری کے علاوہ لعل محمد اقبال نے ''12 بجے'' کے لیے جو گیت کمپوز کیے وہ یہ تھے۔

☆ مہکی مہکی فضا، یہ محفل یہ دنیا (ناہید نیازی)
☆ کیا ہنستی ہے تو (مدھوالماس، احمد رشدی)
☆ پی لے جتنا جی چاہے (ناہید نیازی)
☆ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، میرے صنم (ناہید نیازی۔ نذیر بیگم)

''12 بجے'' فلم تو کامیاب نہ ہوسکی کیونکہ یہ عام روش سے ذرا مختلف فلم تھی۔ کاؤبوائے ٹائپ کی فلم تھی جو از دونوں تماشائیوں کو پسند نہیں آئی۔ اس کے لیے موسیقار ور

کی اس نئی جوڑی نے خاصی جدید اور منفرد انداز میں موسیقی ترتیب دی تھی۔ یعنی ماڈرن موسیقی کی ابتداء ہماری فلموں میں لعل محمد اقبال نے ہی کی تھی۔ مگر اس وقت یہ لوگوں کے پلے نہیں پڑی۔ دیگر گانے تو پس منظر میں چلے گئے مگر نشی کماری کا گایا ہوا گیت۔ ''ہار گئی ہار گئی تو سے دل لگا کے۔'' چل پڑا۔ یہی وہ گیت ہے جس پر خواجہ خورشید انور نے لعل محمد کو گلے لگا کر مبارکباد دی تھی۔ نشی کماری کا دوسرا گیت۔ ''بلما جیا ہے ویران۔'' بھی پسند کیا گیا۔ اس کی طرز کا چربہ مشرقی پاکستان کے ایک موسیقار نے اپنی فلم کے لیے کیا۔

''بارہ بجے'' فلم تو نہیں چلی مگر اس کے موسیقاروں کی جوڑی چل پڑی۔ لعل محمد اقبال کو دوسری فلم ''مسٹر ایکس'' مل گئی۔ ابتداء میں اس جوڑی کو ایسی ہی Stunt قسم کی فلمیں ملیں۔ جن میں شاعری اور موسیقی پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا جاتا تھا۔

مسٹر ایکس کے دو گیت جو قدرے پسند کیے گئے۔ یہ تھے

☆ اجی دیکھو جی مڑ کے ذرا
یہ دل نذرانہ ہے تمہارے لیے

یہ گیت وسیم فاروقی اور نگہت سیما کی آوازوں میں ہے۔ دوسرا گیت ☆ یہ کس کے قدموں کی آہٹ ہے
مسعود رانا نے گایا تھا۔ مجموعی طور پر اس فلم کے گانے نہیں چلے۔

اس جوڑی کی اگلی فلم ''میرے لعل'' تھی جس کے فلمساز ایسٹرن اسٹوڈیو کے مالک سعید ہارون تھے۔ پہلے اس فلم کا کچھ اور نام تھا۔ لعل محمد نے ان سے کہا۔

''کہانی کے لحاظ سے تو اس کا نام ''میرے لعل'' ہونا چاہیے۔''

''تمہارا یہ خیال ہے تو پھر یہی نام اس فلم کا ہوگا۔''

سعید ہارون لعل محمد اور بلند اقبال سے بیٹوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام فلموں کی موسیقی لعل محمد اقبال نے ترتیب دی۔

''میرے لعل'' کے ہدایت کار غفار بھائی تھے جو بمبئی سے آئے تھے۔ وہ بہت اچھے فائٹ انسٹرکٹر بھی تھے۔ ''میرے لال'' باکس آفس پر ناکام ثابت ہوئی اور اس کے گانے بھی مقبول نہیں ہوئے۔

لعل محمد اقبال کے اصل کیریئر کا آغاز فلم ''جاگ اٹھا انسان'' سے ہوا۔ یہ اداکار و ہدایت کار شیخ حسن کی فلم تھی۔ انہوں نے موسیقاروں کی اس جوڑی کو بلوا کر کہا۔ ''ہماری فلم میں میوزک دو گے؟''

''جناب عالی! ہم سائیکلوں کی دکان نہیں کرتے۔ ہمارا کام ہی میوزک دینا ہے۔'' بلند اقبال جو ایسی ہی باتیں کرنے کے عادی تھے بولے۔

شیخ صاحب، ان کی دوٹوک بات کرنے پر بہت خوش ہوئے۔ پھر بولے۔ ''بھئی! میں چاہتا ہوں کہ میوزک ایسا ہو کہ مزہ آجائے۔''

''اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی فلم کا میوزک ہٹ ہو تو آپ کو گانے لاہور میں ریکارڈ کرانا ہوں گے۔'' لعل محمد نے کہا۔

''لاہور بھی ہماری فلم انڈسٹری ہے اگر تم لوگ وہاں کی ریکارڈنگ سے مطمئن ہو تو وہیں تمام گانے ریکارڈ کرواؤ۔''

لاہور کی تو ہر بات ہی نرالی تھی۔ وہاں ایک سے بڑھ کر ایک استاد ساز ندے موجود تھے۔ وہاں کے اسٹوڈیو، شاعر، ساؤنڈ ریکارڈنگ سب کچھ اعلیٰ درجے کی۔ ان دنوں وہاں ادھار چلتا تھا۔ یعنی ساز ندے وغیرہ سے کام لیتے رہتے تھے۔ ان کے پیسے دبا کر رکھتے تھے۔ مگر ان دونوں موسیقاروں نے سازندوں کے ساتھ ادھار کا کوئی کاروبار نہیں کیا۔ ان کا سیٹھ کھلے ہاتھ اور کھلے ذہن کا مالک تھا۔ سازندوں کو نقد پیسے فوراً ادا کر دیا کرتے تھے اس لیے انہوں نے ان کو کیش پارٹی سمجھ کر ان کا کام بہت جی لگا کر اور محنت سے کیا۔ دونوں موسیقاروں نے شیخ حسن کی فلم ''جاگ اٹھا انسان'' کی موسیقی کی دھنیں ایسی دل خوش کن بنائیں کہ سننے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔

اس فلم میں گیت کے طور پر داغ دہلوی کی ایک غزل ''بھنویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں۔''

مجرے کے ایک سین میں پیش کرنا تھا۔ اس کی ریکارڈنگ کے لیے اس جوڑی نے مادام نور جہاں کا انتخاب کیا۔ دونوں مہدی حسن کے ساتھ ان سے ملے۔ مادام نے مہدی حسن کے تعارف کروانے پر دونوں موسیقاروں کا پُرتپاک استقبال کیا اور ہچویشن سن کر فوراً گانے کی آمادگی ظاہر کر دی۔ داغ دہلوی کی غزل ملکہ ترنم کی آواز اور لعل محمد اقبال کی دھن نے وہ سماں باندھا کہ یہ غزل اس دور میں بے حد مقبول ہوئی۔

''جاگ اٹھا انسان'' کی کہانی بہت جاندار تھی۔ جسے شیخ حسن نے بڑی ہدایت کارانہ مہارت سے فلم کا روپ دیا تھا۔ اس فلم کی کامیابی میں اس کے میوزک اور گیتوں نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ مہدی حسن کی نورانی آواز میں فلم کا یہ نغمہ سپرہٹ ثابت ہوا۔

دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں۔
اک دلربا ہے دل میں جو حوروں سے کم نہیں

جس کی مقبولیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ اس فلم کے دیگر نغمے بھی اپنی خوبیوں کی وجہ سے کامیاب ہوئے۔ جن کے بول ہیں۔

☆ دل میں بسا یا پیار سے تم نے (مالا۔ مسعود رانا)
☆ گوری ذرا پھر سے بجا بانسریا
☆ جب ساون گھر گھر آئے (مالا اور ساتھی)
☆ بنسی بجائے کوئی ندیا کے پار (مالا)

اس فلم کے گیت میں موسیقاروں کی جوڑی نے ایک نئی چیز متعارف کرائی۔ جسے راجستھان زبان میں ''راسٹرا'' کہتے ہیں۔ لعل محمد چونکہ راجستھانی تھے اس لیے وہاں کے ''راسٹرا'' کے رنگ انہیں یاد تھے اور اسی کو انہوں نے ایک گیت میں استعمال کیا۔ یعنی گاتے وقت لکڑی کے ڈنڈوں کو آپس میں بجانا، اس فلم کا گیت۔

گوری ذرا پھر سے بجا بانسریا

ایک کورس گیت تھا۔ اس میں سنگرز دونوں ہاتھوں میں ڈنڈے لے کر گاتے اور ڈنڈے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ یہ گیت اور اس کا یہ انداز اتنا پاپولر ہوا کہ مہندی کی رسم پر ایسے ہی ڈنڈوں کے ساتھ گیت گائے جانے لگے۔

سوائے داغ دہلوی کی غزل کے اس فلم کے سارے گیت دکھی پریم نگری کے تحریر کردہ تھے۔ دکھی پریم نگری بنیادی طور پر شوبز جرنلسٹ تھے۔ یہ شیخ حسن ہی تھے جنہوں نے ان کو فلم نگاری پر آمادہ کیا۔ جب یہ دونوں بمبئی میں تھے تو شیخ صاحب نے ان سے اپنی ایک فلم کے گانے لکھوا کر انہیں فلمی نغمہ نگار بنا دیا تھا۔ لعل محمد اقبال کی موسیقی اور مہدی حسن کی آواز نے ان کے گیت ''دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں۔'' امر سنگیت بنا دیا۔ آج اس گیت کے تمام تخلیق کار ہمارے درمیان موجود نہیں مگر ان کا یہ گیت زندہ و تابندہ ہے۔ جب تک میوزک لورز باقی رہیں گے یہ گیت اسی طرح اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ سنا جاتا رہے گا۔

''جاگ اٹھا انسان'' کی سپرہٹ کامیابی سے موسیقاروں کی جوڑی لعل محمد اقبال کی قسمت بھی جاگ اٹھی اور وہ صف اوّل کے موسیقاروں میں شمار کیے جانے لگے۔

''اے ابر کرم آج اتنا برس۔'' جسے احمد رشدی نے گایا تھا اور وحید مراد پر پکچرائز ہوا تھا۔ بہت مقبول ہوا۔ یہ فلم 1970ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم سے بھی اس جوڑی کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

لعل محمد اقبال کی فلم ''نادان'' نے تو ان دونوں موسیقاروں کی موسیقی کی وجہ سے تہلکہ مچا دیا۔ گیتوں کے تیور دیکھیے۔

☆ بھولا بھولا میرا نام
☆ سدا سہاگن اپنی دھرتی
☆ سیاں اناڑی سے نیناں لڑا بیٹھی
☆ تیری جبیں سے چودھویں کا چاند جھانکتا رہے
☆ ذرا ٹھمکے پہ ٹھمکا لگا

جیسے گیتوں نے اس فلم کی کامیابی میں کلیدی کردار کیا۔ اس پر ندیم صاحب کی بے ساختہ اداکاری نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

موسیقاروں کی اس جوڑی کا کہنا ہے کہ ''نادان'' کی نمائش کے بعد ندیم صاحب سے ملاقات ہوئی تو ہمیں دیکھتے ہی بولے۔ ''بھائی! یہ کیا گانا بنا دیا تم لوگوں نے۔'' ''ذرا ٹھمکے پہ ٹھمکا'' اب ہر ہدایت کار کی ڈیمانڈ ہے کہ ندیم صاحب سے ٹھمکے لگاؤ۔''

''نادان'' 1973ء میں ریلیز ہوئی تھی جس نے لعل محمد اقبال کو کامیاب موسیقاروں کے صف اوّل پر پہنچا دیا تھا۔

اور پھر جب کراچی میں پہلی پشتو فلم ''یوسف خان شہر بانو'' بنائی گئی تو اس کے میوزک کے لیے بھی موسیقاروں کے اسی کامیاب جوڑی کو دعوت دی گئی۔

''ہم ایک پشتو فلم بنا رہے ہیں۔ آپ اس کی موسیقی دیں گے؟''

''کیوں۔ یہ کیوں پوچھا کہ دیں گے؟''

''اس لیے کہ اب تک آپ نے صرف اردو فلمیں کی ہیں۔''

''ارے صاحب! جس طرح ناچنے والے کو جہاں چاہو نچا دو۔ اگر ناچنا جانتا ہے تو اس کے لیے تو من تیل لانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی طرح موسیقار اگر میوزک

کمپوز کرسکتا ہے تو فلم کسی زبان کی ہو، اس کے لیے کوئی پرابلم نہیں۔ ہم آپ کی پشتو فلم کے لیے بھی خوبصورت موسیقی ترتیب دیں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ دونوں ہی ہماری اس فلم کی موسیقی ترتیب دیں۔'' اور لعل محمد اقبال نے پختون کلچر کو سامنے رکھ کر ''یوسف خان شہر بانو'' کی موسیقی کی دھنیں کمپوز کیں جو پختونوں کی اپنی روایت کے مطابق تھی۔ ایک گانا ''راشہ اوراشہ'' تو بے حد مقبول ہوا۔ پہلی پشتو فلم ہونے کی وجہ سے پٹھانوں نے اس کی زبردست پذیرائی کی۔ جس سینما ٹکٹ کی قیمت چھ روپے تھی وہ سو روپے میں بلیک سے بکا۔ اس فلم کی کھڑکی توڑ کامیابی سے جہاں پشتو فلمیں بنانے کی رسم چل پڑی وہاں لعل محمد اقبال کو یہ فائدہ ہوا کہ دیگر علاقائی زبانوں کی فلموں کے لیے بھی انہیں میوزک دینے کی دعوت ملنے لگی۔ پشتو فلم ''یوسف خان شہر بانو'' کی کامیابی کے بعد اس جوڑی کو دو گجراتی زبان کی فلموں ''ماں تے ماں'' اور ''پارس منی'' کی موسیقی کے لیے منتخب کیا گیا پھر سندھی فلموں حاکم خان، میران جمالی سمیت ''نفرت'' کی موسیقی کی کمپوزیشن بھی اس جوڑے نے کی۔ ڈھاکے کی دو بنگالی فلموں جن میں سے ایک بنگلہ لوک کہانی ''روپ بان سیریز'' کی ایک فلم اور ''مورپنکھی'' نام کی دوسری بنگالی فلم کے لیے ان کی خدمات حاصل کی گئیں۔

موسیقاروں کی اس خوبصورت جوڑی کی آخری فلم ''ہم سب کے باپ'' تھی۔ یہ ہدایت کار جان محمد کی فلم تھی جو ایک شو بھی نہیں چلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جن دنوں یہ فلم بنائی گئی تھی ان دنوں لاہور میں ٹھیکے پر فلمیں بنائی جارہی تھیں۔

ناکام فلم کی بات چلی ہے تو یہ بات بھی ہوجائے کہ اس جوڑی کی بھی کئی فلمیں ناکامی سے ہمکنار ہوئیں۔ چھوٹی بہن، آزادی یا موت، اکیلے نہ جانا، جین بانڈ آپریشن کراچی، دھماکا، آخری حملہ، پتھر کے صنم، سیاست، جانور، جہاں برف گرتی ہے، ہنستے آنسو کے علاوہ بھی کئی فلمیں ہیں۔ مگر ان فلموں کی ناکامی کی وجہ لعل محمد اقبال نہیں۔ ان کی کمزور کہانی، ناقص ہدایت کاری اور دیگر فنی خرابیاں تھیں۔ بہرحال ان ناکامیوں کا داغ اس جوڑی کے دامن پہ بھی لگا۔

ان کی آخری فلم ''ہم سب کے باپ'' مکمل ہونے کے بعد بھی نمائش سے محروم رہی۔ جبکہ 1964ء میں شروع ہونے والی ایک فلم ''پریتم آن ملو'' مکمل ہی نہیں ہوسکی۔

لعل محمد اور بلند اقبال کی دوستی بہت پکی تھی۔ کبھی کبھی دونوں میں کسی بات پر اختلاف بھی ہوجاتا تھا مگر پھر وہ آپس میں مل جل کر معاملات طے کرلیتے تھے۔ جہاں تک پیسوں کا تعلق ہے جو اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتے ہیں۔ اس سلسلے میں دونوں بڑے کھلے دل کے تھے۔ پیسوں کے معاملے میں ان میں کبھی ان بن نہیں ہوئی۔ لعل محمد کہتے تھے۔

''بلند اقبال اپنے نام کی طرح بہت بلند شخصیت کا مالک ہے۔ میں نے چار بہنیں بیاہیں، اپنی شادی کی، کبھی روپے پیسے کا جھگڑا نہیں ہوا۔ اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔''

بلند اقبال نے بھی اپنی شادی کی پھر اپنی بیٹیوں اور بیٹوں کی شادی کی مگر کبھی پیسوں کے سلسلے میں کوئی تنازعہ بات سامنے نہیں آئیں۔ ان کی (بلند اقبال) بیٹیاں زیادہ تھیں، بیٹا ایک ہی تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان دونوں کے بچوں کو موسیقی سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ البتہ بلند اقبال کے ایک داماد نے آرکسٹرا بنایا ہوا تھا۔ لعل محمد کے بچے تو اس قدر نمود و نمائش سے دور رہتے تھے کہ ایک بار جنگ اخبار نے لعل محمد کے حوالے سے ان کی فیملی کی تصاویر چھاپنے کی خواہش ظاہر کی تو ان کے بچوں نے انکار کردیا کہ ہم اپنے گھریلو افراد کو شوبز کے لوگوں کی صف میں کھڑا کرنا نہیں چاہتے۔

لعل محمد اقبال، اپنے دور کے باوقار اور اعلیٰ معیار کے موسیقار تھے۔ وہ اپنے دور کے بڑے اور جید موسیقاروں سے متاثر ضرور تھے مگر کبھی کسی کی نقل نہیں کی۔ دونوں موسیقار اعظم نوشاد سے بہت زیادہ متاثر تھے۔

ان دونوں نے پاکستانی سنگرز میں نور جہاں، احمد رشدی، مالا، مہدی حسن اور آئرن پروین سے زیادہ کام لیا۔ انہوں نے وسیم فاروقی، ایس بی جان کو بھی گانے کا چانس دیا۔ فلم ''چھوٹی بیگم'' کے لیے اس سے گوایا۔ ''تم کو مبارک خوشی۔''

لیکن اپنی سوبر آواز کے باوجود وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ ایس بی جان کی آواز بھی اچھی تھی مگر بس اس کا ایک ہی گیت

تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے
یہ مانا کہ محفل جواں ہے حسیں ہے

کامیاب ہوسکا۔ فلم والوں نے انہیں موقع نہیں دیا اور وہ بس ریڈیو پاکستان کراچی تک ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ ہاں اس کا ایک بیٹا رابن جان کی بورڈ بجانے لگا تھا۔ ایس بی

جان یہاں کی فلموں اور فلم انڈسٹری سے مایوس ہوکر اپنی فیملی کے ساتھ امریکا منتقل ہوگئے۔

خود خورشید انور، ماسٹر عنایت حسین، رشید عطرے، اے حمید اور خلیل احمد اس جوڑی کے پسندیدہ موسیقار تھے۔ خلیل احمد تو کراچی ہی کے باسی تھے۔ ان دونوں نے ان کے ساتھ بھی کام کیا۔ خواجہ خورشید انور کو تو لعل محمد نے اسسٹ بھی کیا۔ جب وہ ''آہنگ خسروی'' کے ریکارڈ بنا رہے تھے۔ اس میں لاہور کے فنکاروں کو تو وہیں ریکارڈ کیا، پھر کراچی کے کلاسیکل فنکاروں کو ریکارڈ کرنے کراچی آئے تو لعل محمد نے HMV کے اسٹوڈیو میں ان کے ساتھ کام کیا۔

زیڈ اے بخاری صاحب کے بارے میں ان دونوں کی رائے سنیے۔ ''ارے صاحب! ایسے فرشتہ صفت انسان اب کہاں پیدا ہوں گے۔ مزاج کے تلخ ضرور تھے لیکن دل کے نہایت صاف۔ ایک بار طبلے بجانے والا بیمار ہوگیا تو اس کے گھر چلے گئے۔''

''ابے کیا ہوا؟ اٹھ گاڑی میں بیٹھ۔ چل کر دوائی لے۔''

ان کے اسٹاف میں سے اگر کوئی مرجاتا تو سب سے پہلے اس کے گھر بخاری صاحب پہنچتے۔

استاد بڑے غلام علی خان کے بارے میں لعل محمد صاحب بتاتے تھے۔ ''پہلے پہل انہیں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ بھائی! وہ تو پہلوان تھے۔ یہ اونچے، لمبے، تھیم تھیم، بڑی بڑی مونچھیں... مگر جب گاتے تو فضا جھوم اٹھتی۔ سبحان اللہ کیا پُرنور گلا پایا تھا۔ ان کی یہاں رہائش بارہ امام تکیہ کے علاقے میں تھی۔ ٹم ٹم پر ریڈیو تشریف لایا کرتے تھے۔ اچھا ہی ہوا کہ بھارت چلے گئے۔ وہاں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی جو یہاں نہیں ہوسکتی تھی۔ ان کو بمبئی کے سب سے اچھے علاقے میں بنگلا دیا گیا اس وقت کے بھارتی وزیراعظم بطور خاص ان کا حال احوال پوچھتے رہتے تھے۔ ایک بار وزیراعظم نے پوچھا۔ ''خان صاحب! کوئی مسئلہ، کوئی کام ہو تو بتا دیجیے گا۔''

کہنے لگے۔ ''سب کچھ موجود ہے کسی چیز کی کمی نہیں۔ بس ایک دیسی گھی اچھا نہیں ملتا۔'' اس پر وزیراعظم کے ساتھ انہوں نے بھی قہقہہ لگایا۔

لعل محمد اقبال ان کی یاد تازہ کرتے ہوئے کہتے تھے۔ ''کیا درویش صفت لوگ تھے۔ جو کمایا لوگوں کو کھلایا۔ سونا پور قبرستان بمبئی کا مشہور قبرستان ہے سارا سارا دن وہیں رہتے۔ بریانی پک رہی ہے۔ گانا ہو رہا ہے۔ شاگردوں کو تعلیم دی جارہی ہے۔ کیا لوگ تھے۔''

''مجھے یہ ساری باتیں... بہت بعد میں ان کے ایک شاگرد کی زبانی معلوم ہوئیں۔'' لعل محمد صاحب نے اپنی معلومات کے بارے میں بتایا۔

ایک بار استاد امراؤ بندو خان کے بارے میں لعل محمد سے پوچھا گیا۔ ''ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

بولے۔ ''بڑے عالم آدمی تھے۔ بھرپور موسیقار اور کلاسیکل گویے۔ امیر خسرو پر تو اتھارٹی تھے۔ استاد بندو خان سارنگی نواز کے بیٹے تھے۔ بلند اقبال انہی امراؤ بندو خان کے بھائی تھے۔

ساٹھ کی دہائی میں موسیقاروں کی اس جوڑی نے بھارتی سنگر مبارک بیگم، سی ایچ آتما اور طلعت محمود کی آوازوں میں متعدد غیر فلمی گیت ریکارڈ کیے تھے۔ ان میں دو نایاب ترین غیر فلمی گیت یہ تھے جو 1964ء میں ریکارڈ کیے گئے تھے۔ دونوں کو طلعت محمود نے گایا تھا۔

☆ بے بسی ہی میری قسمت کا سہارا تو نہیں
☆ آشاؤں کے سپنے ٹوٹے

☆☆☆

اللہ بھلا کرے اس صحافی کا جس نے ایک بار ایک شاعر و نغمہ نگار سے پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں کامیاب گانے کی تخلیق میں سب سے زیادہ کس کا حصہ ہوتا ہے، شاعر کا، موسیقار کا، یا گانے والے کا؟''

شاعر و نغمہ نگار نے جواب دیا۔ ''اس بارے میں، میں یوں کہوں گا کہ اوّلین چیز گیت کے اپنے بول ہوتے ہیں۔ دوئم اس کی دھن، سوئم گلوکار کی آواز اور چہارم ریکارڈنگ۔''

یہ صحافی شمیم حیدر نقوی تھے اور شاعر و نغمہ نگار صہبا اختر، اور ان کے درمیان یہ بات چیت 1967ء میں ہوئی تھی۔

بات بہت پرانی ہے لیکن بہت سچ ہے۔ حق ہے، مگر ہمارے ہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔ سب سے زیادہ اہمیت سنگر کو دی جاتی ہے۔ اس کے بعد موسیقار کو اور بے چارے نغمہ نگار کو تو بسا اوقات گیت یا گانے کی کامیابی کا حصہ دار ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ گیت کے بول جب

انمول ہوتے ہیں تب ہی گانا کلک کرتا ہے۔ سننے والے گیت کے بول ہی پر دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اچھی موسیقی اور اچھی آواز گانے کے حسن میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ ذرا ان گیتوں اور ان کے بولوں پر غور کیجئے۔

☆ چاند کی بیج پہ تاروں سے سجا کر سہرا
☆ جنم جنم تیرا میرا ساتھ رہے گا
☆ تنہائی تھی اور ہمیشہ سے تنہا ہے زندگی
☆ سدا سہاگن اپنی دھرتی
☆ اک اڑن کھٹولا آئے گا

یہ نغمے اگر روزِ اوّل کی طرح آج بھی تر و تازہ ہیں تو کیا یہ موسیقی اور ان کے گانے والوں کی آواز کے حوالے سے زندہ ہیں یا اپنے انمول بول کی وجہ سے.....؟

نغمہ نگار صہبا اختر نے صحافی شمیم حیدر نقوی کو جو جواب دیا تھا۔ اس کی منہ بولتی مثال صہبا اختر ہی کے گیتوں کے یہ بول ہیں۔

پہلا گیت چاند کی بیج.....فلم ''جھک گیا آسمان'' کا ہے۔ یہ فلم 1970ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

دوسرا گیت۔ جنم جنم.....فلم ''پروفیسر'' کا ہے۔ یہ فلم 1973ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

تیسرا گیت۔ تنہائی.....فلم ''جلتے ارمان بجھتے دیپ'' کا ہے۔ یہ فلم ریلیز نہیں ہوسکی تھی۔ مگر 70 کی دہائی ہی کی تھی۔

چوتھا گیت۔ سدا سہاگن.....فلم ''نادان'' کا ہے۔ جو نمائش پذیر ہوئی تھی 1973ء میں۔

پانچواں گیت۔ اک اڑن کھٹولا.....فلم ''جین بونڈ 008 آپریشن کراچی'' کا ہے۔

بتانے کا مقصد یہ ہے کہ 70 کی دہائی کی فلموں کے گیت اگر آج بھی کانوں کو بھلے لگتے ہیں اور شوق سے سنے جاتے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ اس کے سنہرے اور انمول بول ہیں۔ بے شک دیپو بھٹہ چاریہ، اور نثار محمد اقبال کی موسیقی اور احمد رشدی، مہدی حسن اور رونا لیلیٰ کی آوازوں کا بھی حسن ان میں شامل ہے مگر ان کی مقبولیت کا اصل سبب ان کے بول ہیں۔

کراچی کے شاعروں اور نغمہ نگاروں میں صہبا اختر کا بھی ایک اہم کردار ہے۔ وہ کوئی تک بند شاعر نہیں تھے۔ ایک مستند اور ادبی دنیا میں ایک باوقار شخصیت کے حامل تھے۔ وہ پہلے شاعر تھے۔ نغمہ نگار بعد میں بنے اور جب نغمہ نگاری کی تو اس میں ادبیت کو بھی برقرار رکھا۔ وہ کہتے تھے۔

''میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ فلمی شاعری ادبی شاعری کی ضد نہ ہونے پائے۔ حالانکہ فلم بنانے والوں کا پورا زور ہوتا ہے کہ گیت بازاری زبان میں ہوں یا کم از کم چھ آنے والے معیار کے ہوں۔ مگر میں نے اپنے گیتوں میں ''ادبیت'' کو فراموش نہیں ہونے دیا... کیونکہ شاعری بہر حال شاعری ہے اور اسے شاعری ہی رہنا چاہیے۔''

صہبا اختر شاعر بھی تھے اور فلمی نغمہ نگار بھی اس لیے بہتر ہوگا کہ اس وقت کچھ ان کے بارے میں بھی آپ کی معلومات میں اضافہ کروں۔

صہبا اختر اپنی پیدائش کے بارے میں کہتے ہیں۔

زندگی نامہ

اصل نام: اختر علی رحمت۔ ادبی نام: صہبا اختر
پیدائش: 30 ستمبر 1931ء۔ مقام: جموں
والد: منشی رحمت علی رحمت، پنجاب کے شہر امرتسر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ شاعر، موسیقار، ڈراما نویس، اسٹیج ڈائریکٹر اور اسٹیج ایکٹر تھے۔ آغا حشر کاشمیری کے ہم عصروں میں تھے۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم بریلی کے ہائی اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں انہوں نے ایف ایس سی تک تعلیم حاصل کی۔

ملازمت: مختلف ملازمتیں کیں۔ اندرونِ سندھ لاکھڑا میں تیل کی تلاش میں کمپنی کی سخت ملازمت کی۔ پھر انکم ٹیکس کے محکمے میں کلرکی، کچھ دنوں بعد محکمہ خوراک میں فوڈ انسپکٹر مقرر ہوگئے اور اسی ملازمت کے دوران 1987ء میں ریٹائرمنٹ لے لی۔

نغمہ نگاری: ''پریتم آن ملو'' تھی۔ یہ ہدایت کار اے ایچ صدیقی کی فلم تھی۔ اس کے موسیقار لعل محمد اقبال تھے۔ گلوکار بھارتی سنگر سی آتما تھے مگر یہ فلم مکمل نہ ہوسکی۔

اعزازات: آدم جی ایوارڈ، ستارۂ ادب، شاعر پاکستان، صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی۔

انتقال: تھوڑے دنوں کی علالت کے بعد 19 فروری 1996ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے موت کے وقت ان کی عمر 65 تھی۔

میں اتفاقیہ طور پر جموں میں پیدا ہوا۔ مگر جموں سے میرا کوئی نسلی یا ذہنی رشتہ نہیں۔ میرے والد منشی رحمت علی رحمت پنجاب کے شہر امرتسر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے، موسیقار بھی تھے، ڈراما نویس بھی تھے، اسٹیج ڈائریکٹر بھی تھے اور اسٹیج ایکٹر بھی۔ ان کے ڈراموں کو ہندوستان بھر میں شہرت حاصل تھی۔ ان کے مشہور ڈرامے، دردِ جگر، تصویر رحمت، باوفا قاتل، جلادِ عاشق، محبت اور محبت کا پھول ایسے تھے جو ہفتوں نہیں مہینوں ایک ایک شہر میں اسٹیج کیے جاتے تھے۔ وہ آغا حشر کاشمیری کے ہم عصروں میں تھے۔

صہبا اختر 30 ستمبر 1931ء کو جموں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین نے ان کا نام اختر علی رحمت رکھا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور پرورش یوپی کے ایک شہر بانس بریلی میں ہوئی۔ بریلی سے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی پھر مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے۔ جہاں صرف ایف ایس سی ہی تک تعلیم حاصل کی۔ کیونکہ مالی مسائل کی وجہ سے تعلیم جاری رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ اسکول کے زمانے ہی سے ان کی خوبیاں اجاگر ہونے لگی تھیں۔ وہ ایک اچھے طالب علم ہی نہیں، اچھے مقرر بھی تھے۔ اسکاؤٹنگ میں بھی حصہ لیتے تھے۔ ذہنی اور جسمانی طور پر بہت مضبوط اور قد کاٹھ والے تھے۔ وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے اور ان کی عمر چودہ پندرہ سال ہوگی کہ انہوں نے شعر گوئی شروع کردی۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو وہاں بھی تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ شاعری اور فن تقریر کو جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ آزادی کے موضوع پر نظمیں کہتے اور اس قدر پُراثر تقاریر کرتے تھے کہ تحریک پاکستان کے لیڈروں نے جب سندھ میں تحریکِ پاکستان کی آگاہی کے لیے وفد بھیجا تو اس میں نوجوان صہبا اختر بھی شامل تھے۔ وفد کا مقصد مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد سے سندھ کے عوام کو آگاہ کرنا تھا اور آزادی کی کوششیں تیز کرنا تھی۔ وفد سندھ مدرسۃ الاسلام کے ہاسٹل میں ٹھہرا۔ کراچی میں قیام کے دوران ان کو قائداعظم سے ملاقات کا بھی شرف حاصل ہوا۔

1947ء میں پاکستان عالم وجود میں آیا تو صہبا اختر اپنی والدہ اور گھر کے دیگر افراد کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان آگئے اور کراچی کو اپنا مسکن قرار دیا اور عمر عزیز کا باقی حصہ اسی کراچی میں گزارا۔

کراچی آنے کے بعد جب روٹی روزی کا مسئلہ درپیش آیا تو مختلف ملازمتیں کیں۔ اندرون سندھ لاکھڑا کے مقام پر تیل کی تلاش کا سخت مشقت والا کام کیا، پھر محکمہ انکم ٹیکس میں کلرکی کی۔ اس کے ساتھ اسلامیہ کالج کراچی میں داخلہ بھی لیا لیکن ادھوری تعلیم مکمل کرنے کی آرزو پوری نہ ہوسکی۔

ان کی اپنی ادبی سرگرمیاں تو اپنے طور پر اس وقت بھی جاری تھیں مگر ان کے آگے کوئی گھاس ہی نہیں ڈالتا تھا۔ اخبار اور رسائل ان کا کلام شائع نہیں کرتے تھے۔ ریڈیو میں بھی ان کو کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ مشاعروں میں از خود چلے جاتے لیکن انہیں سنانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس برے اور کڑے وقت میں ان کی دوستی اختر انصاری اکبر آبادی سے ہوگئی۔ اختر انصاری اکبر آبادی حیدر آباد سندھ سے ایک جریدہ ''نئی قدریں'' شائع کرتے تھے۔ ان کی وساطت سے صہبا اختر حفیظ ہوشیار پوری سے ملے۔ حفیظ ہوشیار پوری ریڈیو پاکستان کراچی میں ڈائریکٹر کے درجے کے افسر تھے جو خود بھی غزل کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ناصر کاظمی بھی ان کے شاگرد تھے۔ حفیظ ہوشیار پوری نے صہبا اختر کو ادبی پنڈتوں سے ملوانا شروع کیا۔

صہبا کی اور ان کی شعر گوئی کی تعریف کی۔ حفیظ صاحب کی کوششوں سے صہبا اختر کے گمنامی کے بادل چھٹنے لگے۔ حفیظ صاحب خود بھی کئی چھوٹے بڑے مشاعروں میں صہبا کو اپنے ساتھ لے کر گئے اور پھر جلد ہی انہیں مشاعروں میں مدعو کیا جانے لگا۔ صہبا جہاں اور جس مشاعرے میں شریک ہوتے اپنے اعلیٰ معیار کے کلام اور پڑھنے کے خاص انداز سے مشاعرہ لوٹ لیتے۔ اب صہبا اختر کی پہچان ایک مستند شاعر کی حیثیت سے ہوگئی۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ایک دروازہ کھلتا ہے تو پھر دوسرا دروازے بھی کھلنے لگتے ہیں تو ایسا ہی کچھ صہبا اختر کے ساتھ بھی ہوا۔ حفیظ ہوشیار پوری صاحب کے ایک دوست اعجاز احمد محکمہ خوراک میں جوائنٹ سیکریٹری تھے۔ ان کہہ کر صہبا کو متعلقہ محکمہ میں فوڈ انسپکٹر لگوادیا۔ اب صہبا کی کلرکی سے جان چھوٹی اور زندگی سنورگئی۔ اس بات کو اختر یاد کرکے کہتے تھے۔

''اللہ بہت بڑا ہے۔ کہاں وہ وقت تھا کہ اس شہر مجھے آدھی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی اور کہاں اللہ نے یہ عزت بخشی کہ شہر کے رزق کی تقسیم میرے ہاتھ ہونے لگی۔''

صہبا اختر نے اپنی ملازمت پوری دیانتداری سے کی۔ اس بارے میں وہ کہتے تھے۔ ''پوری ملازمت کے دوران میری کوشش اور خواہش رہی کہ اس شہر میں کوئی کبھی روٹی کو نہ ترسے۔''

صہبا اختر نے شاعری اور ملازمت میں مناسب توازن برقرار رکھا۔ جب انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ وقت کی کمی اور خرابی صحت کی وجہ سے اب یہ توازن قائم نہیں رکھا جاسکتا تو 1987ء میں ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ اس تغیر کے بارے میں صہبا اختر نے ایک بار اپنے ایک ریڈیو انٹرویو میں کہا تھا۔ ''ایک وہ وقت تھا جب کوئی اخبار اور رسالہ مجھے شائع نہیں کرتا تھا۔ ریڈیو پر میں اپنی نظمیں پڑھ سکوں، یہ بھی میرے لیے خواب ہی تھا۔ حفیظ ہوشیار پوری صاحب کی مہربانی نے میری کایا پلٹ دی، اور ایک ایسا وقت آیا کہ اسی ریڈیو کے اجارہ دار میرے طویل غنائیے، منظوم ڈرامے، غزلیں، گیت، حمد و نعت اور سلام، سب کچھ اسٹاف آرٹسٹ کے طور پر نشر کرنے پر مجبور تھے۔''

1960ء کی دہائی صہبا اختر کی خوش بختی کا دور تھا۔ اس دور میں ان کی شمولیت ہی مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی اس لیے ان کی موجودگی مشاعروں کی ضرورت قرار دے دی گئی۔ دوسری طرف چھوٹے بڑے اخبار و رسائل ان کے کلام کو حاصل کرنے کی کوشش میں رہتے۔ انہی دنوں کی بات ہے فخر ماتری صاحب نے اردو روزنامہ ''حریت'' نکالا تو انہوں نے صہبا اختر سے کہا۔ ''صہبا صاحب! آپ ہر ہفتہ ''حریت'' کے لیے ایک نظم لکھیں۔'' روزنامہ ''حریت'' میں ان کی نظموں کی عوامی پسندیدگی کے بعد روزنامہ ''مشرق'' میں بھی ان سے نظمیں اور قطعات لکھوائے جانے لگے۔ ریڈیو پاکستان صہبا اختر کے لکھے قومی نغمات بار بار نشر کرنے لگا۔

1964ء سے کراچی میں پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات شروع ہوئیں تو صہبا اختر کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ ان کے کئی گیت مختلف گانے والوں کی آوازوں میں ٹیلی کاسٹ ہونے لگے۔

ریڈیو پاکستان کراچی کی موسیقار جوڑی لعل محمد اقبال، کراچی میں بننے والی فلموں کی موسیقی ترتیب دیا کرتے تھے۔ اس جوڑی نے صہبا اختر کو فلموں کی گیت نگاری پر مائل کیا۔ ان کا سب سے پہلا فلمی گیت فلم ''پریتم آن ملو'' کا تھا اور اسے بھارت کے مشہور سنگر سی ایچ آتما کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ سی ایچ آتما چند روز کے لیے کسی کام سے پاکستان آئے تھے کہ ہدایت کار اے ایچ صدیقی نے اپنی زیر تکمیل فلم ''پریتم آن ملو'' میں ان سے ایک گیت صدا بند کروایا۔ اس گیت کے لیے صدیقی صاحب نے اپنے موسیقار لعل محمد اقبال سے کہا۔ ''کسی شاعر سے ایک اچھا سا گیت'' فلم کی کسی سچویشن کی مناسبت سے لکھوالو۔''

اور لال محمد اقبال نے سی ایچ آتما سے گوانے کے لیے صہبا اختر سے کہا۔ ''یار! ذرا جھٹ پٹ ایک گیت لکھ دو۔''

''کیوں۔ کیا کرو گے۔ جھٹ پٹ لکھوایا ہوا یہ گیت؟''

''تمہاری قبر پر بیٹھ کر ہم قوالی گائیں گے۔'' بلند اقبال نے جھنجلا کر کہا۔ لعل محمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہ یار! بھارتی گلوکار سی ایچ آتما سے ریکارڈ کروانا ہے۔''

''سی ایچ آتما سے ریکارڈ کرانے کی کیا ضرورت آن پڑی؟ کیا بھارت جا کر یہ گانا ریکارڈ کرو گے؟''

''ارے نہیں یار! وہ پاکستان آیا ہوا ہے۔ کراچی میں اس کی موجودگی سے اے ایچ صدیقی صاحب فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اپنی فلم ''پریتم آن ملو'' میں اس کا گایا ہوا گانا شامل کرنا چاہتے ہیں۔''

''اچھا..... یہ بات ہے۔'' اور پھر لعل محمد اقبال کے بنائے ہوئے طرز پر صہبا اختر نے گیت لکھ دیا۔ جس کے بول تھے۔

چندا تجھ سے ملتا جلتا اور بھی تھا اک چندا
تو نے دیکھا ہو تو بتا

یہ گانا لکھا گیا۔ سی ایچ آتما کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا اور فلم ''پریتم آن ملو'' میں شامل بھی کر دیا گیا مگر شومی قسمت کہ یہ فلم کسی وجہ سے مکمل نہ ہوسکی۔ جس کا افسوس صہبا اختر ہی کو نہیں ہوا لعل محمد اقبال اور اے ایچ صدیقی کو بھی ہوا۔

مگر صہبا اختر سے فلمی گیت لکھوانے کا لعل محمد اقبال کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا اس لیے انہوں نے اپنی اگلی فلم ''چھوٹی بہن'' کے لیے بھی صہبا اختر ہی سے نغمہ نگاری کروائی جس کے بول تھے۔ ''اشکوں کے دیئے صدقے تجھ پر۔''

اسے نگہت سیما کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا اور یہ

صہبا اختر کا وہ پہلا گیت تھا جو کسی فلم کا تھا اور سینما گھروں میں یہ فلم ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کی نغمہ نگاری سے لعل محمد اقبال کے اعتماد میں اور پختگی آئی اور انہوں نے اپنی اگلی فلم ''آزادی یا موت'' کے تمام نغمے صہبا اختر سے لکھوائے۔ جن میں

☆ میرا چن ماہی پاکستان
☆ دنیا جانے میرے وطن کی شان
☆ شیروں کا یہ نغمہ گونجا آزادی یا موت

یہ نغمے پسند کیے گئے۔ جن کو عالم لوہار اور احمد رشدی نے صدا بند کرائے تھے۔

ان کی بطور فلمی نغمہ نگار اگلی فلم ''اکیلے نہ جانا'' تھی۔ اس فلم کے گیت مہدی حسن اور نسیمہ شاہین کی آوازوں میں ریکارڈ کیے گئے تھے۔

ان فلموں کے علاوہ ''میرے لعل''، ''میرے بچے میری آنکھیں''، ''پھر صبح ہوگی''، ''سمندر''، ''اشارہ''، ''بھنگ گیا آسماں''، ''جین بونڈ 008 آپریشن کراچی''، ''نادان'' اور ''پروفیسر'' کے لیے بھی صہبا اختر سے گیت لکھوائے گئے۔ ان کے علاوہ بھی ان کی کچھ اور فلمیں ہیں... جن میں ایک فلم ''جلتے ارمان بجھتے دیپ'' بھی ایک فلم ہے جو مکمل ہونے کے بعد بھی ریلیز نہیں ہو سکی۔

صہبا اختر کے کچھ غیر فلمی گیت بھی مقبول ہوئے... جن میں

☆ میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے۔

جس کی موسیقی سہیل رعنا کی تھی اور آواز محمد علی شہکی کی

☆ تیرے قدموں کو چوموں گا
مجھے تو پاس آنے دے

یہ زہیب حسن اور نازیہ حسن کی آواز میں صدا بند ہوا اور ان کے کیسٹ ڈسکو دیوانے میں شامل ہے۔

صہبا اختر نے پاکستان ٹیلی ویژن کے موسیقی کے پروگرام ''امنگ'' کے لیے بھی کئی خوبصورت گیت لکھے جو عوامی پسندیدگی کے معیار پر پورے اترے۔

شاعر اور نغمہ نگار بھی انسان ہوتا ہے اور انسانوں ہی کی طرح اس کا موڈ مزاج بھی ہوتا ہے۔ صہبا اختر اچھے شاعر اور اچھے نغمہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے مگر ان کا لائف اسٹائل دوسروں سے کچھ الگ تھا۔ بظاہر وہ بڑے سخت طبیعت کے لگتے تھے مگر اندر سے بہت گداز تھے۔ کچھ لوگ انہیں ایک ہیڈ ماسٹر کی طرح کڑک انسان سمجھتے تھے مگر جب وہ ان کے بہت قریب ہوتے تو انہیں اندازہ ہوتا کہ یہ گرفتگی ان کی سخت اصول پسندی کی ہے مزاجاً وہ بہت نرم اور سوفٹ ہیں۔

نامور ادیب ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صہبا اختر کے بارے میں کہتے ہیں۔ ''یہ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے ساری زندگی کبھی کسی کی غیبت نہیں کی۔''

صہبا اختر کی شخصیت کی طرح ان کی شاعری بھی ستھری اور نکھری ہوئی تھی۔ ان کا نام شاعری کی ہر صنف میں معتبر ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز روایتی غزل سے کیا۔ شائستگی، تہذیب، نفاست اور الفاظ کا چناؤ ان کی غزل میں جا بجا دکھائی دیتا ہے۔

انہوں نے حمد، نعت، سلام، مرثیہ، نظم، قطعات اور رباعیات، سب میں طبع آزمائی کی۔ وہ شاعر تو اچھے تھے ہی، وطن کی محبت ان کی پہچان اور شناخت بن گئی۔ ان کے وطن دوست نغموں کو بہتوں نے وقتی ابال کہہ کر رد کرنے کی کوشش کی لیکن صہبا اختر وطن سے محبت کا اظہار کرتے رہے۔ ان کی اس لگن اور جذبے کو دیکھتے ہوئے وطن سے محبت کرنے والوں نے انہیں ''شاعر پاکستان'' کے خطاب کا حقدار قرار دیا۔ ان کی حب الوطنی کسی بھی قسم کی سیاسی گروہ بندی سے پاک تھی۔ وہ زندگی کی آخری سانسوں تک پاکستانیت کے علم بردار رہے۔ اس کی دلیل پیٹریاٹ پاکستانیز دبئی کا 1995ء والا مشاعرہ ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی دبئی کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے تھے۔ ان کو یہ ''خالص پاکستانی مشاعرہ'' کہا کرتے تھے۔ صہبا اختر صاحب کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ ڈاکٹروں نے انہیں سفر کرنے سے منع کیا تھا... مگر وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر مشاعرے میں آئے کیونکہ یہ مشاعرہ پاکستان کے نام پر ہو رہا تھا۔ ان کے اس جذبے سے متاثر ہو کر پروگرام انتظامیہ نے ان کو ''شاعر پاکستان'' کا خطاب دیا اور اگلے سال 19 فروری 1996ء میں وہ پاکستان کی محبت دل میں لیے راہی ملک عدم ہو گئے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

صہبا اختر کی چار تصانیف ان کی زندگی میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ جو یہ ہیں ''سرکشیدہ'' یہ نظموں، آزاد نظموں غزلوں، رباعیات، دوہے اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ جو 1997ء میں شائع ہوا۔

''اقراء'' نعتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ 1981ء میں منظ

عام پر آیا۔

''سمندر'' اس میں طویل نظمیں شامل ہیں۔ اس کی اشاعت 1984ء میں ہوئی ''مشعل'' یہ قومی نظموں کا مجموعہ ہے۔ 1995ء میں منصۂ شہود میں آیا۔

صہبا اختر صاحب کی ادبی خدمات پر انہیں جو اعزازات ملے وہ یہ ہیں۔ آدم ایوارڈ انہیں ''سپر کشیدہ'' پر دیا گیا۔ 1977ء میں۔

''ستارۂ ادب'' جشن کورنگی کراچی کے موقع پر 1974ء میں دیا گیا۔

''شاعرِ پاکستان'' پاکستان پیٹریاٹ پاکستانیز دبئی کی جانب سے 1995ء میں دیا گیا۔

صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی۔ ان کی وفات کے بعد 1996ء میں دیا گیا۔

☆☆☆

ادبی شاعری اور فلمی شاعری کے بارے میں صہبا اختر کی یہ رائے تھی کہ ادبی شاعری اور فلمی شاعری دو جداگانہ چیزیں ضرور ہیں مگر میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ فلمی شاعری ادبی شاعری کی ضد نہ ہونے پائے۔ میں نے اپنے گیتوں میں ادبیت کو کبھی فراموش ہونے نہیں دیا کیونکہ شاعری ہی رہنا چاہیے۔

صہبا اختر کہتے تھے۔ فلمی گانوں میں بھی وزن اور تراکیب کی پابندی ہونی چاہیے یا کم از کم آہنگ موسیقی سے الگ نہ ہونا چاہیے۔ میں بے معنی اور لغو اضافتوں کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے فلمی شاعری میں موسیقیت اور آہنگ سب سے زیادہ اہم نظر آتے ہیں۔ فلمی نغموں کے لفظوں کو خود بھی گنگناتا ہوا ہونا چاہیے۔ اگر انہیں دھن سے علیحدہ بھی پڑھا جائے تو ان کی موسیقیت کی گونج پڑھنے والا محسوس کرے۔ جتنی موسیقی لفظوں میں ہوگی اتنی ہی دھن میں خوبصورتی پیدا ہوگی۔

صہبا اختر کو اکثر فلمسازوں اور ہدایت کاروں سے اس بات کی شکایت رہتی تھی کہ بسا اوقات وہ بجائے شاعر کی ذاتی صلاحیتوں پر اعتماد کرنے کے انہیں طرح طرح سے بے محل اور بے تکے مشورے دیتے رہتے ہیں اور شاعر کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کی پابندی کرے۔ ان کے خیال میں یہ طریقہ بہت غلط ہے... کیونکہ اس طرح گیتوں کا معیار بجائے بلند ہونے کے روز بروز پست ہی ہوتا جائے گا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک واقعہ کا ذکر بھی کیا۔ وہ واقعہ یہ تھا۔

ایک مرتبہ ایک فلمساز نے انہیں مشہور بھارتی نغمہ نگار مجروح سلطان پوری کا ایک مصرعہ دیا اور ان سے کہا۔

''بس اس میں گرہیں لگا دو''

صہبا اختر کو اس فلمساز کی ذہنیت پر بڑا افسوس ہوا اور انہوں نے فلمساز سے صاف صاف کہہ دیا ''یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا... کیونکہ ایسا خیال کرنا بھی میرے لیے تضحیک آمیز اور باعث شرم ہے۔''

ایک ایسے ہی شرمناک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے صہبا اختر نے بتایا۔ ایک پروڈیوسر صاحب ایک بار مجھ سے ملے اور کہنے لگے۔ ''آپ کا بڑا نام سنا ہے۔ آپ ذرا ہماری فلم کے لیے بھی کچھ لکھ دیجیے۔''

زندگی نامہ

اصل نام: اختر علی رحمت۔ ادبی نام: صہبا اختر
پیدائش: 30 ستمبر 1931ء۔ مقام: جموں
والد: منشی رحمت علی رحمت، پنجاب کے شہر امرتسر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ شاعر، موسیقار، ڈراما نویس، اسٹیج ڈائریکٹر اور اسٹیج ایکٹر تھے۔ آغا حشر کاشمیری کے ہم عصروں میں تھے۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم بریلی کے ہائی اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں انہوں نے ایف ایس سی تک تعلیم حاصل کی۔

ملازمت: مختلف ملازمتیں کیں۔ اندرونِ سندھ لاکھڑا میں تیل کی تلاش میں کمپنی کی سخت ملازمت کی۔ پھر انکم ٹیکس کے محکمے میں کلرکی، کچھ دنوں بعد محکمہ خوراک میں فوڈ انسپکٹر مقرر ہوگئے اور اسی ملازمت کے دوران 1987ء میں ریٹائرمنٹ لے لی۔

نغمہ نگاری: ''پریتم آن ملو'' تھی۔ یہ ہدایت کار اے ایچ صدیقی کی فلم تھی۔ اس کے موسیقار لعل محمد اقبال تھے۔ گلوکار بھارتی سنگر سی ایچ آتما تھے مگر یہ فلم مکمل نہ ہوسکی۔

اعزازات: آدم جی ایوارڈ، ستارۂ ادب، شاعرِ پاکستان، صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی۔

انتقال: تھوڑے دنوں کی علالت کے بعد 19 فروری 1996ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملے موت کے وقت ان کی عمر 65 تھی۔

میں نے کہا۔ ''بسر وچشم۔ یہ بتایئے کہ سچویشن کیا ہے؟''

فرمانے لگے۔ ''سچویشن یوں ہے کہ ہماری فلم کا ہیرو اپنے دوست سے کافی عرصہ کے بعد ملتا ہے۔ جس پر ہیرو کا دوست بہت خوش ہوتا ہے اور فرطِ مسرت سے اپنے گھر میں زنخوں (ہجڑوں) کے ڈانس کا اہتمام کرتا ہے۔ بس آپ انہی پر پکچرائز ہونے والے نغمے کے بول لکھ دیں۔''

سچویشن سن کر میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے فلمساز کو یہ مشورہ دیا۔ ''بہتر یہ ہوگا کہ آپ کسی ہیجڑے شاعر سے رجوع کریں... کیونکہ ہیجڑوں پر پکچرائز ہونے والے نغمہ کے بول اس سے بہتر کوئی اور نہیں لکھ سکتا۔''

صہبا اختر موڈ میں ہوتے تو بڑے مزے مزے کے واقعات کا ذکر کرتے تھے ایک بار انہوں نے کہا۔ ''یوں تو زندگی ہی واقعات وحادثات کا دوسرا نام ہے مگر آپ کو میں ایک ایسا واقعہ سناؤں گا جو مجھے اچانک یاد آگیا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب بھارت کے نامور گلوکار سی ایچ آتما مختصر دورے پر کراچی آئے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں ہدایت کار اے ایچ صدیقی اور موسیقار لعل محمد اقبال کی کوشش تھی کہ ان کی فلم ''پریتم آن ملو'' کے لیے ایک گانا سی ایچ آتما کی آواز میں ریکارڈ ہو جائے اس لیے یہ حضرات میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ ''ذرا جھٹ پٹ ایک گانا لکھ دو۔''

میں نے سوچا گانا لکھنا کون سی بڑی بات ہے۔ کسی بھی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر لکھ دیں گے۔ وہ لوگ مجھے صدر کے سلاطین ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا پھر ان لوگوں سے گویا حکم کے انداز میں کہا۔ ''کاغذ پینسل پیش کرو۔'' فرمانِ شاعر کے مطابق یہ دونوں چیزیں پیش کی گئیں۔ چائے بھی آگئی۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیا اور سوچنا شروع کیا۔ ذہن پر زور ڈالا۔ مگر گھنٹے بھر سر مارنے کے باوجود گانے کا کوئی ایک بول بھی موزوں نہ کر سکا۔ اسی طرح دو گھنٹے گزر گئے۔ اب میں گھبرایا اور کچھ کچھ ندامت اور شرمندگی کا خوف بھی طاری ہونے لگا۔ میں نے ان دو فرشتوں سے کہا۔

''بھئی! یہاں شور بہت ہے۔ ہم ذرا سلاطین کی چھت پر جاکر سوچیں گے۔'' اور پھر اس بہانے ریسٹورنٹ سے نکل بھاگا۔ باہر آیا کچھ دور تک پیدل چلتا رہا۔ پھر ایک پان والے کی دکان پر سگریٹ لینے کے لیے رکا۔ سگریٹ لے کر مڑا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ اے ایچ صدیقی اور لعل محمد تیز تیز قدم اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ میں نے اب بھاگنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں راہ گیروں کو کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے۔ لہٰذا میں پکڑا گیا اور یہ لوگ مجھے پھر ریسٹوران میں واپس لے آئے اور زبردستی مجھ سے نغمہ مکمل کروایا۔ خدا جانے میں نے کس طرح یہ نغمہ مکمل کیا۔

صہبا اختر بنیادی طور پر ادبی شاعر تھے۔ فلمی نغمہ نگاری انہوں نے کی مگر اس میں انہیں وہ مقام نہیں ملا جو ادبی شاعر کی حیثیت سے انہیں حاصل ہوا۔ وطن عزیز سے محبت کرنے والے دبئی کے محبِ وطن پاکستانیوں نے انہیں جو ''شاعرِ پاکستان'' کا خطاب دیا وہ ان کی ادبی کارکردگی کو پیشِ نظر رکھ کر دیا۔ انہوں نے فلمی نغمہ نگاری بہت محدود پیمانے میں کی۔ ان کی فلمیں کراچی کی فلم انڈسٹری سے تعلق رکھتی تھیں اور ان میں زیادہ تر معیار کے حوالے درمیانے درجے کی تھیں۔ وہ کہتے تھے میرے لیے یہی اعزاز ہے کہ میں کراچی کا ہوں اور میری فلمیں بھی کراچی کی ہیں۔ انہوں نے کراچی سے آگے قدم نکالنے کی کوششیں نہیں کی۔ مسرور انور اور حمایت علی شاعر بھی کراچی سے تعلق رکھتے تھے مگر لاہور کی فلموں کے لیے بھی انہوں نے نغمہ نگاری کی اور بہت نام کمایا۔ ممکن ہے صہبا اختر نے یہ کوشش اس لیے نہیں کی ہو کہ ان کی زیادہ تر توجہ ادب نگاری پر مرکوز تھی۔ بہرحال کراچی سے تعلق رکھنے والے شاعر اور نغمہ نگار صہبا اختر کی ادبی اور فلمی خدمات کے حوالے سے ہم انہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ جس کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ ہم سے بچھڑے انہیں 24 برس بیت گئے اس کے باوجود ہم ان کو یاد کر رہے ہیں ان کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ دوستو! یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اپنی زندگی میں ہر شخص کو ایسا اچھا کام کرنا چاہیے کہ اسے ہمیشہ اچھے نام سے یاد رکھا جائے۔

☆☆☆

کراچی کے شوبز کی بات ہو اور کراچی کے اس فنکار کا ذکر جمیل نہ ہو جس نے دنیا بھر میں پاکستان کا نام روشن کیا ہے۔ وہ فنکار جس نے اسٹیج، ٹی وی، ریڈیو اور فلم کے شعبوں میں اپنی فنی خداداد صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے کراچی کے

ثقافتی معیار کو بلند کیا ہے۔ کراچی کی شوبز انڈسٹری کو سرخرو کیا ہے۔ آج اس نشست میں اگر میں معین اختر کا ذکر نہیں کروں گا تو نہ صرف اس عظیم فن کار کی ناقدری کروں گا بلکہ آپ کے ساتھ اور اپنے دیگر قارئین کے ساتھ زیادتی کا مرتکب بھی ہوں گا۔

معین اختر کے بارے میں ..... لوگ بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سی باتیں ایسی ہیں جو... لوگ نہیں جانتے ہیں کیونکہ معین اختر اپنے فن اور اپنی شخصیت کی حیثیت سے سمندر کی طرح بے کراں تھے۔ میں ان کی انہی کہی اور ان کہی باتیں آپ تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔

معین اختر محض مزاحیہ اداکار نہیں تھے۔ وہ ایک اچھے میزبان بھی تھے، گائیک بھی تھے اور خوبصورت تحریر میں لکھنے والے رائٹر بھی۔ انہوں نے اسٹیج، ٹی وی، ریڈیو اور فلم میں اپنے فن کا مظاہرہ کرکے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کے بارے میں بڑے بڑے فنکار بھی ان کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا کرتے تھے۔ عمران خان شو کے دوران نامور انڈین اداکار رضا مراد نے ان کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''معین اختر اسٹیج کے لیے اتنے ہی ضرور ہیں جتنا عمران خان اور سنیل گواسکر کرکٹ کے لیے اور دلیپ کمار فلم کے لیے ضروری ہیں۔'' دلیپ کمار صاحب سے معین اختر کی پہلی ملاقات ہوئی تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''آپ کی بڑی تعریف سنی ہے۔'' لتا منگیشکر کہتی تھیں۔ ''معین! تمہاری آواز یوسف بھائی (دلیپ کمار) کی طرح ہے۔''

انڈیا کی فلم انڈسٹری پاکستانی فلمی صنعت سے چاہے جتنی بڑی ہو.. مگر ہر دور میں انڈین فلم میکرز نے پاکستانی فنکاروں کی اعلیٰ کارکردگی کو تسلیم کیا ہے۔ معین اختر نے بھی انڈیا میں بہت سے پروگرام کرائے ہیں۔ دلیپ کمار اور راج کمار کی فلم ''سوداگر'' جب ہٹ ہوئی تو اس کامیابی پر ایک رنگارنگ شو دبئی میں انعقاد پذیر ہوا۔ جس میں معین اختر کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی اور ان کے فن سے سامعین کو محظوظ کیا گیا۔ اس شو کی ریہرسل ممبئی میں کی گئی تھی۔ جہاں پر ریہرسل ہو رہی تھی وہیں ڈیوڈ دھون اپنی ایک فلم کی عکس بندی کر رہے تھے۔ اس جگہ جب معین اختر اداکار انوپم کھیر سے ملنے گئے تو ڈیوڈ دھون نے انوپم سے کہا۔ ''معین بھائی سے کہئے کہ میری فلم میں ایک رول ادا کرلیں۔''

مگر معین اختر نے یہ سوچ کر معذرت کرلی کہ ایسے افراتفری کی حالت میں کسی فلم میں اداکاری کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک بار اداکار عابد علی کا ٹیلی فون آیا کہ انوپم کھیر کہہ رہے ہیں کہ سونی رازداں لندن میں ایک فلم کی شوٹنگ کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ معین اختر ان کی فلم میں اداکاری کرے.. مگر معین اختر نے یہ فلم بھی نہیں کی اور مناسب معاوضہ نہ ملنے کا بہانہ کرکے انکار کردیا۔

ان کے انکار کی وجہ یہ تھی کہ بھارتی فلم والوں کا ایک متعصب طبقہ پاکستانی فنکاروں کی بھارتی فلموں میں شمولیت کے مخالف ہے اور وہ کوئی بھی غلط قدم اٹھا سکتا ہے۔

ایک بار انڈین ٹی وی چینل پر کامیڈی کے پروگرام میں معین اختر کو جج بننے کی دعوت دی گئی مگر انہوں نے انکار کردیا یہ سوچ کر کہ انڈین کامیڈی پروگراموں میں بعض اوقات گھٹیا باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں۔ اس پروگرام میں، میں ہنسوں گا تو لوگ کہیں گے کہ ایسی گھٹیا بات پر معین اختر

تخیل نعت

صہبا اختر

صبح دم جب بزم گل میں چہچہاتے ہیں طیور
پو پھٹے جب جھلملاتا ہے فضائے شب کا نور
روشنی جب پردہ ظلمت سے کرتی ہے ظہور
تب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کیا ہوں گے حضورؐ

غزل

بجلیاں چمکیں بہت میں ابر تھا چھایا رہا
عہدِ حاضر پر مرے افکار کا سایا رہا
وہ خرابا ہوں کہ جس پر روشنی رقصاں رہی
وہ تہی دامن ہوں جس کا فکر سرمایا رہا
کیا حریفانہ گزاری سے حیات نغمہ بار
میں زمانے کا، زمانہ میرا ٹھکرایا رہا
ایک شب اک غیرتِ خورشید سے ملنے کے بعد
اک اجالا مدتوں آنکھوں میں لہراتا رہا
تلخیوں نے زیست کی، کیا کیا نہ سمجھایا مگر
عمر بھی صہبا اختر تری آنکھوں کا بہکایا رہا

ہنس رہا ہے، اگر نہیں ہنسوں گا تو کہا جائے گا کہ معین اختر بڑا آرٹسٹ بن گیا ہے جو جونیئرز کی باتوں پر ہنس نہیں رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ ایسا کام ہی نہیں کرنا چاہیے جو دونوں طرف سے متنازع ہو۔

ان باتوں کا تذکرہ میں نے اس مقصد سے کیا ہے کہ آپ کو اس بات کا پتا چل سکے کہ معین اختر سستی شہرت اور مال و دولت کے خواہش مند نہیں تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک اچھے اور بلند کردار کے انسان تھے۔

معین اختر ہر کام بہت سوچ سمجھ کر کرتے تھے اور اپنے فن کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کے لیے نئے نئے تجربے کرتے تھے۔ وہ سندھی، پشتو، بلوچی، پنجابی، گجراتی، میمنی تقریباً ہر برادری کے لب ولہجہ میں اداکاری کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ ''مجھے زیادہ زبانیں نہیں آتیں مگر مجھے شوق ہے کہ مختلف زبانوں میں بات کرسکوں۔ اردو کے علاوہ میں سندھی اتنی بول لیتا ہوں کہ کام چل جائے۔ پنجابی بھی تھوڑی بہت آتی ہے۔ گجراتی اچھی خاصی آتی ہے۔ ایک نجی ٹی وی چینل سے جب مجھے گجراتی میں انٹرویو دینے کو کہا گیا تو میں نے ایک گھنٹے تک گجراتی میں انٹرویو دیا تھا۔''

معین اختر بے حد صاف ستھری طبیعت کے فنکار تھے۔ جب بھی اور جہاں بھی انہیں اپنے معیار سے ہٹ کر فضا مسموم نظر آتی وہ خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو وہاں سے علیحدہ کرلیتے تھے۔ وہ اسٹیج کے کتنے بڑے اور کتنے اچھے آرٹسٹ تھے۔ اس کا اندازہ انڈین اداکار رضا مراد کے خراج تحسین سے آپ کو ہو چکا ہوگا مگر جب اسٹیج کا ماحول ان کے لیے ناقابل برداشت ہوگیا تو انہوں نے اسٹیج سے اپنے آپ کو دور کرلیا اور اپنا سارا وقت ٹی وی اور مختلف پروگراموں کی میزبانی کے لیے وقف کردیا۔ اسی طرح فلمی دنیا میں بھی وہ ایڈجسٹ نہ ہوسکے کیونکہ وہاں کا ماحول اور وہاں کے بیشتر لوگوں کے موڈ مزاج سے جب ان کی ہم آہنگی نہ ہوسکی تو وہ فلموں سے بھی دامن کشاں ہوکر واپس اپنی دنیا میں آگئے۔ معین اختر نے مختصر عرصے میں چند ہی فلموں میں اداکاری کی۔ جن میں ''راز''، ''سب کے باپ''، ''تابعدار''، ''مسٹر کے ٹو'' شامل ہیں۔ غالباً بھارتی فلموں میں بھی انہی خدشات نے انہیں اداکاری کرنے سے روکے رکھا۔

شاذونادر ہی کچھ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ معین اختر نے سب سے پہلے جس فلم میں اداکاری کی تھی اس کا نام ''تم سا نہیں دیکھا'' تھا اور یہ 1975ء میں بنائی گئی تھی۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے بہت سے آرٹسٹوں کی یہ پہلی فلم تھی جن میں معین اختر کے علاوہ سنگیتا کی بھی مغربی پاکستان میں یہ پہلی فلم تھی۔ امیر احمد خان اس فلم کے موسیقار، یونس ہمدم نغمہ نگار، اخلاق احمد پلے بیک سنگر، یوسف نصر ڈائریکٹر، شاہد علی خان پروڈیوسر اور ناظم ہیرو تھے۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جن کی یہ پہلی فلم تھی۔ یہ فلم مکمل ہونے کے باوجود ریلیز نہیں ہوسکی تھی۔

دوسروں کو تو اس کی نمائش نہ ہونے کا یقیناً افسوس ہوگا مگر معین اختر کو ذرا بھی دکھ نہیں ہوا تھا کیونکہ انہیں فلم میں اداکاری کرنے کا کبھی شوق نہیں تھا۔ ان کے دوستوں نے اس فلم میں کام کرنے پر مجبور کیا تھا تبھی وہ اس فلم کا حصہ بنے تھے۔

معین اختر کا یہ بڑا پن تھا کہ انہوں نے فلموں سے علیحدگی کا ذمے دار کسی اور کو کبھی قرار نہیں دیا۔ اس بارے میں وہ کہتے تھے۔ ''سیدھی سی بات ہے میں فلم میں چلا نہیں۔ اب میں یہ بتانا شروع کردوں کہ غلطی میری نہیں فلاں شخص کی تھی۔ کہانی کمزور تھی۔ ہدایت کاری ناقص تھی یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔ فلم اگر ہٹ ہوگئی تو یہ اچھی فلم ہے، پٹ گئی تو بری فلم ہے۔''

اتنا بڑا فنکار جس کے فن کی دنیا معترف تھی۔ اسے ابتداء میں کن دشوار مراحل سے گزرنا پڑا۔ یہ بھی بڑی دلچسپ بات ہے۔

ریڈیو پر اپنی آواز کا جادو جگانے گئے تو ان سے کہا گیا۔ ''یہاں پہلے آڈیشن دینا پڑتا ہے۔''

اس وقت ریڈیو پاکستان کراچی میں ایک صاحب یزدانی نام کے ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے معین اختر سے پوچھا۔ ''آپ کیا کرتے ہیں؟''

''میں پڑھتا ہوں۔''

وہ بولے۔ ''یہ کام چھوڑیں اور پہلے پڑھائی مکمل کریں۔''

معین اختر نے کہا۔ ''آپ میرے آڈیشن کا نتیجہ بتادیں۔''

''ہم آپ کو خط کے ذریعے نتیجہ سے آگاہ کردیں گے۔'' اس طرح ریڈیو والوں نے معین اختر کو بڑی خوش اسلوبی سے ٹال دیا۔

جب بندہ کچھ نہیں ہوتا ہے تو کوئی بھی اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا ہے۔ معین اختر کو بھی ان کے کیریئر کے ابتدائی ایام میں ایسی ہی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر اپنی صغیر سنی کے باوجود وہ حالات سے مایوس نہیں ہوئے اور اپنے طور پر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

معین اختر 24 دسمبر 1950ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد ابراہیم تھا جو انڈیا کے شہر مراد آباد سے ہجرت کر کے پہلے ممبئی گئے پھر وہاں سے پاکستان آئے تھے اور انہوں نے کراچی میں سکونت اختیار کی تھی۔ ان کی اولادوں میں معین اختر سمیت تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ معین اختر سب سے بڑے تھے۔ کراچی کے مختلف علاقوں ناظم آباد، جیکب لائن، ویسٹ وہارف اور گلشن اقبال میں کرائے کے مکانوں میں رہائش اختیار کرتے رہے۔ ان دنوں اس خاندان کی حالت خانہ بدوشوں کی طرح تھی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا۔

معین اختر کے اندر لڑکپن ہی سے اداکاری کے جراثیم موجود تھے۔ اسکول کے زمانے ہی سے انہوں نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے، ڈراموں میں اداکاری کرتے۔

انہیں عوامی سطح پر سب سے پہلے ڈاؤ میڈیکل کالج کے ایک پروگرام میں اپنی فنی زندگی کا آغاز کرنے کا موقع ملا۔ جہاں انہیں اپنے سابقہ تجربوں (اسکول کے زمانے کے) کی وجہ سے کسی قسم کی گھبراہٹ یا جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ 1966ء میں یوم پاکستان کے موقع پر پہلی بار پاکستان ٹیلی وژن کے پروگرام میں جلوہ گر ہوئے اس وقت ان کی عمر صرف 16 برس تھی۔ 1967ء میں معین اختر ٹی وی کے دو ڈراموں ''چور'' اور ''شادی'' میں کام کر چکے تھے۔ پروڈیوسر قاسم جلالی نے انہیں فون کیا اور پھر خود ان کے گھر آ کر ان کو ٹی وی پر کام کرنے کو کہا۔ معین اختر نے منع کر دیا۔ ''نہیں۔ میں ٹی وی پر کام نہیں کروں گا۔''

قاسم جلالی نے انہیں سمجھایا۔ ''ارے بھئی! تم جو کچھ اسٹیج پر کرتے ہو وہی ٹی وی پر کرنا۔'' جس پر معین اختر راضی ہو گئے۔

1970ء کے الیکشن ہونے والے تھے۔ اس سلسلے میں تین شخصیات کے پروگرام تیار کیے گئے۔ حبیب ولی محمد اور رونا لیلیٰ کے گانے ریکارڈ ہوئے۔ معین اختر کے چند مزاحیہ خاکے تیار کیے گئے جن میں سے ایک خاکہ یہ بھی تھا۔

ایک دیہاتی اسٹیشن ماسٹر سے تمام ریل گاڑیوں کے اوقات پوچھتا ہے کہ فلاں فلاں گاڑی کتنے بجے آئے گی؟ اسٹیشن ماسٹر دیہاتی سے پوچھتا ہے کہ تمہیں جانا کہاں ہے؟ دیہاتی کہتا ہے۔ ''مجھے جانا کہیں نہیں ہے۔ مجھے تو ریل کی پٹڑی پار کرنا ہے۔''

زندگی نامہ

نام: معین اختر

پیدائش: 24 دسمبر 1950ء۔ مقام: کراچی

والد: محمد ابراہیم۔ جو مراد آباد (انڈیا) سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔

بہن بھائی: معین اختر کی ایک بہن اور دو بھائی تھے۔ معین سب سے بڑے تھے۔

کراچی میں ابتدائی ایام: معین اختر نے اپنے اہل خاندان کے ساتھ ابتدائی ایام بڑی کسمپرسی میں گزارے۔

فنی زندگی کا آغاز: عوامی سطح پر پہلی بار ڈاؤ میڈیکل کالج کے ایک پروگرام میں حصہ لیا۔ 13 برس کی عمر میں شیکسپیئر کے ڈراما ''مرچنٹ آف وینس'' میں شائے لوک کا کردار ادا کیا۔ 1966ء میں جب ان کی عمر 16 سال تھی... پہلی بار ٹیلی ویژن کے پروگرام میں حصہ لیا۔ ٹی وی ڈراموں کے علاوہ ضیاء محی الدین شو میں بھی اپنے فن کا جوہر جگایا۔

مہارت: انہیں مشہور شخصیات کی آوازوں کی نقل کرنے پر مہارت حاصل تھی۔ جان ایف کینیڈی (امریکی صدر) انتھونی کوئن (امریکی اداکار) محمد علی، ضیا محی الدین اور ضیاء الحق کی بڑی شاندار نقل اتارتے تھے۔ تقریبات کی خوبصورت میزبانی کرنے میں بھی ان کا ثانی نہیں تھا۔

انور مقصود اور ان کی جوڑی: رائٹر انور مقصود کی تحریر اور معین اختر کی اداکاری کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔

انتقال پُرملال: فن کا یہ عظیم سورج 2011ء کو غروب ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر 61 برس تھی۔

یہ خاکہ بہت مقبول ہوا... اور یوں ٹی وی پر معین اختر کے قدم جمتے چلے گئے، اس کے بعد کی بات ہے۔ معین اختر نگہت سیما کے ساتھ شو کرنے مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وہاں سے وہ واپس آئے تو انہیں پروڈیوسر ظہیر بھٹی کا پیغام ملا کہ انہوں نے ٹی وی پر بلایا ہے۔ پروڈیوسر ظہیر بھٹی ضیا محی الدین شو کے پروڈیوسر تھے اور شو کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ معین اختر ٹی وی اسٹیشن گئے اور ظہیر بھٹی صاحب کے دفتر کے دروازے پر دستک دے کر اندر گئے تو وہاں ضیا محی الدین بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''کہیے۔ کس سے ملنا ہے؟''

''ظہیر بھٹی صاحب نے مجھے بلایا ہے۔ میرا نام معین اختر ہے۔''

یہ سنتے ہی انہوں نے بے ساختہ کہا۔ ''ارے بھئی! آپ نے تو الیکشن نشریات میں کمال کر دیا تھا۔'' پھر ذرا توقف کے ساتھ بولے۔ ''میں جلد ہی اپنا شو شروع کرنے والا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے شو میں آپ ایسا ہی کچھ کریں۔''

اس طرح معین اختر نے ضیا محی الدین کے پہلے شو میں کام کیا۔ ضیا صاحب نے معین اختر سے کہا۔ ''آپ اسٹیج پر جو کچھ کرتے ہیں، وہ مجھے نہیں چاہیے، اس سے کوئی مختلف چیز ہونی چاہیے۔''

اور معین اختر ضیا محی الدین شو میں مختلف رنگ میں نظر آنے لگے۔ معین اختر اپنی مزاحیہ اداکاری کے ساتھ ساتھ مشہور لوگوں کی آوازوں کی نقل بھی بڑی مہارت سے کرتے تھے۔ لہٰذا ایک بار ضیا محی الدین شو میں، ضیا صاحب کو مہمانوں کی صف میں بٹھا کر خود ضیا محی الدین بن کر شو کرنے لگے۔ بالکل ضیا صاحب کی آواز اور انداز کی نقل انہوں نے ایسی کی کہ تمام تماشائیوں کے علاوہ ضیا محی الدین نے بھی دل کھول کر ان کی تعریف کی۔

ٹی وی سے متعلق باتیں ہو رہی ہیں تو آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ انہیں ٹی وی تک رسائی کیسے حاصل ہوئی۔ یہ قصہ آپ معین اختر ہی کی زبانی سنیے۔

''مجھے ٹی وی کی راہ دکھانے میں اداکار سنتوش رسل کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا۔ تم اسٹیج پر اتنی شاندار اداکاری کر لیتے ہو، پھر ٹی وی پر کام کیوں نہیں کرتے؟''

''ٹی وی پر میری کسی سے جان پہچان نہیں ہے۔''

میرا جواب سن کر سنتوش رسل دوسرے دن مجھے اپنے ساتھ ٹی وی اسٹیشن لے گئیں اور پروڈیوسر امیر امام سے ملوایا۔ امیر امام نے اسی وقت اسکرپٹ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک چھوٹا سا رول ہے۔ اسے دیکھ لیں۔''

اس طرح ٹی وی پر میرا پہلا ڈراما 1967ء میں ٹیلی کاسٹ ہوا۔ جس کا نام ''چور'' تھا اور یہ امیر امام کا ہی ڈراما تھا۔ اسی سال محسن علی صاحب کا ڈراما ''شادی'' بھی کیا۔ اس موقع پر معین اختر نے بہت مزہ لے لے کر بتایا۔ ''میں چونکہ ٹی وی پر نو وارد تھا اس لیے شروع میں مجھ سے بہت غلطیاں ہوتی تھیں اور امیر امام صاحب میری خوب بے عزتی کرتے اور ہر غلطی پر سب کے سامنے ڈانٹتے تھے۔ ایسے مواقع پر میرے لیے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ ان حالات میں اکثر قاضی واجد صاحب میری بہت حوصلہ افزائی کرتے اور کہتے تھے۔ ''یار معین! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔''

وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معین اختر کی اداکاری میں پختگی آتی گئی پھر وہ وقت بھی آیا جب امیر امام کا ڈراما ''سچ مچ'' ہٹ ہو گیا انہوں نے ایک پریس کانفرنس کے دوران معین اختر ''پاکستان کا سرمایہ'' کہا۔

اس موقع پر معین اختر نے انہیں پچھلی باتیں یاد دلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو یاد ہے، آپ مجھے کتنا لتاڑا کرتے تھے؟''

''ہاں یاد ہے۔ اس وقت تمہیں اداکاری نہیں آتی تھی۔ تمہیں بتانے اور سکھانے کے لیے ڈانٹا ڈپٹا ضرور تھا۔''

اداکاری کی طرح میزبانی میں بھی معین اختر زبردست مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس مہارت کی وجہ سے ان کو ان پروگراموں کی میزبانی کا بھی شرف حاصل ہوا جن میں سربراہان مملکت نے شرکت کی۔ ان میں ذوالفقار علی بھٹو، جنرل یحییٰ خان، جنرل ضیاالحق، بے نظیر بھٹو، نواز شریف، غلام اسحاق خان، جنرل پرویز مشرف، گیمبیا کے وزیراعظم داؤدی الجوز اور اردن کے شاہ حسین شامل ہیں۔

پاکستان میں مشہور شخصیات کی نقل اتارنے کا

بلاشبہ معین اختر کے سر ہی باندھا جاسکتا ہے۔ 1968ء میں نگار ایوارڈ کی تقریب میں معین اختر نے اداکار محمد علی کی ایسی شاندار نقل اتاری کہ خود محمد علی نے کھڑے ہو کر انہیں داد دی اور محمد علی کی دیکھا دیکھی پورا ہال کھڑا ہو گیا اور تالیاں بجا کر معین اختر کو خراج تحسین پیش کیا۔

معین اختر کی اداکارانہ خوبی ایک یہ بھی تھی کہ وہ معاشرے کے جس کردار کو سامنے رکھ کر پرفارم کرتے تھے۔ اس کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتے تھے۔ انور مقصود کے لکھے ہوئے مزاحیہ لانگ پلے ''ہاف پلیٹ'' میں انہوں نے ایک مفلوک الحال شاعر کی کردار نگاری اس خوبی کے ساتھ کی تھی جس نے بھی دیکھا داد دیئے بغیر نہ رہا۔

لانگ پلے کی بات چلی ہے تو ''روزی'' کا ذکر بھی ہو جائے۔ پی ٹی وی کے اس لانگ پلے میں معین اختر نے روزی کا نسوانی کردار اس شاندار انداز میں کیا تھا کہ آج تک لوگوں کو یاد ہے۔

''روزی'' کی تخلیق سے متعلق حقائق کچھ یوں ہیں کہ ٹی وی اسٹیشن پر معین اختر کی ملاقات ساحرہ کاظمی سے ہوئی تو انہوں نے کہا۔ ''مجھے ایک لانگ پلے بنانے کا ٹاسک دیا گیا ہے۔ بتاؤ میں کس موضوع پر لانگ پلے بناؤں۔''

''ٹوٹسی (Tootsie) ہالی ووڈ کی ایک فلم) پر کام کرو۔''

ساحرہ کاظمی نے فوراً پوچھا۔ ''کیا تم کرو گے؟''

''ہاں کرلوں گا۔''

''تم واقعی سنجیدہ ہو؟''

''ہاں۔ بالکل سنجیدہ ہوں۔''

اس کے بعد ساحرہ کاظمی نے عمران اسلم سے ''روزی'' کا اسکرپٹ لکھوایا۔ ''روزی'' کرنے سے پہلے معین اختر نے فلم ''ٹوٹسی'' نہیں دیکھی تھی۔ ساحرہ نے معین اختر سے کہا۔ ''یہ فلم دیکھ لو تاکہ کچھ آئیڈیا ہو جائے۔''

''نہیں۔ میں یہ فلم نہیں دیکھوں گا۔ دیکھوں گا تو ڈسٹن ہوف مین (ٹوٹسی کا ہیرو) کی نقل کرنے لگ جاؤں گا۔''

اس طرح معین اختر نے متعلقہ فلم دیکھے بغیر ''روزی'' میں روزی کا کردار کیا۔ اور اللہ کے فضل و کرم سے ایک عالم نے اس کی زبردست تعریف کی۔

پی ٹی وی کا ایک شو ''ففٹی ففٹی'' بہت مقبول ہوا۔ جس کے پروڈیوسر شعیب منصور تھے۔ اس میں اسماعیل تارا اور

مینار پاکستان

آج سے تقریباً 40 برس قبل بابائے قوم کی صدارت میں اجلاس نے تاریخی قرارداد منظور کی۔ آزادی کی قرارداد۔ نئی سیاست کی قرارداد۔ اس کی یاد میں یہاں ایک مینار تعمیر کیا گیا، جو مینار پاکستان کہلاتا ہے۔ اس کی لمبائی 1/2 96 فٹ اور مختلف مقامات پر قرآنی آیات اور اشعار درج ہیں۔ جن کی خطاطی خورشید عالم، خورشید رقم، حافظ یوسف لاہوری، الماس رقم، ابن پروین رقم، محمد اقبال اور محمد صدیق نے کی۔ مینار کا نقشہ روسی نژاد مسلمان مرات خان نے تیار کیا اور میاں عبدالخالق اینڈ کمپنی نے اس کی تعمیر کی۔ اس کی تعمیر میں بڑی تکنیکی مہارت سوئی گئی اور کچھ اس قسم کا ساز و سامان استعمال کیا گیا جس سے مختلف مقامات پر پیش آنے والی مشکلات کی عکاسی ہوتی ہے۔ مثلاً اس کے مختلف چبوترے ہیں ایک چبوترا بڑا کھردرا اور ناتراشیدہ ہے۔ یہ اس بات کا غماز ہے کہ آزادی کے وقت پاکستان کی حالت کسی قدر دگرگوں تھی۔ دوسرے تختہ میں پتھروں کو ترتیب و تراش دے دی گئی ہے مگر ان میں کھردرا پن موجود ہے یعنی پاکستان اب سنور گیا ہے۔ تیسرے تختہ میں سب کچھ ختم کر کے ملائمت پیدا کر دی گئی۔ مینار کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔ یہ 1/2 13 فٹ اونچے پشتے پر ہے۔ چوتھے چبوترے پر سنگ مرمر متعمل ہے کہ لوگ خوشحال ہو گئے ہیں۔ مینار کی آخری ٹوپی پاکستان کی عالمی دنیا میں سربلندی کی علامت ہے۔ اس مقصد سے اس میں اسٹین لیس اسٹیل استعمال ہوا ہے جس پر سورج کی شعاعیں پڑتے ہی منعکس ہو کر ماحول کو منور کر دیتی ہیں۔ مارچ 1940ء اور 19 اپریل 1946ء دونوں قرارداد اس مینار پر رقم ہیں۔ یہ اردو، انگریزی اور بنگالی زبان میں درج ہیں۔ آزادی کی تحریکوں کا بھی مختصر ذکر ہے۔ سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ مائدہ، سورہ الرعد کی قرآنی آیات بھی درج ہیں۔ مینار کے صدر دروازے پر، اللہ اکبر، اور ایک سل پر ''مینار پاکستان'' اور اس کے نیچے ''اللہ المشرق والمغرب'' لکھا ہے۔

مرسلہ: احمد صادق، لاہور

ماجد جہانگیر ''نہیں ڑے''، ''ہاں ڑے'' کہا کرتے تھے۔ جو بہت مقبول ہوا تھا۔ معین اختر کا کہنا ہے کہ یہ میرے اور مشک بار فاطمہ کے ''سات رنگ'' نامی ایک شو کی نقل ہے جس میں ظہور احمد اور میں ''اماں نہیں''، ''اماں ہاں'' کہتے تھے۔ جس کی نقل یہ ''نہیں ڑے'' اور ''ہاں ڑے'' ہے۔

معین اختر اور مشک بار فاطمہ ''سات رنگ'' کی میزبانی کرتے تھے۔ اس میں سات خاکے ہوا کرتے تھے۔ ایک خاکے میں ظہور احمد اور معین اختر باتیں کرتے تھے۔ مثلاً

''یہ کیا چیز ہے؟''

وہ کہتے ''یہ چاند کا گڑھا ہے۔''

معین اختر کہتے۔ ''یہ چاند کا گڑھا نہیں بلکہ حسن اسکوائر پر بنا گٹر کا ڈھکنا ہے۔'' اس پر وہ دونوں کہتے۔

''اماں نہیں۔''

''اماں ہاں۔''

''ففٹی ففٹی'' کے خاکے پہلے انور مقصود لکھتے تھے پھر شعیب منصور لکھنے لگے۔ انور مقصود کا نام آیا تو معین اختر کے ساتھ ان کی جوڑی کا ذکر نہ کرنا اچھی بات نہیں ہوگی۔ انور مقصود کے بارے میں معین اختر کہتے تھے۔

''ہماری کیمسٹری آپس میں مل گئی ہے۔ انور کیا کہتے ہیں وہ مجھے پتا ہے۔ اس کے لکھنے کے پیچھے کیا وجوہات ہیں یہ میری سمجھ میں آچکا ہے۔ انور جو کہتے ہیں وہ میں سمجھ لیتا ہوں اس سے ہماری انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی ہے۔''

معین اختر کہتے تھے۔ ''پروگرام کی تیاری میں اکثر میں بھی انہیں اپنے آئیڈیاز دیتا ہوں۔ جب ذہن میں کوئی بات آتی ہے تو میں انور سے کہتا ہوں کہ اس پر کام کرنا چاہیے۔ مثلاً ایک دن ٹی وی پر اردشیر کاؤس کو دیکھا تو فوراً انور کو فون کیا کہ فلاں چینل پر اردشیر کاؤس جی آرہے ہیں۔ انہیں دیکھو۔ انور نے انہیں دیکھ کر مجھ سے پوچھا کہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کہ میں اردشیر کاؤس جی کی نقل اتاروں گا۔ انور کو آئیڈیا پسند آیا اور انہوں نے اردشیر صاحب پر اسکرپٹ لکھا اور وہ کامیاب رہا۔''

انور مقصود کے ساتھ معین اختر نے جب بھی کام کیا اور جو بھی کیا اس کا ایک اپنا ہی رنگ تھا۔ لانگ پلے ''ہاف پلیٹ''، ''عید ٹرین''، ''اسٹوڈیو ڈھائی'' ہو یا ''لوز ٹاک'' انور مقصود کی تحریر اور معین اختر کی اداکاری کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ ''لوز ٹاک'' میں وہ مختلف روپ میں جلوہ گر ہوتے تھے۔ معاشرہ کی مختلف قابل ذکر شخصیات کی نقل و حرکت اور آواز کی ایسی عکاسی کرتے تھے کہ دیکھنے والے داد دیے بغیر نہیں رہتے تھے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کی آمد کے بعد خداداد صلاحیتوں کے حامل کئی فنکاروں نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا۔ اس زمانے میں انور مقصود، بشریٰ انصاری اور معین اختر کی صلاحیتوں کی تال میل سے کئی شاہکاروں کا جنم ہوا۔

معین اختر نے اداکاری کا آغاز 13 برس کی عمر ہی میں کر دیا تھا۔ اور شیکسپیئر کے ڈرامے ''مرچنٹ آف وینس'' کے ''شائے لوک'' کا کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ مختلف کام کرنے کی کوشش کی۔ ان کا فنی کیریئر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انہوں نے ''ذرا ہٹ کر'' کام کر کے اپنی ایک الگ فنی تعمیر کی۔ 1966ء میں معین اختر نے اسٹینڈ اپ کامیڈی کا آغاز کیا۔ انتھونی کوئین، اور جان ایف کینڈی کی آوازوں کی نقل کی جس سے انہیں ابتداء ہی میں الگ پہچان مل گئی۔

مزاحیہ اداکاری میں سب سے بڑا چیلنج شائستگی اور پھکڑ پن کے درمیان فرق قائم رکھنا ہوتا ہے۔ بودی بات اور بھونڈی اداکاری کا نام مزاح نہیں۔ یہی اصول تاعمر معین اختر کے پیش نظر رہا اسی لیے انہوں نے اپنے عروج کے دور میں اسٹیج سے صرف اس لیے کنارہ کشی اختیار کر لی کہ اسٹیج پر بے ہودہ اور ذو معنی مکالموں اور رقص کا رواج عام ہوتا جارہا تھا۔

معین اختر اداکاری کا ایک منفرد انداز رکھتے تھے۔ فن اداکاری سے آشنا اہل فن معین اختر کی صلاحیتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان کے فن کی بے ساختگی کو ان کا طرۂ امتیاز قرار دیتے تھے۔

معین اختر نے اپنے ایک انٹرویو میں ایک بار کہا تھا۔ ''جو کردار کلک کر جائے وہ کلاسک بن جاتا ہے۔ میری طبیعت میں ایک فطری بذلہ سنجی ہے اور یہی فطری صلاحیت کلک کر جاتی ہے۔''

لوگوں کا غم سمیٹنے والے اس فنکار کے فنی قد سے پاکستان ہی نہیں ایک دنیا واقف ہے۔ اس کے ذاتی کردار اور خوبیوں کے گواہ اس کے رفقائے کار اور اس کی فنی کامیابی کی دلیل اس کے لاکھوں پرستار ہیں۔ معین اختر کے رخصت ہوتے ہی خوشگوار اداکاری کا ایک عہد تمام ہوا لیکن وہ خود ہی کہہ گئے تھے۔

JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

Convey Your Message to Millions of Our Readers, World Wide Through

63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.
PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551
Email : jdpgroup@hotmail.com

''میں نے جو کام کیا ہے وہ تاریخ کا حصہ بن چکا۔ اس تاریخ کے ساتھ زندہ تو نہیں رہا جاسکتا، لیکن چند لوگ ہوں گے جو کہیں گے کہ ایک شخص تھا جس نے یہ سب کچھ کیا اور بہت مختلف انداز میں کیا۔''

معین اختر کی شہرت اور مقبولیت کی دلیل جہاں ان کے لاکھوں کروڑوں پرستار ہیں وہاں فن کے پنڈتوں نے بھی ان کی خداداد صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ سرکاری اور عوامی سطح پر بھی انہیں متعدد اعزازات سے نوازا گیا تھا۔ ان میں تمغۂ حسن کارکردگی، ستارۂ امتیاز، نگار ایوارڈز، کریٹک ایوارڈز، گریجویٹ ایوارڈز، مصور ایوارڈز، عوامی ایوارڈز اور چھ پی ٹی وی ایوارڈز شامل ہیں۔

وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے۔ جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہیں۔ تو کچھ ایسے ہی حالات کا معین اختر کو بھی کبھی کبھار سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ''سات رنگ'' ان کا ایک مقبول ٹی وی شو ہوا کرتا تھا جس میں وہ سات خاکے پیش کیا کرتے تھے۔ ایک بار اس کے ایک خاکے پر سرکاری سطح پر سخت برہمی کا اظہار کیا گیا اور اس شو کو بند کرا دیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء لگا ہوا تھا۔ سرکاری طور پر اعتراض یہ کیا گیا تھا کہ اس کے ایک خاکے میں ضیاء الحق کی نقل کی گئی ہے۔ کرنل صدیق سالک نے اس پر اعتراض اٹھایا اور لیفٹیننٹ جنرل مجیب جو سیکریٹری انفارمیشن تھے۔ بڑے خفا ہوئے اور انہوں نے اعتراضات کیے کہ معین اختر نے جو مونچھیں لگائی ہیں وہ ضیاء الحق کی مونچھوں سے ملتی جلتی ہیں۔ بالوں میں بیچ کی مانگ بھی انہیں اچھی نہیں لگیں۔ یہ بھی اعتراض کیا گیا کہ ان کے انداز میں معین اختر بولے ہیں۔

معین اختر کا کہنا ہے۔ ''بعد میں جب ہم نے ان اعتراضات پر غور کیا تو ان کی باتیں صحیح معلوم ہوئیں۔'' معین اختر نے اس سلسلے میں یہ بھی کہا۔ ''یہ خاکہ ہم سے انجانے میں بن گیا تھا۔''

اس واقعے کے بعد معین اختر کافی عرصہ تک پی ٹی وی سے دور رہے۔ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ ان پر پی ٹی وی کے دروازے بند کردیے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد جب پہلا پی ٹی وی ایوارڈ کی تقریب ہوئی تو معین اختر کو کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تقریب کی پرفارمنگ کے دوران حکومت کا ایک آدمی ہر آدھے گھنٹے بعد معین اختر کا اسکرپٹ چیک کرتا کہ وہ اسٹیج پر کیا کہنے اور کرنے والے ہیں۔

وہاں معین اختر کی ملاقات لیفٹیننٹ جنرل مجیب سے ہوئی تو معین اختر نے ان سے کہا۔ ''میں نے جان بوجھ کر یہ کام (جنرل ضیاء کی نقل) نہیں کیا تھا۔''

''تمہیں یقین ہے کہ یہی بات تھی؟''

''جی ہاں۔ بالکل یہی بات تھی۔'' جس پر مجیب صاحب نے انتہائی خفگی کے باوجود معین اختر کے ساتھ اس موقع پر اچھا سلوک کیا۔

معین اختر نے اسٹیج سے ہی اپنے فنی کیریئر کا آغاز کیا تھا اور اسٹیج پر ہی کامیابی کے بعد وہ ٹی وی، ریڈیو اور فلم کی طرف گئے تھے۔ ابتدا میں معین اختر آدم جی ہال میں ہونے والے ڈراموں میں حصہ لیتے تھے۔ اس زمانے میں وہ اور ان کے ساتھی فنکار بڑی محنت سے ریہرسل کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ابراہیم راز، نرالا، لہری، قاضی واجد، عرش منیر، سلیم ناصر، محبوب عالم، جاوید شیخ، زیبا شہناز، رزاق راجو، عثمان میمن، اسماعیل تارا، بہروز سبزواری وغیرہ اسٹیج ڈراموں اور دیگر پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔ ان میں اختر شیرانی، سکندر صنم، شکیل صدیقی اور رؤف لالہ بھی شامل تھے۔ معین اختر کا کہنا ہے۔ ''عمر شریف کو میں نے ہی ''بایونک سرونٹ'' میں متعارف کروایا تھا۔

معین اختر کی آواز بھی بہت اچھی تھی لہٰذا انہوں نے فن گائیکی میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ جب بھی اور جہاں بھی کچھ گانے کا سچویشن ہوا اپنی سریلی آواز سے سننے والوں کو محظوظ کیا۔ وہ متعدد خوبیوں کے مالک تھے۔ ان گنت کرداروں میں ڈھلنے والے منفرد فنکار تھے۔ لوگوں کے ہونٹوں پر مسکان کے پھول کھلانے والے، ہر دلعزیز عوامی اداکار تھے۔ وہ جو ہزار روپ لیے ہوئے تھے۔ 2011ء کا ایک منحوس دن آیا اور انہیں، ان کے بے شمار پرستاروں سے جدا کرگیا۔ وہ چہرہ یادوں کے دھندلکوں میں گم ہوگیا۔ زندگی کی آخری سانسوں تک فن سے جڑا رہنے والا، چراغ سحر... کی طرح بجھ گیا۔ سنجیدہ اور بامقصد مزاح کا دور ختم ہوگیا۔ کراچی سے جنم لینے والا، کراچی کا یہ نابغہ روزگار فنکار کراچی کی ثقافتی دنیا کو ویران کرگیا۔

++

سفر پہلا پہلا

احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر اور مشاہدہ کو الفاظ کا پیرہن دینا۔ اندازِ بیان کے مختلف قرینوں، سلیقوں سے ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتِ حال کو اپنی اظہاری صلاحیت کے ذریعے قارئین کی نذر کرنا، اس طرح پیش کرنا کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری اسیر رہے۔ یہ کمال ہے ندیم اقبال کا۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' اور ''شمشال سے ٹورنٹو'' کے بعد ان کا یہ تیسرا سفر نامہ جو جوانی کے ابتدائی ایام کا احوال ہے اور ایک نئے انداز سے لکھا گیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔

ایک نوجوان کے احساسات و جذبات میں گندھی سفر کہانی کا سولہواں حصہ

لالہ زار کے خاموش ماحول میں ہمارے پیچھے والی جیپ چند درختوں کے نیچے آکر رکی تھی۔ میں انتظار میں تھا کہ کنول وہاں سے اترے تو دیکھوں کہ کہیں وہ سفر کی صعوبتوں سے بے حال تو نہیں.. مگر دیکھا کہ کنول نے اپنی ماں سے مل کر اپنے والد کو سہارا دے رکھا ہے۔ میں پریشانی کے عالم میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھی بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ تینوں لڑکھڑاتے چلے آرہے تھے۔ اس کے والد کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ میں اور شہزاد بھاگے بھاگے آگے بڑھے۔

کنول کو ہٹا کر اس کے والد کو ہم نے سہارا دیا۔ وہ کمزور جان کے تھے اور ہم ایک طرح سے انہیں اٹھا کر دری تک لائے۔ وہاں ہم نے انہیں سیدھا لٹا دیا۔

مجھے ڈر تھا کہیں انہیں ہارٹ اٹیک نہ ہوا ہو۔ مگر نبض چیک کی تو رفتار ذرا کم تھی۔ جب کنول نے بتایا کہ پہلے ان کی متلی والی کیفیت پیدا ہوئی اور بعد میں زور کی متلی ہوئی۔ ہم سمجھ گئے کہ کوئی ہارٹ اٹیک نہیں ہوا بلکہ یہ بلندی کا اثر ہے۔ نہ انہیں سانس لینے میں دشواری تھی اور نہ کہیں ان کو درد تھا۔ اس کی والدہ متواتر کچھ پڑھ کر اپنے شوہر پر پھونک رہی تھیں۔ دونوں بیٹیاں باپ کے پاؤں دبا رہی تھیں۔ اور اطہر ڈری ڈری نظروں سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے کومل سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ گاڑی میں سیون اپ کے ٹن پڑے ہیں۔ میرے کہنے پر وہ گاڑی سے لے آئی۔ سہارا دے کر میں نے انہیں چند گھونٹ پلائے اور پھر دوبارہ لٹا دیا۔ کچھ ہی دیر میں لالہ زار کی تازہ اور خنک ہوا نے اپنا کام دکھایا اور ان میں بہتری نظر آنے لگی۔ کنول کی والدہ نے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھگو دی تھیں۔ دونوں بہنیں بھی کھلی نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ میں سب کی تسلی کرا رہا تھا۔ اس کی والدہ سے میں نے کہا۔

”چند دن پہلے ٹھنڈیانی جاتے ہوئے میری ایسی ہی حالت ہوگئی تھی۔ چکر آنے سے ایسا ہو جاتا ہے۔ آپ کی شکل نے تو سب کو فکر مند کر کے رکھ دیا ہے۔“

انہوں نے تشکرانہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ماشاءاللہ پاک نے تم کو عقل دی، سمجھ دی ہے اور ساتھ دل بھی اچھا دیا ہے۔ کون ہوتا ہے جو دوسروں کی خاطر اتنا پریشان ہو جائے۔“

”آنٹی آپ تو میرے اپنے ہیں۔ خود کو کوئی اجنبی تو نہ کہیں۔“

”بیٹا تم کو عقل تو آگئی مگر یہ سمجھ نہ آئی کہ میرا یہ مطلب نہ تھا۔“ پھر شوہر کو کہنے لگیں۔ ”بات میں کیا کرتی ہوں اور یہ لڑکا سمجھتا کچھ اور ہے۔“ پھر اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”بیٹا تم میں اور میری بیٹی کنول میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی بالکل تمہاری طرح کسی بات کو نہیں سمجھتی اور پھر ناراض ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ تم تو پھر بھی مسکرا رہے ہو اور وہ تو چھوٹی چھوٹی بات پر رونے لگتی ہے۔ بڑی مشکل سے چپ ہوتی ہے۔“

میں نے شرارت سے کہا۔ ”آنٹی، مجھے لگتا ہے اسے بڑے نازوں سے پالا ہے۔ کومل بھی تو ہے ناں۔ جتنا ڈانٹ دو پرواہ نہیں کرتی۔ صرف اپنے کھانے پر لڑتی ہے۔“

کومل پھٹ سے بولی۔ ”جی نہیں۔ کوئی مجھے ڈانٹ کر تو دیکھے۔ کہتے ہیں کومل پرواہ نہیں کرتی۔ کرتی تو ایسا ویسا ہے کہ آگے والے کو اگلا پچھلا یاد کرا دیتی ہے۔“

”میں نے تو تمہاری تعریف کی ہے؟“

”بھائی، مجھے کوئی تعریف اس میں نظر نہیں آئی بلکہ آپ نے دوبارہ میرے کھانے کا ذکر کیا ہے۔ دوبارہ کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ پھر ماں سے مخاطب ہوئی۔ ”امی بھائی کو سمجھائیں۔ پتا تو کریں میری ان سے دشمنی کیا ہے؟“

ماں نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔ ”کومل کومل، باپ بیمار پڑا ہے اور تیرا اس سے جھگڑا ختم نہیں ہوا۔ وہ عقل مند ہے۔ ذہین ہے۔ تم کو چھیڑتا ہے اور تم ہو کہ لڑنے مرنے پر آجاتی ہو۔“

”امی مجھے کیوں چھیڑتے ہیں۔ ان سے کہیں مجھے نہیں کنول کو چھیڑیں۔“ یہ کہہ کر منہ دبائے ہنسنے لگی۔

”اس کو کیوں چھیڑے گا۔ صرف تم کو دیکھ کر اس کی رگ پھڑکتی ہے... ورنہ کنول کی طرح تو چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔“

کنول خاموش بیٹھی اب اپنے والد کے ہاتھ دبا رہی تھی۔ اپنا نام سنا تو ماں کو نہیں مجھے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ آنکھوں میں ایک چمک اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

اس کی والدہ نے سوچتے سوچتے کہا۔ ”کنول کے بابا کو نظر لگی ہوئی ہے۔ اگر کل دم رکھوا لیتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔“ پھر منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا بتا رہی ہوں ان کی فکر ایک دن میری جان لے لیں گی...... اگر یہاں بیمار پڑ گئے تو اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ کیسے انہیں سنبھالوں گی۔“

میں بولا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ انکل ٹھیک تو ہیں۔ آپ انہیں بیمار بیمار کہہ کر ان کے علاوہ خود کو بھی بیمار کر دیں گی۔ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہر ایک کے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ اور آپ ان کو تسلی دیں ناکہ اپنی جان جانے کی باتیں کریں۔ آپ پریشان ہوگئیں تو بچے بھی دہل جائیں گے۔“

”بیٹا تو میں کیا کروں۔ دیار غیر میں ان کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اکیلی عورت کس کس کو سنبھالے۔“ پھر باقاعدہ رونے لگیں۔ کنول، کومل اور اطہر سارے ماں کے گرد جمع ہوگئے۔

میں نے کہا۔ ”آنٹی دیکھا، آپ کے بچے بھی پریشان ہوگئے ہیں، اور آپ اکیلی نہیں ہیں۔ میں بھی تو ساتھ ہوں ہوا بھی کچھ نہیں اور آپ نے سب پر پریشانی طاری کردی۔“

سن کر خاموش ہوگئیں۔

''آنٹی۔ ایسے ٹرپ ہم بار بار نہیں کر سکتے۔ آپ خود بھی انجوائے کریں اور بچوں کو بھی کرنے دیں۔''

وہ بولیں۔ ''ہم نے یہ ایک دو دن باہر کہیں نہیں جانا۔ یہ آرام بھی کر لیں گے۔ بچوں نے کہیں گھومنے جانا ہوگا تو تمہارے ساتھ جا سکتے ہیں۔''

میں خاموش بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔

انہوں نے کہا۔ ''تم بھی آنٹی کو روتے دیکھ کر افسردہ ہو گئے۔ اللہ تمہیں ان نیکیوں کا اجر دے.....''

دوسری جانب سائیں دوسری دری پر منتظر بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر آنٹی نے۔ ''تمہارا وہ دوسرا دوست کہاں ہے؟ وہ تمہارے انکل کا مسئلہ اچھی طرح سے سمجھ گیا ہے لیکن شرارتی بہت ہے۔''

''مسئلہ ہے کون سا کہ وہ سمجھے گا۔ انکل ٹھیک تو ہیں؟'' میں بولا۔

''تم بس اس کو بلاؤ۔ اللہ نے تمہیں عقل اور سمجھ دی ہے مگر تم نے نہ سیکھا اور نہ سیکھو گے کہ کس پر کیا بیت رہی ہے۔ میں ابھی رو رہی تھی اور تم کو معلوم بھی نہ تھا کہ میں رو کیوں رہی ہوں؟''

''آنٹی میرا مقصد تھا کہ انکل ٹھیک ہیں۔ انہیں کسی خصوصی دم کی ضرورت نہیں.....''

انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ ''تم اپنے دوست کو بلاؤ بس۔ ادھر آنٹی آنٹی کرتے ہو اور پھر میری ہر بات پر مسکرا بھی رہے ہوتے ہو..... جاؤ یہاں سے۔''

☆☆☆

اطہر اپنے ہمراہ فٹ بال لے آیا تھا۔ ہمارے دوستوں کے ساتھ وہ فٹ بال کھیلنے لگا۔ کومل نے ان کو کھیلتے دیکھا تو ہرنی کی مانند قلانچیں بھرتی سب کے درمیان بھاگی پھر رہی تھی۔ لطیف بڑے احترام سے سائیں کو لے آیا۔

سائیں اس کی والدہ کے روبرو جب بیٹھا تو وہ پھر سے دوپٹا ٹھیک کرنے لگیں۔ کنول اٹھ کر طاہرہ اور ثروت کے ساتھ جا بیٹھی۔

سائیں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ کلائی پر ایک عدد تسبیح بھی لپیٹ رکھی تھی۔ آنکھیں بند تھیں جیسے مراقبے میں ہوں۔

کنول کی والدہ لطیف کو اشارہ کر رہی تھیں کہ بات شروع کرو، اور لطیف انہیں اشاروں سے چپ رہنے کا کہہ رہا تھا۔ مگر وہ سمجھ نہیں رہی تھیں کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر کار وہ آہستگی سے بولیں.....

''پیر صاحب مراقبے میں ہیں.....؟''

لطیف نے بتایا۔ ''سب خاموش ہو جائیں۔ پیر سائیں کہیں گئے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گے۔''

مجھ سمیت سب حیران تھے کہ اچانک کیا ہو گیا ہے۔ اب سائیں آنکھ موندے بیٹھے تھے۔ سائیں کو خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ کیا کریں۔ ادھر لطیف اس کی والدہ کو بتا رہا تھا.....

''بلاوا آیا ہے۔ کچھ دیر میں آ جائیں گے۔''

''کہاں سے بلاوا آیا ہے.....؟''

لطیف نے آسمان کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ''اوپر سے.....؟''

''کیا.....؟''

''میرا مطلب ہے بڑے مرشد نے بلایا ہے۔ دس منٹ تک تو ہمیشہ آ جاتے ہیں۔''

اب سائیں کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا کیونکہ وہ دس منٹ تک ایک طرح سے قید ہو چکے تھے۔ اپنی آنکھیں کھولنا بھی ان کے لیے محال تھا۔

اب انہی دس منٹوں میں لطیف آسمان کو غور سے دیکھ رہا تھا اور میں لطیف کو۔ باقی سب سہمے سے بیٹھے سائیں کو دیکھنے لگے۔ اس کے والد نے دس منٹ کا وقفہ پایا تو دوبارہ لیٹ گئے۔

''اٹھ کر بیٹھ جائیں۔ ذرا ذرا دیر میں زمین بوس ہو جاتے ہیں۔'' اس کی والدہ نے ہولے سے شوہر کو ڈانٹا، اور وہ سر ہلاتے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

اتنے میں سائیں نے بے چینی میں کچھ ہلنا جلنا شروع کر دیا۔ میں نے لطیف سے کہا کہ لگتا ہے پیر سائیں کی واپسی شروع ہو گئی ہے۔ یہ سن کر سائیں نے ہل چل بڑھا دی۔ میرے اشارے پر لطیف چیخنے لگا:

''آ گئے آ گئے..... ہم سب کو یہ واپسی مبارک ہو۔ خوش آمدید۔ خوش آمدید۔''

کسی اور نے تو کچھ نہ کہا مگر سائیں نے آنکھیں کھول کر چین کا ایک لمبا سانس لیا۔

لطیف نے پوچھا۔ ''آج ذرا جلدی نہیں آ گئے۔''

سائیں نے غور سے لطیف کو دیکھا اور پھر ہلکے لہجے میں پھنکارے۔ ''ہمارے بہت سے معاملات ہوتے ہیں اور تم کو

ان کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر وقت سوال کرنا مناسب بات نہیں۔''

مگر سائیں کی آنکھوں میں یہ خوف بھی تھا کہ لطیف اسے ایک گھنٹے کے لیے کہیں واپس مرشد کے پاس نہ بھیج دے۔ اسی خاطر سائیں نے اپنا ہاتھ ذرا ہلکا رکھا تھا۔

لطیف نے اس کی والدہ سے کہا۔ ''آنٹی آپ مدعا بیان کریں۔''

اس کی والدہ نے پہلے اپنے شوہر کو دیکھا اور پھر سائیں سے مخاطب ہوئیں:

''میں اللہ کا جتنی بار شکر ادا کروں کم ہے۔ لوگوں کو شہروں میں پیر نہیں ملتے اور مجھے ویرانے میں مل گیا۔ پیر صاحب یہ نصیب کی باتیں ہوتی ہیں کہ کسی کو خزانہ ڈھونڈنے سے نہیں ملتا اور کسی کو میری طرح دور دراز کے علاقوں میں مل جاتا ہے۔''

ادھر سائیں پلکیں جھکائے بیٹھا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔

لطیف نے اشارہ کیا کہ اصل مدعا بیان کریں گی تب سائیں کچھ فرمائیں گے۔

وہ بتانے لگیں۔ ''میرے بچوں کو ایسے ہی نظر لگتی ہے جیسے ابھی میرے شوہر کو لگی۔ رات سے بہت چہک رہے تھے اور اب دیکھیں رنگ زرد پڑ گیا ہے۔'' پھر کنول کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ لڑکی ذرا سی تیار ہو جائے اور اگلے ہی لمحے اداس بیٹھی ہوتی ہے۔ خود سے کچھ نہیں بتاتی اور جب پوچھو تو رونے بیٹھ جاتی ہے۔''

کنول کے والد بول اٹھے۔ ''حضرت جی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھ پر نہ کوئی تعویذ کیا گیا ہے اور نہ آج مجھے کوئی نظر لگی ہے۔ جیپ کے دھکوں اور بلندی کی وجہ سے متلی ہونے لگی تھی۔ ہماری بیگم کو شبہ ہوا کہ کسی نے آج صبح مجھ کو نظر لگائی ہے..... بیٹی ایبٹ آباد میں تھک گئی تو چپ چپ رہنے لگی تھی۔ اور ماں سمجھی کسی نے تعویذ کیا ہوا ہے۔ اگر کوئی تعویذ ہوتا تو یہاں خوش کیوں ہوتی۔ دیکھیں اللہ کا شکر ہے ادھر ٹھیک ہے۔''

اس کی والدہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھے کوئی یہ بتا دے کہ راستہ کیا صرف ان کے لیے خراب تھا؟ سب دوڑ بھاگ رہے ہیں اور یہ جب سے آئے ہیں تھکے تھکے پڑے ہیں۔''

اس کی والدہ نے پہلے شوہر کو اشارے سے چپ ہونے کی کال دی اور اس کے بعد گویا ہوئیں:

''ان کو نظر کے علاوہ یہ تعویذ بھی دیں کیونکہ یہ میری ہر بات کی مخالفت کرتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں بات آگے چلانے سے پہلے آپ ان کو زبان بندی کا کوئی دم رکھ دیں تاکہ میں سکون سے بات تو کر سکوں۔''

سائیں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

لطیف بیچ میں بولا۔ ''پیر سائیں۔ ان کی شادی کو پچیس سال ہو گئے ہیں لیکن انکل ابھی تک آنٹی کی بات نہیں سمجھ پاتے۔''

وہ بولے۔ ''میاں، پچیس سال سے بیگم کی غلامی کر رہے ہیں اور تم نے پل میں سب کیا کرایا مٹی میں ملا دیا۔''

لطیف نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس کے علاوہ دن میں دو نہیں تو ایک بار انکل کو نظر ضرور لگتی ہے۔ آنٹی کی بات ٹھیک ہے کہ کوئی تعویذ ہونے سے پہلے ہی وہ ان پر اثر دکھا دیتا ہے۔ کل میں نے بھی اندازہ لگا لیا تھا، اس گھر پر کسی شیطان کی نگاہ ہے۔''

''پیر صاحب آپ نے سنا۔ یہ کل کا لڑکا سمجھ گیا مگر نہ سمجھے تو میرے میاں نہ سمجھے۔''

سائیں سے لطیف نے کہا۔ ''سب کو دم رکھنے کی بجائے صرف آنٹی کو رکھ دیں۔ اسی طرح سب ان کی بات سمجھنے لگیں گے۔ ایک دم کا اثر سارے گھر پر پڑے گا۔''

اس کے والد لطیف سے بولے۔ ''یہ ٹھیک رہے گا۔ ہر ایک سکھی ہو جائے گا۔''

وہ لطیف پر پھٹ پڑیں۔ ''تو پھر ادھر اُدھر کی ہانکنے لگا ہے۔ میں دوسروں کے لیے کچھ مانگ رہی ہوں اور تو مجھے تعویذ پہنا رہا ہے؟''

سائیں نے لطیف کو تلقین کی۔ ''خاتونِ خانہ کو حالت بیان کرنے دو۔ اسی دوران خاموشی برقرار رکھی جائے۔''

سن کر لطیف مسکرا کر چپ ہو گیا۔ اس کی والدہ لطیف کو قہر بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

وہ گویا ہوئیں۔

''حضرت جی۔ شادی کو چھبیس سال ہو گئے ہیں۔ یقین کریں میرا ایک دن چین کا نہیں گزرا۔ میری ڈولی کے ساتھ ہی دشمنوں کی غلیظ نظریں بھی گھر میں اتریں۔ میں جتنا بھی توڑ کروں مگر دشمن اپنا وار کر جاتا ہے۔''

مجھے یقین تھا کہ ان کو صرف وہم ہے۔ کئی جعلی لوگ پیر بن کر انہیں لوٹ رہے ہوں گے۔ میں نے بھی ان کی کسی بات

کو سنجیدہ نہیں لیا۔ لالہ زار کو روانگی سے پہلے میں سائیں کے گوش گزار یہ بات کر چکا تھا۔ ان کو کہا تھا کہ آنٹی کی تو ہم پرستی صرف آپ ہی ختم کر سکتے ہو۔ آپ کی عقیدت میں وہ اتنی آگے جا چکی ہیں کہ کسی اور کی نہ سنیں گیں اور نہ سمجھیں گیں۔ .... آپ کی بات کو کبھی نظر انداز نہیں کریں گیں، پھر ہم ایک پلان بنا کر آئے تھے اور اسی پلان کے تحت سوال پوچھے جا رہے تھے۔

''مالی حالات تو آپ کے ٹھیک ہیں.....؟''

سر پر دوپٹا درست کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اللہ کا بڑا احسان ہے۔ کنول کے بابا نے ہمیں کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔'' پھر ہاتھ سامنہ بنا کر کہا۔ ''اور تو اور رشتہ داروں کے بھی گھر بھرتے رہتے ہیں۔''

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ غریب رشتہ داروں کی مدد کرتے ہوں گے اور یہ ان کو اچھا نہیں لگتا ہے۔

''بچے بھی فرماں بردار ہیں؟''

''جی جی۔ آپ کے سامنے ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کنول سے کہا۔ ''میری بچی انہیں اٹھ کر سلام کر۔''

مگر سائیں نے اسے بیٹھنا کا اشارہ کر دیا۔

''بچے پڑھائی میں بھی اچھے ہوں گے.....؟''

''جی۔ ماشاءاللہ۔ سب اوّل پوزیشن لیتے ہیں۔''

سائیں نے پوچھا۔ ''گھر میں خدانخواستہ کوئی بیماری وغیرہ.....''

وہ دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولیں۔ ''نہیں بالکل نہیں۔ کنول کے بابا کو بہت عرصہ پہلے دل کی ہلکی سی تکلیف ہوئی تھی۔ مگر اب ٹھیک ہیں۔''

سائیں نے نظریں اٹھا کر میری جانب ذرا سا دیکھا۔ میں مسکرا رہا تھا۔ کنول کے والد حیران نظروں سے سائیں کو دیکھ رہے تھے کہ پیر کہاں اس قسم کے سوال پوچھتے ہیں۔ اکثر پیر تو ڈرا دیا کرتے ہیں۔ میں اور سائیں دونوں سمجھ چکے تھے کہ ان کو مسئلہ کوئی بھی نہیں ہے۔ صرف ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے اپنے ذہن کو جعلی پیروں کے ہاتھوں گروی رکھ چکی ہیں۔

لطیف بولا۔ ''انکل تو ماشاءاللہ صحت مند ہیں۔ دو ہفتوں سے اکیلے گاڑی چلا رہے ہیں۔ یہ ڈرائیونگ کوئی آسان کام تو نہیں۔''

یہ سن کر کنول کی والدہ پہلے ہلکا سا کانپیں۔ پھر جلدی سے کچھ پڑھا اور ساتھ بیٹھے شوہر پر پھونک دیا۔ اس کے بعد بولیں.....

''ایسی ہی باتوں سے ان کو نظر لگ جاتی ہے۔'' سائیں کے آگے ہاتھ باندھ کر بولیں۔ ''ابھی اگر آپ نہ بیٹھے ہوتے تو دیکھتے کہ کس طرح سے یہ غش کھا کر گرتے ہیں..... آپ کی موجودگی کی وجہ سے نظر ان کے قریب بھی نہیں پھٹکی۔''

اب تو سائیں خود بھی بے یقینی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ میں بھی سمجھنے لگا تھا کہ اس معاشرے میں یہ اکیلی نہیں بلکہ لاکھوں ہیں۔ سائیں اور میں نے آنکھوں آنکھوں میں کچھ باتیں طے کیں کہ معاملے کو کس طرح سے نمٹانا ہے۔ اسی دوران لطیف سائیں سے بولا:

''لگتا ہے یہ مسئلہ بڑے مرشد کی خدمت میں لے جانا ہوگا۔ بات حد سے نکل چکی ہے۔''

سائیں نے غصے بھری نگاہ لطیف پر ڈالی۔ ''کہا نہیں تھا چپ بیٹھنا ہے۔ لگتا ہے چاچے شفیع کو کہنا پڑے گا کہ آدھے گھنٹے کے لیے تمہیں سامنے پہاڑ پر بٹھا آئے۔''

لطیف گڑگڑایا۔ ''پیر سائیں۔ جیکٹ پتلی ہے۔ اوپر برف میں تو مر جاؤں گا۔''

''تو پھر چپ ہو کر بیٹھ۔ جلال کسی وقت بھی مجھے آ سکتا ہے۔''

اسی دوران کنول کی والدہ چونک پڑی تھیں۔ گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔ ''کیا چاچا جی یہاں بھی آئے ہوئے ہیں.....؟''

سائیں نے سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا۔ لطیف نے سائیں سے پوچھا۔ ''وہ تو فٹ بال کھیل رہے ہوں گے؟'' پھر اس کی والدہ سے کہا۔ ''فٹ بال کھیلنے کے بڑے شوقین ہیں۔ ہر میچ دیکھنے بیساکھی گراؤنڈ جاتے ہیں۔''

یہ سن کر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ بچوں کو زور زور سے آوازیں دے کر اپنے پاس بلایا۔ وہ اس بات سے ڈر گئی تھیں کہ ان کے بچے کسی جن کے ساتھ مل کر فٹ بال کھیل رہے ہیں۔

''کومل فوراً واپس آؤ فوراً... اور اطہر کو بھی ساتھ لے آؤ۔'' .... پھر بیٹھ کر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ''چاچا جی کتنے ناراض ہوں گے کہ ایک جوان جہان لڑکی اتنے لڑکوں کے ساتھ فٹ بال کھیل رہی ہے۔''

اتنے میں کومل بھاگتی ہوئی آئی اور آتے ہی ماں سے لپٹ گئی۔ سائیں کو دیکھ کر بولی۔ ''واہ وا۔ بڑے دم رکھوائے جا رہے ہیں۔''

ماں نے کہا۔ ''اب آرام سے میرے ساتھ بیٹھ جا اور

زندگی کے سفر کا پہلا پڑاؤ ہمارا آبائی گھر ہوتا ہے۔ وہ گھر جہاں ہم پیدا ہوتے ہیں۔ بچپن سے لڑکپن کا دور گزارتے ہیں۔ زندگی کو محسوس کرتے ہیں اور دنیا کو سمجھتے ہیں۔ شروع کی دوستیاں جہاں بنتی ہیں اور اوائل کے قصے جنم لیتے ہیں۔ درس گاہ صرف اسکول اور گھر نہیں بلکہ ہمارا محلّہ بھی ہوتا ہے۔ اسی عمر میں ہم دوسرے لوگوں کا اپنے ساتھ پیار بھی محسوس کرتے ہیں اور دوست بنا کر ان سے لڑتے بھی ہیں۔ جھوٹ سچ بھی اسی دور میں سیکھتے ہیں۔ عجیب قسم کے خواب بنتے ہیں اور رنگین تعبیریں سوچتے ہیں۔ ایک مٹھی میں پیسے بند ہوتے ہیں دوسری میں امنگیں لیے پھرتے ہیں۔ کسی کی عزت اور کسی پر غصہ کرنا ہے، ہم اسی دور میں سیکھتے ہیں۔ کبھی ہم بھاگے پھرتے ہیں اور کبھی چھپ کر کسی کونے میں خاموش ہو کر اداس بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی بہنیں اچھی لگتی ہیں اور کبھی ان سے لڑتے ہیں۔ ماں باپ سے ڈرتے ہیں اور ان کی محبت دل میں وہ نہیں ہوتی جو بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ رشتہ دار وہی اچھے لگتے ہیں جو محبت سے پیش آتے ہیں۔ محلے کے دوست، گلیاں، نالیاں، بجلی کے کھمبے، دکانیں، دکاندار اور دکانوں کے تختے اپنے دوست بن جاتے ہیں۔ گھروں میں بیر، توت اور جامن کے درخت بہت بھاتے ہیں۔ ان گھروں کی لڑکیوں کا کام بھاگ بھاگ کر کرتے ہیں۔ کسی شادی میں ماں کے ساتھ جاتے ہیں اور کبھی باپ کے ہمراہ کسی کے نکاح میں جاتے ہیں۔ ماں کے سامنے چیختے چلّاتے ہیں اور باپ آتا ہے تو خاموش ہو جاتے ہیں۔ فرمائشیں ماں سے کرتے ہیں اور ان کو پورا باپ کرتا ہے۔ بڑا بھائی ڈانٹتا ہے اور چھوٹی بہن اپنی عیدی تک ہمیں دے دیتی ہے۔ ماں سے لڑتے بھی ہیں مگر کوئی اور جھگڑا کرے تو تمام عمر یہ بات نہیں بھولتی۔ پھر سین بدلتا ہے۔ ماموں مجھے اسکول میں داخل کرانے لے جاتے۔ پرائمری اسکول نمبر 3 جسے کھگل اسکول بھی کہتے تھے اس کے ٹاٹ، تختیاں، نلکا، ایک پرانا درخت، چند کمرے، کمروں میں رینگتے سانپ، سوکھا دودھ اور گھی کے ڈبے اور اس کے علاوہ استاد رزاق میرے دماغ کی اسکرین پر موجود ہیں۔ مجھے میرا وہ گھر بہت یاد آتا ہے۔ دو کمرے، ایک برآمدہ، صحن، چھت اور اس تک جاتیں لکڑی کی سیڑھی۔ چھت پر بچھی بہت سی چارپائیاں، کھلا آسمان، چمکتے تارے، روشنی بکھیرتا چاند اور چاند کا سفر، یہ سب بھولتے نہیں بھولتے۔ وہ گرمیاں، وہ لمبے دن اور چھوٹی راتیں، وہ نلکا اور وہ اس کے ٹھنڈے پانی تلے بیٹھ کر نہانا، وہ پتنگیں، وہ آسمان اور

اپنی سانسیں بھی درست کر......"

"امی۔ کیوں بلایا مجھے۔ اتنا تو مزہ آ رہا تھا۔"

"کومل جب محفل میں بزرگ بیٹھے ہوں تو دھیمی آواز میں بات کیا کرتے ہیں۔ اپنا دوپٹا ٹھیک کر کے پہلے پیر صاحب کو ادب سے سلام کرو۔"

دوپٹا تو ویسے ہی لٹکتا رہا مگر پیر سائیں کو ادب سے فرشی سلام کر ڈالا۔

میں نے کومل سے کہا۔ "کنول کی طرح تمیز سے تم یہاں بیٹھتی مگر تم چاچا شفیع سے فٹ بال کھیلنے چلی گئیں۔"

"سچ بھائی! قسم اٹھائیں۔ جن چاچا بھی کھیل رہیں ہیں......؟"

"میرا اعتبار نہیں تو پیر سائیں سے پوچھ لو۔"

وہ فوراً سائیں کی جانب گھومی اور کہا۔ "چاچا کے بھی مزے لگ گئے ہیں۔ مفت میں اتنی سیر جو ہو رہی ہے۔"

اس کی ماں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ میں نے سائیں سے کہا "پہلے تو اس کو کوئی پکا دم رکھیں کہ کہیں آرام سے بھی بیٹھ جایا کرے۔ یہ جن سے نہیں ڈرتی تو اوروں سے کیا ڈرے گی؟"

اس کی والدہ سائیں سے کہنے لگیں۔ "اس نے تو مجھے بھی عاجز کر رکھا ہے۔ جتنا بھی سمجھاؤں نہیں مانتی جب تک بات اس کے اپنے بھیجے میں نہ بیٹھ جائے۔" اس کے بعد کومل سے چیخ کر کہا۔ "میرا کندھا توڑ کر رکھ دیا ہے۔ ہٹا اپنا ہاتھ یہاں سے۔"

کومل سائیں سے ہنستے ہوئے بولی۔ "مجھے پہلے کوئی ایسا دم رکھیں کہ دم مجھ پر اثر کرے۔ امی نے سارے پیر آزما لیے مگر میرا جن نہ اترا۔"

میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "تم پر کوئی جن ہے......؟"

"معلوم نہیں بھائی۔ لیکن امی کہتی ہیں کہ کوئی جن مجھ سے چمٹا ہوا ہے۔"

سائیں سر جھکائے مسکرا رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "تم میں تو اتنی ہمت نہیں کہ چاچے شفیع سے میچ کھیلو۔ تمہاری جگہ وہی جن کھیل رہا ہوگا جو تم کو چمٹا ہے......"

اس کی ماں نے پکڑ کر کومل کو دو جڑ دیں۔ "کبھی نہ بیٹھنے دینا مجھے سکون سے۔ اب میں تیرے باپ کی خبر گیری کروں کہ تیری۔ وہ شروع سے اگر میری سنتے تو آج میں بھی سکون

آسمان پر پتنگیں ڈھونڈتی بے چین نگاہیں، وہ پرندے، وہ کھجوریں، وہ ایک سیر برف لے آنا، وہ سوتے ہوئے رات کو ماں کا مجھے جگانا اور آدھا گلاس ٹھنڈا دودھ پینے کو دینا، وہ رات میں چلتی خنک ہوا اور وہ غنودگی۔ وہ دریا، وہ تیرنے کے لیے کدو اور ٹیوب، وہ آئس کریم یہی نہیں وہ سردیوں کے دن، وہ لمبی راتیں، وہ گرم رضائیاں، وہ صحن کی نرم دھوپ، چولہے پر چڑھی ہانڈی، ہانڈی تلے جلتی لکڑیاں ابھی تک مجھے گرماتی ہیں۔ وہ سرمائی شامیں، زرد بلب میں کھلی اداس دکانیں، وہ مونگ پھلی، چلغوزے، سدہ کھیری، اما مڑا بوتلوں والا، جمعہ کبابی، وہ مغل اور وہ گنڈیریاں بیچتا گاما، وہ عبدالرحمان سبزی فروش، وہ ساتھ بیٹھا قسائی، وہ روزے، وہ بڑی مسجد میں افطاری کے وقت بجتے گولے، وہ مسجد، وہ تراویح، وہ عید اور وہ میں۔ وہ چھوٹا سا باورچی خانہ، اس میں بچھی پٹ سن کی بوریاں اور وہاں ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہم سب۔ وہ چولہے کے پاس ماں، وہ کٹوریاں، وہ کپڑے میں لپٹیں روٹیاں، وہ پالٹی اور اس میں... بھرا پانی اور وہ تانبے کے گلاس۔ یہ سب میرے آبائی گھر میں میرے ساتھ آباد تھے۔ بھولتے نہیں بھولتے وہ گرمیوں کے موسم کا دریا، وہ درخت، وہ ہوا وہ فضا وہ حیرتیں وہ خواہشیں، وہ نئے مناظر، وہ نئے سفر وہ نئے ہمسفر۔ کچھ چھوٹی چھوٹی چوریاں، وہ جھوٹ، وہ سچ، وہ دل لگیاں، وفائیں وہ جفائیں وہ رونا وہ ہنسنا، وہ میرے کپڑے، وہ جوتے، وہ کنگھی اور وہ شیشہ۔ سب میرے آبائی گھر میں بسے تھے۔ وہ سنیما، وہ فلمیں، وہ سنیما کی کھڑکی، وہ مالشیے، وہ ٹوٹے پھوٹے بینچ، وہ پچھلی سیٹ پر منہ لپیٹے بیٹھا محلے کا مولوی، وہ سگریٹوں کا اُٹھتا دھواں اور وہ سیٹیاں۔ لگتا ہے آبائی گھر میں میرے ساتھ رہتے تھے۔ صحن چھوٹا مگر دل بڑا تھا۔ راحتیں کم اور خوشیاں زیادہ تھیں۔ شرارتوں میں شوخیاں تھیں۔ شوخیوں میں محبتیں تھیں۔ نئے تجربے اور نئے شوق تھے۔ نئی حیرتیں اور نئے استعجاب تھے، تارے، بادل، سورج اور چاند، پھول اور بھنورے، خوشبوئیں، تتلیاں اور خواب سب میرے دوست تھے اور میرے گھر کا حصہ تھے۔

پھر یوں ہوا کہ میں بڑھتا چلا گیا۔ عقل نے معصومیت کی جگہ لے لی، اور میرے یہ دوست مجھے ایک ایک کر کے چھوڑتے چلے گئے۔ عقل نے بہت کچھ دلوایا مگر میرا آبائی گھر مجھے پھر نہ ملا۔

(ندیم اقبال، مشی گن امریکا)

سے ہوتی۔''

سائیں نے کومل کو اپنے ساتھ بٹھا کر کہا۔ ''اپنی جگہ سے ہلنا نہیں۔'' یہ کہہ کر سائیں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ کومل حیرت سے ارد گرد دیکھنے لگی۔ ماں کی غصے بھری نظریں دیکھیں تو اپنی آنکھیں بھی سائیں کی طرح موند لیں۔

چند لمحوں بعد سائیں نے آنکھیں کھول کر اس کی ماں سے کہا.....

''بہن جی اس پر کوئی سایہ نہیں ہے۔ نصیبوں والی بچی ہے۔ یہ شرارتیں عمر کے ساتھ سنجیدگی میں بدل جائیں گی۔''

اس کے بعد سائیں نے کومل کو بھی بلا کر اپنے ساتھ بٹھا دیا۔ گو مجھ سے اس کا فاصلہ تھوڑا سا تھا مگر یوں لگ آرہا تھا کہ مجھ سے لگ کر بیٹھی ہے۔ اس کی خوشبو اس کے وجود سے نکل کر مجھے معطر کیے جارہی تھی۔ پیر سائیں نے آنکھیں ایک بار پھر بند کیں۔ کومل نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں محبت سے چھلک رہی تھیں۔ ایک امڈتا طوفان تھا جو بہتا چلا آرہا تھا۔ سائیں نے آنکھیں کھولیں اور اس کی والدہ سے منت والے انداز میں کہا:

''اپنی اس بچی کا بہت خیال رکھنا بہن جی۔ یہ بہت نازک دل کی ہے۔ اس کی کسی بات کو رد نہ کرنا۔ یہ کوئی ضد نہیں کرے گی۔ اگر کبھی کرے تو اسے نہ ٹالنا۔''

ماں نے کومل کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر اپنے گلے سے لگالیا۔

''پیر صاحب۔ اس نیک بخت نے آج تک کوئی ضد نہیں کی۔ کھانے پہننے پر کبھی تکرار نہیں کی۔ اس نے تو گھر کو جنت بنا رکھا ہے۔''

ماں نے تعریف بیٹی کی کی اور خوشی مجھے محسوس ہوئی۔

☆☆☆

سائیں اور اس کی والدہ کے بیچ مکالمہ ایک بار پھر شروع ہوا۔

''بی بی۔ آپ نے اپنے شوہر کی حالت تو بیان کردی کہ انہیں فوری طور پر نظر لگ جاتی ہے اور یہ کہ کوئی دشمن آپ کے گھر کو خدانخواستہ نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ مجھے آپ یہ بتائیں کہ گھر سے کبھی کوئی تعویذ وغیرہ نکلے ہیں۔ آپ کو معلوم تو ہے کہ ہمارے معاشرے میں کئی شیطانی صفت لوگ حسد اور دشمنی کی بنیاد پر ایسے کام کرتے ہیں۔''

کومل کی والدہ نے ایک گہرا سانس خارج کر کے کہا۔

''پیر صاحب! آپ نے تو میرے دل کی بات بھانپ لی۔ میں نے بتایا بھی نہیں اور آپ نے معلوم کرلیا کہ میرے دل کے اندر کیا چھپا ہے۔''

''بی بی۔ اگر آپ مختصر کر کے مجھے بتائیں تو ہم دونوں کا وقت ضایع نہیں ہوگا۔''

وہ ایک دم سنبھل گئیں، پھر اپنے شوہر کی جانب اشارہ کیا۔ ''ان کے ایک رشتہ دار گھر ملنے آئے۔ اس نے دور سے دیکھا کہ کوئی ہمارے گھر کے گیٹ کے قریب زمین میں کچھ دبا رہا ہے۔ اس نے آواز دی تو وہ بندہ بھاگ گیا۔ وہ اللہ کا بندہ وہی تعویذ اٹھا کر اندر لے آیا۔ میں حالانکہ پہلے اسے اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتی تھی۔ مگر اس دن کے بعد میرے گھر کا فرد بن گیا ہے۔ جب بھی آتا ہے تو سارا گھر چھان کر کوئی نہ کوئی تعویذ برآمد کر دیتا ہے۔ کبھی لان میں تعویذ ملتا ہے اور کبھی گھر کے پیچھے کہیں گڑا ہوا ملتا ہے۔ یہ تو میں نے خود دیکھا کہ کوئی گیٹ کے اوپر سے آٹے کا پیڑا ڈال جاتا ہے جس میں سوئیاں چبھی ہوتی ہیں۔ کبھی کوئی گڑیا جس میں سوئیاں پار ہوتی ہیں۔ ایک بار کالے بکرے کی سری کوئی پھینک گیا۔ سالوں سے میرے ساتھ یہی ہوتا آرہا ہے۔ جب بھی کچھ ایسا ہوتا ہے تو فوری طور پر بکرے کا صدقہ دیتی ہوں اور پھر کسی پیر کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''صدقے کا گوشت محلے میں بانٹتی ہیں؟''

''نہیں بیٹا۔ ان کے بہت سے رشتہ دار آس پاس رہتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ پہلا حق رشتہ داروں کا ہوتا ہے۔''

میرے ذہن میں صدقے کے گوشت کی بات یوں آئی کہ سوچا کہیں ایسا تو نہیں رشتہ دار انہیں تنگ کرنے اور ہر ماہ گوشت کے چکروں میں ان کے گھر تعویذ وغیرہ پھینک جاتے ہوں۔ دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ یہ ان لوگوں کو اپنے گھر میں داخل بھی نہیں ہونے دیتی تھیں کہ سب ان کے دشمن ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی ایسی حرکتوں سے انتقام لے رہے ہوں۔ اس پہلو پر یہ بات میں اور پیر سائیں پہلے سے ڈسکس کر چکے تھے۔ ہمارے خیال میں یا تو کوئی ان کو ڈرا کر بلیک میل کر رہا ہے اور یا پھر ان کو کوئی نفسیاتی بیماری ہے۔ پچھلے دو تین دن سے ہم نے جانچ لیا تھا کہ یہ ہر اچھے برے واقعے کو کسی دوسرے انسان سے جوڑ رہی ہیں۔

سائیں نے ایک پتا پھینکا۔ ''یہ آٹے کے پیڑے، گیٹ کے اندر تعویذ ڈال جانا، یہ منگل یا بدھ کے دن ہوتا ہوگا؟''

سن کر وہ اچھل پڑیں۔ ان کا شوہر بھی حیران بیٹھا تھا۔ بولیں۔ ''ان بدبختوں نے یہی دن چن رکھا ہے۔ میں تو پہلے سے جمعرات کا انتظام کر لیتی ہوں۔ مہینے میں دو بار نہیں تو کم از کم ایک بار ایسا ضرور ہوتا ہے۔''

سائیں نے پوچھا۔ ''انتظام کیا کرتی ہیں.....؟''

''ایک تو صدقے کے لیے کسی جانور کا بندوبست کر لیتی ہوں اور دوسرا جادو کا اثر کم کرنے کے لیے ہانڈی کو دم کر کے چھت پر رکھ دیتی ہوں۔''

ان کے شوہر بولے۔ ''اب تو گھر کی چھت مجھے چھت نہیں لگتی۔ کسی کمہار کا کوٹھا لگتا ہے۔''

ہمارے محلے میں بھی ایسا ہوتا تھا کہ کسی گھر میں جمعرات سے پہلے کوئی تعویذ وغیرہ ان کے رشتہ دار پھینک دیا کرتے تھے اور پھر جمعرات کو دعوت اڑاتے تھے۔

کنول کی والدہ سائیں کو بتا رہی تھیں کہ آپ مجھے پہلے ایسے پیر ملے ہیں جنہوں نے پیسے لینے سے انکار کر دیا ہے۔ اور کچھ باتیں تو میرے بتائے بغیر مجھے بتا دیں۔ میں تو سینکڑوں روپے صرف چلے کٹوانے پر لٹا چکی ہوں۔

اس کے والد نے کہا۔ ''اب تو مویشی منڈی کے بیوپاری کوئی کالا بکرا دیکھ کر ہمارے گھر پہنچا دیتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم کالے بکروں کا اسٹاک رکھتے ہیں۔''

''اور کالی مرغیوں کا بھی۔'' کومل نے گرہ لگائی۔

''تو چپ کر۔ میری بیٹی ہی میری دشمن ہے۔ ایک تمہارا باپ کم تھا کہ اب تو بھی باپ سے مل گئی ہے..... کم بخت!''

سائیں نے پوچھا۔ ''ایسا بھی ہوتا ہوگا کہ بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ آج کچھ برا ہونے والا ہے۔ یا ڈراؤنے خواب دیکھتی ہوں گی۔ یا ایسے خواب کہ کوئی آپ سب کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ کبھی آپ اچانک بیٹھی ڈر جاتی ہوں گی۔ یا پھر بلاوجہ سے پریشان ہو جاتی ہوں گی۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی دھڑکا لگا رہتا ہو؟''

سنا تو پُرجوش ہو گئیں۔ ''بالکل یہی ہوتا ہے۔ چیخ چیخ کر ان کو بتاتی ہوں مگر میرا اعتبار بھی نہیں کرتے۔ یہی کہتے ہیں کہ میرا وہم ہے۔'' پھر اپنے شوہر کو کہا۔ ''اب آ گیا ناں میرا اعتبار؟ سن لیا ناں اپنے کانوں سے۔''

وہ خاموش تھے مگر اب باتوں میں دلچسپی لینے لگے۔

سائیں نے پوچھا۔ ''گھر میں درخت ہے؟''

''ہاں۔ ایک نہیں دو ہیں۔''

''ایسا تو انہیں ہوتا کہ پرندے بیٹھ کر شام سے پہلے یا صبح کو شور مچاتے ہوں؟''

پھر تو وہ عقیدت سے جھکتی چلی گئیں۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں سائیں کے آگے سجدے میں نہ گر پڑیں۔

''پیر صاحب! آپ نے تو بغیر دیکھے میرا گھر کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ سائیں کے آگے باندھ لیے۔ میں ایک دم پریشان ہوگیا۔ مجھے ہرگز گوارا نہ تھا کہ کنول کی ماں ہمارے جیسے لڑکوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھی ہوں۔ میں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے اور بولا:

''پیر سائیں کے آگے کوئی ہاتھ جوڑے تو یہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ اسے پسند نہیں کرتے۔''

انہوں نے جوڑے ہاتھ کھول دیے اور سائیں سے بات جاری رکھی۔ ''ایک دن دیکھا آسمان دھندلا دھندلا تھا۔ ایسے ہی ذہن میں خیال آگیا کہ کہیں آندھی نہ آجائے... کیونکہ آندھی سے پورا گھر مٹی مٹی ہو جاتا ہے۔ ادھر مجھے آندھی کا دھڑکا لگا ہی تھا کہ کچھ دیر بعد سچ مچ کی آندھی آگئی۔''

ہم حیران تھے کہ اس میں ایسی کیا بات ہے جس نے ان کو پریشان کر دیا تھا۔ بولیں۔ ''پیر صاحب۔ ایسے ہی جب بھی کسی بات کا ڈر دل میں آتا ہے تو وہی کام ہو بھی جاتا ہے۔ مجھ پر کسی نے ایسا جادو کیا ہے کہ میرا خوف حقیقت بن جاتا ہے۔''

سائیں نے پوچھا کہ یہ اکثر ہوتا ہے؟

''اکثر تو نہیں بھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ ایک دفعہ چولہے پر ہانڈی رکھی۔ سوچا ذرا دیر کو لیٹ کر آرام کر لوں۔ جا کر بستر پر سو گئی... پھر محسوس ہوا کہ ہانڈی جل رہی ہے۔ فوراً اٹھی اور بھاگم بھاگ کچن میں پہنچی۔ وہاں دیکھا کہ ہانڈی جل کر کوئلہ ہو چکی ہے۔ اسی وقت کنول کے بابا کو فون کیا کہ اگلی جمعرات کے لیے بکرے کا انتظام کر دیں۔''

''ایسے خواب عموماً آتے رہتے ہیں؟''

''پیر صاحب۔ وہ خواب کہاں تھا۔ میں نے تو جاگتے میں جلنے کی بو محسوس کر لی تھی اور ہانڈی اصل میں جلی تھی۔''

اب میرے علاوہ سائیں بھی سر اٹھا کر انہیں حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔ میں سوچنے لگا جب کوئی جلتے چولہے پر ہانڈی چھوڑ کر جائے گا تو ہانڈی نے بہرحال جلنا ہی تھا۔ میں نے اپنے تاثرات فوری طور پر چھپا لیے۔

سائیں نے پوچھا۔ ''کسی سے دم درود تو کروایا ہوگا؟''

''ہاں بہت۔ جس نے کسی کا بتایا تو میں وہاں پہنچ گئی۔ جو مانگا میں نے دیا۔ مگر یہ سلسلہ ابھی تک بند نہ ہوا۔ بچوں پر توجہ دینے سے زیادہ وقت ان مسائل میں گزرتا ہے۔ پیر صاحب بہت پریشانی ہے۔ کئی دم کرنے والے گھر پر آئے۔ ہر کمرے کے ہر کونے میں دم کیے پانی کا چھڑکاؤ بھی کرتی ہوں۔ دھاگے لٹکوائے۔ دیواروں میں کیلیں بھی ٹھونکیں مگر کچھ بہتر نہ ہوا۔ جب بھی ذرا سکون ملتا ہے تو زیادہ تعویذ ملنے لگتے ہیں۔ جیسے گھر پر ان کی بارش شروع ہوگئی ہے۔ ذہنی سکون میرا تو خراب ہوا ہے مگر ان کو بھی میں نے پریشان کر رکھا ہے۔ بچے علیحدہ سے چپ چپ رہنے لگے ہیں۔''

ان کے وسوسے اور خوف ایک بھیانک خواب بن کر ان کو چمٹ چکے تھے۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ان کی آواز بھرا گئی۔ میرا اپنا دل ان کی حالت زار پر بھر آیا تھا۔ کنول بھی سب کی مانند اداس بیٹھی تھی۔ ہم کچھ دیر اسی طرح کی باتیں کرتے رہے اور جو نتیجہ ہم نے اخذ کیا وہ یہ تھا۔

صاف نظر آرہا تھا کہ وہ تو ہم پرستی کا شکار ہیں۔ ان کی شادی ایک بہت پڑے لکھے بندے سے ہوئی تھی۔ وہ پہلے دن سے اس وہم کا شکار تھیں یا کسی حقیقت سے آگاہ تھیں کہ اس شادی سے حسد کرنے والے بہت لوگ ہیں۔ خاندان کا ہر بندہ انہیں اپنا دشمن دکھائی دیتا۔ آس پاس جو مالی طور پر کم درجے کے رشتہ دار تھے یہ ان کو اپنے سے دور رکھنے لگیں۔ وہ لوگ کچھ حسد اور کچھ ان کے رویے سے نالاں ہو گئے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی ایک ان کا واقعی دشمن بن گیا ہوگا۔ تو ہم پرستی کا شکار تو وہ پہلے سے تھیں لہٰذا اس نے ان کے گھر تعویذ وغیرہ پھینکنے شروع کر دیئے ہوں گے۔ جو رشتہ دار ان کے گھر آتا جاتا تھا مجھے وہی ملوث لگتا تھا۔ اسی کے کہنے پر یہ پیروں فقیروں کے چکر میں تو پڑیں مگر ساتھ ہی کسی جانور کا صدقہ خیرات بھی شروع کر دیا۔ اسی طرح سے ان لوگوں کے گھر ہر دو ہفتے بعد گوشت پہنچنا شروع ہوگیا۔ یہ سلسلہ جب سے شروع ہوا وہ اب تک جاری ہے۔ مالی طور پر یہ مستحکم لوگ تھے تو ان کو زیادہ فرق بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ شوہر شروع میں مخالف ہوا مگر بیوی کی نفسیاتی حالات کے آگے وہ بھی بے بس ہوگیا تھا۔

میں سائیں اور لطیف ٹانگیں سیدھی کرنے کے بہانے اٹھ آئے۔ چل پھر کر ہم آپس میں بات کرتے رہے اور آخر کار اسی نتیجے پر پہنچے کہ ان حالات سے سائیں ہی انہیں باہر نکال سکتے ہیں۔ واپس آکر بیٹھے تو سائیں اور ان کے درمیان یہ بات ہوئی:

''بی بی۔ آپ تین تین بار کلمہ اور درود شریف پڑھ کر شوہر اور بچوں پر پھونک لیں۔''

نائیجر

افریقہ کی مسلم جمہوریہ جو 3 اگست 1960ء کی آزادی سے قبل فرانسیسی نوآبادی نظام کا حصہ تھی۔ ملک کا کل رقبہ 48919 مربع میل ہے۔ جس کا پچاس فیصد صحرائے اعظم پر مشتمل ہے۔ مرکزی مقام نیامی ہے۔ نائیجر میں مسلم اکثریت ہے جو تعداد میں 85 فیصد ہیں۔ عیسائیوں کی آبادی 45 فیصد ہے اور مظاہر پرست 14.5 فیصد ہیں۔ اس کے شمال میں الجیریا اور لیبیا ہیں۔ مالی اور اپر ڈیلٹا مغرب میں ہیں جبکہ جنوب میں ڈاہومے اور نائیجیریا ہیں، چاڈ مغرب میں ہے۔ اس کے جنوب مغربی حصے پر دریائے نائیجیر بہتا ہے۔ یہیں مرکزی دارالحکومت بھی ہے۔ اس حصے میں بارشیں بھی دوسروں کی نسبت سے زائد ہوتی ہیں۔ حکومتی مجموعی سالانہ بارش کی اوسط 10 انچ ہے موسم سارا سال گرم اور خشک رہتا ہے جو افریقی علاقوں کا خاصہ ہے۔ یوروبا، ابوہوز اور جرما سنگھائی کے قبائل آباد ہیں جن کا پیشہ کاشت کاری ہے کپاس و کھجوریں، چاول، گندم، سبزیاں، مونگ پھلی اہم زراعت میں شامل ہیں۔ معدنیات میں نمکیات، ٹین ٹنگسٹن اور دھاتیں، ملک کی زیادہ آمدنی بھی انہی برآمدات سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مویشی بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ سالانہ ساڑھے تین لاکھ اونٹ اور اتنے ہی گائے بیل، چار لاکھ گھوڑے، اور خچر اور سات لاکھ بھیڑ بکریاں افزائش پاتی ہیں۔ آبادی زیادہ پڑھی لکھی نہیں، صرف 200 پرائمری اسکول ہیں جن میں 2500 طالب علم علم حاصل کرتے ہیں۔ آٹھ سیکنڈری اسکول ہیں اور صرف ایک ٹیکنیکل کالج۔ کم تعلیمی ترقی کی وجہ سے

انہوں نے پڑھ کر سب پر پھونک ماردی۔

سائیں نے کہا۔ ”میں جو آپ سے کہوں گا اسے بڑے غور سے سننا ہے، اور عمل بھی کرنا ہے۔ دم رکھنے کے علاوہ پڑھنے کو بھی کچھ دوں گا۔ اگر آپ نے پھر کوئی پیر بدلا تو میرا کیا کرایا سب ختم ہوجائے گا۔ پہلے آپ مجھے یقین دہانی کرائیں کہ پیر نہیں بدلیں گیں تب میں اپنی بات شروع کروں گا۔ اگر کوئی ضرورت ہو تو آپ مجھے خط لکھ کر بتا دیا کریں گی۔“

وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھی تھیں۔ سائیں کی بات سن کر ذرا سا اپنی جگہ سے آگے کھسک کر بولیں۔ ”میرا وعدہ ہے۔ آپ سے وعدہ کرلیا تو کرلیا۔ اب آپ کا در کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ آپ ہی تو ہیں جنہوں نے میرے سارے مسائل بنا مجھے سنے معلوم کرلیے۔“

سائیں بولے۔ ”ٹھیک ہے۔ میں آپ کے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے آپ سے کچھ باتیں کروں گا۔ سب سے پہلے گھر میں آپ اور بچے نماز اور تلاوت کی پابندی رکھیں گے۔ آپ کے گھر میں جب کوئی تعویذ یا کوئی اور چیز پھینک جائے تو خاموشی سے اٹھا کر تعویذ کو بغیر دیکھے زمین میں گاڑھ دیں۔ اس کے بعد دو نفل پڑھ کر اپنے کام میں مشغول ہو جائیں۔ کسی تعویذ یا کوئی اور چیز گھر میں ملنے پر صدقہ خیرات کبھی نہیں کرنا۔ صدقہ خیرات کے لیے کوئی اور روٹین بنالیں۔ ایک دو ماہ میں کوئی خیرات کرلیا کریں۔ جو رشتہ دار آس پاس رہتے ہیں ان کے علاوہ جان پہچان کے لوگ بلا کر قرآن کا ختم کر کے ان کو کھانا کھلا دیا کریں۔ میں آج شام ہوٹل جا کر آپ کو تعویذ دوں گا۔ آپ نے اسے اپنے کمرے کے کسی کونے میں چھپا کر رکھنا ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی اور تعویذ گھر میں آیا تو بہت بڑی آفت آئے گی۔ اپنے گھر جاتے ہی چھت پر رکھی ساری ہانڈیاں آپ نے صرف اپنے ہاتھ سے توڑنی ہیں۔ ہر ہانڈی توڑنے سے پہلے زور سے کلمہ پاک پڑھنا ہے۔ چھت کو ہانڈیوں سے ہمیشہ پاک رکھنا ہوگا۔ آپ سب کو آج شام دم رکھ دوں گا۔ شیطان بھی بہکائے گا کہ فلاں پیر کے پاس چلی جاؤ فلاں کے پاس چلی جاؤ۔ مگر دھیان سے کہ آپ نے کہیں نہیں جانا۔ اگر کہیں بھی گئیں تو ایک نئی مصیبت کو گھر لے آئیں گیں۔ جو حاجت ہو وہ فرض نماز کے بعد اللہ سے مانگیں۔ وہی ایک مشکل کشا ہے۔ اگر آپ کی بہتری میں ہوا تو وہی آپ کو دے گا۔ کوئی اور آپ کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ ہر مصیبت کی گھڑی میں صرف اس کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ اللہ پر اپنے توکل کو ہرگز کمزور نہیں ہونے دینا۔ یہی تو ہمارا اصل امتحان ہے۔ اور یہی اس دنیا اور آخرت کی کامیابی بھی ہے۔“

سائیں خاموش ہوا تو میرے ساتھ سب اس کو تحسین بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کنول کے والد حیرت میں گم بیٹھے تھے۔ کنول کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ اس کی نظریں میرا شکریہ ادا کررہی تھیں۔

مجھے یقین تھا کہ اب اس کی والدہ سائیں کے حکم پر ایمان لاکر وہی کریں گیں جو سائیں نے ان کو کہا ہے۔ وہ سائیں کی اور زیادہ معتقد نظر آرہی تھیں۔ ان کے ذہن میں

ملک ابھی پسماندہ علاقوں میں شامل ہے۔اس کی صنعت ابھی مضبوطی حاصل نہیں کرسکی۔سڑکیں اور دوسرے ذرائع مواصلات بھی ابھی کمزور ہیں۔صرف ایک دو روزنامے شائع ہوتے ہیں جن کی اشاعت بھی پندرہ ہزار سے بڑھنے نہیں پاتی۔باور کیا جاتا ہے ا... سو سال قبل یہاں ٹارگس آباد تھے۔جن کا مرکزی دارالحکومت اجڈیز کا گاؤں تھا۔یہیں غلاموں کی خرید وفروخت کی سب سے بڑی مارکیٹ تھی۔1515ء میں سونگانی کے مسلمان عقید محمد اول نے ہاؤسا قبائل پر لشکر کشی کر کے آغادیس کے شہر پر قبضہ کرلیا۔جس سے تمام علاقوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔آہستہ آہستہ یہ قبائل دوبارہ سر اٹھانے لگے۔ان کا ساتھ ان انگریزوں اور فرانسیسیوں نے دیا جو انیسویں صدی کے آغاز ہی سے وہاں بسنا شروع ہوگئے تھے۔1805ء میں فولانی خاندان کے مسلمان حاکم سے ہاؤسا قبائل نے حکومت لے لی۔1810ء میں پھر فولانی خاندان کے رہنما عثمان نے انہیں اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔وقت کے ساتھ فرانسیسی بھی مضبوطی حاصل کرتے رہے۔بیسویں صدی کے اوائل میں انہوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔1922ء میں اسے باقاعدہ نوآبادی بنادیا گیا۔1958ء میں فرانسیسی بلاک کی خودمختار جمہوریہ بنایا گیا۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کی سرکاری زبان اب بھی فرانسیسی ہے۔اس کے دو سال بعد اسے آزادی مل گئی۔یہاں کا سکہ فرانک ہے جو امریکی ڈالر کے مقابلے میں 235 گنا کم قدر رکھتا ہے۔

مرسلہ: نعمان اشرف، سید فدا حسین، لالہ موسیٰ

شاید یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ سائیں کی کہی بات سے روگردانی ایک نئی مصیبت کو جنم دے گی۔

ہم تینوں وہاں سے اٹھے تو سب اپنی اپنی جگہ پر خوش تھے۔سب کی آرزوئیں پوری ہوگئی تھیں۔سائیں میری نظروں میں سرخرو ہوا اور میں کنول کی نظروں میں۔اس کی والدہ نے ایک بار پھر دبے الفاظوں میں ہدیے کا پوچھا مگر سائیں نے نرم انداز میں کہا۔"یہ دھن دولت ہمارے کسی کام کی نہیں اور ہم اللہ کا کلام نہیں بیچتے۔آپ واپس جا کر ان پیسوں سے کسی غریب کی حاجت پوری کردینا۔"

ہم واپس آئے تو میں نے سائیں سے کہا۔"استاد جی۔آج تو بڑا رنگ جمادیا ہے۔میں تو ڈر رہا تھا کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔"

مونچھوں کو ہلکا سے سہلا کر بولے۔"اب زیادہ چخ چخ نہ کر...ورنہ لالہ زار میں چیر کر یہیں دفنا دوں گا...اور جا کر پتا کر کھانے میں لڑکیاں کیا کیا لائی ہیں۔اب نکل یہاں سے، ہنس کیوں رہا ہے۔"

میں مسکرا کر جیپ کے پیچھے دیکھنے لگا جہاں کنول اور کشمیرن ایک بڑے درخت تلے چولہا جلانے کی کوشش میں مصروف تھیں۔

☆☆☆

وقت چلتی ہوا کی طرح ہولے ہولے گزر رہا تھا۔پیار کی بہتی موج نے دل و دماغ کو قابو میں کر رکھا تھا۔خالدہ اور ثروت سائیں کو گھیر کر بیٹھیں اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے اپنے مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔میں دری پر لیٹا نیلے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔پھولوں بھری زمین مجھ پر مہربان تھی۔ہوائیں مجھے دلاسے دیتی تھیں۔چیڑ کے درختوں پر بیٹھے پہاڑی کوے کائیں کائیں کرتے تھے۔طارق معلوم نہیں کون سی آگ بھڑکانے کے لیے کشمیرن کی مدد کررہا تھا۔نیلا دھواں وہاں سے اٹھ کر درختوں کی شاخوں سے الجھ جاتا تھا۔ٹیپ ریکارڈر پر یہ گانا گونج رہا تھا......

دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے
دور تک نگاہوں میں ہیں گل کھلے ہوئے
یہ گلہ ہے آپ کی نگاہوں سے
پھول بھی ہوں درمیاں تو فاصلے ہوئے
میرا دل ہے تیری پناہوں میں
آ چھپا لوں تجھے میں بانہوں میں
تیری تصویر ہے نگاہوں میں
دور تک روشنی ہے راہوں میں
کل اگر نہ روشنی کے قافلے ہوئے
پیار کے ہزار دیپ ہیں جلے ہوئے

کیا بےخودی میں ڈوبے لمحے تھے کہ جی چاہتا کہ وقت یہیں رک جائے۔ساری کائنات حسین دکھائی دے رہی تھی۔فضائیں گنگناتی محسوس ہونے لگیں۔ہواؤں سے زمین پر دور دور تک نظر آتے پھول ڈولنے لگے۔دل کرتا ہواؤں میں اڑتا پھروں۔کنول کا ہاتھ تھام کر اسے حسین وادیوں میں لے جاؤں۔محبت کا یہ سکون بھی مجھے بےقرار کیے ہوئے تھا۔اس

سے ایک پل کی دوری میں ایک بے چینی تھی۔ محفل ہو کہ تنہائی، میں کنول کی یاد اور وجود کی خوشبو سے مہکنے لگا۔ اس کو سوچتا اور اس کی سوچوں پر مسکرانے لگتا۔ اسے دیکھتا تو دیکھتا جاتا مگر ساتھ میں وسوسے بھی چلے آتے۔ اگلے چند دن بعد کی جدائی کا خوف بھی اندر بیٹھا تھا۔ ہر لحظہ مجھے یہ خوف ڈسنے لگتا۔ اس خوف کا زہر میری رگوں میں دوڑنے لگا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے چلے جانا تھا۔ وقت کی رفتار ہماری جدائی کی گھڑی کو قریب سے قریب لا رہی تھی۔ ایک مہیب اندھیرا مجھے ڈسنے لگتا۔ اپنے ساتھ اس کا دکھ بھی ستانے لگتا۔ میں کنول کی جانب دیکھنے لگا جو چولہے کے پاس کھڑی آگ کی شدت سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس پر کوئی اداسی نہ تھی۔ وہ بھول بیٹھی تھی کہ محفل چند لمحوں میں سمٹنے والی ہے۔ یہاں صرف ہواؤں کی سسکتی صدائیں ہی رہ جائیں گیں۔ ہر پھول کملا جائے گا۔ ہر نغمہ ڈوب جائے گا۔ لبوں پر ٹھہری یہ مسکراہٹ معدوم ہو جائے گی۔ آنکھوں کی یہ دو بھری جھیلیں کسی بنجر زمین کی طرح لگنے لگیں گی۔

میں اسے عقل و فہم سے مبرا ہو کر دیکھنے لگا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹہلتا ہوا وہاں نکل گیا جہاں درخت ہوا سے باتیں کرتے تھے۔ ایک خاموش اور فسوں ساز سماں تھا۔ وہاں تنہائی تھی۔ چولہے کے پاس ان سب کی باتیں تیرتی میری جانب آتی تھیں۔ وہ میری نظر کی زد پر تھی۔ میں ایک تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں کنول کے علاوہ نہ کچھ دیکھنا چاہتا تھا اور نہ کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

اس نے دری پر مجھے نہ پایا تو اس کی نگاہیں آس پاس بے چینی سے بھٹکنے لگیں۔ مجھے وہاں نہ پایا تو ہراساں سی نظر آنے لگی۔ جب گھومتی نظریں مجھ پر رکیں تو وہیں جم گئیں۔ نظروں میں کچھ سوال کچھ شکوے تھے۔ مگر ان شکوؤں میں محبت پنہاں تھی۔ وہ میری طرف آنا چاہتی تھی۔ ارادہ بندھتا، قدم اٹھنے لگتے مگر وہیں رک جاتے۔ نگاہوں کا تذبذب قدموں تک پھیلا تھا۔ میں اسے بغور دیکھ رہا تھا کہ کیا فیصلہ کرتی ہے۔ دنیا کا ڈر غالب آتا ہے کہ شوق ملاقات رکنے نہیں دیتا۔ یہیں پر مجھے اس کی سب سے ٹکرا جانے کی ہمت کا اندازہ ہونا تھا۔ پھر دیکھا کہ اس نے سارے ڈر نیچے پھینکے اور ان کو روندتی میری جانب بڑھنے لگی۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ سب کی موجودگی میں وہ اکیلی میری جانب نہ آئے۔ میں تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کی جانب چلا تو وہ وہیں رک گئی۔ میں قریب پہنچا تو اس نے پلکیں اپنی شفاف آنکھوں پر جھکا دیں۔ میں جب قریب جا کر کھڑا ہوا تو اس نے اپنی خوشبو بھری نگاہیں اٹھائیں تو ان میں شرم کے علاوہ کچھ بے باکی بھی تھی۔ یوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہم دونوں نے خود کو نہ روکا تو لپک کر ایک دوسرے سے لپٹ جائیں گے۔

وہ میری بے کیف زندگی میں ایک کہکشاں کی مانند آئی تھی۔ کنول نے مجھ جیسے ایک بے پروا لڑکے کو چند دن میں ایک ذمے دار انسان بنا دیا۔ زندگی کے طور طریقوں اور رشتوں پر غور کرنے لگا۔ گہری سوچ میری عادت بننے لگی۔ اپنا مستقبل سنوارنے کی سوچ میرے ذہن پر چھانے لگی۔ میں وہ نہ رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ میں وہ ہونے لگا جو مجھے ہونا چاہیے تھا۔ میں خود کو اس کی پاکیزگی کا نگراں اور عزت کا پاسباں سمجھنے لگا۔ میں وہ ہو گیا جس کے کندھے پر ذمے داری ہوتی ہے۔

وہاں کشمیرن بیٹی پیالیوں میں چائے ڈال رہی تھی۔ کنول کو کیا سوجھی کہ ایک کپ میں چائے ڈال کر میری طرف آ گئی۔ لڑکوں نے شور ڈال دیا کہ یہ آیا ابھی ہے لہٰذا چائے بھی اسے بعد میں ملے گی۔ وہ اتنا شور سن کر گھبرا گئی۔ لڑکے چپ نہیں ہو رہے تھے۔ اس نے کپ مجھے پکڑایا اور ماں کے پاس جا کر خاموش بیٹھ گئی۔ میں بھی اپنا کپ لے کر وہیں جا بیٹھا۔ اتنے میں آملیٹ، کباب اور پراٹھے بانٹے جانے لگے۔ میں نے کچھ نہ لیا۔ اس نے اپنا کھانا اخبار میں لپیٹا اور پرس میں رکھ لیا۔ ماں سے کہا کہ بعد میں کھاؤں گی۔ کومل مجھ سے بولی:

''بھائی آپ کو بھوک نہیں تو اپنا کھانا مجھے دے دیں۔''

میں نے اپنا کھانا اسے دے دیا۔ اس کی ماں کومل سے بولی۔ ''مجھ سے مانگ لیتی، مگر تیری نظر بھائی کے کھانے پر ہی رہتی ہے۔''

''امی مجھے معلوم ہے یہ کم کھاتے ہیں۔ میں نہ لیتی تو یہ کوؤں کے آگے پھینک دیتے۔''

مجھ سے وہ کہنے لگیں۔ ''بیٹا۔ اسے سر پر مت چڑھاؤ۔ تم بہت بھلے مانس ہو اور اس کو کسی کا لحاظ نہیں۔ اپنا کھانا اس سے واپس لو۔''

میں نے کہا۔ ''آنٹی۔ یہ میری چھوٹی بہن کی طرح ہے۔ اگر مجھے بھوک ہوتی تو تب بھی اسے انکار نہ کرتا۔''

میں محسوس کر رہا تھا کہ جب سے کنول کی فیملی کی اور اس کے علاوہ دوسری لڑکیاں ہمارے ساتھ شامل ہوئیں تب سے ہم سب بہت تمیز دار ہو گئے تھے۔ ہم جو پہلے بے دریغ راہ چلتی لڑکیوں پر تبصرے کرتے تھے وہ ساری بدتمیزیاں ختم ہو گئیں۔ اب سامنے کیا ہم پیٹھ پیچھے بھی ان کے بارے میں بات نہیں

کرتے تھے۔ لڑکیوں نے یہ کیا کہ نہ غیر ضروری طور پر ہم سے فاصلہ کم کیا اور نہ ہی بڑھایا۔ انہوں نے جب اپنی عزت خود کی تو ہم بھی کرنے لگے۔ اب تو لڑکے ان کے سامنے اسموکنگ بھی نہیں کرتے تھے۔

مجھے اندازہ ہونے لگا کہ لڑکیاں کس طرح لڑکوں سے اپنی عزت کروا سکتی ہیں۔ یہ نہیں کہ لڑکے نے بات کی اور تڑاخ سے جواب دے دیا۔ بلکہ چہرے پر سنجیدگی لا کر اپنے تاثرات سے جواب دیا۔ جب ہنسی بھی تو دھیمے لہجے میں۔ ہاتھوں اور چہرے کے غیر فطری اشارے بھی نہ کیے۔ نہ ہی بلا وجہ انگریزی بولی۔ جب انہوں نے تہذیب کا دامن برقرار رکھا تو ہم بھی تہذیب یافتہ ہو گئے۔ اگر عورت کو پُراعتماد مرد پسند ہے تو مرد بھی پُراعتماد عورت کو پسند کرتا ہے۔ بھلے عورت ماں ہو بیٹی، بیوی کہ بہن ہو، عزت دار وہی ہوتی ہے جو پہلے اپنی عزت کرتی ہے۔ وہ عورت اور مرد جن کو نمایاں ہونے کے لیے مصنوعی سہارا نہیں لینا پڑتا، وہ سادگی میں بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ بھڑکیلے لباس سے وقتی طور پر جذبات تو بھڑک سکتے مگر ایسے لباس کسی پائیدار پسندیدگی میں نہیں بدل سکتے۔ گفتگو میں آنکھوں، ہاتھوں اور ہونٹوں کا بلا ضرورت استعمال کسی کو کوئی ابدی خوشی نہیں دے سکا ہے۔

عورت پیدائشی طور پر اللہ کی خوبصورت تخلیق ہے۔ اس کی شکل تو صرف ایک حصہ ہے اصل تو اس کے خصائل ہیں۔ عادات اور اس کی روح ہے۔ یہ پائیدار حسن ہے جو دوسرے پر آہستگی سے اثر کرتا ہے۔ اثر تو آہستگی سے ہے مگر انتہائی پختہ اثر ہوتا ہے۔

مجھے تو محسوس ہو رہا تھا کہ بدلے ماحول میں طارق نے بھی اپنا عشق کشمیرن سے وقتی طور پر ملتوی کر دیا تھا۔ کئی بار تو کنول کے خاندان کو قریب آتا دیکھ کر ہم ٹیپ ریکارڈر بھی بند کر دیتے تھے۔

اتنے میں کنول کے والد نے پوچھا۔ ''اتنے لڑ کے گھوم رہے ہو اور موسیقی بھی نہیں۔ یہ تو نری بدذوقی ہے.....؟''

امتیاز نے بتایا۔ ''ٹیپ ریکارڈ تو ہے مگر شہزاد بہت اچھا گاتا ہے۔''

''اس سے کہو کچھ ہمیں بھی سنائے۔''

''انکل۔ شہزاد آنٹی سے شرما رہا ہے۔'' امتیاز نے بتایا۔

''کیوں بھئی۔ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ وہ تو خود سارا دن ٹیپ ریکارڈ پر گانے سنتی رہتی ہیں۔''

پھر شہزاد نے یہ گانا گا کر ایک سماں سا باندھ دیا:

چلتے چلتے، میرے یہ گیت یاد رکھنا
کبھی الوداع نہ کہنا،
روتے ہنستے، بس یونہی تم
گنگناتے رہنا
پیار کرتے کرتے، ہم تم کہیں کھو جائیں گے
انہی بہاروں کے، آنچل میں تھک کے سو جائیں گے
سپنوں کو پھر بھی، تم یونہی سجاتے رہنا
کبھی الوداع نہ کہنا،

ہر ایک اداس ہو گیا کیونکہ ہر ایک نے ایک دوسرے سے دو تین دن میں بچھڑ جانا تھا۔ سب کی کوئی نہ کوئی یاد اس سفر سے جڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سب ایک دوسرے کو الوداع کہہ کر کچھ دیر میں بچھڑ جائیں گے۔ میں نے دیکھا کہ کنول کے والدین کے ساتھ کنول بھی اداس لگ رہی تھی۔ سب اس گانے کے بولوں کا سہارا لے کر دوسروں کو الوداع کر رہے تھے۔ ہم میں سے کسی نے اس وقت نہیں سوچا ہو گا کہ ان یادوں سے ہم اپنی آئندہ زندگی کے سونے اور پھیکے لمحوں کو رنگدار بنایا کریں گے۔ میری زندگی کے وہ عجب لمحے تھے جو برق رفتاری سے آئے اور اپنی خوشبو سے آشنا کر کے سرعت سے نکل گئے۔ وہ خوشبو تب تو محسوس ہوئی تھی مگر وقت کے ساتھ یہ بڑھتی رہی ہے۔

کنول نے بھیگی پلکوں کی اوٹ سے مجھے دیکھا تو میرا دل دولخت ہوتا محسوس ہوا۔ وہاں غم کی پرچھائیں تھیں۔ وہ وقت آنے سے پہلے مجھے الوداع ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ محبت کی کوئی روشنی پوری شدت سے اسے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ہماری محبت ہمیں ملانے کی بجائے کوئی سہانی یاد بن کر ہم سے کھیلا کرے گی۔

اس کی آنکھوں میں دکھ بھی تھے اور بے بسی کے ساتھ

نعت کے غیر مسلم شاعر

اعظم جلال آبادی، حکیم تر لوک ناتھ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۹ء میں انتقال ہوا۔ فرماتے ہیں کہ:

مجھ سے کیا پوچھتے ہو کون ہوں میں کیا ہوں میں
روضۂ پاک محمد کا جبیں سا ہوں میں
حوریں آنکھوں پہ بٹھائیں گی مجھے جنت میں
کفش بردارِ شہِ یثرب و بطحا ہوں میں

اقتباس: بہرِ زماں۔ نور احمد میرٹھی
مرسلہ: حبیب الرحمن

...کہ سوال تھے۔ ایسے سوال جن کے جتنے جوابات دیتا انہوں نے مزید الجھ جانا تھا۔

میرے نازک سوال میں اترو
ایک حرف جمال میں اترو
خواہ پت جھڑ کی ہی ہوا بن کر
پیڑ کی ڈال ڈال میں اترو
مضمحل رات اور تنہائی
کاش خواب وصال میں اترو۔

اس گانے کے بعد سب تتر بتر ہو گئے۔ کوئی کہاں جا بیٹھا اور کوئی کہاں۔ سامنے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برفوں کے پیوند لگے تھے۔ ڈھلوانوں سے دامن تک درخت ہی درخت نظر آ رہے تھے۔ وہاں کوئی جادو چھایا تھا جو مجھے اپنی جانب بلا رہا تھا۔ کوئی وہاں سے مجھے پکارتا تھا۔ میں ان پہاڑوں کے قریب جانا چاہتا تھا مگر کنول کو یہاں چھوڑ کر میرا چلے جانا ناممکنات میں سے تھا۔

وہاں چوٹی سے بادل نیچے کھسکتے چلے آ رہے تھے۔ یہاں سے لے کر پہاڑوں کے دامن تک تا حد نظر پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ ہوا سے پھول جھومتے تو لگتا رنگین لہریں ایک ساتھ چل پڑی ہوں۔ پاپلر کے پتے شور مچانے لگتے اور بجھتے چولہے کا دھواں آسمان میں تحلیل ہوتا دکھائی دیتا۔

☆☆☆

میں اپنی چاہتوں اور خواہشوں کو لیے دری پر لیٹا ہوا تھا۔ اتنے میں اطہر آ گیا۔ ''بھائی جان۔ بابا آپ کو بلا رہے ہیں۔''

میں وہاں گیا تو بولے۔ ''ناں میاں۔ ہم سے کوئی ناراضگی ہے جو چپ چپ ہم سے دور لیٹے ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے انکل۔ میں تو آسمان کی وسعتوں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ یہ کائنات کتنی بڑی ہے تو اس کا بنانے والا اللہ ہی ہوگا۔''

وہ ہنس پڑے۔ ''ہاں! صرف اللہ ہی خالق ہو سکتا ہے۔''

پھر مجھ سے پوچھا۔ ''کئی لوگ کہتے ہیں کہ ایک بڑا دھماکا ''بگ بینگ'' ہوا تھا جس کے نتیجے میں یہ کائنات وجود میں آئی، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ نہ کوئی خدا ہے اور نعوذ باللہ نہ ہی خدا کا وجود۔''

میں بولا۔ ''دھماکے کا فطری نتیجہ چیزوں کا بگڑنا ہے جڑنا نہیں۔ اگر یہ مان بھی لیں کہ کوئی دھماکا ہوا تھا تو یہ بھی اللہ کی حکمت عملی ہو سکتی ہے، اور اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ کوئی خالق نہیں ہے تو پھر وہ اپنی تخلیق کو کسی اور طرح سے ثابت کر کے دکھائیں۔''

کنول کی والدہ نے کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ یہ لڑکا عقل مند ہے، باشعور بھی ہے۔ فہم بھی اسے ہے مگر.....''

بیچ میں کنول بول اٹھی۔ ''امی۔ اب ان کو کچھ کہہ نہ دینا۔ کیا سوچیں گے کہ تعریف کرنے کے بعد ڈانٹ بھی دیتی ہیں۔''

وہ کہنے لگیں۔ ''میری بچی۔ کب اس کو میں نے ڈانٹا ہے۔ میں تو صرف کہنے والی تھی کہ بہت خوبیاں ہیں مگر کبھی آوارہ بھی لگتا ہے۔ جیسے کسی کی بھی نہیں سنتا۔ ہے کل کا چھوکرا.... مگر سمجھتا ہے مرد بن گیا ہے۔ اچھا برا جو بھی دل میں آتا ہے وہی کرتا ہے۔''

میں سن کر مسکرایا تو باقی سب ہنس پڑے۔

اس سے پہلے وہ کوئی اور بات کرتیں کہ جلدی سے اس کے والد نے مجھ سے کہا:

''جب لالہ زار میں آئے ہو تو ذرا اِدھر اُدھر گھوم بھی لو۔ یہ بچیاں بھی اب بور ہو رہی ہیں۔''

میں نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اور آنٹی بھی ساتھ چلیں تو زیادہ مزہ آئے گا۔''

اس کی والدہ شوہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولیں ''نہ تو میں کہیں جاتی ہوں اور نہ ان کو کہیں جانے دوں گی۔ تم لوگ ہو آؤ۔ انہیں اب آرام کرنا ہے۔ پیر صاحب نے بھی یہی کہا ہے۔''

میں اٹھنے لگا تو کنول کے والد نے فرمائش کی۔ ''جانے سے پہلے علامہ اقبال کے چند شعر تو سناتے جاؤ۔''

اس کی والدہ بولیں۔ ''اب بس بھی کریں۔ گھر میں کنول اور یہاں یہ لڑکا۔ آپ کو تو شعر سننے کا بہانہ چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''آنٹی پیر سائیں کو بھی اقبال بہت پسند ہے۔ کہتے ہیں ان کی شاعری سننے سے ثواب ملتا ہے۔''

وہ خاموش ہو گئیں۔ میں نے یہ اشعار سنائے:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
میں جو سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

☆☆☆

ہمارا گروپ ایک الگ راستے پر جارہا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ پیچھے والے درختوں کے جھنڈ سے ہو کر سامنے پہاڑوں کے دامن تک چلیں گے۔

وہ مختصر سا سفر بہت دلفریب تھا۔ ایک سحر انگیزی ہم دونوں پر طاری تھی۔ بے مقصد بھٹکنا محبت کے دنوں کی ایک خوبصورت مصروفیت ہوتی ہے۔ چہل قدمی کرتے کرتے دو لوگ کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں۔ اتنے محو کہ واپسی کا رستہ بھی یاد نہیں رہتا۔ باتیں عام ہوں مگر بہت اہم ہوتی ہیں۔ راستہ کیسا بھی ہو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ راستے کی گرد کوئی مخملی گھاس لگتی ہے۔ چلتے چلتے ایک دوسرے سے ذرا سا ٹکراتے ہیں، پھر دور ہو کر پھر قریب آجاتے ہیں۔ یہ کہیں جا نہیں رہے ہوتے بلکہ ایک دوسرے کے دلوں میں گھوم رہے ہوتے ہیں۔ ایسے سفر میں نہ تھکاوٹ ہوتی ہے، نہ پسینا آتا ہے اور نہ ہی سانس چڑھتی ہے۔ ایک ہی طرح کی باتیں ہوتی ہیں مگر لگتا ہے ہر بات نئی ہے۔ اس سفر میں دل کی طرح قدم بھی بھٹکتے رہتے ہیں۔

ہم درختوں کی چھاؤں تلے آئے تو خنکی کا احساس زیادہ ہونے لگا۔ شاخوں سے چھن چھن کر آتی سورج کی کرنیں تمازت سے خالی تھیں۔ نیچے پھول نہ تھے، صرف گھاس بچھی تھی۔ اس کے علاوہ ہوا اور تنہائی تھی۔

میں درختوں کو اپنی عادت کے مطابق چھو کر گزر رہا تھا جیسے وہ میرے دوست ہوں۔ کسی سے بغلگیر ہوتا اور کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا۔

کنول نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ درختوں کو اتنی احتیاط اور پیار سے کیوں چھو رہے ہیں۔ جیسے کوئی اپنی پالتو چیز کو چھوتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ زندہ ہیں۔ یہ ہماری موجودگی سے واقف ہیں۔ یہ ہم سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ ان کو تو یہ بھی معلوم ہے میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ یہ خوش ہوں تو دعائیں بھی دیتے ہیں۔ اللہ ان کی دعائیں رد نہیں کرتا کیونکہ یہ کسی کا دل نہیں توڑتے..... ان کو ہمیشہ پیار سے چھونا۔“

اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا مجھ سے بھی یہ باتیں کریں گے؟“

اگر میری طرح انہیں پیار سے چھوؤ گی تو ضرور باتیں کریں گے؟“

”ادبی اقدار“ (1956ء) ”نئی نظم اور پورا آدمی“ (1962ء) ”غالب کون؟“ (1971ء) ”ادھوری جدیدیت“ (1977ء) ”اقبال ایک شاعر“ (1978ء) ”محمد حسن عسکری آدمی یا انسان“ (1982ء) ”اسلامی نظام مسائل اور تجزیے“ کے علاوہ سیکڑوں مضامین، روزنامہ حریت و روزنامہ جسارت کراچی کے اخبارات میں لکھنے، ہفتہ وار تکبیر میں تجزیہ نگاری کرنے والے دانشور و ادیب سلیم احمد 27 نومبر 1927ء کو ضلع بارہ بنکی کے قصبہ کھیولی میں سید شرافت علی کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر شمیم احمد جامعہ بولان کوئٹہ میں اردو کے استاد اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں مگر انہوں نے سلیم احمد کی طرح نہ ریڈیو اور ٹی وی کے لیے ڈراما نگاری کی اور نہ ہی شاعری کی... چنانچہ یہ شعبہ سلیم احمد کے پاس ہی رہا۔ جنہوں نے ”بیاض“ (1966ء) ”اکائی“ (1982ء) ”چراغِ نیم شب“ (1985ء) اور ”مشرق“ (طویل نظمیہ 1989ء) جیسے شعری مجموعے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ سلیم احمد ریڈیو پاکستان میں اور گھر پر بھی شمع محفل اور مرکز بزم رہتے۔ ”حلقۂ اربابِ ذوق“، ”انجمن ترقی پسند مصنفین“ اور دیگر علمی اور ادبی حلقوں میں بھی پروفیسر حسن عسکری کے نام لیوا اور لائق وفائق ادیب کی حیثیت سے مدعو کیے اور مانے جاتے تھے۔ وہ مکالمے کو پسند کرتے۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور علمی اختلاف سے خوش ہوا کرتے تھے۔ ضیاء الحق دور میں اطلاعات ونشریات کے مشیر بھی رہے۔ تاہم ریڈیو پاکستان کراچی کے پروڈیوسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور یکم ستمبر 1983ء کو خالقِ حقیقی کی بارگاہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے بعد پاپوش نگر قبرستان میں آسودۂ راحت ہو رہے ان کی قبر کتبے پر یہ شعر مرقوم ہے۔

اِک پتنگے نے یہ اپنے رقص میں آخر کہا
روشنی کے ساتھ رہیے روشنی بن جایئے

اس نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔ ''اور پیار سے کیسے چھوا جاتا ہے؟''

''جیسے رات تم نے چھوا تھا۔''

اور پھر اس کی نظریں حیا سے جھک گئیں۔

وہ اپنی جگہ کھڑی رہی۔ میں نے کہا۔ ''چلو آؤ تمہیں بتاتا ہوں انہیں کیسے چھوا جاتا ہے۔''

وہ میرے ساتھ چلی آئی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ درخت کے تنے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میری طرح اس پر ہاتھ رکھو۔''

اس نے اپنے ہاتھ ڈرتے ڈرتے رکھ دیے۔

میں نے درخت سے کان لگاتے ہوئے اس کو کہا۔

''اب میری طرح کان لگا کر سنو اور سمجھو یہ کیا کہہ رہا ہے:.....''

اس نے درخت سے کان لگا لیے۔

میں درخت سے لپٹ کر کھڑا تھا۔ اس سے پوچھا۔

''بتاؤ کچھ کہہ رہا ہے؟''

کنول نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور اپنے لہجے کو سرگوشی میں بدلتے کہا۔ ''مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اس لڑکے کی محبت پر شک نہ کرنا۔ جتنا یہ تم کو پیار کرتا ہے دنیا میں کوئی اور تم سے نہیں کرے گا۔ اس کی قدر کرنا۔''

ہم دونوں درخت سے لپٹے ہوئے تھے۔ ہمارے چہرے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ ہم اتنے قریب کہ جیسے وہ میرے کانوں میں باتیں کر رہی ہو۔ اس کے ہاتھ کا لمس اور اس کا مہکتا لہجہ مجھے محبت سے سرشار کر گیا۔ کچھ اس کی سرگوشی نے مجھے بتایا اور بہت کچھ اس کی بولتی آنکھیں میری آنکھوں میں بیٹھ کر کہہ گئیں۔

کتنے چمکدار تھے آنکھوں کے آئینے جن میں میں اپنا عکس دیکھتا تھا۔ آنکھیں آنکھوں کی زبان میں باتیں کرنے لگیں۔ کچھ پیام دیے اور کچھ وصول کر کے مسکرا دیں۔ آنکھیں سن رہی تھیں اور آنکھیں سمجھ رہی تھیں۔ آنکھیں پوچھ رہی تھیں اور آنکھیں بتا رہی تھیں۔ جو آنکھوں نے دیا وہ آنکھوں نے لیا۔ آنکھیں دل بن گئیں۔ ہونٹ اور چہرہ بن گئیں۔ اشعار، غزلیں اور مثنوی بنیں۔ وہ آنکھیں دریا بنیں، جھیل بنیں اور سمندر بنیں۔ وفا کے جزیرے اور پیار کی وادیاں بنیں، اور آخر میں کچھ وہ آنکھیں ڈوبیں اور کچھ یہ آنکھیں ڈوبیں۔

ہم دوبارہ سے چل پڑے۔

کنول کہہ رہی تھی۔ ''محبت کتنی عجیب چیز ہے۔ چور بن کر آتی ہے اور ہوا کی مانند پھیل جاتی ہے۔ لگتا ہے اس کی کوئی حد نہیں۔ یہ لامحدود ہے۔ رلاتی تو ہے مگر پھر بھی اچھی لگتی ہے۔ ایک کسک سی اندر رہتی ہے۔ یہ بہت خوبصورت اور لازوال جذبہ ہے۔ یہ تڑپاتی ہے مگر تڑپنے میں بھی ایک قرار چھپا ہوتا ہے۔ سونے نہیں دیتی مگر جاگنے میں بھی لطف ہے۔ کوئی شدت سے یاد آ رہا ہو تو نہ بھوک لگتی ہے اور نہ پیاس لگتی ہے۔ نہ کوئی دکھ دکھ لگتا ہے اور نہ کوئی اور خوشی خوشی لگتی ہے۔

میں اچانک چونک گیا۔ پوچھا۔ ''تم نے کھانا کھایا ہے؟''

نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں کھایا' اور آپ نے بھی تو اپنا کھانا کول کو دے دیا تھا۔''

''یہ کیا بات ہوئی کہ میں نے نہیں کھایا اور تم بھی بھوکی رہیں۔''

''میں یہی تو کہہ رہی تھی کہ محبت بہت عجیب چیز ہے۔ بیت کس پر رہی ہوتی ہے اور محسوس کوئی اور کرتا ہے۔ اداس کون ہوتا ہے اور روتا کوئی اور ہے۔ کھانا آپ نے نہیں کھایا اور بھوک میری ختم ہو گئی۔ ایک محبت پیار مانگتی ہے اور ایک محبت پیار بانٹتی ہے۔ اپنا ہر احساس کسی اور کے احساس سے جڑا ہوتا ہے۔''

''مگر تم کو بھوکا نہیں رہنا چاہیے تھا کنول۔''

اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور میری جانب مسکرا کر دیکھا۔ ''یہ ہے میرا اور آپ کا کھانا۔ میں نے رکھ لیا تھا کہ موقع ملا تو اکٹھے کھائیں گے ورنہ دونوں بھوکے رہیں گے۔''

میں نے کہا کہ لگتا ہے بہت ستایا کرو گی۔ نہ سونے دو گی نہ جاگنے دو گی۔

جواب میں اس نے مجھے آتش کی غزل کے چند مصرعے سنائے:

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا
خاک پر سنگِ درِ یار نے سونے نہ دیا
دھوپ میں سائے دیوار نے سونے نہ دیا

☆☆☆

اتنے میں کول چلتے چلتے ہم دونوں کے قریب آ گئی:

''میں بھی سنوں کہ یہ شیریں فرہاد آپس میں باتیں کیا کرتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''تم نہ ہی سنو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔''

"کیوں میں کیوں نہ سنوں......"

"چھوٹے بچے ایسی باتیں نہیں پوچھتے۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔ اب میں چھوٹی بچی ہو گئی؟ ایسا تگنی کا ناچ دکھاؤں گی کہ میری سمجھ اچھی طرح سے آجائے گی۔"

میں نے کہا۔ "کیا اب ہمارے ساتھ چپکی رہو گی۔ وہ دیکھو طاہرہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

"آپ بہت ہی برے ہیں۔ آج کہتے ہیں کہ چپک رہی ہوں اور کل بھاگ بھاگ کر میرے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔"

"اچھا کیا پوچھنا چاہتی ہو......؟"

سوالیہ انداز میں کہا۔ "بہت مزے مزے کی باتیں ہو رہی ہیں؟ مجھے بھی بتائیں۔"

"اگر میں بتادوں تو راز رکھنا جانتی ہو۔"

"ہاں بھائی۔ قسم سے کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

"اور میں بھی راز رکھنا جانتا ہوں۔"

وہ میری بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

کنول نے اس سے کہا۔ "ان کا مطلب ہے کہ میں بھی راز کو راز رکھتا ہوں۔ لہٰذا کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

یہ سن کر ہنستے ہوئے طاہرہ اور ثروت کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

ہم ایسے گھاس کے پشتے پر چل رہے تھے جہاں ہر جانب پھول تھے۔ ہمارے اندر اطمینان ایسے بھرا تھا جیسے ہمیں یقین ہے اسی راستے پر ہماری منزل ہے۔

لطیف نے اطہر کو ایک عجیب سے کام میں لگا دیا تھا۔ وہ دونوں پہاڑوں پر لگے درخت گن رہے تھے...اور گنتے گنتے کہیں سے کہیں نکل گئے۔ لڑکیاں پھول چنتی چنتی پھولوں میں گم ہو گئیں۔

وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "آج آپ نے امی اور بابا کی نظر میں اپنی عزت بہت زیادہ بڑھا لی ہے۔ پہلے بابا کو جیپ سے لا کر دری پر بٹھانا اور ان کا خیال رکھنا یہ سب امی کے لیے بہت اہم تھا، پھر جس طرح سے آپ اور سائیں صاحب نے امی کو طریقے سے سمجھا کر جعلی پیروں سے دور کیا اس پر بابا بہت خوش ہیں۔ جو بات امی کو آج تک کوئی نہیں سمجھا سکا وہ آپ نے بڑی آسانی اور خوبصورتی سے سمجھا دی۔ آپ لوگ سمجھ گئے تھے کہ امی کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ بڑے طریقے سے یہ بھی سمجھا گئے کہ اپنے غریب رشتہ داروں کو گھر بلا کر کھانا بھی کھلا دیا کریں۔ بابا کے علاوہ میں خود آپ کی احسان مند ہوں۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ نے ہمارے گھر کا کتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ امی کی ان باتوں کی وجہ سے ہمارے گھر میں ناچاقی رہتی تھی۔ امی کو کوئی ایک نے سمجھایا مگر وہ کبھی نہ سمجھ سکیں۔ اب بابا سے یہ کہہ رہی تھیں کہ گھر جاتے ہی سب سے پہلے ساری ہانڈیاں توڑوں گی کیونکہ پیر صاحب کا حکم ہے۔"

میں ہنس پڑا۔ مجھ سے پوچھنے لگی۔ "امی کو سیدھی راہ پر ڈالنے کا آپ نے پلان بنایا تھا ناں؟"

میں نے بتایا۔ "پلان میں نے اور سائیں نے فوری طور پر بنایا۔ جب یہ دیکھا کہ وہ سائیں کی معتقد ہیں تو یہ منصوبہ میرے ذہن میں آیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تمہاری امی سالوں سے جعلی پیروں پر پیسے لٹا رہی ہیں۔ سوچا کیوں نہ سائیں کے ذریعے انہیں ان بدعتوں سے روکنے کی کوشش کروں۔ ایسے لوگ اپنے پیروں کی باتیں آنکھیں بند کر کے مانتے ہیں۔ مجھے یقین ہے اب آپ کے گھر میں امن آجائے گا۔"

وہ بتانے لگی۔ "پہلے بابا جب بھی تھکے ہارے واپس آتے تھے تو امی انہی باتوں سے ان کی تھکاوٹ بڑھا دیتی تھیں۔"

پھر مسکرا کے پوچھا۔ "سائیں اصلی پیر نہیں......؟"

میں نے ہنسی میں بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "سچ جھوٹ تو اللہ جانتا ہے۔ ایسی باتوں پر ہر ایک کو اپنا دماغ استعمال کرنا چاہیے۔"

"میں بابا سے کہوں گی کہ اپنے سائیں صاحب کو کہہ کر یہ سب کروایا ہے۔"

"یہ تو جھوٹ ہے......"

"اگر کوئی جھوٹ ہم دونوں کو ملا سکتا ہے تو اس کا کوئی گناہ نہیں۔ یہ جائز ہو جاتا ہے......؟"

"کنول یہ بتاؤ کہ محبت میں اور کیا کیا جائز ہے۔"

"کچھ جائز ہیں اور کچھ ناجائز پابندیاں ہیں۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ "اس بات کا کیا مطلب؟"

وہ بھی مسکرانے لگی۔ بولی۔ "جن کو آپ اختیار کریں گے ان کی اجازت ہے۔ جن پر رک جائیں گے وہ ممنوع ہیں۔"

"یہ تو سارا بوجھ تم نے ڈال دیا ہے......؟"

"ہاں۔ میں جب آپ کی ہوئی تو اپنی ساری ذمے داریاں بھی آپ کے سپرد کر دیں۔"

''کیوں؟''

''کیونکہ آپ پر بھروسا بہت ہے۔''

''میں دھوکا بھی تو دے سکتا ہوں.....؟''

''میری محبت مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔''

''تمہاری محبت میں اگر اچھائیاں ہیں تو برائیاں بھی تو ہوں گی۔''

میرے بہت قریب آکر بولی۔ ''اچھائیاں زیادہ ہوں تو سمجھدار لوگوں کو ذات کی برائیاں نہیں دیکھنا چاہیں، اور پیار کرنے والے تو بالکل ہی نہیں دیکھتے۔''

آج اس میں کوئی اور طرح کی دلآویزی تھی۔ کبھی نیلے چمکتے آسمان کی وسعتوں میں دیکھنے لگتی۔ تب ایسا لگتا اس کی روح فضاؤں سے ہم کلام ہو۔ کبھی چلتے چلتے میرے اتنے قریب آجاتی جیسے کان میں سرگوشی کرتی ہو۔ کبھی ہواؤں میں بہکنے لگتی جیسے اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ رہی ہو۔ اس کی آنکھیں دعا گو تھیں۔ اس کے لب ہل رہے تھے۔ پھول اسے جھوم جھوم کر دیکھتے تھے۔ سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر رقص کرتی تھیں۔ اس لطیف فضا میں سانس لیتے وقت میں نے زندگی کا لمس محسوس کیا۔

''ایک بات بتائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''اب تم کو مجھ سے کچھ پوچھنے کے لیے اجازت کی ضرورت ہوگی؟''

''غزالہ آپ سے کتنی محبت کرتی تھی؟''

میں چونک پڑا۔ مجھے خدشہ تھا وہ گاہے گاہے اس کے بارے میں سوال کرے گی۔ سوچنے لگا اسے غزالہ کے بارے میں بتا کر ٹھیک نہیں کیا۔

بڑے سرسری انداز میں کہا۔ ''کیا معلوم کتنا کرتی تھی۔ میں نے کبھی ناپا تولا نہیں۔''

''تو آپ کتنا کرتے تھے؟''

''یہ کیسا سوال ہے اور یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟''

کہنے لگی۔ ''یہ معلوم کرنا ہے کہ اس سے پیار زیادہ کرتے تھے یا مجھ سے کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جو چلی گئی وہ اپنے حصے کی ساری محبتیں سمیٹ کر ساتھ لے گئی۔ تم مسلسل لے رہی ہو کیونکہ تم میرے پاس ہو۔ تم غزالہ کے بارے میں مت پوچھو۔ صرف یہی غور کرو کہ میں کیا ہوں اور تم میرے لیے کیا ہو۔''

''لیکن میرے ذہن میں یہ سوال آرہا ہے۔ ایک چبھن ہے کہ کہیں میرا پیار اس سے کم نہ ہو، اور یہ بھی کہ آپ کی محبت اس کے لیے مجھ سے زیادہ نہ ہو۔''

''کنول ایسا نہیں ہے۔ جیسے تمہاری محبت کا دریا بہہ رہا ہے اسی طرح میرا پیار بھی تمہارے لیے ایک وسیع اور بیکراں سمندر ہے۔ وہ گئی اور تم آگئی۔ اب تم ہو اور تمہارے علاوہ کوئی نہیں۔''

اس کی آنکھوں میں سوچوں کے دائرے چل پڑے تھے۔

میں نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ''میری درخواست ہے کبھی اس کو اپنے آمنے سامنے کھڑا مت کرنا۔ صرف حقیقت کو سمجھو۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ کسی اور کی ہے۔ میری زندگی سے اس نے خود کو نکال لیا ہے۔ وہ تھی اور تم ہو۔ یہ بہت بڑا فرق ہے۔''

وہ میرے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی تھی۔ کہہ رہی تھی:

''میں آپ کو ایک عجیب بات بتاتی ہوں۔ میرا وجدان مجھ سے کہہ رہا ہے کہ آپ جیسی محبت مجھ سے کوئی اور کر ہی نہیں سکتا۔ میں بھی کسی کو وہ پیار نہیں دے سکتی جو آپ کو دے رہی ہوں۔ کیونکہ ہمارے بیچ محبت پہلے ہوئی اور تعارف بعد میں ہوا۔ نہ ہم نے سوچنے سمجھنے کے لیے ایک دوسرے سے ٹائم مانگا اور نہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت تھی۔ ہمیں ایک دوسرے سے پیار اس لیے ہوا کیونکہ یہ آسمانوں پر ازل سے لکھا تھا۔ کسی مقام پر آپ سے بچھڑ جاتی تو ایک شمع اندر روشن رہتی کہ ہم پھر ملیں گے...اور حیرت ہوتی جب ہم پھر کہیں مل جاتے۔ ایسا ایک نہیں کئی بار ہوا۔ آپ کا دوبارہ ملنا بذات خود ایک عجیب بات ہوتی۔ مجھے محبت اس سے ہوگئی جس کے نام سے بھی انجان تھی۔ نہ ہم نے کوئی خط لکھے اور نہ کوئی اشارے ہوئے۔ ایک بار دیکھا اور اگلے لمحے حیران کھڑے تھے۔ آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میری زندگی صرف وہی ہے جو آپ کے ساتھ گزرے گی۔ کبھی سوچتی ہوں جب ہم ایک دوسرے کی زندگی بنیں گے تو کس طریقے سے میں آپ کے ساتھ رہوں گی؟ کیا کروں اور کیا نہ کروں گی۔ سمجھ صرف یہی آتی ہے کہ رہنے کا طریقہ صرف محبت کا طریقہ ہے۔ جس میں پیار اور خلوص ہو اسی طریقے سے رہوں گی۔''

بولتے ہوئے اس کا لہجہ محبت سے بھیگ رہا تھا۔ چہرہ اس کا زمینی نہیں ملکوتی تھا۔

میرے لیے محبت کبھی وقتی جذبہ نہیں رہا بلکہ یہ ایک دائمی احساس ہے۔ یہ ختم نہیں ہوتا۔ صرف واقع طور پر زمانے کی گرد

میں دب جاتا ہے اور جب دل و دماغ کسی شکست و ریخت کا شکار ہوتا ہے تو یہی محبت کہیں سے آکر ہمیں مضبوط سہارا مہیا کرتی ہے۔ محبت ایک طرح سے شفاف پانیوں کی بہتی ندی ہے۔ محبت کرنے والے اس کے کنارے کنارے چل رہے ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم ان کناروں سے ذرا دور نکل جاتے ہیں۔ مگر جب پیاسے ہو جاتے ہیں تو بھاگ کر اس ندی کی جانب دوڑتے ہیں کیونکہ اسی میں ہماری بقا ہے۔ محبت کسی سے بھی ہو یہ ایک چٹانی حوصلہ ہے جس کی پناہ میں ہم رہنا چاہتے ہیں۔ محبت حقیقی ہو تو یہ چٹان ہمارے اندر کھسک آتی ہے۔ جب محبت مجازی ہو تو ہم اسے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ہر صورت میں سہارا ہمیں یہی محبت مہیا کرتی ہے۔ زندگی کے سفر میں ہمیں بہر صورت یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں بھٹک کر پیار کی بہتی ندی کے کناروں سے بہت دور نہ نکل جائیں۔ اتنی دور نہ چلے جائیں کہ واپسی کے تمام راستے کھو جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہم تمام عمر ظلمات کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔ جو تا حیات اس کے کنارے کنارے چلتا ہے تو یہ ندی اسے فیض یاب کرتی رہتی ہے۔ یہ ندی کبھی غزالہ کی صورت دکھتی ہے، کبھی کنول کبھی نسرین اور کبھی کسی اور کی صورت، مگر اس کی تاثیر کبھی نہیں بدلتی..... کبھی نہیں۔

چاہت کے سفر میں کبھی ٹھیسیں بھی پہنچتی ہیں جو زخم نہیں بلکہ مرہم ہوتی ہیں۔ یہ زخم آگے جا کر گلاب بن جاتے ہیں۔ یہ گلاب یادوں کو اپنی خوشبو سے مہکاتے رہتے ہیں۔ یہ پھول نہ کملاتے ہیں اور نہ جھڑتے ہیں۔ یادوں اور ایسی ٹیسوں کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔

میں کنول کے لمس سے نہیں بلکہ اس لمس کے احساس سے سرشار تھا۔ ہم میدان کے اس کنارے آکر کے جہاں ہمارے سامنے پہاڑ کھڑے تھے۔ ان کی چوٹیوں پر برفیں پڑی تھیں۔ اجلے بادلوں کے غول پہاڑ کی ڈھلوان پر سرک رہے تھے۔ ڈھلوانوں سے اترتیں خنک ہوائیں وادی میں ہر سو پھیل رہی تھیں اور کنول کی چادر کا پلو ہوا سے سرسراتا تھا۔

وہ ایک منفرد اور کمال منظر تھا۔ اللہ کی شان ساری کائنات پر محیط دکھائی دیتی تھی۔ اس کی وسعت لامتناہی تھی۔ وہ اس نظارے میں کھو گئی۔ اس کی متلاشی نگاہیں اوپر پہاڑوں پر بھٹک رہی تھیں۔ میں اسے دلجمعی سے دیکھ رہا تھا۔

ہم اپنے ساتھیوں سے پہلے پہنچ گئے تھے۔ کنول نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ بولی۔ ”بہت شکریہ کہ آپ کے ساتھ نے مجھے یہ مناظر دکھائے..... میں اکیلی یہاں ہوتی تو یہ سب اتنا خوبصورت نہ ہوتا۔ آپ کے ساتھ نے ان کو مزید حسین بنا دیا ہے۔“

اس کی خوشبو سے ڈوبی نگاہوں میں کوئی طوفان برپا تھا۔ لگتا وہ محبت کر نہیں رہی بلکہ یہ اس کی فطرت میں شامل ہے۔

سامنے پہاڑوں پر جنگلات بچھے تھے جہاں سورج نے بادلوں سے مل کر دھوپ چھاؤں کا ایک کھیل شروع کر رکھا تھا۔

☆☆☆

ہمارے ساتھی آچکے تھے۔ پہاڑوں کی جانب رخ کیے ہم بیٹھ گئے۔ کنول طاہرہ اور ثروت کے بیچ بیٹھ گئی۔ میں اور لطیف ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ نرم دھوپ مجھے تھپکیاں دیتی تھی۔ ہولے سے چلتی ہوا لوریاں دینے لگی۔ مجھ پر غنودگی چھانے لگی۔ میں تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔ سب کے بولنے کی آوازیں مجھ تک پہنچتی تھیں مگر میں غافل پڑا رہا۔ پھر گہری نیند میں چلا گیا۔ اسی نیند میں مجھے خواب آنے لگے۔ میں خوبصورت سپنے دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا میں کسی بہشت میں ہوں۔ خواب میں منظر ایسا ہی تھا جیسے ہمارے سامنے اس وقت پھیلا تھا، مگر صرف میں اور کنول وہاں تھے۔ کوئی اور نہ تھا۔ پریوں جیسا بھیس اس کا تھا۔ وہ بہت حسین دکھ رہی تھی ہمارے ارد گرد لمبی لمبی گھاس ہے۔ ہم اس میں چل رہے ہیں۔ وہ مجھ سے آگے ہے۔ جہاں سے وہ گزرتی ہے وہاں کی گھاس دونوں جانب سے ایک طرف ہو جاتی ہے اور ہم بہ آسانی وہاں سے گزرتے جاتے ہیں۔ گھاس کی ڈالوں پر ہر جانب سفید پھول کھلے ہیں جو کنول کے لباس کی طرح چمکیلے ہیں۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے مختلف رنگ کے پرندے ہم دونوں کے کندھوں پر پرواز کرتے آرہے ہیں۔ ان کی بولیاں اتنی مدھر کہ کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ میں پرندوں کو دیکھنے کے لیے رکتا ہوں تو مڑ کر مجھے دیکھتی ہے۔ مجھے کھڑا دیکھ کر وہ بھی رک جاتی ہے۔ وہ کسی سنگ مرمر کے مجسمے کی طرح نظر آرہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ پرندے اس کے کندھوں اور بازوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پرندوں کی گردنیں گلابی اور پر سفید ہیں۔ میں حیرت سے کنول کے چہرے کو دیکھ رہا ہوں جہاں سے کوئی روشنی پھوٹ رہی ہے۔ وہ مجھے اس طرح کھڑے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ سماں یہیں ٹھہر جائے۔ وقت کا پہیا رک جائے۔ منظر یہیں جم جائے۔ ایک خوشی مجھے اپنے وجود سے پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ میں اتنے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

(جاری ہے)

نواں حصّہ

روسیاہ

عاطر شاھین

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آبنپوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

پل پل بدلتے چہروں کی طویل سرگزشت

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

علی کو جب ہوش آیا تو وہ لاہور سے دور اسماعیل شاہد کے ایک فارم ہاؤس کے تہہ خانے میں قید تھا۔ وہاں سے وہ فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اسماعیل شاہد وہاں آتا ہے اور وہ اسے اس کی اغوا شدہ بہن روزینہ کے بارے میں بتاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے حواریوں بالے اور رجب کو کہتا ہے کہ علی کو جلا کر مار دو۔ اس کے جانے کے بعد وہ دونوں علی پر پیٹرول چھڑکتے ہیں لیکن ان کے پاس ماچس نہیں ہوتی۔ دونوں باری باری ماچس ڈھونڈنے اوپر کچن میں جاتے ہیں اور واپس نہیں آتے۔ اسی دوران وہاں شانزے اور ماریہ آجاتی ہیں۔ علی کے پوچھنے پر شانزے نے بتایا کہ وہ اسماعیل شاہد کا تعاقب کرتی ہوئی وہاں پہنچی ہیں پھر وہ علی کو آزاد کر کے اپنے ساتھ لے گئیں لیکن بالا اور رجب ان کا تعاقب کرتے ہیں۔ کافی دور جانے کے بعد دونوں میں سے کسی کی فائرنگ سے شانزے کی کار کا ٹائر برسٹ ہو گیا اور کار ایک ڈھلوان میں الٹ گئی۔ ماریہ زخمی ہو گئی تھی۔ کماد میں علی، بالے اور رجب کے درمیان جھڑپ ہوتی ہے اور علی ان کے گھیرے سے نکل جاتا ہے اور شانزے ماریہ کو لے کر پجارو میں لاہور پہنچتا ہے۔ اسماعیل شاہد اپنی بھتیجی کی منگنی میں موجود نہیں تھا۔ علی ملتان آ گیا۔ حیدر الماس اس کے امریکا جانے کے لیے کاغذات بنوا رہے تھے۔ ایک روز علی کی شانی کے دوستوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ بہت تگ و دو کے بعد علی نے کر وہاں سے نکلا پھر چند روز کے بعد اسے بابر عرف جوکر کی کال موصول ہوئی۔ اس نے بتایا کہ حیدر الماس کو اغوا کر لیا گیا ہے۔

اب آگے پڑھیں

میں غیر ارادی طور پر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پریشانی نے میرے وجود کا بھی احاطہ کر لیا تھا۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد میں نے ششدر لہجے میں پوچھا۔

''کک..... کک..... کس نے اغوا کیا ہے؟''

لیکن دوسری طرف سے بابر مجھے جواب دینے کی بجائے خاموش ہی رہا۔ نجانے کیوں۔

''بابر..... بابر..... کیا تم میری آواز سن رہے ہو.....؟'' میں نے بابر کا نام لے کر پکارتے ہوئے کہا لیکن اس نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا۔ میں حیران ہوا کہ آخر وہ مجھے جواب کیوں نہیں دے رہا۔ میں نے ایک بار پھر اسے پکارا لیکن دوسری طرف ہنوز خاموشی برقرار تھی اور یہ خاموشی مجھے اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔

''بابر..... بابر.....''

''ہاں ہاں۔ سن رہا ہوں۔'' اچانک اس نے جواب دیا تو سکون کی ایک لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔ اس کے جواب دینے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ نیند سے اچانک جاگا ہو۔ مجھے ایسا لگا جیسے بابر سکتے کی کیفیت میں ہو اور اس کیفیت نے اس کے اعصاب سُن کر دیئے ہوں۔ حیدر الماس اس کا چچا تھا۔ شاید اُن کے اغوا کے صدمے نے اس پر گہرا اثر ڈالا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو بابر؟'' میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں..... ہاں..... میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بہ مشکل بولا۔

''یہ بتاؤ..... کیا انکل حیدر کو گھر سے اغوا کیا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم..... تم یہاں آ جاؤ، پھر میں تمہیں بتاؤں گا۔'' بابر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آواز دستور متوحش تھی۔

''اچھا، تم فون رکھو۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ پریشان مت ہونا۔ انکل کو کچھ نہیں ہوگا۔ ہم انہیں تلاش کے بازیاب کرا لیں گے۔'' میں نے اس کی ڈھا بندھاتے ہوئے کہا۔

''جل..... جل دی.....'' وہ اتنا ہی کہہ سکا اور پھر کی آواز بند ہو گئی۔

''بابر..... بابر..... کیا ہوا تمہیں۔ بابر.....'' میں تیز لہجے میں کہا لیکن دوسری طرف سے بابر نے کوئی جو نہ دیا۔ میں نے سیل فون کان سے ہٹا کر دیکھا تو ڈسکنٹ نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب بابر کو میری آواز دے رہی تھی لیکن وہ جواب کیوں نہیں دے رہا تھا۔

''بابر..... بابر..... جواب کیوں نہیں دے رہے بابر۔'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا لیکن اس جواب دینا تھا نہ دیا۔ میں نے بادل نخواستہ سیل فون آف کے جیب میں رکھا اور انتہائی عجلت سے دروازے کی طر بڑھا۔ مجھے خطرے کی بُو محسوس ہوئی تھی۔ میں نے جیسے دروازہ کھولا تو اسی لمحے مرینہ میرے لیے چائے کپ لیے آ گئی۔ میں اس سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا تھ چائے میرے کپڑوں پر گر جاتی۔ مجھے عجلت میں دیکھ

نے استفسار کیا۔ ''آپ کہیں جارہے ہیں؟''

''ہاں۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''میں آپ کے لیے چائے لائی ہوں۔'' وہ کپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''فی الحال میرے پاس چائے پینے کا ٹائم نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم پی لو۔ میں واپس آکر پی لوں گا۔''

میں کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو اُس نے پوچھا۔ ''آپ جا کہاں رہے ہیں؟ خیریت تو ہے نا؟''

شاید اس نے میرے چہرے سے میری پریشانی بھانپ لی تھی۔ میں بیرونی دروازے تک پہنچ کر مڑا اور بولا۔ ''ہاں۔ خیریت ہی ہے۔ بس ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔''

''کب تک واپسی ممکن ہے؟''

میں جھنجلایا۔ ''کوئی پتا نہیں ہے۔ جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔''

اس سے پہلے کہ وہ مزید سوال و جواب کرتی، میں گھر سے نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سڑک کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ دماغ میں بھانبھڑ سے چل رہے تھے کہ حیدر الماس کو کس نے اغوا کیا تھا۔ میری چھٹی حس تو یہی کہہ رہی تھی کہ انہیں اسماعیل شاہد یا چودھری باسط میں سے کسی ایک نے اغوا کیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے بھی تو چودھری باسط نے اپنے حواریوں کے ذریعے اُن کی کار پر فائرنگ کروائی تھی جس سے وہ زخمی ہوگئے تھے۔ ہوسکتا ہے اس بار بھی ان کے اغوا میں چودھری باسط کا ہاتھ ہو۔ ایسے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ جیسے ہی انہیں موقع ملتا ہے اپنے مخالف کو ٹھکانے لگانے یا اسے نقصان پہنچانے میں وہ ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرتے۔ بہرکیف یہ تو حیدر الماس کی رہائش گاہ پر پہنچ کر ہی بابر کی زبانی معلوم ہوگا کہ اُنہیں کس نے اغوا کیا ہے۔

سڑک پر کافی تعداد میں آٹو رکشے موجود تھے۔ میں ایک آٹو رکشے میں سوار ہوکر حیدر الماس کی رہائش کی طرف روانہ ہوگیا۔ نہ جانے میری چھٹی حس مجھے کیوں بار بار کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ ایسا خطرہ جو میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

میں چالیس منٹ کے اندر اندر حیدر الماس کی رہائش گاہ والی گلی میں پہنچ گیا۔ کرایا ادا کرنے کے بعد میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کوٹھی کی طرف بڑھ گیا۔ کوٹھی کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ مجھے چوکی دار کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندر داخل ہوکر میں لمحہ بھر کو رکا اور غائرانہ نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ پورچ میں حیدر الماس کی نئے ماڈل کی کار بھی موجود تھی۔ میری چھٹی حس بار بار الارم بجا کر مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن بھی غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی۔ میں چند لمحے اسی کیفیت میں گھرا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا پورچ کی طرف بڑھ گیا۔ پورچ کی دائیں طرف ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا۔

پورچ میں پہنچ کر میں نے ایک بار پھر بیرونی دروازے کی طرف دیکھا اور ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا، میں دھڑکتے دل کے ساتھ ڈرائنگ میں داخل ہوگیا۔

ڈرائنگ روم میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لائٹ جل رہی تھی لیکن کسی نفوس کی موجودگی کے آثار محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے ڈرائنگ روم کا بہ غور جائزہ لیا تو وہاں رکھی ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ میں چونکہ پہلے بھی کئی بار یہاں آچکا تھا اس لیے مجھے وہاں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔

اچانک مجھے بابر عرف جوکر کا خیال آیا تو میں نے اسے پکارا۔ ''بابر..... بابر.....''

میری آواز ڈرائنگ روم کے سناٹے کو چیرتی ہوئی گونجی۔ میں نے لمحہ بھر ٹھہر کر دوبارہ بابر کو آواز دی لیکن وہاں ہنوز خاموشی برقرار تھی۔ یک لخت مجھے وسوسوں نے گھیر لیا۔ بابر مجھ سے بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہوگیا تھا۔ شاید وہ حیدر الماس کے اغوا کا صدمہ برداشت نہ کرسکا ہو اور بے ہوش ہوکر کسی کمرے میں پڑا ہو۔ اگر حیدر الماس کو گھر سے اغوا کیا گیا تھا تو اس وقت چوکی دار کہاں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ چوکی دار اغواکاروں سے مل گیا ہو۔ پیسوں سے کسی کو بھی خریدنا ناممکن نہیں تھا۔ میری تشویش کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی۔ ڈرائنگ روم کے کونے میں ایک بڑا سا دروازہ تھا جو اندرونی راہداری میں کھلتا تھا۔ یہاں خواتین تو رہتی نہیں تھیں اس لیے میں نے سوچا کہ مجھے اندرونی کمروں میں دیکھنا چاہیے۔ بابر یقیناً کسی کمرے میں موجود ہوگا۔

چنانچہ میں دروازہ کھول کر راہداری میں آگیا۔ راہداری خاصی وسیع تھی اس کے دونوں اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے جن کے دروازے بند تھے۔ ماربل کا فرش تھا

اور دیواروں پر ہلکا سبز رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا۔ ایک دیوار پر ایک بہت بڑی سینری بھی موجود تھی۔ اُس وقت مجھے پینٹنگ دیکھنے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں نے صرف نظر کرتے ہوئے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ کمرے کے اندر خاموشی اور اندھیرے کا راج تھا۔ میں دروازہ بند کر کے دوسرے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بھی اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ راہداری کے کونے میں کچن تھا لیکن وہاں بھی خاموشی نے ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔

میں نے تیسرے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اس کمرے میں روشنی تھی لیکن وہاں کوئی نفوس موجود نہیں تھا۔ میں نے کونے میں موجود دروازے کی طرف دیکھا جو یقیناً باتھ روم کا تھا۔

میں نے بابر کو پکارا۔ ''بابر.....''

بابر کا جواب تو نہیں آیا البتہ ایک ریوالور کی نال میری گردن سے آ لگی اور میں بے اختیار ٹھٹک گیا۔ میں مڑنا ہی چاہتا تھا کہ ایک کرخت آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

''ہینڈز اَپ۔''

آواز سنتے ہی میرے تنے ہوئے اعصاب یک لخت ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ بابر تھا جو مجھے ''ہینڈز اَپ'' کرنے کا ''حکم'' دے رہا تھا۔

میں نے مڑتے ہوئے کہا۔ ''یار جوکر! یہ کیسا مذاق ہے؟''

بابر کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کا رخ ابھی تک میری طرف ہی تھا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر میں نہ سمجھنے والے انداز میں اسے گھورنے لگا۔ حیدر الماس اغوا ہو چکے تھے اور اس کے چہرے پر اداسی کے بجائے مسکراہٹ تھی۔

''میں نے کہا ہے، ہینڈز اَپ۔'' بابر نے بہ دستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں سنائی نہیں دے رہا؟''

''میں ہینڈز اَپ نہیں کرتا۔'' میں نے انکار میں جواب دیا۔ ''یہ ڈرامے بازی چھوڑو، یہ بتاؤ، انکل حیدر کا کچھ پتا چلا۔ ویسے تمہارے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔ کہیں تم.....''

اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں بابر نے میرے ساتھ مذاق تو نہیں کیا کیونکہ اس ''کمینے'' سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ یہ لڑکا دل پھینک ہونے کے ساتھ ساتھ شرارتوں کا بھی منبع تھا۔

''دال میں کچھ کالا نہیں ہے بلکہ..... ساری دال ہی کالی ہے۔'' بابر نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس نے ریوالور اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا۔

''انکل حیدر اغوا نہیں ہوئے ہیں؟''

''تم نے تو فون پر کہا تھا کہ.....'' میں کہہ ہی رہا تھا کہ اس نے میری بات درمیان سے کاٹ دی۔

''کیا تم چاہتے ہو کہ انکل اغوا ہوں؟''

''یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو۔'' مجھے اس کی یہ بات ناگوار لگی۔ ''میں ایسا کیوں چاہوں گا؟''

''اگر میں ایسا نہ کہتا تو بھی تم نہ آتے۔ خیر آؤ میرے ساتھ۔''

وہ مجھے لے کر ایک دوسرے کمرے میں پہنچ گیا جہاں حیدر الماس صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی احتجاجاً کہا۔ ''حیدر صاحب۔ یہ سب کیا ہے؟''

''کیوں کیا ہوا؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

میں نے انہیں پوری بات بتائی تو انہوں نے بھی بابر کو سمجھایا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

حیدر الماس نے میری حمایت کی۔ پھر سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئے۔ ''اِس طرح کا سنگین مذاق بعض اوقات سنگین صورت اختیار کر جاتا ہے۔ سائنسی تحقیق کے مطابق سنگین حادثے کی اطلاع سے انسان کے دماغ پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ کمزور اعصاب والا انسان جان کی بازی بھی ہار سکتا ہے۔''

بابر سے بات کرنے کے بعد حیدر الماس نے میری طرف دیکھا اور معذرت خواہانہ لب و لہجے میں بولے۔ ''علی! بابر کی اس حرکت پر میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔'' انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''انکل! معافی آپ کو نہیں، اس جوکر کو مانگنی چاہیے۔'' میں نے ان کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا پھر میں نے بابر کی طرف دیکھا۔ ''جو غلطی کرتا ہے معافی مانگنا بھی اسی کا حق بنتا ہے۔''

بابر عرف جوکر کے چہرے پر بہ دستور مسکراہٹ موجود تھی۔ وہ شرمندہ ہونے کی بجائے ہماری باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ مجھے اس پر غصہ آیا۔ وہ بھی ڈھیٹ پن کی انتہاؤں پر

تھا۔

''مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''بلکہ مجھے تو اس ڈرامے سے بہت مزہ آیا ہے۔'' پھر وہ حیدر الماس سے بولا۔ ''انکل! آپ نے علی کو دیکھا تھا، کتنا پریشان اور متجسس تھا۔ دیکھنے والا سین تھا۔ کاش میں اسے کیمرے میں محفوظ کر لیتا۔''

عین اسی لمحے ڈور بیل بجی تو ہم سب چونک پڑے۔ پھر حیدر الماس، بابر سے مخاطب ہوئے۔ ''بابر! جا کر دیکھو کون آیا ہے؟''

''تم سے میں بدلہ ضرور لوں گا۔'' بابر میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں حیدر الماس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ویزے کا کیا بنا انکل!''

''جلد آ جائیں گے۔'' وہ بولے۔ ''میری کل ہی اپنے دوست سے بات ہوئی تھی۔ اس نے کہا ہے کہ ویزوں کے لیے درخواست منظور ہو گئی ہے۔ بس کچھ دن تک ویزے آ جائیں گے۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ کچھ دیر کے بعد بابر نے آ کر اطلاع دی کہ ایس پی شیراز خان آئے ہیں، اس نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔ میں نے قیاس کیا کہ ایس پی شیراز خان کی آمد اس وقت یقیناً کسی خاص بات کے حوالے سے ہو گی۔ بہرکیف، ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ایس پی شیراز خان اپنی یونی فارم میں ملبوس تھے۔ وہ صوفے پر دراز تھے لیکن ہمیں ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

حیدر الماس نے ان سے ملنے کے بعد بابر عرف جوکر اور میرا تعارف کرایا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اچھا تو یہ ہے وہ لڑکا، جو اسماعیل شاہد اور چودھری باسط جیسے گینگسٹروں سے ٹکرایا ہے۔''

''ہاں۔'' حیدر الماس اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے اور پھر ہم تینوں صوفوں پر بیٹھ گئے جبکہ بابر چائے کے لوازمات کا بندوبست کرنے چلا گیا تھا۔

''کیا پیش رفت ہوئی ہے۔ کیا اسماعیل شاہد کے حواری نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اڈا اسماعیل شاہد کا تھا۔'' حیدر الماس سنجیدہ لہجے میں ایس پی شیراز خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''ہاں، اُس نے اعتراف تو کر لیا ہے لیکن.....''

ایس پی شیراز خان کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔ ان کا لیکن کہہ کر خاموش ہو جانا تجسس پیدا کر گیا تھا۔

''لیکن کیا؟'' حیدر الماس مستفسر ہوئے۔

''لیکن یہ کہ.....'' اتنا کہہ کر ایس پی شیراز رکے اور پھر بات آگے بڑھائی۔ ''اُس نے اسماعیل شاہد کا نام نہیں لیا۔ اُس نے بیان میں کہا ہے کہ وہ کسی اسماعیل شاہد کو نہیں جانتا۔ وہ اڈا بشیر نامی کسی بندے کا ہے۔ وہ وہاں کبھار اڈے پر آتا تھا۔ اب کافی عرصہ گزرنے کے باوجود وہ وہاں نہیں آیا۔ اس اڈے کا انچارج شیرو ہے جو ابھی تک فرار ہے۔ وہی بشیر کو جانتا ہے۔ بہرکیف، پولیس شیرو اور بشیر کو تلاش کر رہی ہے۔ وہ ہمارے ہاتھ لگ جائے اُمید ہے وہ ہمیں اسماعیل شاہد تک پہنچا دے گا۔''

''واہ اسماعیل شاہد واہ۔'' حیدر الماس طویل سانس لینے کے بعد بولے۔ ''گینگسٹر ہونے کے باوجود وہ ہمارے ہتھے نہیں چڑھ رہا۔ بڑی صفائی سے کام کرتا ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔'' ایس پی شیراز نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''میں نے ایسا پہلا مجرم دیکھا ہے جو نیوٹرل انداز میں غیر قانونی کام کر رہا ہے لیکن کب تک، بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ایک نہ ایک دن وہ قانون کے شکنجے میں ہو گا پھر اسے اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا ہو گی۔''

ڈرائنگ روم میں لمحہ بھر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ میں نے کہا۔ ''اسماعیل شاہد نے میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ وہ گینگسٹر ہے اور لڑکیوں کو اغوا کر کے انہیں فروخت کرتا ہے۔''

ایس پی شیراز خان نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ''مجھے تمہاری سچائی پر کوئی شک نہیں ہے علی، لیکن تمہارے پاس اسے گینگسٹر ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے۔'' ایس پی ..... شیراز خان لمحہ بھر کے بعد بولے تو میں نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''اگر تمہارے پاس اسے گینگسٹر ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت ہوتا تو ہم اسی ثبوت کی بنا پر اسے گرفتار کر سکتے تھے۔''

اُن کی بات میرے دل کو لگی تھی۔ اسماعیل شاہد کے خلاف میرے پاس کوئی بھی ایسا ثبوت نہیں تھا جس کی بنا پر اسے گینگسٹر ثابت کیا جا سکتا۔ وہ مجرم ہو کر بھی مجرم ثابت نہیں ہو رہا تھا۔

''اگر آپ کہیں تو میں اس کے خلاف نیوز پیپر میں

بیان دے دوں؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ محض الزام ہوگا۔''

ایس پی شیراز جہاندیدگی سے بولے۔ ''ویسے بھی تم پر اس کی بیٹی کے اغوا کا جھوٹا مقدمہ چل رہا ہے۔ تمہارے بیان دینے سے تمہیں تو نہیں البتہ اسے ضرور فائدہ پہنچے گا اس لیے ہمیں اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کرنا ہوگا تب جا کر ہم اس پر ہاتھ ڈال سکیں گے۔''

عین اسی لمحے ایس پی شیراز خان کے سیل فون کی مترنم گھنٹی گنگنا اٹھی تو انہوں نے سیل فون کی طرف دیکھا وہ حیدر الماس سے اجازت لے کر جانے کے لیے اٹھ گئے۔ اُن کے جانے کے بعد ہی جوکر ٹرے اٹھائے اندر آ گیا۔ ٹرے پر چائے سے بھرے کپس اور بسکٹس کی پلیٹ رکھی تھی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی تو میں بولا۔ ''تم نے چائے بنانے میں کافی دیر لگا دی۔ ایس پی شیراز خان تو چلے گئے۔''

''کیوں؟'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے حیرانی سے بولا۔ ''انہیں رکنا چاہیے تھا۔''

''میں نے کہا تھا لیکن انہوں نے کہا کہ بابر کے ہاتھ میں ذائقہ نہیں ہے۔ وہ بدمزہ چائے بناتا ہے اس لیے وہ چائے پیے بنا ہی چلے گئے۔'' میں شرارت بھرے لہجے میں بولا تو بابر میری شرارت سمجھ گیا۔

''نہیں۔ شیراز انکل کو تو میرے ہاتھوں کی بنی چائے بہت پسند ہے۔ انہوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا تھا۔'' بابر نے مسکراتے ہوئے کہا تو حیدر الماس قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''میں مذاق کر رہا تھا۔'' میں سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''انہیں کوئی ضروری کال آ گئی تھی اس لیے وہ چلے گئے ہیں اور وعدہ کر گئے ہیں کہ وہ پھر کسی دن آ کر تمہارے ہاتھوں کی بنی چائے پئیں گے۔''

چائے پینے کے دوران ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر کے بعد میں نے حیدر الماس سے اجازت لی اور کوٹھی کے بیرونی گیٹ پر آیا تو مجھے چوکی دار دکھائی دیا جو مجھے دیکھ کر زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر میں بھی مسکرایا اور پھر اس سے مصافحہ کر کے سڑک کی طرف بڑھ گیا۔ یکدم میرے دل میں آیا کہ مجھے اپنے پرانے گھر جانا چاہیے۔ کافی عرصہ ہو گیا تھا اپنے گھر نہیں گیا تھا اس لیے میں آٹو رکشے میں سوار ہو کر اپنے پرانے گھر پہنچ گیا۔ گھر پر گرد آلود تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے فاروق کے گھر کی بیل بجائی تو لمحہ بھر کے بعد فاروق ہی باہر آیا۔ اس نے جب مجھے دیکھا تو فرطِ جوش و جذبات سے مجھ سے لپٹ گیا۔

''علی بھائی! آپ نے کافی عرصے کے بعد شکل دکھائی ہے۔ کہاں غائب تھے۔ رابطہ بھی نہیں کر رہے تھے۔'' فاروق نے شکایتوں کے انبار لگا دیے۔

''بس یار، چند مسائل میں پھنسا ہوا تھا۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''تم سناؤ، کیسے ہو؟''

''میں الحمدللہ ٹھیک ہوں۔''

''کہیں جا رہے ہو؟'' میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کیونکہ وہ تیار دکھائی دے رہا تھا۔

''نہیں بھائی۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا پھر صراحت بھرے لہجے میں بولا۔ ''وہ دراصل شمسہ باجی کے رشتے کے لیے چند لوگ آ رہے ہیں اس لیے.....''

''ہمم۔'' میں نے ہنکاری بھری۔

''بھائی، آپ باہر کیوں کھڑے ہیں۔ آئیں میرے ساتھ۔ اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' فاروق نے اصرار کیا لیکن میں نے انکار کر دیا۔

''نہیں، پھر کبھی سہی۔'' میں نے کہا۔ ''میں دراصل اپنا گھر دیکھنے آیا تھا۔''

''میں چابی لے آتا ہوں۔'' فاروق نے کہا اور چابی لے آیا۔ اس نے تالا کھولا تو میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مکان اندر سے بھی ویسا ہی تھا جیسا چھوڑ کر گیا تھا لیکن فرش اور دیواریں گرد سے اَٹی ہوئی تھیں۔ برآمدے میں موجود کرسیوں، میز اور چارپائیوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ اپنے اجڑے ہوئے گھر کو دیکھ کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ اس گھر میں ہم پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے۔ ہمارا آشیانہ کتنا خوبصورت تھا۔ گھر میں رونق ہوتی تھی، چہل پہل ہوتی تھی لیکن اب گھر کسی بھوت بنگلے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ گھر میں چھایا سناٹا اور ویرانی مجھے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ منڈیر پر مٹی کا برتن ویسے کا ویسا پڑا تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے وہ برتن اٹھایا اور اسے نمناک آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ مجھے یاد تھا، میں روزانہ ہی اُس مٹی کے برتن میں پانی ڈالتا تھا۔ چڑیا، کبوتر اور دوسرے پرندے آ کر پانی پیتے تھے لیکن اب اسے خشک دیکھ کر مجھے اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم میں نے خود پر ضبط کیا اور برتن واپس منڈیر پر رکھنے کے بعد رخسار پر لڑھکتے آنسوؤں کو دونوں ہاتھوں

صاف کیا۔

برآمدے میں میری موٹر بائیک بھی موجود تھی۔ موٹر بائیک دیکھتے ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا کیونکہ اس کی مجھے ضرورت تھی۔ میں نے سوچا کہ جب تک میں پاکستان میں موجود ہوں اسے استعمال کرتا رہوں گا۔

فاروق خاموش کھڑا تھا لیکن پھر اس نے خاموشی کو توڑا۔ ''بھائی۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟''

''آں، ہاں۔'' اس کی آواز پر میں چونکا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔''

''بھائی! آپ کو ایک بات بتاؤں، کئی لوگوں نے مکان خریدنے کے لیے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔''

''اچھا۔'' میں نے فاروق کی طرف دیکھا۔ ''پھر.....''

''پھر کیا۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ مکان برائے فروخت نہیں ہے۔''

''ہمم۔'' میں نے ہونٹ بھینچے۔ ''ٹھیک کیا۔''

''علی بھائی! آج کل آپ نے کہاں رہائش رکھی ہوئی ہے۔ آنٹی کیسی ہیں اب؟ اور روزینہ بہن کا کچھ پتا چلا؟''

میں لمحہ بھر خاموش رہا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''گل گشت سے آگے کہکشاں کالونی ہے ہم وہیں مقیم ہیں..... اور..... امی کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہے۔''

''اور روزینہ بہن.....؟''

''اُس کی تلاش جاری ہے۔'' میں نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

''اوہو۔'' اُس کے چہرے پر تشویش کے تاثرات ابھرے۔ ''اللہ آپ کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے۔''

''آمین۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''علی بھائی! میرے لائق کوئی کام ہو تو بتائیے گا۔''

''ضرور۔''

میں پندرہ، بیس منٹ وہاں رہا۔ وہاں سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے موٹر بائیک کی ٹنکی ڈھکن کھول کر دیکھی تو اس میں پیٹرول موجود تھا۔ میں نے فاروق کو گھر کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور اپنی موٹر بائیک پر سوار ہو کر گل گشت کی طرف بڑھ گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں گھر پہنچا تو مرینہ موٹر بائیک دیکھ کو حیران ہوئی اور پوچھا۔ ''بھائی جان! آپ گھر گئے تھے؟''

''ہاں۔ موٹر بائیک لینے چلا گیا تھا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سوچا کہ موٹر بائیک کھڑے کھڑے خراب ہو جائے گی اس لیے اسے استعمال کروں۔''

''گھر کی حالت کیسی تھی؟'' مرینہ کے لہجے میں افسردگی اور اداسی گھلی ہوئی تھی۔

''ویسی ہی، جس حالت میں ہم اسے چھوڑ کر آئے تھے۔'' میں نے جواب دیا تو وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے یہ استفسار نہیں کیا کہ میں صبح اتنی جلدی میں کیوں گیا تھا۔ بڑے ماموں بھی گھر پر ہی تھے۔ میں اپنے کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے پاس کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں تو کیا کرتا۔ مجھے تو اُس وقت کا انتظار تھا جب میرا اور بابر عرف جوکر کا ویزا آ جائے گا اور ہم امریکا روانہ ہو جائیں گے۔

انتظار کے لمحات کتنے اذیت ناک ہوتے ہیں اِن سے میں وقت کے ساتھ ساتھ آشنا ہوتا جا رہا تھا۔ بے چینی ہنوز برقرار تھی۔ مجھے تو ایسے لگتا تھا جیسے وقت تھم سا گیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ میرے لیے وقت گزارنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ جب سے مجھے پتا چلا تھا کہ میری بہن امریکا میں ہے بس اُسی وقت سے ہی میں جلد از جلد امریکا پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔

رات کو نو بجے میں ایک نیوز چینل پر نیوز دیکھ رہا تھا کہ اسی دوران ایک بریکنگ نیوز چل پڑی۔ نیوز چودھری باسط کے حوالے سے تھی۔ چند ہفتے پہلے چودھری باسط کی مخالف پارٹی کے ایک رکن نے اس کی نااہلی کے حوالے سے عدالت میں کیس دائر کیا تھا اور آج اس کیس کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ نیوز کے مطابق عدالت نے چودھری باسط کو ناجائز اثاثے بنانے، غیر عورتوں سے تعلقات رکھنے اور کرپشن کے الزامات ثابت ہونے پر نہ صرف ایم این اے کی سیٹ سے برطرف کر دیا تھا بلکہ اسے تاحیات نااہل قرار دے دیا تھا اور اس کی کسی بھی سیاسی فنکشن میں شرکت اور بیان بازی پر پابندی لگا دی گئی۔

یہ نیوز میرے علاوہ ان لوگوں کے لیے بھی ''خوش آیند'' تھی جو چودھری باسط کے مخالف تھے۔ میرا ملک پاکستان اِس وقت ایسے کرپٹ لوگوں کے لیے متحمل نہیں ہو سکتا۔ اِس ملک کو کرپشن سے پاک کرنا ہوگا جبھی یہ ملک ترقی کی طرف گامزن ہوگا اور ہر طرف خوشحالی ہوگی۔

میں نے چینلو بدلے تو ہر چینل پر چودھری باسط کی نااہلی کے حوالے سے بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ ابھی تک چودھری باسط کا اس حوالے سے کوئی بیان سامنے نہیں آیا تھا البتہ چند چینلو پر ریڈ ٹکر (سرخ پٹی) چل رہی تھی جن کے مطابق چودھری باسط اسلام آباد میں موجود تھا اور چینلو کے نمائندے اس سے رابطہ کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے لیکن اُس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں چودھری باسط کو چشم تصور میں دیکھ رہا تھا۔ اُس کی حالت دیدنی تھی۔ وہ پاگل ہو رہا تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سب کچھ تہس نہس کردے۔

ایک معما ابھی تک حل طلب تھا کہ اخبارات کو چودھری باسط اور نازنین عرف بلی کی تصویریں کس نے دی تھیں۔ چند روز پہلے بھی اس حوالے سے حیدر الماس سے میری گفتگو ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ میری دی ہوئی ویڈیو ابھی تک ان کے پاس محفوظ ہے۔ بہرکیف، وہ معما بھی جلد ہی حل ہو جائے گا۔ آخر وہ کون ہے اس بارے میں سب کو پتا چل جائے گا۔ میں ٹی وی آف کر کے ٹھنڈی ہوا لینے کی غرض سے چھت پر آ گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میرے سیل فون پر ایک انجان نمبر سے کال آنے لگی۔ میں نے لمحہ بھر نمبر کو دیکھا پھر کال اٹینڈ کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلو.....'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔

''تمہاری موت کے دن قریب آ گئے علی۔'' دوسری طرف سے چودھری باسط کی غراتی ہوئی آواز میرے کان کے پردے پھاڑنے لگی۔ ''اب تم میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکو گے۔ میں تمہیں ایسی عبرتناک موت ماروں گا کہ کوئی تمہاری لاش بھی نہیں پہچان سکے گا۔ تمہاری وجہ سے آج میں نااہل ہوا ہوں اور.....''

میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔ ''میری وجہ سے نہیں چودھری باسط۔ تم اپنے کرتوتوں کی وجہ سے نااہل ہوئے ہو اور اچھا ہی ہوا ہے کہ تم تاحیات نااہل ہو گئے ہو۔ کم سے کم تم جیسے بدکردار، لٹیرے اور کرپٹ شخص سے ملک آزاد تو ہوا۔''

میری بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ چودھری باسط کو تپ چڑھ گئی۔ وہ بھڑکتے ہوئے بولا۔ ''تم نے جو بکواس کرنی ہے، کر لو۔ بس تم اپنے دن گننا شروع کر دو۔ اب تم میرے ہاتھوں سے زندہ نہیں بچ سکتے۔''

''تم سے جو کچھ ہو سکتا ہے، کر لینا۔ میں تم سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔'' میں نے جواباً کہا۔

''دیکھ لوں گا تمہیں۔'' وہ دوبارہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ پھر اس نے میری بات سنے بغیر ہی رابطہ کاٹ دیا تو میں سیل فون کی اسکرین دیکھنے لگا۔ چودھری باسط کی حالت واقعی بھوکے بھیڑیئے کی سی ہو رہی تھی۔ وہ پل پل کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ گو کہ میں اس کی دھمکی آمیز باتوں سے مرعوب نہیں ہوا اور نہ ہی ڈرا تھا البتہ اس نے مجھے نفسیاتی طور پر محتاط رہنے کا پیغام دے دیا تھا۔ اُس نے نادانستگی میں ہی صحیح، بہرحال مجھے خبردار کر دیا تھا۔

میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر میں حیدر الماس کو کال کرنے لگا لیکن دوسری طرف بیل مسلسل بجتی رہی لیکن انہوں نے کال اٹینڈ نہ کی۔ شاید وہ کہیں بزی تھے۔ میں نے سیل فون جیب میں ڈالا اور اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ پانچ منٹ گزرنے کے بعد میں نے پھر حیدر الماس کو کال کی لیکن اس بار بھی انہوں نے فون اٹینڈ نہ کیا۔ میں نے سیل فون جیب میں رکھا اور سیڑھیاں اُتر کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

رات کے دس بجنے والے تھے۔ میں نے کپڑے چینج کیے اور نائٹ بلب جلا کر بستر پر لیٹ گیا، لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ لاہور سے واپس آنے کے بعد آج پہلا موقع تھا جب مجھے باوجود کوشش کے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ میرے اندر عجیب سی ہل چل مچی ہوئی تھی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ حیدر الماس کی کال آ گئی۔ میں نے انہیں چودھری باسط کے فون کرنے کے حوالے سے بتایا تو انہوں نے نہ صرف مجھے تسلی دی بلکہ محتاط رہنے کی ہدایت کی۔ بقول ان کے، جب شیر بھوکا ہوتا ہے تو وہ پاگل بھی ہو جاتا ہے۔ سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی حال اب چودھری باسط کا ہو رہا ہے۔ وہ اب مجھے جان سے بھی مار سکتا ہے۔ اُس نے یقیناً اپنے حواریوں کو مجھے ٹریس کرنے کے لیے الرٹ کر دیا ہوگا۔ اب مجھے ہر لمحہ محتاط رہنا تھا۔

حیدر الماس کی ہدایت کے مطابق میں نے اب گھر سے نکلنا کم کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب تک ویزا نہیں آ جاتا میں بلاضرورت گھر سے نکلنے سے پرہیز کروں۔ البتہ اگر کسی ضروری کام سے کہیں جانا بھی ہوتا تو میں اپنا حلیہ بدل لیتا تھا۔ زیادہ تر میں اَپر کا ہی استعمال کرتا تھا جس سے میرا چہرہ کسی حد تک چھپ جاتا تھا۔ ویسے بھی ماموں گھر

پر تھے۔ باہر کے سارے کام وہی کر رہے تھے اس لیے مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ اُس دن کے بعد مجھے دوبارہ چودھری باسط کا ''دھمکی آمیز'' فون نہیں آیا تھا۔

دو روز گزر گئے تھے۔ میں ایک بار پھر اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس روز ماموں گھر کی ضرورت کے لیے چیزیں خریدنے باہر گئے ہوئے تھے۔ شام کو جب وہ واپس آئے تو میں نے انہیں تشویش میں مبتلا دیکھا تو میری چھٹی حس نے کسی خطرے کا الارم بجا دیا۔ سامان ممانی کو پکڑانے کے بعد وہ مجھے لیے میرے کمرے میں آگئے۔

''علی پُتر! گھر سے باہر نہ نکلنا۔''

میرے چہرے پر حیرت دَر آئی۔ ''کیا ہوا ہے ماموں؟''

وہ مدھم آواز میں بولے۔ ''کچھ لڑکے تمہیں تلاش کر رہے تھے؟''

''مجھے؟'' میں ٹھٹکا۔

''ہاں۔'' ماموں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اُن کے پاس موبائل فون میں تمہاری تصویر تھی۔ وہ لوگوں کو تصویر دکھا کر پوچھ رہے تھے۔ میں گل گشت میں ایک مارکیٹ میں موجود تھا تو دو لڑکے میرے پاس آئے، ایک کے پاس تمہاری تصویر تھی۔ اس نے مجھے تمہاری تصویر دکھائی اور پوچھا کہ کیا آپ نے اِس لڑکے کو کہیں دیکھا ہے؟ تمہاری تصویر میں دیکھ کر چونک تو گیا تھا۔ بہرکیف، میں نے انکار کر دیا۔''

میں نے ماموں کی بات سن کر لمبی سانس لی۔ ''وہ لڑکے دِکھنے میں کیسے تھے؟''

''وہ لڑکے.....'' ماموں نے اپنے ذہن پر زور ڈالا پھر لحہ بھر سوچ کر مجھے ان لڑکوں کے حلیے بتانے لگے۔ انہوں نے جن لڑکوں کے حلیے بتائے تھے وہ نازو اور ہاشم کے تھے۔

''آپ نے پوچھا تھا کہ وہ مجھے کیوں تلاش کر رہے ہیں؟'' لحہ بھر ہونٹ بھینچنے اور سوچنے کے بعد میں نے ماموں جان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں پوچھا تھا۔'' ماموں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ایک لڑکا کہنے لگا کہ یہ لڑکا چور ہے اور ہمارے موبائل کی دکان سے موبائل چوری کر گیا ہے۔ بہرکیف، مجھے پتا ہے تم چوری نہیں کرتے پھر بھی محتاط رہنا۔ مجھے وہ لڑکے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔''

''ماموں! وہ لڑکے چودھری باسط کے حواری ہیں۔'' میں نے کہا تو ماموں کی بھنویں سکڑ گئیں۔ ''آپ کو پتا تو ہے کہ چودھری باسط تاحیات سیاست سے نااہل ہو گیا ہے۔ جس روز وہ نااہل ہوا تھا اسی رات اس نے مجھے کال کر کے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ یہ لڑکے اسی کے کہنے پر مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ اِن لڑکوں سے ایک ہفتہ قبل میرا آمنا سامنا ہو چکا ہے۔ یہ اُس روز بھی مجھے پکڑ کر لے جا رہے تھے لیکن میں اُن کے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔''

''اوہو۔'' ماموں کی تشویش بڑھی۔ ''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔''

''یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔'' میں نے بہانا تراشا۔

''کیسے خاص بات نہیں ہے؟'' ماموں کے چہرے پر خفگی کے تاثرات ابھر آئے۔ ''وہ کمینہ چودھری تمہیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ..... یہ کوئی بات نہیں ہے۔''

''دیکھیں ماموں۔'' میں نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''جب تک اللہ نہ چاہے وہ روسیاہ مجھے گزند تک نہیں پہنچا سکتا۔ میری زندگی اور موت میرے پاک پروردگار کے ہاتھ میں ہے، چودھری باسط کے ہاتھ میں نہیں اس لیے آپ پریشان نہ ہوں۔''

میری بات سے ماموں جان کو تسلی ہو گئی۔ انہوں نے بے اختیار مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیہ لہجے میں بولے۔ ''اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے اور دشمن کے ہر شر سے محفوظ رکھے۔ آمین۔''

میں نے بھی دل سے آمین کہا۔ ماموں جان اور میں کمرے سے باہر آگئے۔ اس دوران مرینہ ہمارے لیے چائے بنا لائی تھی اور ہم صحن میں ہی بیٹھ کر چائے پینے لگے۔

☆☆☆

اُس روز موسم ابر آلود تھا۔ وقفے وقفے سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مجھے اپنے گھر میں ''محصور'' ہوئے تیسرا روز تھا۔ جس روز ماموں نے مجھے بتایا تھا کہ نازو اور ہاشم میری تصویر دکھا کر مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں اس روز سے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔

حیدر الماس سے میری سیل فون پر بات ہو جاتی تھی۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ ابھی تک اسماعیل شاہد کے اڈّے سے فرار شیرو اور بشیر پولیس کے ہتھے نہیں چڑھے

تھے۔ پولیس مسلسل ان کی گرفتاری کے لیے مختلف جگہوں پر چھاپے مار رہی تھی۔

اُسی شام کو ہی شانزے کی کال آ گئی۔ اُس نے کافی دنوں کے بعد مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ اس کی ''حفاظت'' کے پیش نظر میں اسے فون نہیں کرتا تھا۔ حال احوال کے بعد بولی۔ ''کیا ہم آج مل سکتے ہیں؟''

''آج؟'' میں مستفسر ہوا۔

''ہاں۔'' وہ مختصر بولی۔ ''بتاؤ مل سکتے ہو؟''

''کیا ملنا ضروری ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر تم بزی ہو تو میں فورس نہیں کروں گی۔'' شانزے جواباً بولی۔

''نہیں، بزی تو نہیں ہوں۔''

''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ میں اسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس کے باپ کے حواری میری تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں اور میں اس کے ڈر سے گھر میں محصور ہوں۔

''مجھے تمہارے لہجے سے صاف لگ رہا ہے کہ کوئی خاص بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔'' شانزے کو شاید لہجے پڑھنے میں مہارت تھی اس لیے اس نے میرے لہجے اور رویے سے نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔

''ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ کہاں ملنا ہے؟''

شانزے بولی۔ ''میں اس وقت کچہری کے قریب ایک مارکیٹ میں موجود ہوں۔ اس مارکیٹ کے قریب ہی ایک ہوٹل ہے۔ تم اسی ہوٹل میں آ جاؤ۔ میں تمہیں لوکیشن سینڈ کر رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔'' میں نے گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا ماریہ بھی تمہارے ساتھ ہے؟''

''نہیں۔ ماریہ کے انکل کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ وہ فیصل آباد گئی ہوئی ہے۔'' شانزے صراحت بھرے لہجے میں بولی تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر چند مزید باتوں کے بعد ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا۔ دو منٹ کے بعد اس نے مجھے لوکیشن سینڈ کر دی۔ میں نے ایک نظر لوکیشن دیکھی۔ پھر میں نے لباس تبدیل کرنے کے بعد اپر پہنی اور موٹر بائیک لے کر گھر سے نکل پڑا۔ شانزے سے کافی دنوں کے بعد بات ہوئی تھی اس لیے میرا بھی اس سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ویسے بھی میں گھر میں محصور ہونے پر انتہائی بوریت کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے خود پر افسوس بھی تھا۔ میں شاید موت کے خوف سے ڈر کر گھر میں محصور ہو گیا تھا۔ شاید یہ بھول گیا تھا کہ موت اور زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر چودھری باسط کے ہاتھ میں ہوتی تو میں کب کا اس دنیا سے کوچ کر چکا ہوتا۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور موسم بے حد سہانا ہو گیا تھا۔ دن میں شام کا سماں محسوس ہو رہا تھا۔ بیس منٹ کے بعد میں مطلوبہ ہوٹل پہنچ گیا۔ میں نے موٹر بائیک پارکنگ میں پارک کی اور اندرونی ہال کی طرف بڑھ گیا۔

یہ چھوٹا سا مگر شاندار اور خوبصورت ہوٹل تھا۔ یہ حال ہی میں تعمیر ہوا تھا۔ ہال کے دروازے پر ایک باوردی دربان کھڑا تھا۔ میں جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچا تو اس نے سلام کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا اور میں اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

ہال میں چند افراد موجود تھے جن میں لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو شانزے مجھے ہال کے کونے میں بیٹھی دکھائی دی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو۔ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ وہ جین اور سبز کلر کے سویٹر میں ملبوس تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بدستور کھوئے کھوئے انداز میں بیٹھی تھی۔ میں ٹیبل کے گرد گھوم کر اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پلکیں جھپکے بغیر سامنے دیکھے جا رہی تھی۔ میں مخمصے میں پڑ گیا۔ شانزے کہاں کھوئی ہوئی تھی کہ اسے میری آمد کی خبر بھی نہیں ہو سکی تھی حالانکہ میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے جھکتے ہوئے شانزے کے سامنے چٹکی بجائی تو وہ بے اختیار چونکتے ہوئے ہوش میں آ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''علی تم..... تم کب آئے؟'' وہ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی تو میں اس کے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ کر اندر ہی اندر سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یقیناً شانزے ڈپریشن میں مبتلا ہے۔

''میں تو کب کا آیا ہوا ہوں البتہ تم کہیں کھوئی ہوئی تھیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دی لیکن اس کی مسکراہٹ مجھے مصنوعی لگی۔

''ہاں..... وہ.....'' وہ گڑبڑائی پھر بات بدلتے

ہوئے مجھے بیٹھنے کا کہتے ہوئے خود بھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔ ''کافی پیو گے یا چائے؟''

میں نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد پوچھا۔ ''تم کیا پیو گی؟''

''کافی.....''

''پھر میں بھی کافی پیوں گا۔''

شانزے نے اثبات میں گردن ہلائی پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے ویٹر کو بلایا۔ اسے دو کافی لانے کا آرڈر دینے کے بعد وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ میں بھی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ مجھے دیکھتے دیکھتے جیسے وہ پھر کہیں کھوگئی ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا ہال میں موجود سب لوگ کھانے پینے اور باتیں کرنے میں مشغول تھے۔

میں نے شانزے کی طرف دیکھا اور چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو۔ کہاں کھوگئی ہو؟''

''آں، ہاں۔'' وہ یکدم خیالی دنیا سے باہر نکل آئی۔

''شانزے! تم مجھے پریشان دکھائی دے رہی ہو۔ خیریت تو ہے؟'' میں نے بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

شانزے ایک بار پھر مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بھلا میں کیوں پریشان ہوں گی؟''

''تو پھر کہاں کھوئی ہوئی ہو؟''

''کہیں نہیں۔''

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اسی اثناء میں ویٹر کافی لے آیا اور ہم کافی پینے لگے۔ میں کافی پینے کے ساتھ ساتھ شانزے کے چہرے کا بھی مطالعہ کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق شاید وہ اپنے باپ چودھری باسط کی نااہلی کی وجہ سے پریشان تھی یا کوئی دوسری ایسی بات تھی جس نے اسے ڈپریشن میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ کافی کا سپ لینے کے بعد میں نے کپ رکھا اور کہنیاں میز پر رکھتے ہوئے تھوڑا سا جھکا پھر کہا۔ ''دیکھو شانزے۔ اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتا سکتی ہو..... اور اگر تم اپنے باپ کی نااہلی کی وجہ سے پریشان ہو تو.....''

اس نے میری بات قطع کی۔ ''نہیں۔ میں اس وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔''

''تو.....'' میں نے کہا۔ ''مجھے کھل کر بتاؤ، کیا بات ہے؟''

شانزے چند لمحے گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہی پھر کپ میز پر رکھنے کے بعد وہ بولی۔ ''دراصل میں نے رات پاپا (چودھری باسط) اور شانی کو باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔''

''وہ یقیناً میرے متعلق ہی گفتگو کر رہے ہوں گے۔'' میں دھیما سا مسکرایا۔

شانزے چونکی اور حیرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''تمہیں کیسے پتا کہ وہ تمہارے بارے میں بات کر رہے تھے۔''

''تمہارے پاپا نے چند روز پہلے کال کر کے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔'' میں نے اطمینان سے بتایا۔ ''پھر اگلے روز مجھے میرے ماموں نے بتایا کہ دولڑ کے سیل فون میں موجود میری تصویر لوگوں کو دکھا کر میرے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔''

''اوہو۔ پھر۔'' شانزے حیران ہونے کے ساتھ ساتھ متوحش بھی ہوئی۔

''پھر کیا۔'' میں نے کہا۔ ''میرے ماموں نے مجھے سختی سے گھر سے نہ نکلنے کا حکم دے دیا۔ میں تین دن اپنے گھر میں محصور رہا ہوں۔ آج جب تمہاری کال آئی تو میں ساری پابندیاں توڑ کر یہاں آگیا۔''

شانزے نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میرے پاپا تمہارے بارے میں ہی بات کر رہے تھے۔''

''ویسے تمہارے پاپا کیا کہہ رہے تھے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''وہ شانی بھائی سے کہہ رہے تھے کہ..... کچھ بھی ہو جائے اس لڑکے کو تلاش کرو، شہر کا کونا کونا چھان مارو۔ مجھے وہ لڑکا زندہ یا مردہ حالت میں چاہیے۔ اگر تم اسے زندہ لے آئے تو میں خود اس کی بوٹیاں بوٹیاں کروں گا۔''

میرے وجود میں چودھری باسط اور شانی کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہ دونوں دوبارہ میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور میری جان کے درپے تھے۔ میں نے شانزے کی ڈھارس بندھائی۔

''تم پریشان مت ہو۔ اللہ نے چاہا تو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جن کے اپنے چہرے اور دامن سیاہ ہوں اور ان

کے کرتوت دنیا کے سامنے آجائیں تو ان کی حالت خراب ہو ہی جاتی ہے۔ تمہارے پاپا کی نااہلی میں میرا نہیں، ان کا اپنا ہاتھ ہے۔''

''جانتی ہوں۔'' وہ نظریں جھکا کر بولی۔ ''لیکن تم پھر بھی محتاط رہنا۔ شانی بھائی کے دوست تمہیں پورے شہر میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔''

''تم بے فکر رہو۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ بات تم یاد رکھنا، تمہارے بھائی نے میری بہن کو اغوا کر کے اسماعیل شاہد کے حوالے کیا تھا اس لیے میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

شانزے نے ایک نظر میری طرف دیکھا مگر چپ رہی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے شانزے کی آنکھوں اور چہرے پر خوف کے سائے لہراتے ہوئے دیکھے۔ یک لخت وہ ساکت و جامد ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کرسی پر پتھر کا بت ایستادہ کر دیا گیا ہو۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھی۔

میں ٹھٹک گیا۔ ''کیا ہوا شانزے؟''

''وہ.....وہ.....'' جواباً وہ اتنا ہی بول سکی۔

میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر دیکھا۔ میرے عقب میں ایک کھڑکی تھی جس پر شیشے لگے ہوئے تھے لیکن اس کھڑکی کے پار کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے شانزے کی طرف دیکھا تو وہ بہ دستور پتھر کی مورت بنی کھڑکی کی طرف دیکھے جا رہی تھی پھر جیسے ہی وہ ہوش میں آئی تو ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''نکل چلو علی۔ جلدی کرو۔'' وہ ہراساں لہجے میں بولی تو میں بھی متحیر ہو کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہو گیا ہے شانزے.....تم کیوں خوفزدہ ہو رہی ہو۔'' میں نے صراحت طلب لہجے میں پوچھا۔

''وہ.....وہ.....'' شانزے تذبذب کے عالم میں پھر اتنا ہی بول پائی۔ شاید وہ حد سے زیادہ خوفزدہ ہو چکی تھی کہ الفاظ اس کے حلق میں پھنس رہے تھے۔

''ہاں ہاں بولو۔''

لیکن وہ کچھ نہ بول پائی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنا پرس اٹھایا اور چشم زدن میں میز کی طرف سے گھوم کر میری طرف آئی اور میرا بازو پکڑے خارجی دروازے کی طرف جانے کی بجائے دائیں طرف والی راہداری کی طرف بڑھ گئی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں مستفسر ہوا لیکن شانزے نے کوئی جواب نہ دیا۔

اُس طرف راہداری میں رہائشی کمرے تھے اور اس کی دوسری طرف سیڑھیاں تھیں جو گولائی کی صورت میں اوپر جا رہی تھیں۔ ان کے کونوں میں اسٹیل کی ڈیزائننگ والی گرلز لگی ہوئی تھیں جن کی وجہ سے سیڑھیوں کی خوب صورتی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شانزے مجھے لے کر سیڑھیوں کی طرف جانے کی بجائے راہداری کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ شانزے اتنی عجلت اور پریشانی میں میرا بازو تھام کر مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔

میں اس ہوٹل میں پہلی مرتبہ آیا تھا اس لیے مجھے اس کی لوکیشن معلوم نہیں تھی۔ شانزے جدھر مجھے لے کر جا رہی تھی میں اس کے ساتھ گھسٹتا جا رہا تھا لیکن میں اتنا سمجھ گیا تھا کہ کوئی خطرے والی بات تھی جس کی وجہ سے شانزے مجھے وہاں سے لے کر کہیں محفوظ جگہ کی طرف جا رہی تھی۔ شانزے اس وقت سر تا پا برق بنی ہوئی تھی۔

''شانزے! کچھ بتاؤ گی بھی کہ.....'' میں نے اس سے پوچھنا چاہا۔

''میں نے.....میں نے شانی بھائی کو دیکھا ہے۔'' وہ خوف بھرے لہجے میں بولی تو مجھے اس کے خوف کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شانی ہی تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ وہ شانی بھائی ہی تھا۔'' وہ تیقن سے بولی۔ ''وہ کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ لمحہ بھر کھڑکی سے دیکھنے کے بعد وہ غائب ہو گیا۔''

''ہمم۔'' میں نے ہمکاری بھری۔ میں بھی اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اگر واقعی کھڑکی سے دیکھنے والا شانی تھا تو پھر خطرے والی بات تھی۔ وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

''شاید اس نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تھا۔'' شانزے نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

میں نے ٹھنڈی سانس اپنے اندر انڈیلی اور میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑے۔

''اتنی معمولی بات کے لیے تم پریشان ہو گئی۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ پریشان میں بھی ہو گیا تھا لیکن میں

خود کو پُرسکون رکھ رہا تھا تاکہ شانزے کا حوصلہ برقرار رہے۔

''کیا یہ معمولی بات ہے؟'' وہ حیرت کے زیرِ اثر تھی۔

''میرے لیے تو معمولی بات ہے شانزے۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا بھائی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔''

''سن کر حیرت ہوئی ہے۔'' شانزے متحیر ہو کر بولی۔ ''ایک بندہ تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے اور تم اسے معمولی قرار دے رہے ہو۔ میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ وہ پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کرتا پھر رہا ہے۔''

''میری بلا سے کرتا رہے۔'' میں نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ ''جانتی ہو وہ کئی بار مجھ سے پٹ چکا ہے اور شاید آج بھی پٹے گا۔''

میری بات پر شانزے شاکڈ ہو کر رہ گئی۔ ''کیا واقعی؟''

''اپنے بھائی سے پوچھ لینا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن وہ تمہیں کبھی نہیں بتائے گا۔ ایک بندہ کیسے بتا سکتا ہے کہ اس نے فلاں بندے سے مار کھائی ہے۔''

''میں اس سے کیسے پوچھ سکتی ہوں۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تم سے ملتی رہتی ہوں تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔'' شانزے بولی۔

''اور میں اسے مار دوں گا۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ چلتے چلتے رک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ہم آدھی سے زیادہ راہداری کراس کر چکے تھے۔

''واقعی تم بہت بہادر ہو علی۔'' شانزے نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''طنز کر رہی ہو یا تعریف؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تعریف کر رہی ہوں۔'' شانزے تیقن بھرے لہجے میں بولی۔

''تعریف کرنے کا شکریہ۔'' میں نے سچے دل سے کہا۔ ''ایک بات یاد رکھنا۔ ڈرتے وہ لوگ ہیں جن کے دل میں چور ہوتا ہے یا، جن کے کرتوت سیاہ ہوتے ہیں۔ الحمدللہ نہ میرے دل میں چور ہے اور نہ ہی میرے کرتوت سیاہ ہیں اس لیے میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ خاص کر اِن روسیاہ انسانوں سے۔''

شانزے سمجھ گئی تھی کہ میرا اشارہ چودھری باسط، شانی اور اسماعیل شاہد کی طرف ہے اس لیے اس نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ ہم پھر آگے بڑھ گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے اپنے بھائی کے قہر سے بچانا چاہتی تھی یا اسے یہ ڈر تھا کہ اگر شانی نے اسے میرے ساتھ دیکھ لیا تو اس کا ردِعمل ہوگا۔

اب ہم راہداری کے کونے میں پہنچ چکے تھے۔ راہداری اختتام پر دائیں طرف مڑ رہی تھی۔ چند سیڑھیوں کے اسٹیپ تھے اور اس کے اختتام پر ایک دروازہ تھا۔ شاید وہ دروازہ ہوٹل کے عقبی طرف کھلتا تھا یا ایمرجنسی کے لیے بنایا گیا تھا۔ بہرکیف، ہم جلدی سے سیڑھیاں اتر کر دروازے پر پہنچے۔ شانزے نے دروازہ کھولنا چاہا تو مگر تیر گئی قسمت، وہ بند تھا۔

''اوشٹ۔'' شانزے جھنجلائی۔ پھر مجھے دیکھا۔ ''یہ تو بند ہے۔''

''ہٹو۔ میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ شانزے ایک سائڈ پر ہو گئی تو میں نے آگے بڑھ کر جلدی سے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر بُری طرح سے جھنجوڑا لیکن دروازہ دوسری طرف سے لاک تھا اور قدرے مضبوط تھا۔ جھنجوڑنے کے باوجود اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''یہ نہیں کھلے گا۔'' میں نے شانزے کی طرف دیکھا تو وہ خوف زدہ ہو گئی۔ پھر میرا بازو پکڑے تقریباً مجھے گھسیٹتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر راہداری میں آئی اور ہم واپس اُدھر بڑھنے لگے جدھر سے آئے تھے۔ راہداری کے دائیں بائیں پتلی سی گلیاں تھیں جن کے اختتام پر رہائشی کمروں کے دروازے تھے۔ ابھی ہم راہداری میں ہی موجود تھے کہ دفعتاً دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ہماری سماعتوں سے ٹکرائیں۔ دوڑنے والا شاید عجلت میں تھا۔

شانزے رک گئی اور گھبرائی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں اور چہرے پر دنیا جہان کا خوف اُمڈ آیا تھا۔ اُس وقت میرا ذہن بھی آندھیوں کی زد میں آ گیا تھا پھر میری نظر راہداری کے بائیں طرف والی پتلی سی گلی پر پڑی تو میں شانزے کا بازو تھامے اُس پتلی گلی میں گھس گیا۔ گلی کے اختتام پر ایک دروازہ تھا جو کہ بند تھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے شانزے کو اپنے پیچھے کیا اور میں خود دیوار کے ساتھ چپک کر آنے والے کا انتظار کرنے لگا۔ قدموں کی آوازوں سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ ایک تھا اور وہ قدم بہ قدم انتہائی محتاط سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے قدموں کی آوازیں اب قدرے قریب آتی جا رہی تھیں۔ لمحہ

بھر کے بعد راہداری کی چھت پر لگے بلب کی روشنی میں مجھے ایک سایہ دکھائی دیا جو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آ رہا تھا۔ شاید یہ شانی تھا یا اس کا کوئی حواری۔ بہرکیف، میں نے گردن موڑ کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شانزے کو خاموش رہنے اور فرش پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا تو اس نے جواباً اثبات میں گردن ہلا دی اور فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں سائے کی حرکات و سکنات دیکھنے لگا۔

سایہ لمحہ بہ لمحہ گہرا پھیلتا ہوا قریب آتا جا رہا تھا۔ شاید آنے والے کو پتا چل گیا تھا کہ ہم راہداری کی پہلی گلی میں چھپے ہوئے ہیں اس لیے وہ بھی احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ سایہ ذرا اور آگے آیا تو میں نے روشنی میں اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ لیا۔ ریوالور اس نے دونوں ہاتھوں میں دبا رکھا تھا اور اس کا انداز انگریزی ایکشن فلموں والا تھا۔ وہ کبھی ریوالور کو دائیں طرف کرتا تو کبھی بائیں طرف۔ میں نے اپنا سر بھی دیوار کے ساتھ چپکا لیا۔ میں تہی دست تھا اس لیے مجھے انتہائی احتیاط سے نووارد پر قابو پانا تھا تاکہ مجھے اور شانزے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ہم دونوں ہی کسی نقصان کے متحمل نہیں تھے۔

جیسے ہی وہ سایہ گلی کی نکڑ پر پہنچا تو میں پھرتی سے فرش پر بیٹھ گیا، اور بیٹھتے ہی ایڑیوں کے بل گھومتے ہوئے اپنا پیر سائے کے گھٹنے پر مارا تو وہ نہ صرف لڑکھڑا گیا بلکہ دوسری طرف کی دیوار سے ٹکرا بھی گیا۔ ریوالور بہ دستور اس کے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا۔ اس نے گولی بھی چلائی تھی۔ یقیناً ریوالور پر سائیلنسر فٹ تھا اس لیے گولی کی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میری خوش بختی تھی کہ میرے بروقت کروٹ بدلنے کی وجہ سے گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتے ہوئے دیوار میں پیوست ہو گئی تھی۔

وہ شانی نہیں اس کا کوئی گرگا تھا۔ وہ نوجوان تھا اور تربیت یافتہ دکھائی دیتا تھا۔ گولی چلنے سے ہلکی سی ''ٹھک'' کی آواز پیدا ہوئی تھی اس لیے یہ غالب امکان نہیں تھا کہ شانی یا اس کا کوئی اور ساتھی یا ہوٹل کے عملے میں سے کوئی اس طرف آ سکتا تھا۔ مجھے شانزے کی دبی دبی سسکی سنائی دی تھی لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ مدِمقابل ہتھیار سے لیس تھا۔ میری ذرا سی غفلت اسے کامیابی سے ہمکنار کر سکتی تھی اور مجھے دوسری دنیا میں پہنچا سکتی تھی۔

میں سنبھلا ہی تھا کہ اس نے چشم زدن میں ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دبا پاتا، شانزے کا پرس اس کے چہرے پر لگا اور وہ گڑبڑا گیا۔ شانزے نے پرس کھینچ مارا تھا۔

اس کے لڑکھڑانے سے مجھے موقع مل گیا تھا۔ میں نے فضا میں ہی جست لگائی اور عقاب کی مانند اس پر جھپٹا۔ میں نے سب سے پہلے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر ہاتھ مارا تھا۔ نتیجتاً ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر چند قدم کے فاصلے پر جا گرا۔ اگلے ہی لمحے اس کا طاقتور گھونسا میرے جبڑے پر پڑا۔ جس نے مجھے دن میں تارے دکھا دیئے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے یک لخت اندھیرا سا پھیلنے لگا تھا۔ میں سر جھٹک کر سنبھلنے ہی پایا تھا کہ حواری کا دوسرا گھونسا ایک بار پھر میرے جبڑے پر پڑا اور میرے منہ سے خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑا۔ بلاشبہ وہ قدرے طاقتور تھا۔ اس کے پہلے ہی گھونسے نے میری حالت نڈھال کر دی تھی۔ رہی سہی کسر دوسرے گھونسے نے پوری کر دی۔ میں لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹکرایا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے منہ سے مغلظات بک کر آگے بڑھ کر ایک اور گھونسا مجھے مارنا چاہا لیکن میں جھکائی دے گیا۔ نتیجتاً اس کا گھونسا دیوار پر پڑا اور اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔ وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات واضح تھے۔ اس کی حالت متغیر ہو گئی تھی۔ میں بھی خود کو سنبھال چکا تھا اس لیے اب میں اُس سے گھونسوں کا بدلہ لے سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے برق سرعت سے آگے بڑھ کر پہلے اس کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ جیسے ہی ''اوغ'' کی آواز نکالتا ہوا رکوع کی حالت میں آیا میں نے اس کی ناک پر مکا جڑ دیا۔

میرا یہی وار ہمیشہ کامیاب رہتا تھا۔ اس کے تمِ مقابل کے حواس منتشر ہو جاتے تھے اور چند لمحوں کے لیے اس کا دماغ چکرا کر رہ جاتا تھا۔ یقیناً اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اُس کے حلق سے کراہ نکلی تھی اور وہ اندھے بھینسے کی طرح مجھ پر حملہ کرنے لپکا تھا کہ اس کے ناک پر پڑنے والے میرے دوسرے مکے نے اسے نڈھال کر دیا۔ اس کی ناک سے خون ایسے ابلا جیسے کسی نے بھرے پانی کا نل کھول دیا ہو۔ اس کی حالت دیدنی ہو گئی تھی۔ ناک سے نکلنے والے خون نے اس کی ٹھوڑی تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اُس نے مجھے ایک غلیظ گالی سے نوازا اور میں نے اس کی گالی کے

جواب میں اس کی ناک پر ایک اور مکا رسید کر دیا۔ نتیجتاً وہ کراہ کر فرش بوس ہو گیا اور خود کو سنبھالنے لگا۔

اِس دوران شانزے نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی اور نہ ہی کسی کمرے سے کوئی باہر نکلا تھا۔ میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ حواس باختہ سی کھڑی تھی۔ میں نے دائیں بازو کی آستین سے منہ سے نکلتا خون صاف کیا اور شانزے سے کہا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

میری آواز سن کر شانزے ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آئی پھر اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر زخمی کے قریب پڑا اپنا پرس اٹھا لیا۔ ''ہاں..... آں..... میں ٹھیک ہوں۔''

''آؤ چلیں۔''

''کس طرف سے جائیں گے؟''

میں نے راہداری کے کونے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اِدھر سے چلتے ہیں۔''

''وہ..... وہ..... شانی۔''

''شانی کہاں ہے؟'' میں نے شانزے کی بات کا جواب دینے کی بجائے حواری سے استفسار کیا لیکن وہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے کراہتا رہا۔

معاً میری نظر اس کے پیروں کے قریب پڑے اس کے ریوالور پر نظر پڑی۔ عین اسی لمحے اس نے بھی ریوالور دیکھ لیا تھا۔ وہ ریوالور اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر ریوالور پر پاؤں کی ٹھوکر ماری تو وہ اچھل کر دور جا گرا۔ اگلے ہی لمحے میں نے ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں پر مار دی تو وہ کراہ کر رہ گیا، پھر ہم دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے راہداری کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ حواری فرش پر پڑا کراہتا رہ گیا۔

راہداری کی نکڑ پر پہنچے تو میں نے شانزے کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود دیوار سے چپک کر ہال میں نظریں دوڑانے لگا۔ ہال میں کافی لوگ موجود تھے۔ نظریں دوڑاتے ہوئے مجھے ہال کے خارجی دروازے کے پاس شانی کھڑا نظر آیا تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہو گیا کہ مبادا اس کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے۔

''کیا ہوا؟''

''ہال کے دروازے پر شانی موجود ہے۔'' میں نے سرگوشی کرتے ہوئے اسے انفارم کیا۔ وہ مضطرب ہو گئی۔

''اوہ..... پھر۔'' شانزے گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

''چند منٹ انتظار کر لیتے ہیں۔ شاید وہ اِدھر اُدھر ہو جائے۔'' میں نے قیاس ظاہر کیا۔ شانزے بہ دستور سہمی ہوئی تھی۔ مجھے اس زخمی کے آنے کا بھی خدشہ تھا۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا اور کسی بھی لمحے ہمارے پیچھے آ سکتا تھا۔ اس کے آنے سے کام بگڑ بھی سکتا تھا۔

''اب دیکھو، شاید وہ چلا گیا ہو۔'' دو منٹ کے بعد شانزے نے کہا تو میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے راہداری کی دیوار سے چپک کر ہال میں جھانکا۔

شانی ابھی تک ہال کے خارجی دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ بہ دستور موجود تھی۔ معاً اس نے راہداری کی طرف دیکھا تو میں تیزی سے پیچھے ہو گیا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔

''کیا وہ ابھی تک موجود ہے؟'' شانزے نے شانی کے متعلق استفسار کیا۔

''ہاں.....''

وہ پھر حواس باختہ ہوئی۔ ''پھر اب کیسے یہاں سے نکلیں گے؟''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دینے کے بعد سر ترچھا کر کے ہال کی طرف دیکھا تو مجھے شانی اُدھر راہداری کی طرف ہی دیکھتا ہوا دکھائی دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا۔ اس کی نظر شاید مجھ پر پڑ گئی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہوا۔ لمحہ بھر کے بعد میں نے دوبارہ راہداری میں جھانکا تو مجھے شانی آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے پیچھے ہوتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے اور شانزے سے بولا۔ ''شانی آ رہا ہے۔''

''اوہ۔ اب..... اب کیا ہو گا۔'' شانزے اضطراب میں مبتلا ہو گئی۔

''اطمینان رکھو، کچھ نہیں ہو گا۔'' میں نے اس کی ڈھارس بندھائی پھر اس کا بازو پکڑا اور آگے بڑھ گیا۔ عین اسی لمحے شانی کا ساتھی دکھائی دیا جو رک رک کر چلتا ہوا ریوالور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کی پشت ہماری طرف تھی اس لیے ہم اِس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں نزدیکی راہ داری میں گھس گئے۔ اس کے اختتام پر کمرے کا دروازہ بہ دستور بند تھا۔ اتنی ہنگامہ آرائی ہونے کے باوجود کسی بھی کمرے سے کوئی باہر نہیں نکلا تھا۔ شاید کمرے خالی پڑے

تھے اور رہائش پذیر افراد ہال میں کھانا کھانے میں مصروف تھے۔

گلیارے میں ایک بلب جل رہا تھا جسے آن آف کرنے کا بٹن بھی ایک دیوار پر نظر آیا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر بٹن دبایا تو بلب آف ہوگیا اور گلی میں اندھیرا پھیل گیا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ شانی کا ساتھی ریوالور اٹھائے گلی کے سامنے سے گزر گیا۔ اس نے گلی میں دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ یہ ہمارے لیے اچھا ہی ہوا تھا۔ دفعتاً ہماری سماعتوں سے شانی کی آواز ٹکرائی۔ اس کے لہجے میں حیرت اور تفکرات کے ملے جلے تاثرات تھے۔

''جعفر! تمہاری یہ حالت کس نے کی ہے؟''

''یہ اسی لڑکے کی کارستانی ہے۔ میں نے اس پر قابو پا لیا تھا لیکن.....'' حواری بتا رہا تھا کہ شانی نے درشتگی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''واہ، کیا بات ہے۔ تم ایک لڑکے سے مار کھا گئے۔''

''شانی بھائی..... میں.....'' جعفر نے پھر کہنا چاہا۔

''صراحت بعد میں کرنا، میں نے اسے اسی راہداری میں جاتے دیکھا ہے۔ کہاں گیا ہے وہ؟''

''نہیں۔ وہ اِدھر نہیں ہے۔ وہ میرے سامنے فرار ہوا تھا۔'' جعفر بولا۔

''کب؟''

''ابھی..... چند منٹ پہلے۔ اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔'' حواری جعفر نے اسے بتایا۔

''لڑکی۔'' شانی گرجا۔ ''وہ لڑکی کون تھی؟''

''مجھے کیا پتا بھائی۔'' جعفر کی تذبذب میں ڈوبی آواز ابھری۔ ''لیکن اس نے تمہارا نام لیا تھا۔ شاید وہ تمہیں جانتی ہے۔''

میں نے شانزے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں اور چہرے پر خوف پھیلا ہوا تھا۔

''میرا نام لیا تھا؟'' شانی کے لہجے میں اس بار حیرت در آئی تھی۔

''ہاں بھائی۔''

''ہٹو۔'' شانی گرجا۔

پھر مجھے تیز تیز قدموں کی آوازیں سنائی دیں تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ شانی کی بات سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ جو لڑکی میرے ساتھ ہے وہ اس سے بے خبر ہے کہ وہ شانزے ہے۔

شانزے کی حالت مجھ سے قدرے بدتر تھی۔ اس کا چہرہ خوف و دہشت سے زرد پڑ گیا تھا۔ عین اسی لمحے ہمارے عقب میں کمرے کا دروازہ کھلا تو ہم نے بے اختیار مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ اُن کی آنکھوں پر نظر کی عینک تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر بے اختیار چونکیں، اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتیں، میرے دماغ میں ایک خیال کوندے کی مانند لپکا۔ میں نے شانزے کا بازو پکڑا اور جلدی سے کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہ خاتون ''ارے، ارے'' کرتی رہ گئیں۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر خاتون کا بازو پکڑ کر انہیں اندر کھینچا اور جھٹ سے دروازہ بند کر کے لاک لگا دیا۔

''ارے یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کون ہو تم لوگ؟'' وہ خاتون ہراساں ہوتے ہوئے بولیں۔

''آنٹی، پلیز۔ شور نہ مچایئے گا۔ ہم چور، ڈاکو نہیں ہیں۔ ہمارے دشمن ہمارے پیچھے ہیں ان سے بچ کر اِدھر آ گئے ہیں۔'' میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

''اوہ، کیا تم اس لڑکی کو گھر سے بھگا لائے ہو؟'' خاتون متحیر ہوئیں۔

''ایسا ہی سمجھ لیں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''یہ میری بیوی ہے۔ ہم نے گھر سے بھاگ کر شادی کی ہے اور اس کا بھائی ہمیں مارنا چاہتا ہے۔ پلیز آپ ہماری ہیلپ کریں۔''

''میں..... میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟'' وہ حیران ہوئیں۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی تو ہم نے بے اختیار چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''اوہ۔ اِس کا بھائی آ گیا ہے۔'' میں نے شانزے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے لہجے سے بے پناہ خوف ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''پلیز آنٹی، ہماری مدد کریں۔ پلیز۔''

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔ یہاں تو ایسی کوئی جگہ بھی نہیں ہے جہاں تم دونوں چھپ سکو۔'' خاتون کے لہجے میں جھلاہٹ کا عنصر شامل تھا۔ میں نے غائرانہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔ دروازے کے سامنے والی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جس پر صرف شیشے لگے ہوئے تھے۔ اس پر لگے پردے ایک سائیڈ پر ہوئے پڑے تھے۔ دفعتاً میرے ذہن میں ایک خیال آیا تو میں جلدی سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی فرش سے چار، پانچ فٹ کے فاصلے پر تھی اور دوسری طرف ایک پتلی سی گلی تھی۔

دفعتاً دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ خاتون مضطرب الحال دکھائی دے رہی تھیں۔ میں مڑ کر خاتون کے پاس آیا۔

''پلیز، ہمارے جانے کے بعد دروازہ کھولیے گا..... اور ہمارے بارے میں کچھ بھی نہ بتایئے گا۔ یہ آپ کا ہم پر احسان ہوگا۔'' میں نے ایک بار پھر ملتجیانہ لہجے میں کہا تو خاتون نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''آؤ شانزے۔'' میں نے کہا اور شانزے کا ہاتھ پکڑ کر کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ کھڑکی میں نے پہلے ہی کھول دی تھی اس لیے میں جلدی سے کھڑکی پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔ شانزے نے بھی کودنے میں لمحہ بھر لگایا تھا۔ ہمارے کودتے ہی خاتون نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر کے پردے آگے کر دیئے تھے۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شانزے کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھنے لگا۔ گلی چار فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ اُس گلی میں کمروں کے واش رومز کے پائپ اور اے سی کے پائپ لگے ہوئے تھے۔ یہ گلی آگے مڑ کر پارکنگ کی طرف جا رہی تھی۔ ہم گلی کے اختتام پر مڑے ہی تھے کہ مجھے شانی کی آواز سنائی دی۔ اس نے چیخ کر اپنے ساتھی سے کہا تھا۔

''وہ باہر جا رہے ہیں۔ جعفر، باہر جاؤ۔''

میں نے گردن موڑ کر گلی میں جھانکا تو شانی کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ جوش غیظ سے تپا ہوا تھا۔ میں شانزے کو لے کر پارکنگ میں آ گیا۔

''شانزے۔ تم جاؤ۔ میں شانی کو سنبھال لوں گا۔'' میں نے کہا تو شانزے مضطرب ہوئی۔

''لیکن تم.....''

''میری فکر مت کرو۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اور ہاں..... پریشان مت ہونا کیونکہ تمہارے بھائی کو نہیں پتا کہ تم میرے ساتھ ہو۔ اب جاؤ۔ جلدی۔''

شانزے کے چہرے پر یک لخت اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی وہ مڑ کر اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ ایک منٹ کے بعد اس کی کار گیٹ کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ گیٹ کراس کر گئی۔ اُس کے جاتے ہی میں نے بھی پارکنگ بوائے کو پیسے اور کارڈ تھما دیا۔ ہیلمٹ پہننے کے بعد میں نے موٹر بائیک اسٹارٹ کی اور اس کا رخ گیٹ کی طرف کر دیا۔ میں نے گیٹ کراس کرنے کے ساتھ ہی گردن موڑ کر دیکھا تو شانی اور اس کا ساتھی جعفر بھی دوڑتے ہوئے پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے موٹر بائیک پر ''فرار'' ہوتے دیکھ لیا تھا۔

''ہونہہ۔ اب مجھے تلاش کرتے رہو۔'' میں نے ہنکارا بھرا اور پھر موٹر بائیک ہوٹل سے نکال کر کچہری کی طرف دوڑانے لگا۔ چوک پر بے تحاشا ٹریفک تھا۔ شانزے کی کار ٹریفک میں گم ہو چکی تھی اس لیے میں اس کی طرف بے فکر ہو گیا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ میں شانی سے ڈر کر فرار ہو رہا تھا۔ درحقیقت میں نہیں چاہتا تھا کہ ہوٹل میں کوئی تماشا ہو اس لیے میں نے اس سے ٹکرانے سے گریز کیا تھا۔ اگر وہ اپنی بہن شانزے کو میرے ساتھ دیکھ لیتا تو ہو سکتا تھا کہ اس کی غیرت جاگ جاتی اور شانزے اس کے قہر کا شکار ہو سکتی تھی۔

میرے لیے یہ بات بھی معما تھی کہ شانی کو کیسے پتا چلا تھا کہ میں ہوٹل میں موجود ہوں۔ شانزے پر تو شک کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ تو کچہری کے قریب ایک مارکیٹ میں موجود تھی اور یہیں سے اس نے مجھے کال کیا تھا۔

بوندا باندی بہ دستور ہو رہی تھی۔ کچہری چوک سے میں نے موٹر بائیک کو چونگی کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ اب شانی مجھے اتنی جلدی تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کی دسترس سے بہت دور نکل چکا تھا۔ جب وہ کچہری چوک پر پہنچے گا تو وہ یقیناً مخمصے کا شکار ہوگا کہ میں کدھر گیا ہوں۔ البتہ یہ امکان غالب تھا کہ وہ گل گشت کی طرف آ سکتا تھا کیونکہ چند روز پہلے اس کے حواری نازو، نجو اور ہاشم سے اسی علاقے میں ہی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ شانی کا ذہن اس طرف جا سکتا تھا کہ میں گل گشت کی کسی کالونی میں رہائش پذیر ہوں۔

یہی وجہ تھی کہ میں بیک مرر میں مسلسل اپنے عقب کا جائزہ بھی لے رہا تھا تاکہ اگر کوئی مشکوک کار یا موٹر بائیک دکھائی دے تو اسے ڈاج دے سکوں۔ چونگی تک پہنچنے تک تو مجھے کوئی مشکوک کار یا موٹر بائیک دکھائی نہ دی اس لیے میں مطمئن ہو کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

خراب موسم کے سبب سڑکوں پر ٹریفک کم تھا۔ کھمبوں پر نصب مرکری بلب بھی روشن تھے۔ بوندا باندی کے سبب سڑک پر کافی پھسلن ہو چکی تھی۔ میں انتہائی محتاط سے موٹر بائیک چلا رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد میں اپنے گھر پہنچ گیا۔ جب میں گھر پہنچا تو رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ موٹر بائیک صحن میں کھڑی کرنے کے بعد میں ہیلمٹ

اتار کر موٹر بائیک ہنڈل سے ہک کیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ اُسی وقت مرینہ بھی میرے کمرے میں آ گئی۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے؟'' وہ تشویش زدہ لہجے میں بولی۔ پھر اس کی نظر میری شرٹ کی آستین پر پڑی تو وہ بے اختیار چونک پڑی۔

''اوہو۔ یہ خون کیسا ہے۔ک..... کیا آپ کی کسی سے لڑائی ہوئی ہے؟'' اس نے میری آستین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ میں نے بھی بے اختیار آستین کی طرف دیکھا تو اس پر خون جما ہوا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس لیا اور اقرار زدہ لہجے میں بولا۔ ''ہاں۔ لیکن ماموں کو یہ مت بتانا کہ میں باہر گیا تھا۔ وہ خوامخواہ پریشان ہوں گے۔''

''ماموں کو نہیں بتاؤں گی۔'' وہ کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ''لیکن آپ کی لڑائی کس سے ہوئی ہے۔ اوہ..... کہیں شانی.....''

''شانی تو میرے ہاتھوں پٹنے سے بچ گیا تھا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''البتہ اس کے ساتھی سے میری لڑائی ہوئی تھی اور حسب توقع جیت میری ہوئی تھی۔ ویسے اگر شانی میرے ہاتھوں پٹتا تو اس کی بہن اسے پٹتا دیکھ کر کیا سوچتی۔ شانی کے لیے تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مقام ہوتا۔''

مرینہ بھی ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ ''بے چاری کو افسوس ہی ہوتا۔''

''صحیح کہہ رہی ہو۔ بالکل کسی فلم کا سین ہی ہوتا۔''

''شانی کا ساتھی آپ کو کیسے مل گیا تھا؟''

میں نے مختصراً ہوٹل میں شانزے سے ملنے سے لے کر وہاں سے فرار تک کی بات چیت اس کے گوش گزار کر دی۔

''کھانا کھائیں گے؟''

''ہاں۔ بہت بھوک لگی ہے۔ اس بدبخت شانی کے بچے نے کھانا بھی نہیں کھانے دیا تھا۔'' میں نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں لے آتی ہوں۔ آپ پیٹ بھر کر کھائیے گا۔''

وہ جانے لگی تو میں نے پوچھا۔ ''کیا باقی سب نے کھا لیا ہے؟''

''ہاں۔'' اتنا کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی اور میں کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد مرینہ کھانا لے آئی اور میں کھانے میں مشغول ہو گیا۔ جبکہ مرینہ میرے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔

آج کی شام واقعی ایڈونچرس تھی لیکن یہ ایڈونچر صرف بیس سے پچیس منٹ پر مشتمل تھا۔ شانی مجھے مسلسل گھیرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا لیکن ہر بار میں اس کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ گویا ہمارے درمیان چوہے بلی کا کھیل جاری تھا۔ مجھے صرف ویزے کا انتظار تھا اس کے بعد میرے ساتھ کیا حالات پیش آنے تھے، نہیں جانتا تھا۔

میں نے کھانا کھا لیا تو مرینہ چائے لے کر آ گئی۔ اس نے کپ میز پر رکھا اور کھانے کے برتن اٹھا کر لے گئی۔ میں نے چائے کا کپ اٹھایا اور چائے گھونٹ گھونٹ اپنے حلق میں اتارنے لگا۔ ساتھ ہی میری سوچوں کا محور شانزے کی طرف چلا گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر ابھر آیا جب اس نے ہوٹل میں کھڑکی سے جھانکتے شانی کو دیکھا تھا تو وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اُس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ میری تلاش میں ہوٹل آ سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ شانزے کو کال کر کے اس کی خیریت معلوم کروں پھر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ میں اسے کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ خود ہی مجھے کال کر کے صورتِ حال سے آگاہ کر دے گی۔ چنانچہ میں وقت گزاری کے لیے ٹی وی پر نیوز دیکھنے لگا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا جب میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا اور میں اس وقت بستر پر دراز سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا سیل فون سائیڈ ٹیبل پر پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا تو شانزے کال کر رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھا اور کال ریسیو کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے شانزے کی آواز سنائی دی۔ وہ دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔ ''ہیلو علی۔''

''بولو شانزے۔ کیا صورتِ حال ہے؟'' میں نے جواب دینے کے بعد پوچھا۔

''بہت خطرناک صورتِ حال ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں ٹھٹکا۔

''ہمارے جانے کے بعد شانی بھائی نے ہوٹل کے ایک ویٹر سے میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی کہ..... وہ لڑکی کون تھی، اس نے کس رنگ کا

لباس پہنا ہوا تھا۔ یعنی وہ میرے بارے میں معلوم کر رہا تھا۔" شانزہ تشویش زدہ لہجے میں بولی۔ لہجہ دھیما ہی تھا۔ "یہاں پاپا نے اس نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے کیمرے کی ریکارڈنگ بھی نکلوائی تھی۔"

"اوہ پھر۔" میں بھی تشویش زدہ ہوا۔ "کیا اس نے ریکارڈنگ میں تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا ہے؟"

"اسے تم اتفاق ہی سمجھ لو کہ...... اس وقت ہوٹل کا کیمرا خراب تھا اور مکینک اسے درست کر رہا تھا۔" شانزہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "اس لیے بال بال بچی ہوں۔ شانی بھائی کے بقول، وہ لڑکی کے بارے میں پتا چلتے ہی اسے اٹھوا لیتا اور تمہیں بلیک میل کر کے کسی جگہ بلاتا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے اس کی باتیں سنی ہیں۔"

میں نے بھی دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے طویل سانس اپنے اندر انڈیلی۔ واقعی یہ اتفاق ہی تھا اور ایسے اتفاق، اتفاقی طور پر ہی ہوتے ہیں۔

"چلو، اس کا پلان کامیاب نہیں ہوا۔" میں مسکرایا۔

"ہاں بالکل۔" وہ بولی۔ "لیکن تمہیں پہلے سے زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ میں بھی پاپا اور شانی بھیا کی ایکٹویٹی پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ اگر کوئی اہم بات معلوم ہوتی تو میں تمہیں آگاہ کر دوں گی۔"

اس کے بعد چند مزید باتیں ہوئیں اور پھر رابطہ منقطع ہوگیا تو میں نے سیل فون آف کر کے میز پر رکھا اور دوبارہ بستر پر دراز ہوگیا۔ شانی نے واقعی بہت تیزی سے کام کیا تھا۔ میرے خواب وخیال میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ ہوٹل سے ریکارڈنگ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہماری ریکارڈنگ ہوجاتی تو چودھری باسط اور شانی کا کیا ردعمل ہوتا۔ اپنی بیٹی کو میرے ساتھ دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو جاتے۔ میری وجہ سے چودھری باسط بہت بڑے نقصان سے دوچار ہوا تھا یعنی سیاست سے تاحیات نااہل ہو گیا تھا اور اس کی بیٹی میرے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ ایسے میں اگر چودھری باسط اور شانی اس پر دباؤ ڈالتے تو وہ باغی بھی ہوسکتی تھی کیونکہ وہ اپنے باپ اور بھائی کے سیاہ کرتوتوں سے واقف ہو چکی تھی۔ ایک عذرا تھی اسماعیل شاہد کی بیٹی...... وہ اپنے باپ کے سیاہ کرتوتوں سے واقف تو ہوئی تھی لیکن اس نے مانا نہیں تھا۔ ہاں اگر وہ اپنی آنکھوں سے جب باپ کے کرتوت دیکھے گی تو تب اسے یقین آ جائے گا۔ سوچتے سوچتے میں نیند کی وادی میں پہنچ

سہانے، دلفریب لمحوں سے مزین دسمبر کے شمارے کی ایک جھلک

اولین صفحات

سیاست کے میدان میں ہونے والے کمالات...... ایسی بساط جس کا ہر مہرہ اپنی چالیں کھیلنے کے لیے تیار تھا۔ **غلام قادر** کے قلم سے سیاسی چالیں......

انا گیر

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل فگار داستان...... **امجد جاوید** کے زورِ آور قلم کا امتحان......

الاؤ

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل...... زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جا رہی تھی...... **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

محبت اور نفرت کے کھیل میں خسارے اٹھانے والوں کا انجام۔ سرورق کی دلچسپ کہانی

دوسرا رنگ

ہواؤں کے شور میں گھر ہی نہیں انسان بھی بکھر جاتے ہیں۔ تند و تیز ہواؤں کی کارستانیاں

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

گیا۔

☆☆☆

میں ایک ہال نما کمرے میں دیوار کے ساتھ زنجیروں سے بندھا ہوا تھا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ میرے سر کے اوپر دیوار میں ایک بہت بڑا روشن دان تھا جس پر موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ہال کمرے میں اسماعیل شاہد، چودھری باسط اور شانی موجود تھے اور میری بے بسی و بے قراری پر زوردار انداز میں قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے قہقہے بازگشت بن کر ہال کمرے میں گونج رہے تھے۔ میں نفرت بھری نظروں سے ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُن کے قہقہے مجھے زہر لگ رہے تھے اور میرے اندر لاوا بھرتا جا رہا تھا۔ میں غصے کی شدت سے تینوں کی طرف بڑھنے لگتا لیکن میرے بازوؤں اور ٹانگوں کے گرد بندھی زنجیریں چھوٹی تھیں اس لیے میں ان تک نہیں پہنچ پاتا۔

''دیکھو دیکھو، یہ کتنا بے بس ہے آج۔'' چودھری باسط کی مکروہ آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

''خود کو بہت بڑا ہیرو سمجھتا ہے یہ۔'' اسماعیل شاہد نخوت سے بولا۔ ''لیکن آج میں اس کا سارا ہیروپن اس کی ناک کے راستے نکال دوں گا۔ مرنے کے بعد بھی یہ یاد رکھے گا کہ اس کا پالا کس سے پڑا تھا۔''

''انکل۔'' اس بار شانی بولا۔ ''میں نے بھی اس سے اپنے بدلے چکانے ہیں۔ پہلے مجھے موقع دیجیے گا۔''

''ہاں ہاں ضرور۔ پہلے تم اپنی بھڑاس نکال لینا۔'' اسماعیل شاہد نے جواباً کہا پھر وہ تینوں قہقہے لگانے لگے۔

میں دانت پر دانت جمائے ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ غصے کی شدت سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا اور میں دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

کمرے میں دو آدمی داخل ہوئے تھے جنہوں نے میری بہن روزینہ کو بازوؤں سے پکڑا ہوا تھا۔ وہ زندہ لاش کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں مکروہ چہروں والے آدمی اسے میرے سامنے لے آئے اور میں سکتے کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

روزینہ کی حالت بھی بے حد خستہ تھی۔ کپڑے میلے کچیلے اور شکن آلود، سر کے بال بکھرے ہوئے، ہونٹ پپڑی زدہ، چہرہ بے رونق، آنکھوں کے گرد حلقے، ننگے پیر۔

''رر..... رر..... روزینہ.....'' بمشکل میں اس کا نام پکار سکا۔

میری آواز سن کر روزینہ نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہ چند لمحے گومگو کی کیفیت میں مجھے دیکھتی رہی شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی پھر جیسے وہ مجھے پہچان گئی۔

''بب..... بب..... بھیا۔'' اس کے منہ سے نکلا۔

اس کے لہجے میں بے پناہ کرب تھا جس نے میرے دل کو چیر دیا تھا۔ وہ تینوں خاموش کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے مکروہ چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ میں نے ایک قہر آلود نظر ان تینوں پر ڈالی پھر روزینہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ''بھیا..... بھیا..... مجھے بچا لو..... مجھے بچا لو..... بھیا۔ میں بہت اذیت میں ہوں۔ یہ لوگ..... یہ لوگ بہت غلیظ ہیں۔''

اس سے آگے وہ بول نہ پائی اور شدت سے رونے لگی۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس وقت بپھرے شیر کی طرح دھاڑا تھا۔

''مت رو میری بہن۔ صبر کرو۔'' میں نے اسے دلاسا دینا چاہا۔ ''میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں لے جاؤں گا۔''

میں نے دیکھا، روزینہ کی آنکھوں میں اُمید کی کرن چمک اٹھی تھی۔

''کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں۔ آپ مجھے یہاں سے لے جائیں گے۔ آپ مجھے بچا لیں گے نا۔'' وہ اُمید بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی اور میں اثبات میں گردن ہلا رہا تھا۔

دفعتاً اسماعیل شاہد کی آواز گونجی۔ ''لے جاؤ اس لڑکی کو۔''

دونوں مکروہ چہرے والے آدمیوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور روزینہ کو گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگے۔

روزینہ خوف کی شدت سے چلّا رہی تھی اور میں بے بسی و کرب میں مبتلا پُرنم آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی، مچل رہی تھی اور اُن مکروہ چہروں والے آدمیوں کی گرفت سے خود کو چھڑانے کی ازحد کوشش کر رہی تھی لیکن وہ کمزور و ناتواں تھی اور وہ دونوں آدمی ہٹے کٹے اور مشٹنڈے تھے۔ اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی تھی اور وہ بہ دستور اسے گھسیٹتے ہوئے لے کر جا رہے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے، لمحہ بہ لمحہ میری نظروں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ مجھے پکار بھی رہی تھی۔

''بھیا..... بھیا.....''

''چھوڑ دو میری بہن کو۔ چھوڑ دو۔'' میں پوری شدت سے چلّایا۔ میری آواز بازگشت بن کر کمرے میں گونج اٹھی لیکن وہ دونوں آدمی اسے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔

''بھیا..... بھیا..... مجھے بچالو۔ بھیا۔'' وہ سسکتی ہوئی مجھ سے مدد طلب کررہی تھی اور میں بے بس تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ نہ صرف میری نظروں سے غائب ہوگئی بلکہ اس کی چیخ وپکار معدوم ہوگئی۔

''روزینہ! میں تمہیں بچالوں گا۔ میں تمہیں گھر لے جاؤں گا۔'' میں چیخا لیکن وہ وہاں سے جا چکی تھی۔ اب ہال کمرے میں میرے علاوہ وہ تینوں روسیاہی انسان موجود تھے۔ میں قہرناک نظروں سے ان تینوں کو دیکھنے لگا۔ میری آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے۔ یہاں تک کہ میرے وجود میں بھی انگارے بھر گئے تھے۔

''تم تینوں میرے ہی ہاتھوں مروگے۔ میں تم سب کو اذیت ناک موت ماروں گا۔'' میں نے قہرناک لہجے میں چلّاتے ہوئے کہا۔

میری اپنی آواز نے مجھے بیدار کردیا، میری آنکھ کھل گئی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میری آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور سانسیں دھونکنی کی مانند تیز تیز چل رہی تھیں۔ میں حواسوں میں بھی نہیں تھا۔ چند لمحوں کے بعد جب میرے حواس نارمل ہوگئے تو میں نے نائٹ بلب کی روشنی میں قرب وجوار کا جائزہ لیا۔ میں اپنے کمرے میں بستر پر موجود تھا۔ لحاف میری ٹانگوں پر موجود تھا۔ میرا چہرہ عرق آلود ہورہا تھا اور میری سانسیں بہ دستور تیز تیز چل رہی تھیں۔ وہ حقیقت نہیں، خواب تھا۔ میں نے سیل فون اٹھا کر اس پر ٹائم دیکھا تو اس وقت صبح کے چار بج کر چونتیس منٹ ہو رہے تھے۔ یعنی فجر کی اذانیں ہونے والی تھیں۔

سیل فون سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر میں کچھ دیر اسی حالت میں بستر پر بیٹھا رہا۔ ایک گلاس پانی پینے کے بعد میں دوبارہ لحاف اوڑھ کر بستر پر لیٹ گیا لیکن اب نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہوگئی تھی۔ اِس خواب پر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میری بہن مصیبت میں ہے۔ اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔

میری بے چینی اور بے قراری از حد بڑھ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ فجر کی اذانیں شروع ہوگئیں۔ میں چند لمحے بستر پر لیٹا رہا پھر اٹھ کر باہر آگیا۔ مرینہ بھی جاگ چکی تھی اور وضو کرکے اپنے کمرے میں جارہی تھی۔ میں بھی وضو کرکے مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ ماموں اسلم وحید مجھ سے پہلے ہی مسجد میں چلے گئے تھے۔ ان کی عادت تھی، فجر کی اذان ہوتے ہی وہ مسجد میں چلے جاتے تھے۔ باقی نمازوں کے وقت بھی ان کی یہی روٹین تھی۔ وہ کوئی نماز قضا نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا چہرہ پُرنور تھا۔

فجر کی نماز ادا کرکے میں اور ماموں اسلم اکٹھے ہی گھر آئے تھے۔ مرینہ اور ممانی نماز ادا کرکے قرآن پاک کی تلاوت کررہی تھیں جبکہ امی تسبیح میں مشغول تھیں۔ اُن کی حالت روز بہ روز بہتر ہوتی جارہی تھی۔ انہوں نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا لیکن روزینہ کا غم انہوں نے خود پر مسلط کیا ہوا تھا۔ ماموں جان میرے ساتھ میرے کمرے میں ہی آ گئے۔

''برخوردار! کیا بنا ویزے کا؟'' کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''بس آنے والا ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''ہمم۔'' انہوں نے ہنکاری بھری۔ ''اچھا، میں جلال پور پیر والا جارہا ہوں۔ شام تک واپس آجاؤں گا۔''

میں چونکا۔ ''خیریت تو ہے ماموں؟''

''پتا نہیں پتر۔'' وہ بولے۔ ''رئیس کو تو جانتے ہی ہو۔ اس کی کسی سے لڑائی ہوگئی ہے۔ اسی سلسلے میں جارہا ہوں۔ میں رئیس کے سنگت سے بے حد پریشان ہوں۔ کئی بار اُسے سمجھایا ہے لیکن وہ بندے کا پتر بنتا ہی نہیں۔''

میں خاموش رہا کیونکہ میں رئیس کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ تھا تو میرا کزن لیکن اس کا اٹھنا بیٹھنا اچھے لوگوں میں نہیں تھا۔ بہرکیف، میں نے صرف اتنا کہا۔ ''ٹھیک ہے ماموں۔''

ماموں اٹھ کر چلے گئے۔ ناشتا ہم نے اکٹھے ہی کیا تھا پھر ماموں جلال پور پیر والا کے لیے روانہ ہوگئے۔ میں بھی گھر سے نکل کر حیدر الماس کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ گھر پر ہی تھے۔ بابر عرف جوکر بھی وہیں موجود تھا۔ وہ چائے بنا کر لایا اور ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے پینے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرنے لگے۔

''میں نے آج تمہیں فون کرنا تھا۔'' حیدر الماس نے چائے کا سپ لینے کے بعد کہا۔ وہ اچھے موڈ میں دکھائی دے رہے تھے۔

''کیا ویزا آگیا ہے؟'' میں نے اندازہ لگاتے

ہوئے کہا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ بابر عرف جوکر بھی مسکرا رہا تھا۔

''ہاں۔'' حیدر الماس بولے تو میری آنکھیں چمک اٹھیں۔

''ویزا کب آیا تھا؟''

''کل شام کو۔'' وہ بولے۔

''چلو، یہ تو اچھا ہوگیا ہے۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''امریکا کس روز روانہ ہونا ہے؟''

''ڈیڑھ ہفتے بعد۔'' وہ بولے۔ ''تم دونوں کی ٹکٹیں بک ہوگئی ہیں۔ سولہ تاریخ کو تم دونوں کی روانگی ہے۔''

''سولہ تاریخ۔'' میں نے زیرلب دہرایا۔ آج چار تاریخ تھی اور سولہ تاریخ آنے میں ابھی گیارہ روز پڑے تھے۔ بارہویں روز ہماری روانگی تھی۔

''امریکا کا ویزا ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' حیدر الماس کہہ رہے تھے۔ ''لیکن میں نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے ویزے منگوائے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اور سناؤ، آج کل کیا ہو رہا ہے؟'' میری بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ بابر نے مجھے مخاطب کیا۔

''کچھ خاص نہیں، میرا زیادہ وقت گھر پر ہی گزرتا ہے... بلکہ تین چار روز سے تو میں اپنے گھر میں ہی محصور تھا۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا تو حیدر الماس چونک پڑے۔

''کیوں، کیا کوئی بات ہوئی ہے؟'' حیدر الماس بولے۔

''جی انکل۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ چودھری باسط نے اپنی نااہلی والے روز مجھے فون کر کے دھمکیاں دی تھیں۔ وہ اور اس کا بیٹا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔'' میں نے بلاتمہید ساری باتیں حیدر الماس کو بتا دیں۔ یہاں تک کہ کل ہوٹل میں ہونے والی شانی کی کارروائی بھی ان کے گوش گزار کر دی۔

''ارے واہ۔ باپ اور بیٹا تمہاری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور تم چودھری باسط کی بیٹی سے عشق کی پینگیں لڑا رہے ہو۔'' جوکر نے تمسخرانہ لہجے میں کہا تو میں جھینپ سا گیا۔

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے صراحت سے کہا۔

''تو پھر کیسی بات ہے؟'' بابر عرف جوکر بھی ڈھیٹ تھا۔ میرے منہ سے کچھ اگلوانا چاہتا تھا۔ ''تم تین چار روز سے گھر میں محصور تھے لیکن جب محبوبہ نے کال کر کے بلایا تو بھاگم بھاگ اس سے ملنے چلے گئے۔ یہ بھی پروا نہیں کی کہ اس کا بھائی تمہیں تلاش کر رہا ہے۔ واہ بھئی واہ۔ عشق ہو تو ایسا۔ کاش میری بھی کوئی محبوبہ ہوتی۔'' آخر میں اس نے ٹھنڈا سانس لیا تھا۔ میں نے حیدر الماس کی طرف دیکھا تو وہ مصنوعی خفگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''محبوبہ؟'' میں نے زیرلب دہرایا۔

''ہاں۔ کیا وہ تمہاری محبوبہ نہیں ہے؟'' بابر نے آنکھیں سکیڑیں۔

''وہ تو..... صرف میری دوست ہے۔'' میں نے دوست پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''دوست..... میں کیسے مان لوں؟'' وہ جرح کرنے کے موڈ میں تھا۔ ''کہ وہ صرف تمہاری دوست ہی ہے۔'' اس کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ بھی دوڑ رہی تھی۔

''تو نہ مانو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''ہم اچھے دوست ہی ہیں۔''

''بابر۔ کیوں علی کو تنگ کر رہے ہو؟'' دفعتاً حیدر الماس نے مصنوعی غصے سے اسے ڈپٹا۔ ''تمہیں اس سے کیا لینا دینا کہ وہ علی کی دوست ہے یا کچھ اور.....''

''انکل! میں تو اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پوچھ رہا تھا۔'' بابر نے کھسیانے لہجے میں کہا۔

''معلومات۔'' حیدر الماس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات بکھر گئے۔ ''حد ہوگئی ہے۔ اب تم لڑکیوں کے بارے میں معلومات رکھو گے۔''

میں بھی مسکرا دیا تھا۔ بابر نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ..... میں تمہیں بعد میں دیکھ لوں گا۔ میں نے سر جھٹکا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا انکل۔ اب مجھے اجازت دیں۔''

''کچھ دیر اور رک جاتے۔'' حیدر الماس بھی اٹھتے ہوئے بولے۔

''نہیں انکل۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''ماموں جلال پور پیر والا چلے گئے ہیں۔ ان کی واپسی شام کو ہوگی۔ گھر میں تین خواتین اکیلی ہیں اس لیے اب مجھے جانا ہوگا۔''

حیدر الماس اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔
''ٹھیک ہے۔ پھر تم جاؤ۔'' آخر میں وہ مجھے ''احتیاط سے جانا'' کہنا نہ بھولے۔

جب میں دونوں سے مصافحہ کر کے روانہ ہوا تو اس وقت دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ یعنی میں ان کے پاس دو گھنٹے بیٹھا رہا تھا۔

کچہری چوک پر پہنچ کر میں چونگی کی طرف جانے کی بجائے گھنٹا گھر کی طرف بڑھ گیا۔ گو گھر جانے کے لیے مجھے اس طرف سے لمبا راستہ پڑتا تھا لیکن میں نے اس طرف سے جانے کو ترجیح دی تھی۔ اس روڈ پر وومن کالج کے علاوہ بے تحاشا موبائل مارکیٹیں تھیں۔ وہاں دن گیارہ بجے سے لے کر رات دس بجے تک موبائل خریدنے اور فروخت کرنے والوں کا جم غفیر لگا رہتا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میری نظر ایک فرنیچر شاپ سے نکلتے ہوئے اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد پر پڑی تو میں نے بے اختیار موٹر بائیک کا بریک پیڈل دبا دیا۔ بائیک ایک جھٹکے سے رک گئی۔ یہ تو اچھا ہوا تھا کہ میرے عقب میں کوئی سواری نہیں تھی ورنہ وہ میری بائیک سے ٹکرا جاتی۔

اسماعیل شاہد اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی اور بیٹی عذرا بھی تھی۔ میں اس کی بیوی کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔ شکل وصورت اور چال ڈھال سے وہ گھریلو خاتون دکھائی دے رہی تھی۔ عذرا شکل وصورت سے اپنی ماں پر گئی تھی۔ وہ تینوں فرنیچر شاپ سے نکل کر اپنی کار کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ اسماعیل شاہد کو دیکھ کر میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے جیسے شعلے ناچنے لگے۔ دفعتاً لاہور کے فارم ہاؤس والا واقعہ میرے ذہن کے پردے پر ابھر آیا تھا۔ اس روسیاہ نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اگر وہاں شانزے اور اس کی سہیلی ماریہ بروقت نہ پہنچتیں تو شاید میں آگ میں جل کر دارِ فانی سے کوچ کر چکا ہوتا۔

میں نے غور کیا تو مجھے اسماعیل شاہد کی کار کے پیچھے دو موٹر بائیکس پر دو اشخاص دکھائی دیئے۔ انہوں نے کوریئر کمپنی والے ملازموں کے لباسوں کی طرح سیاہ رنگ کے لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ شرٹس کے اوپر جیکٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کے سروں پر ہیلمٹ تھے اور ہیلمٹوں کے شیشے اوپر تھے۔ پھر جیسے ہی اسماعیل شاہد کی کار حرکت میں آئی تو دونوں موٹر بائیکس سواروں نے ہیلمٹوں کے شیشے نیچے کیے اور اپنی موٹر بائیکس کار کے پیچھے دوڑانے لگے۔ میں نے بھی موٹر بائیک آگے بڑھا دی۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں موٹر بائیکس سوار اسماعیل شاہد کے ''باڈی گارڈز'' ہیں۔ اسماعیل شاہد نے خطرے کے پیشِ نظر انہیں اپنے ساتھ رکھا ہوگا۔ دونوں موٹر بائیکس، کار سے تقریباً سات آٹھ گز کے فاصلے پر موجود تھیں اور دونوں ہی ایک دوسرے سے تین، چار فٹ کے فاصلے پر موجود تھیں۔

میں نے گھر جانے کا ارادہ ترک کیا اور اسماعیل شاہد کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چہ جائیکہ اس میں خطرہ تھا لیکن میں خطروں کو مول لینے کا عادی ہو چکا تھا۔ اسماعیل شاہد نے مجھے یہ تو بتا دیا تھا کہ میری بہن روزینہ امریکا میں ہے لیکن اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے روزینہ کو امریکا میں کس کمپنی کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کا ٹھکانا دیکھنے کے لیے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

گو میں اس کا گھر جانتا تھا لیکن میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی تھی کہ جس طرح اس نے اپنی حفاظت کے لیے باڈی گارڈز رکھ لیے ہیں، ہو سکتا ہے اُس نے گھر بھی بدل لیا ہو۔ ایسے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ جس طرح یہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں بالکل اسی طرح یہ اپنے ٹھکانے بھی بدلتے رہتے ہیں۔

میں گردوپیش کا جائزہ لیتا ہوا اسماعیل شاہد کا تعاقب کر رہا تھا۔ میں نے موٹر بائیکس سے پچاس گز کا فاصلہ رکھا تھا تاکہ اسماعیل شاہد یا اس کے ''باڈی گارڈز'' میں سے کسی کو تعاقب کا شبہ نہ ہو۔ اس کی کار رشید آباد کی طرف دوڑنے لگی۔ باڈی گارڈز بھی اس کی پیروی کر رہے تھے۔ چوک سے ذرا آگے جا کر ایک کالونی میں داخل ہو گئی لیکن حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ دونوں باڈی گارڈز کار کے پیچھے جانے کی بجائے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہ میرے لیے پریشان کن بات تھی۔ میں تذبذب کا شکار ہو گیا تھا کہ باڈی گارڈز کار کے پیچھے جانے کی بجائے آگے کیوں بڑھ گئے تھے۔ کالونی کی نکڑ پر پہنچ کر میں نے موٹر بائیک روک دی اور سوچنے لگا کہ شاید اسماعیل شاہد کو اپنے تعاقب کا شبہ تو ہو گیا ہے اور وہ مجھے پھانسنے کے لیے کوئی چال چل رہا ہو۔

یہ میری غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی کہ دونوں موٹر بائیکس سوار اس کے باڈی گارڈز نہ ہوں اور اتفاقاً اسی راستے سے

اپنی منزل کی طرف جا رہے ہوں جدھر سے اسماعیل شاہد کی کار گئی تھی۔ میں نے تذبذب کے عالم میں اسماعیل شاہد کی کار کی طرف دیکھا جو کافی دور جا چکی تھی۔ اگر مجھے ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر ہوگئی تو پھر میں کار کو تلاش نہیں کر سکوں گا۔ دونوں موٹر بائیکس باڈی گارڈز بھی میری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

چنانچہ میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے اسماعیل شاہد کی کار کا تعاقب کرتے ہوئے اس کا ٹھکانہ دیکھنا چاہیے۔ یقیناً اس نے اپنا گھر تبدیل کر لیا ہے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ اب اسی کالونی میں رہائش پذیر ہے۔ میں نے موٹر بائیک کالونی کی گلی میں موڑی اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ چند لمحے پہلے کار میری نظروں کے سامنے تھی لیکن اب مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اسماعیل شاہد کی کاریوں غائب ہوگئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

میں نے کالونی کی مختلف گلیوں میں کار تلاش کی لیکن ہر بار مایوسی نے میرا استقبال کیا تھا۔ ایسا میری تذبذب کی کیفیت کی وجہ سے ہوا تھا۔ اُس کالونی میں بڑی بڑی کوٹھیوں کے علاوہ تین، پانچ، سات اور دس مرلے کے مکانات بھی تھے۔ وہ یقیناً کسی کوٹھی میں گیا تھا۔ یہ خدشہ بھی مدِنظر تھا کہ شاید وہ مجھے یہ تاثر دیتے ہوئے کہ وہ اسی کالونی میں رہائش پذیر ہے کسی کوٹھی میں جانے کی بجائے مجھے ''جُل'' دے کر نکل گیا ہو۔ بہرکیف، اب واپس جانے کے علاوہ میرے پاس اور کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے موٹر بائیک موڑ لی۔

ابھی میں نے چند گز کا فاصلہ ہی عبور کیا تھا کہ دفعتاً مجھے وہی موٹر بائیکس سوار آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میرے شک کی تصدیق ہوگئی تھی کہ اسماعیل شاہد اپنے تعاقب سے آگاہ ہوگیا تھا اور اس نے مجھے الجھانے کے لیے باڈی گارڈز کو آگے بھیج دیا تھا تاکہ جب میں ناکام و نامراد ہو کر واپس جانے لگوں تو وہ اچانک وہاں آ کر مجھے گھیر لیں۔ باڈی گارڈز کو دیکھ کر میرے دماغ میں خطرے کا الارم بجنا شروع ہوگیا تھا۔ باڈی گارڈز اپنے موٹر بائیکس دوڑاتے ہوئے میری سائیڈ کی طرف سے ہوتے ہوئے میری طرف ہی آ رہے تھے۔ میں اُن کا ارادہ سمجھ گیا تھا اس لیے میں نے چشم زدن میں موٹر بائیک موڑی اور بجلی کی سی تیزی سے اسے دوڑانے لگا۔ میں نے بیک مرر میں دیکھا تو دونوں بائیکس سوار بھی تیز رفتاری سے میرے پیچھے آ رہے تھے۔

چونکہ کالونی کی گلیاں کافی چوڑی تھیں اس لیے مجھے بائیک دوڑانے میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہو رہی تھی البتہ اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں کوئی بچہ یا کوئی اور اچانک سامنے نہ آ جائے۔ اس طرح ایکسیڈنٹ ہونے کا احتمال تھا۔ میں جدھر اور جس گلی میں موٹر بائیک موڑتا تو وہ دونوں موٹر بائیکس سوار بھی اسی طرف آ جاتے۔ وہ جونک کی طرح ہی میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور میں ان سے جلد از جلد پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ان میں سے کسی نے ہتھیار استعمال کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ بس مسلسل مجھے ''ہراساں'' کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی موقع دیکھ کر مجھ پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہوں اس لیے وہ خاموشی سے میرا تعاقب کر رہے تھے۔ بہرکیف، مختلف سوچیں میرے دماغ میں ہل چل مچا رہی تھیں۔

گلیوں میں اِکا دُکا ہی ذی نفس موجود تھے۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ روٹین کے مطابق کوئی آ رہا تھا تو کوئی جا رہا تھا۔ ایک اور گلی سے مڑتے ہی میں نسبتاً سنسان گلی میں آ گیا۔ وہ گلی آگے سے بند ہو رہی تھی اور سڑک کے دائیں بائیں چند زیرِتعمیر مکانات اور کوٹھیاں تھیں۔

''او.....شٹ۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

میرے لیے ''فرار'' کے راستے اب مسدود ہو گئے تھے۔ اب کوئی چارہ ہی نہیں تھا کہ میں ... موٹر بائیک موڑ کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کروں۔ میں نے یہ سوچ کر موٹر بائیک موڑی ہی تھی کہ تیرِ قسمت وہ دونوں موٹر بائیکس سوار بھی گلی میں آ گئے۔ انہوں نے موٹر بائیکس کھڑی کیں پھر انہوں نے ہیلمٹ اتار دیئے۔ شکل وصورت سے وہ چھٹے ہوئے بدمعاش ہی دکھائی دیتے تھے۔ ایک کی داڑھی مونچھیں تھیں جبکہ دوسرے کی صرف مونچھیں تھیں اور اس نے انہیں دونوں سائیڈوں سے موڑ رکھا تھا۔ میں نے بھی ہیلمٹ اتار کر موٹر بائیک کے سیف گارڈ پر لٹکا دیا۔

''اب تم بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟'' داڑھی والے نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

میں نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کک.....کک.....کون ہو تم لوگ۔ کیوں میرا پیچھا کر رہے تھے؟''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا

دیئے۔ مونچھوں والے آدمی نے داڑھی والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نذیر! وقت ضائع نہیں کرتے۔ ہمارے پاس اچھا موقع ہے۔ اسے گولی مار کر واپس چلتے ہیں۔''

''ہمم۔ میں اسے شوٹ کرتا ہوں۔'' داڑھی والے نے ہمکاری بھرتے ہوئے کہا اور موٹر بائیک سے اتر کر اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک ریوالور نکال کر اس کا رخ میری طرف کر دیا۔ مونچھوں والا آدمی بہ دستور موٹر بائیک پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اترنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں بہ دستور خوفزدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن میرے اندر ہل چل مچ چکی تھی۔ میں تہی دست تھا اور وہ دونوں مسلح۔ میں کسی صورت ان کو کراس کر کے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ موت سینہ تانے میرے سامنے کھڑی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ معلوم نہیں تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ کسی جاندار کو اپنی موت کے معین وقت کا معلوم نہیں ہے۔ موت اچانک آتی ہے اور جاندار ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دارِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔

دونوں کی باتوں اور انداز سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھے زندہ چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ داڑھی والا آہستہ آہستہ چلتا ہوا میری طرف آ رہا تھا اور پھر مجھ سے نو، دس فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا۔ اس نے ریوالور کا رخ بہ دستور میری طرف ہی کیا ہوا تھا۔ اس کے چہرے، آنکھوں میں سفاکی اور بے رحمی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ اسماعیل شاہد کا ساتھی تھا۔ اسی کے حکم پر ہی تو مجھے گولی مارنے لگا تھا ورنہ ہم ایک دوسرے کو کہاں جانتے تھے۔

اچانک میں نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا۔ اس کے چونکنے کی کیا وجہ تھی۔ میں سمجھ نہیں پایا تھا۔ تاہم اس نے آنکھیں چوڑی کر کے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''کیا تم..... حسن کامران کے بیٹے ہو؟''

اُس کے منہ سے اپنے والد کا نام سن کر اب چونکنے کی باری میری تھی۔ یقیناً وہ میرے والد صاحب کو جانتا تھا۔

''ہاں۔ میں حسن کامران کا بیٹا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہمم۔'' اُس نے ہمکاری بھرتے ہوئے ہونٹ بھینچے۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات پھیل چکے تھے لیکن اس نے ریوالور کا رخ ابھی تک میری طرف ہی کیا ہوا تھا۔

میں مستفسر ہوا۔ ''تم میرے والد صاحب کو کیسے جانتے ہو؟ اور مجھے بھی؟''

قبل از آنکہ وہ میری بات کا جواب دیتا، اس کے ساتھی مونچھوں والے نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ''نذیر! کیوں دیر کر رہے ہو۔ مارو اسے گولی اور نکل چلو۔''

''اچھا۔'' نذیر نے صرف اتنا ہی کہا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے والد اور میں ایک ہی فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ میرے بہترین دوست تھے۔ میں نے تمہیں ایک بار ان کے ساتھ دیکھا تھا اور ان سے پوچھا۔ تو انہوں نے بتایا تھا کہ..... یہ میرا بیٹا ہے..... اس لیے تمہیں دیکھتے ہی میں پہچان گیا۔''

یہ انکشاف میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ اسماعیل شاہد کا ایک ساتھی میرے والد صاحب کا شناسا اور دوست نکل آیا تھا۔ مجھے اُمید کی کرن دکھائی دینے لگی کہ وہ اب مجھے گولی نہیں مارے گا۔ یقیناً میرے والد صاحب سے دوستی کا لحاظ کرے گا۔ بالآخر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''سنو۔ میں رفیق کو باتوں میں الجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم موقع ملتے ہی یہاں سے فرار ہو جاؤ۔''

اس کا اشارہ اپنے ساتھی کی طرف تھا۔ اس کا نام رفیق تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ موٹر بائیک سے اتر کر نذیر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''وہ آ رہا ہے۔''

رفیق نے نذیر کے قریب پہنچتے ہی استفسار کیا۔ ''کیا بات ہے نذیر۔ تم نے اسے گولی کیوں نہیں ماری؟''

اچانک نذیر نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا اور چہرے پر اذیت بھرے تاثرات سجا لیے۔ اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے کراہیں نکلنے لگیں۔ وہ سڑک پر گرنے ہی لگا تھا کہ رفیق نے اسے تھام لیا۔ لمحہ بھر کے لیے میں بھی چونک گیا لیکن پھر مجھے نذیر کی بات یاد آ گئی۔ گویا وہ رفیق کو الجھانے کے لیے ایکٹنگ کر رہا تھا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے نذیر؟'' رفیق بوکھلا گیا۔

''میرے دل میں..... درد.....'' نذیر اتنا کہہ کر کراہا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور بھی نکل کر سڑک پر گر گیا تھا۔ وہ ایسی ایکٹنگ کر رہا تھا کہ حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔

اُس کی بات سن کر رفیق واقعی بوکھلا گیا تھا۔ وہ اسے سنبھالے ہوئے تھے۔ مجھے وہاں سے ''فرار'' ہونے کا موقع

مل گیا تھا۔ قبل از آنکہ رفیق میری طرف متوجہ ہوتا میں جلدی سے موٹر بائیک پر سوار ہوگیا۔ ایک ہی کک پر وہ اسٹارٹ ہوا تو رفیق موٹر بائیک کی آواز سن کر بے اختیار چونک کر میری طرف متوجہ ہوا لیکن اسے اب دیر ہوگئی تھی۔ میں نے چشم زدن میں گیئر لگایا اور ایک جھٹکے سے موٹر بائیک آگے بڑھا دی۔ چونکہ رفیق نے نذیر کو تھام رکھا تھا اس لیے وہ میرے پیچھے نہ آسکا اور میں وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

مین روڈ پر آتے ہی میں نے موٹر بائیک ایک سائیڈ پر روک دی۔ ہیلمٹ پہنا اور پھر موٹر بائیک آگے بڑھا دی۔ میں دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کررہا تھا کہ اس نے میری جان بچالی تھی۔ اگر نذیر میرے والد صاحب کا دوست نہ نکلتا تو شاید اب تک وہ مجھے دوسری دنیا میں پہنچا چکا ہوتا۔ بہرکیف، اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔

میں ابھی کالونی میں ہی موجود تھا کہ میں نے غیر ارادی طور پر بیک مرر میں دیکھا تو مجھے وہی دو موٹر بائیکس آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ایک موٹر بائیک آگے اور دوسری اس سے قدرے فاصلے پر موجود تھی۔ یقیناً آگے والی موٹر بائیک پر رفیق سوار ہوگا۔ شاید اسے ہمارے ڈرامے کی حقیقت پتا چل گئی ہوگی اس لیے وہ میرے پیچھے آرہا ہوگا۔ وہ واقعی اسماعیل شاہد کا وفادار اور جاں نثار باڈی گارڈ لگتا تھا۔ میں نے موٹر بائیک کی رفتار بڑھا دی اور جلد ہی میں چوک پر پہنچ گیا۔

چوک پر یہ دستور ٹریفک کا اژدھام تھا اور اس اژدھام میں، میں بھی گم ہوگیا۔ اب رفیق میری گرد کو بھی نہ پاسکتا تھا۔ ٹریفک کے اژدھام میں مجھے تلاش کرنا اس کے لیے ازحد مشکل تھا۔ میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ میں نے فلائی اوور سے جانے کی بجائے نیچے سے جانے کو ترجیح دی۔ یہ سیف راستہ تھا۔

میرا خیال یہی تھا کہ رفیق میرے پیچھے نہیں آئے گا اور نہ ہی مجھے تلاش کرپائے گا لیکن میں غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ عیدگاہ روڈ پر پہنچتے ہی میں نے غیر ارادی طور پر بیک مرر میں دیکھا تو مجھے رفیق دکھائی دیا۔ اُس نے نہ صرف مجھے دیکھ لیا تھا بلکہ وہ میرے تعاقب میں بھی آرہا تھا۔ اس کی موٹر بائیک کی اسپیڈ بے حد تیز تھی۔ میں نے بھی موٹر بائیک کی اسپیڈ بڑھا دی لیکن رش کے باعث مجھے وقفے وقفے سے اسپیڈ کم کرنی پڑتی۔ رفیق اب قدرے میرے قریب پہنچ چکا تھا۔

میں نے بیک مرر میں دیکھا ہی تھا کہ اچانک میں موٹر بائیک سمیت اچھل کر فٹ پاتھ کے قریب جا گرا۔ عین اسی لمحے ہی رفیق نے مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ ہلکی سی ''ٹھاہ'' کی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میری خوش بختی تھی کہ میری بائیک گڑھے سے ٹکرا گئی تھی جس کے باعث میں بے توازن ہوکر اچھل کر فٹ پاتھ پر گرا تھا اور گولی میرے قریب سے گزرتی ہوئی نامعلوم سمت میں غائب ہوگئی تھی۔ میں سڑک پر پھسلتا ہوا سر کے بل فٹ پاتھ سے ٹکرایا تھا۔ ہیلمٹ ہونے کی وجہ سے میرے سر پر کوئی چوٹ نہیں لگی تھی۔ ہیلمٹ کے واقعی بہت سے فوائد تھے جن میں سے سب سے اہم فائدہ دماغی چوٹ سے بچنا تھا۔

زن کی آواز کے ساتھ ہی رفیق کی بائیک میرے قریب سے گزری تھی۔ فٹ پاتھ سے ٹکرانے کے باعث مجھے کافی خراشیں آئی تھیں۔ لوگ بھی وہاں جمع ہوگئے تھے لیکن کوئی رفیق کے پیچھے نہیں گیا تھا کیونکہ اس کے پاس ریوالور تھا۔ اپنے تعاقب میں آنے والے کو بھی وہ گولی مار سکتا تھا۔ میری موٹر بائیک کا بھی کافی نقصان ہوگیا تھا۔ ہیڈ لائٹ اور بایاں اشارہ ٹوٹ گیا تھا جبکہ ٹنکی پچک گئی تھی۔ شکر یہ ہوا کہ ٹنکی لیک نہیں ہوئی تھی ورنہ گرم انجن میں آگ بھڑک سکتی تھی۔ چند لوگوں نے مجھے اٹھایا اور قریبی دکان میں کرسی پر بٹھا دیا۔ ایک آدمی فوراً ہی میرے لیے پانی لے آیا۔ تب تک میں نے ہیلمٹ اتار لیا تھا۔ کسی نے میری موٹر بائیک بھی ایک سائیڈ پر کھڑی کردی تھی۔ میں نے پانی پی کر گلاس واپس کیا تو اس آدمی نے کہا۔

''اللہ کا شکر ہے کہ تمہاری جان بچ گئی ہے۔ یہ جو تم نے ہیلمٹ پہنا ہوا ہے اسی کی وجہ سے تمہارا سر زمین سے نہیں ٹکرایا۔ ہم ضلعی انتظامیہ کو اس گڑھے کی مرمت کے حوالے سے متعدد درخواستیں دے چکے ہیں لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اِس گڑھے کی وجہ سے کئی ایکسیڈنٹ ہوچکے ہیں۔ کل شام کو بھی حادثہ ہوا تھا۔''

اس کی بات سن کر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ رفیق نے مجھ پر گولی چلائی تھی اور میں بچتے ہوئے گڑھے سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ میری بے دھیانی کی وجہ سے موٹر بائیک گڑھے سے ٹکرائی ہے۔ اصل میں رفیق کے ریوالور پر یقیناً سائیلنسر فٹ ہوگا اس لیے گولی چلنے کی آواز کسی کو سنائی نہیں دی۔ ویسے بھی اس روڈ پر گاڑیوں کا اتنا شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز بھی

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

سنائی نہیں دیتی۔

''اصل میں، میں بھی بے دھیانی سے موٹر بائیک چلا رہا تھا۔'' میں نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

''موٹر بائیک بہت خطرناک سواری ہے اس لیے اسے دھیان اور مکمل توجہ سے چلانا چاہیے۔ ہیلمٹ کا استعمال تو لازمی ہی کرنا چاہیے ورنہ ایکسیڈنٹ کی صورت میں زندگی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔'' اِس بار دکان دار نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ سب لوگ میرے اِردگرد ایسے کھڑے تھے جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں یا کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوں۔

''بیٹا! کدھر رہتے ہو؟'' ایک باریش بزرگ نے مجھ سے دریافت کیا۔

''گل گشت کالونی میں۔''

''کیا کام کرتے ہو؟''

''جی.....'' لمحہ بھر ٹھہر کر میں نے جواب دیا۔ ''ہوم ٹیوشنز پڑھاتا ہوں۔''

''ہمم۔'' میری موٹر بائیک کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔ ''بیٹا! تمہاری موٹر بائیک کی حالت تو خراب ہے۔ گھر کیسے جاؤ گے؟''

''جی، میں اسی پر چلا جاؤں گا۔''

''بیٹا! اگر کہو تو میرا بیٹا تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آئے؟''

''نہیں انکل۔ آپ کا بے حد شکریہ۔'' میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ پھر میں جانے لگا تو دکان دار نے نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔

''بیٹا! ٹیٹنس کا انجکشن ضرور لگوا لینا ورنہ جراثیم پھیل کر زخم خراب کر سکتے ہیں۔''

''جی بہتر۔'' میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ہیلمٹ پہننے کے بعد موٹر بائیک پر سوار ہو کر کِکیں مارنے لگا۔ تیسری ہی کِک پر موٹر بائیک کا انجن غرّا اٹھا۔ میں نے سب پر الوداعی نظر ڈالی اور پھر ہیلمٹ کا شیشہ نیچے گرا کر موٹر بائیک آگے بڑھا دی۔

گو خطرہ ابھی بھی تھا۔ رفیق کہیں بھی چھپا ہو سکتا تھا اور وہ دوبارہ مجھ پر گولی چلا سکتا تھا یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ پولیس اور لوگوں کے ڈر سے فرار ہو گیا ہو۔ بہرکیف، میں جان ہتھیلی پر رکھ کر موٹر بائیک آگے بڑھاتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے چونگی سے موٹر بائیک موڑی اور آگے بڑھاتا چلا گیا۔

رفیق واقعی فرار ہو گیا تھا۔ یہ میرے لیے اچھا ہی ہوا تھا۔ مزید بیس منٹ کے بعد میں گھر کی طرف مڑنے والی گلی میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک میڈیکل اسٹور بھی تھا۔ میں نے وہیں سے ٹیٹنس کا انجکشن لگوایا اور گھر آ گیا۔ ممانی اور مرینہ نے میری اور موٹر بائیک کی حالت دیکھی تو وہ پریشان ہو گئیں۔ امی اپنے کمرے میں تھیں۔

''یہ کیا ہوا ہے بیٹا؟'' ممانی جان نے فکرمندی سے پوچھا۔

''چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔'' میں نے جواباً تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''اوہ۔ کیسے؟''

میں نے صحن میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''ایک موٹر بائیک کے اوور ٹیک کرنے کی وجہ سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔''

''تمہیں زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟'' ممانی بہ دستور فکرمندی دکھائی دے رہی تھیں۔

''نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔''

ممانی سکون کا سانس لیتی ہوئیں بولیں۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہوا۔ آج کل کے نوجوان موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر نجانے خود کو کیا سمجھتے ہیں۔ ایسے ایسے خطرناک انداز میں موٹر سائیکلیں چلاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ میرا تو دل حلق میں آ جاتا ہے انہیں دیکھ کر۔''

''بھائی جان! کیا آپ نے ٹیٹنس کا انجکشن لگوایا ہے؟'' مرینہ نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس کے چہرے پر بھی سکون آ گیا۔

''آپ چینج کر لیں، میں ہلدی ملا دودھ لے آتی ہوں۔'' مرینہ نے کہا تو میں اثبات میں گردن ہلا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ممانی امی کے کمرے میں چلی گئیں۔

میں نے کپڑے چینج کیے اور ہلدی ملا دودھ پینے کے بعد میں اپنے بازو پر موجود خراشوں کا جائزہ لینے لگا۔ مرینہ وہیں بیٹھی تھی۔ آج دوسری بار میں موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا۔ اگر رفیق کا نشانہ نہ چوکتا تو گولی نے میرا دماغ چاٹ لینا تھا۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا۔ اللہ نے مجھے بچانا تھا سو میں بچ گیا تھا۔

''بھائی جان! کیا واقعی یہ ایکسیڈنٹ تھا یا.....'' مرینہ نے جانچتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں الٹا اس سے سوال کیا۔

''مجھے لگتا ہے آپ کی شانی یا اس کے ساتھیوں سے مڈبھیڑ ہوگئی ہوگی اور.....''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''نہیں۔ آج شانی کے ساتھیوں سے نہیں..... اسماعیل شاہد کے ساتھیوں سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔''

''اوہ۔'' مرینہ کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا۔

''کیسے؟''

میں نے مختصراً اسے ساری بات بتا دی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوتا جا رہا تھا۔ میں اپنی چھوٹی بہن کو ساری باتیں بتا دیا کرتا تھا۔ کوئی بات اس سے نہیں چھپاتا تھا کیونکہ وہ مجھے ''ہیرو'' سمجھتی تھی۔ میں دشمنوں سے برسرِ پیکار تھا اور خود کو بچانا میرا حق تھا۔ میں اسے جو بھی بات بتاتا تھا وہ آگے کسی کو نہیں بتاتی تھی۔ اس کی یہی خوبی بہت اچھی تھی۔ میں نے اسے جب یہ بتایا کہ میرا امریکا کا ویزا آ گیا ہے تو وہ خوش ہونے کی بجائے اداس ہو گئی۔ ظاہر ہے بہن جو تھی۔ اس سے بھائی کی جدائی برداشت کرنا مشکل ہو رہی تھی۔ میں اس کی اداسی کا سبب سمجھتا تھا لیکن میں مجبور تھا۔ اپنی دوسری بہن کو تلاش کرنے کے لیے مجھے امریکا جانا تھا۔ اسے واپس لاؤں گا تب ہی ہمیں سکون نصیب ہوگا۔

''آپ کب جا رہے ہیں؟'' اس کے لہجے میں بھی اداسی گھلی تھی۔

''ڈیڑھ ہفتے بعد۔''

اُس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

شام تک ماموں بھی جلال پور پیر والا سے واپس آ گئے۔ انہیں جب میرے ''ایکسیڈنٹ'' کی خبر ملی تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ وہ بھی آج کے نوجوانوں کو کوسنے لگے جن کی غیر ذمے داری اور بے احتیاطی کی وجہ سے کئی لوگ موت کے منہ میں جاتے جاتے بچتے تھے۔ میں اور ماموں اُس وقت کمرے میں موجود تھے۔ ممانی جان اور مرینہ رات کا کھانا تیار کرنے میں مصروف تھیں۔

میں نے ماموں جان کو بھی ویزے کی بابت بتا دیا۔ انہوں نے بھی مجھے کامیاب ہونے کی دعائیں دیں اور ایک بار پھر تسلی دی کہ میں امی اور بہن کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں۔ باتوں کے دوران ہی انہوں نے بتایا۔

''تمہارا چھوٹا ماموں ذیشان وحید پاکستان آ رہا ہے۔''

''کب؟'' میں مستفسر ہوا۔

''اگلے ہفتے۔'' وہ بولے۔ ''وہ یہاں بھی آئے گا۔ میری اس سے بات ہوگئی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ اس کے بعد ہم روٹین کی باتیں کرتے رہے۔ مرینہ کھانے کی اطلاع دینے آئی تو ہم اٹھ کر برآمدے میں چلے گئے جہاں امی اور ممانی بھی موجود تھیں۔ ہم سب کھانے میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

شانی اور اس کے ساتھی مجھے مسلسل تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ شہر کا کونا کونا چھان رہے تھے۔ میرے نہ ملنے پر ان کی حالت خارش زدہ کتوں کی طرح ہو رہی تھی۔ اگلے روز میری شانزے سے بات ہوئی تو اس نے اس بارے میں مجھے بتایا۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ گزشتہ رات اسماعیل شاہد بھی ان کے گھر آیا تھا۔ اور انتہائی غصے میں تھا۔ وہ، اس کا باپ چودھری باسط اور شانی ایک کمرے میں کافی دیر تک ''خفیہ میٹنگ'' کرتے رہے تھے۔ شانزے کے مطابق اسے خفیہ میٹنگ میں ہونے والی باتوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد اسماعیل شاہد چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد چودھری باسط بھی اسلام آباد چلا گیا تھا۔ وہ اپنی نااہلی کے خلاف عدالت میں اپیل دائر کر رہا تھا۔ اس بارے میں گزشتہ رات میڈیا پر بھی نیوز چلی تھی جو میری نظروں کے سامنے سے گزری تھی۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ عدالت اس کی نااہلی کی اپیل منظور کرتی ہے یا نہیں۔

میں نے اس کی بات ختم ہونے کے بعد جب اسے ویزے کی بابت بتایا تو وہ خوش بھی ہوئی اور اداس بھی۔

''اپنا خیال رکھنا علی۔'' اس کے لہجے میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔ ''میری دعا ہے کہ تمہاری بہن جلد از جلد تمہیں مل جائے اور تم واپس آ جاؤ۔''

''آمین۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''اور تم بھی اپنا خیال رکھنا۔ ویسے کتنے مزے کی بات ہوگی، میں امریکا میں ہوں گا اور تمہارا بھائی مجھے یہاں تلاش کرتا پھر رہا ہوگا۔''

وہ بھی ہنس دی۔ پھر بولی۔ ''ہاں بالکل۔ اچھا یہ بتاؤ، تم نے بتایا تھا کہ انکل اسماعیل شاہد نے روزینہ کو امریکا میں کسی کمپنی کو فروخت کیا ہے۔ کیا تمہیں پتا چلا کہ انکل نے روزینہ کو کس کمپنی کو فروخت کیا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں کہا۔

''پھر کہاں تلاش کرو گے اسے؟'' اس نے بھی وہی سوال کیا جو حیدر الماس پہلے کر چکے تھے۔ ''اس طرح تو تمہیں مشکل ہوگی۔''

''اللہ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر دے گا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس اپنے اندر انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے کہ..... امریکا، برطانیہ اور روس پورنوگرافی کے گڑھ ہیں۔ کسی نہ کسی کمپنی کے ذریعے معلوم ہو ہی جائے گا۔''

گو میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں بتایا تھا تاہم یہ بتاتے ہوئے میری کیفیت میں رنج و الم کا عنصر بھی شامل تھا۔

''ہمم۔'' شانزے نے ہمکاری بھری۔ ''کاش، انکل اسماعیل شاہد بتا دیتے تو روزینہ کو تلاش کرنے میں تمہیں آسانی ہو جاتی۔''

''صحیح کہہ رہی ہو۔'' میں نے ٹھنڈی سانس اپنے اندر انڈیلی۔

''اگر کہو تو..... میں کوشش کروں؟ شاید مجھے پتا چل جائے۔'' شانزے نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو میں ٹھٹکا۔

''تم کیسے معلوم کرو گی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''میرے ذہن میں ایک پلان آیا ہے۔'' شانزے یکدم پُرجوش آواز میں بولی۔

''کیسا پلان؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''سنو، مجھے یقین ہے کہ انکل اسماعیل جن لڑکیوں کو فروخت کرتے ہیں وہ یقیناً ان کا ریکارڈ بھی اپنے پاس رکھتے ہوں گے کہ کس لڑکی کو کس کمپنی اور کس تاریخ کو فروخت کیا ہے۔ میں عذرا سے ملنے کے بہانے اُن کے گھر جاتی ہوں اور موقع ملتے ہی انکل اسماعیل کے کمرے کی تلاشی لے لیتی ہوں۔ ہوسکتا ہے، شاید کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو تمہارے کام آسکے۔ کیا کہتے ہو؟'' شانزے نے اپنے پلان کے بارے میں بتانے کے بعد میری رائے دریافت کی تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''پلان تو اچھا ہے۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں جواباً کہا۔ ''لیکن..... اس میں خطرہ بہت زیادہ ہے۔''

''جانتی ہوں۔'' شانزے بولی۔ ''لیکن میں ایسا کروں گی۔ شاید کوئی کام کی دستاویز مل جائے۔ جس سے تمہارے لیے آسانی پیدا ہو جائے۔''

''ہمم۔ اگر عذرا کو شک پڑ گیا تو.....؟'' میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ''وہ..... تم سے ناراض ہو جائے گی۔ کیا تم اس کی ناراضی برداشت کر لو گی؟''

''ہو جائے۔'' شانزے کے لہجے میں بے پروائی شامل تھی۔ ''تمہاری خاطر میں آگ کے دریا میں کود جاؤں گی۔''

اُس کی بات نے میرے دل کی دھڑکن یکبارگی بڑھا دی۔ دل میں لطیف سے جذبات سر ابھار کر گدگدی کرنے لگے۔ شانزے کا یہ والہانہ پن مجھے سرتاپا سرشار کر گیا۔

''ایسا مت کرنا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اگر تم آگ کے دریا میں کود گئی تو میں کیا کروں گا؟''

میری بات پر وہ مترنم ہنسی ہنس دی پھر صراحت سے بولی۔ ''پاگل! میں نے محاورتاً کہا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ اگر مجھے تمہاری خاطر کچھ بھی کرنا پڑا تو میں کرنے سے گریز نہیں کروں گی۔ اسے تم میرا جذباتی پن سمجھ لو اور..... محبت بھی۔''

میرا دل یکبارگی پھر دھڑکا۔ سرشار سی کیفیت نے مجھے دوبارہ گھیر لیا۔ لمحہ بھر ٹھہرنے کے بعد شانزے دوبارہ بولی۔ ''میں ایک نیک مقصد کے لیے کام کر رہی ہوں۔ عذرا کا باپ کون سا پارسا انسان ہے۔ انکل اسماعیل، میرا باپ اور شانی بھائی تینوں ہی گینگسٹر ہیں اور معاشرے پر سیاہ کلنک۔ میں سوچتی ہوں کہ یہ روسیا ہی انسان دوسروں کی بہن، بیٹیوں کو فروخت کرنے سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ان کی بھی بیٹیاں ہیں۔ اگر ہمیں اغوا کر کے کوئی فروخت کر دے تو ان کے دل پر کیا گزرے گی لیکن میرا خیال ہے ان کے سینوں میں دل نہیں پتھر ہیں۔ ان کے دل بھی ان کے چہروں کی طرح سیاہ ہیں ان کو اپنی بہن، بیٹیاں عزیز ہیں لیکن دوسروں کی نہیں۔ علی، کتنے ظالم، سفّاک اور سنگدل لوگ ہیں یہ۔''

شانزے کا لہجہ انتہائی جذباتی تھا۔ وہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی۔

''اللہ کی پکڑ بہت سخت ہے شانزے۔'' میں نے طمانیت سے کہا۔ ''جس روز یہ اللہ کی پکڑ میں آئیں گے تو

پھر انہیں چھڑانے والا کوئی نہیں ہوگا۔''

''ان شاء اللہ، یہ اللہ کی پکڑ میں ضرور آئیں گے۔'' شانزے نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

''عذرا کے گھر کب جاؤ گی؟''

''آج، تھوڑی دیر تک۔''

''ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ محتاط رہنا۔ اگر اسماعیل شاہد کو ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو وہ تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔'' میں نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم بے فکر رہو۔'' شانزے پُرجوش انداز میں بولی۔ ''میں محتاط ہو کر کام کروں گی۔''

''اچھا یہ بتاؤ، کیا اسماعیل شاہد رادی کالونی والی کوٹھی میں رہتا ہے؟'' میں نے یاد آنے پر پوچھا۔

''ہاں۔ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ویسے ہی۔''

''کہیں دوبارہ تو عذرا کو اغوا کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟''

''ارے نہیں، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ پہلے ہی میں اس کے اغوا کے جرم میں ضمانت پر ہوں۔'' میں ہنس کر بولا۔

''تو یہ کیس کب ختم ہوگا؟''

''جب عذرا عدالت میں پیش ہو کر سچ بتا دے گی۔'' میں نے کہا۔

''ہمم۔'' اس نے سنجیدگی سے ہنکاری بھری۔ ''اگر وہ عدالت میں پیش نہ ہوئی تو.....''

''تو.....'' میں نے لمحہ بھر کو سوچا اور جواباً بولا۔ ''انکل حیدر کے جاننے والے ایک وکیل اس کیس کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔''

''اچھا، میں فون رکھ رہی ہوں۔ شانی آ گیا ہے۔ میں عذرا کی طرف جانے کے لیے نکلتی ہوں۔ اپنا خیال رکھنا ملی۔ اللہ حافظ۔''

میں نے بھی اللہ حافظ کہا تو شانزے نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے سیل فون میز پر رکھا اور شانزے کے پلان پر غور کرنے لگا۔ شانزے کا پلان اچھا تھا لیکن اس میں خطرے کا چانس زیادہ تھا۔ اگر اس کے ہاتھ کوئی ایسی دستاویز لگی جو میرے لیے کارآمد ہو سکی تو میرے لیے امریکا میں اپنی بہن کو تلاش کرنے میں آسانی ہو جائے گی لیکن یہ تو اس کی کامیابی پر منحصر تھا۔ ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ شانزے اپنے ''مشن'' میں کامیاب ہو گی یا اسے ایسی کوئی دستاویز ملے گی جس سے اسماعیل شاہد گینگسٹر ثابت ہو سکے۔ جس طرح وہ نیوٹرل ہو کر کام کر رہا تھا یقیناً اس نے گھر میں بھی ایسی کوئی دستاویز نہیں رکھی ہوگی۔ وہ بھلا کیسے چاہے گا کہ وہ اپنی فیملی میں بدنام ہو۔ بہرکیف، اب یہ شانزے پر ہی منحصر تھا کہ وہ اپنے ''مشن'' میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔

دوسرے روز شام کو ہی شانزے کی کال آ گئی۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔ ''کیا بنا تمہارے مشن کا؟''

''کچھ خاص نہیں۔'' وہ مایوس لہجے میں بولی۔ ''میں نے انکل کا سارا کمرا چھان مارا تھا لیکن ایسی کوئی دستاویز یا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے روزینہ کے بارے میں کچھ پتا چل سکتا۔''

''مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔'' میں نے سر کرسی کی پشت سے ٹکایا۔

''کس بارے میں؟'' اس کی چونکتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''یہی کہ..... اسماعیل شاہد اپنے گھر میں ایسی کوئی دستاویز نہیں چھوڑے گا جس سے وہ گینگسٹر ثابت ہو۔'' میں نے صراحت بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہارا اندازہ درست تھا علی۔ انکل کے کمرے کی الماری خالی تھی۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''پھر جب میں نے میز کی دراز میں چیک کیں تو مجھے ایک دراز سے ایک چٹ ملی ہے جس پر امریکن کوڈ کا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔''

''امریکن کوڈ کا فون نمبر؟'' میں چونکا۔

''ہاں۔'' شانزے بولی۔ ''مجھے لگتا ہے یہ نمبر یقیناً پورنوگرافک کمپنی کے کسی فرد کا ہے۔ شاید یہ نمبر روزینہ کی تلاش میں مدد دے۔''

میرے دل میں اُمید کی کرن پھوٹی۔ ''اوہ۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ تم وہ نمبر مجھے سینڈ کر دو۔''

''میں سینڈ کرتی ہوں۔'' شانزے نے کہا اور پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس نے ایک نمبر سینڈ کر دیا۔ میں نے غور سے وہ نمبر دیکھا۔ واقعی وہ امریکی فون نمبر تھا۔ شانزے اپنے مشن میں پچاس فیصد کامیاب رہی تھی۔ اِس نمبر کی اسماعیل شاید کی میز کی دراز میں موجودگی سے یہی لگتا تھا کہ یہ نمبر پورنوگرافک کمپنی کے لیے کام کرنے والے کسی فرد کا ہے اور امریکا پہنچ کر یہ میرے کام آ سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے میں اس نمبر کے سبب روزینہ کو

تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ بہرکیف، میں نے وہ نمبر اپنے سیل فون میں سیو کیا اور حیدر الماس کو کال کرنے لگا۔ میں اِس نمبر کی بابت انہیں بتانا چاہتا تھا لیکن وہ میری کال اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔

میں نے یہ سوچ کر دوبارہ کال نہیں کی کہ شاید وہ کسی کام میں بزی ہوں گے۔ جب وہ فری ہو کر میرا نام دیکھیں گے تو وہ کال بیک کر لیں گے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ حیدر الماس کی کال آ گئی۔

''ہیلو انکل حیدر۔'' میں نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''کیسے ہو بیٹے؟'' دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز سن کر میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ آواز حیدر الماس کی نہیں تھی۔ میں نے سیل فون کی اسکرین دیکھی تو اس پر نام انکل حیدر لکھا ہوا چمک رہا تھا۔

''کون۔ کون ہو تم؟'' میں نے حتی المقدور محتاط لہجے میں دریافت کیا۔

''مجھے نہیں پہچانا بیٹے؟'' حیرت بھرے لہجے میں پوچھا گیا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ مجھے جواب میں دوسری طرف سے طنزیہ قہقہہ سنائی دیا۔ پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''حیرت ہے، تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میرا خیال تھا کہ میری آواز سنتے ہی تم پہچان جاؤ گے۔''

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ''اچھا، تم خود ہی بتا دو کہ تم کون ہو اور انکل حیدر کہاں ہیں۔ ان کا فون تمہارے پاس کیوں ہے؟''

''اپنے دماغ پر زور دو۔ شاید تم مجھے پہچان لو۔'' اُس نے کہا تو میں اُس کی آواز پر غور کرنے لگا۔ کئی لمحات گزر گئے لیکن میں اس کی آواز نہیں پہچان پا رہا تھا کیونکہ میں اُس کی آواز فون پر پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔

''تمہید کیوں باندھ رہے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''بتاؤ، کون ہو تم اور انکل.....''

اس نے سرعت سے میری بات کاٹی۔ ''میں حیران ہوں کہ تم اپنے جانی دشمن کی آواز کو نہیں پہچان رہے۔ ایک بار پھر اپنے ذہن پر زور دو۔ یقیناً تمہیں اپنا جانی دشمن یاد آ جائے گا۔'' اُس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''جانی دشمن'' پر میں بے اختیار ٹھٹکا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک سنسناہٹ سی لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ میرے جانی دشمن تو تین تھے۔ اسماعیل شاہد، چودھری باسط اور شانی۔ یہ اُن تینوں میں سے ایک تھا۔ دفعتاً مجھے اپنے سر پر دھماکا سا محسوس ہوا۔

''ابھی بھی مجھے نہیں پہچان پائے؟'' دوسری طرف سے آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''میرا خیال ہے مجھے اپنا تعارف خود ہی کرا دینا چاہیے۔ کیا خیال ہے؟''

''شش.....شانی۔'' میرے منہ سے تشکیک بھرے انداز میں نکلا تو دوسری طرف سے مجھے استہزائیہ قہقہہ سنائی دی۔

''کافی دیر کے بعد پہچانے ہو۔'' قہقہہ لگانے کے بعد اُس نے کہا جو کہ شانی تھا۔ چونکہ اُس کی آواز میں نے پہلی بار فون پر سنی تھی اس لیے اسے پہچاننے میں واقعی مجھے ایک، دو منٹ کی دیر ہو گئی تھی۔ میرے رگ و پے میں غصے کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ ساری بات مجھے سمجھ آ گئی تھی کہ شانی نے حیدر الماس کو اغوا کر لیا تھا۔ وہ ان کے ذریعے مجھ تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن مجھے حیرت بھی تھی کہ اُس نے حیدر الماس کو کیسے اغوا کر لیا تھا۔ وہ تو انتہائی چوکس رہتے تھے۔

''اب کس سوچ میں گم ہو گئے ہو؟'' شانی کی آواز مجھے گہرے کنویں سے آتی ہوئی سنائی دی۔

''تم یقیناً حیدر انکل کے بارے میں پریشان ہو رہے ہو گے؟'' شانی نے کہا۔ ''وہ میرے پاس ہیں اور بالکل خیریت سے ہیں۔''

اُس کے بتانے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی کسی کے رشتے دار کو اس کے کسی عزیز کے بارے میں اطلاع دیتا ہے کہ وہ پریشان نہ ہوں۔

''تم نے انہیں اغوا کیا ہے؟'' میں نے غصے کو دباتے ہوئے استفسار کیا۔

''آف کورس۔'' شانی نے ایسے کروفر بھرے انداز میں بتایا جیسے اس نے حیدر الماس کو اغوا کر کے ''شاندار'' کارنامہ انجام دیا ہو۔

''کیا چاہتے ہو؟'' میں مستفسر ہوا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے اس کے باوجود میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔

''تمہیں۔'' اس نے برجستہ جواب دیا۔ ''اگر تم چاہتے ہو کہ میں انکل حیدر کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤں تو میں جو چاہتا ہوں ویسا کرو۔ کیا میری بات ماننے کے لیے تیار ہو؟'' آخر میں اس نے گویا میری رائے طلب کی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔'' میں نے ہامی بھری۔

''ہمم۔ یہ ہوئی نا بات۔'' اُس نے چہکتے ہوئے کہا۔ جیسے میرے ہامی بھرنے پر اسے بے حد خوشی ہو رہی ہو۔ ''میں تمہیں ایک ایڈریس سینڈ کر رہا ہوں۔ تم چپ چاپ وہاں پہنچ جاؤ۔ لیکن یہ یاد رکھنا، اگر تم نے کسی کو بھی مطلع کرنے کی کوشش کی تو انکل حیدر کی موت کے ذمے دار تم خود ہو گے۔ مجھے تمہاری چالاکی کی ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو میں انکل حیدر کو گولیاں مارنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہاں۔'' میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''گڈ۔'' اس نے ستائش بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں ایڈریس سینڈ کرتا ہوں۔ بس تم پہنچنے کی کرو۔''

رابطہ منقطع ہوتے ہی میں نے دانت کچکچاتے ہوئے سیل فون کی طرف دیکھا۔ مجھے جال میں پھانسنے کے لیے شانی نے انتہائی چالاکی سے کام لیا تھا۔ وہ میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا، جانتا تھا لیکن حیدر الماس کو بچانے کے لیے مجھے جانا تھا۔ وہ میرے محسن تھے اور میں انہیں مشکل میں گھرا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد حیدر الماس کے نمبر سے شانی نے ایڈریس سینڈ کر دیا۔ میں نے ایڈریس پڑھا اور سیل فون جیب میں رکھ لیا پھر میں کچھ سوچنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ عین اسی لمحے میرے سیل فون کی میسج ٹیون بجی تو میں نے سیل فون پر دیکھا، وہ بھی حیدر الماس کے نمبر سے میسج آیا تھا۔ شانی نے لکھا تھا۔

''جلدی پہنچنے کی کرو۔''

میرے پورے وجود میں غصے کی شدید ترین لہر دوڑ گئی۔ میں نے سیل فون جیب میں رکھا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر میں رکا، جیب سے سیل فون نکالا اور پلٹ کر الماری کی طرف بڑھا۔ میں نے سیل فون آف کر کے الماری میں چھپایا اور الماری بند کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ میری موٹر بائیک تو اس حالت میں نہیں تھی کہ میں اس پر سوار ہو کر جاتا۔ مجھے آٹو رکشے میں شانی کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچنا تھا۔ گھر کے سارے افراد امی کے کمرے میں موجود تھے۔ میں امی کے کمرے کی طرف بڑھا تا کہ مرینہ سے کہہ دوں کہ وہ بیرونی دروازہ لاک کر لے۔ کچھ سوچ کر میں رکا اور مڑ کر کچن میں آ گیا۔

میں نے طائرانہ نظر دوڑائی تو مجھے دیوار گیر ریک میں چھوٹے برتن، چھری کانٹے اور چمچے ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں نے آگے بڑھ کر تین چھریاں اٹھا لیں۔ تینوں کو باری باری چیک کیا تو ایک چھری تیز دھار تھی۔ شانی اور اس کے حواری مسلح ہوں گے اس لیے میں تہی دست نہیں جانا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے دفاع کے لیے وہ تیز دھار چھری اپنے دائیں پاؤں کی جراب میں چھپالی۔ چھری اس انداز میں چھپائی تھی کہ ضرورت کے تحت اسے جلدی سے نکال سکوں۔ ایسی ترکیب میں نے ایک انگلش فلم میں دیکھی تھی جب ہیرو ولن سے مڈبھیڑ ہونے کے لیے جاتا ہے تو وہ چھری اپنی جراب میں چھپا لیتا ہے۔

میں کچن سے نکلا ہی تھا کہ وہاں ممانی آ گئیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔ ''علی بیٹا! کیا بھوک لگ رہی ہے؟ بس میں کھانا بنانے ہی آئی تھی۔ تم تھوڑی دیر انتظار کر لو۔'' انہوں نے سوال بھی کیا اور جواب بھی دے دیا۔

''ٹھیک ہے، میں آتا ہوں۔'' میں کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا تو انہوں نے پوچھا۔

''کہیں جا رہے ہو بیٹا؟''

''جی۔'' مختصراً کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر میں جانے ہی لگا تھا کہ مرینہ نے مجھے آواز دی۔

''بھائی جان۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ مرینہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی آئی۔

''بھائی جان! کہاں جا رہے ہیں؟''

''ایک ضروری کام ہے، وہ کر کے آتا ہوں۔'' میں نے جواباً کہا۔ مجھے اس وقت جانے کی بے حد جلدی تھی۔

''امی کہہ رہی تھیں کہ..... انہیں برگر کھانا ہے تو واپسی پر برگر بھی لیتے آیئے گا۔'' مرینہ بولی۔

''مجھے واپسی پر دیر ہو سکتی ہے۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''تم ماموں سے کہہ دو، وہ برگر لا دیں گے۔ گلی کی نکڑ پر ہی تو برگر والے کی شاپ ہے۔''

''اچھا..... ٹھیک ہے۔'' مرینہ اثبات میں گردن ہلاتی ہوئی بولی۔ ''میں ماموں سے کہتی ہوں۔ ویسے آپ کتنی دیر تک آ جائیں گے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ کھانا کھا لینا۔ میں باہر کھا لوں گا۔''

اس کے بعد میں.... گھر سے نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سڑک کی طرف بڑھ گیا۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ سڑک کے کنارے چند آٹو رکشے موجود تھے۔ میں نے ایک آٹو رکشے میں سوار ہوتے ہی ڈرائیور کو مطلوبہ ایڈریس پر چلنے کا کہا تو اس نے آٹو رکشا اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔

میرے حواسوں پر شانی سوار تھا۔ دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ میں نے بھی اپنے دشمنوں کو کمزور نہیں سمجھا تھا۔ وہ کافی پاور فل تھے۔ چودھری باسط اور شانی کو اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد کی آشیر باد حاصل تھی۔ مجھے بھی حیدر الماس کی آشیر باد حاصل تھی لیکن وہ اس وقت شانی کی قید میں تھے۔ ٹی وی نیوز کے مطابق چودھری باسط ابھی تک اسلام آباد میں تھا لیکن اسماعیل شاہد نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ بھی شانی کے ساتھ موجود ہو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں واپس زندہ بھی لوٹوں گا یا نہیں۔ یہ میں نے قسمت پر چھوڑ دیا تھا۔

شانی نے جو ایڈریس دیا تھا وہ مظفر آباد سے قدرے دور ایک بستی کا ایڈریس تھا۔ اس بستی کا نام مہندی پور تھا۔ بستی کے درمیان میں نہر نما ایک نالہ تھا جسے گندا نالہ کہا جاتا ہے۔ اس نالے کے دونوں اطراف میں کچے، پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ وہاں زیادہ تر غرباء ہی رہتے تھے۔ میں نے اس بستی کا نام تو سنا ہوا تھا لیکن آج پہلی مرتبہ جا رہا تھا۔

آٹو رکشے نے جب مجھے گندے نالے پر اتارا تو اس وقت رات کے سوا آٹھ بج رہے تھے۔ کرایا ادا کرنے کے بعد میں قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں کئی دکانیں تھیں جن میں سے کچھ بند تھیں تو کچھ کھلی ہوئی تھیں۔ گندے نالے کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ایک دکاندار سے مہندی پور جانے کا ایڈریس پوچھا۔ دکاندار نے میری رہنمائی کی اور میں گندے نالے کے کنارے کنارے چلتا ہوا بستی میں داخل ہو گیا۔ کہیں کسی کسی مکان کی پیشانی پر لگے مرکری بلب ٹمٹما رہے تھے جن کی مدھم روشنی اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

شانی نے میسج میں مہندی پور میں ایک پرانی کوٹھی میں پہنچنے کا لکھا تھا اور اب میں وہی پرانی کوٹھی تلاش کر رہا تھا۔ گندے نالے کی بدبو بدستور پھیلی ہوئی تھی اور تعفن سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ یہاں آباد لوگ نہ جانے کیسے رہ رہے تھے۔ گندے نالے کی دوسری طرف جانے کے لیے درختوں کے موٹے موٹے تنے رکھے گئے تھے۔ ایک جگہ مجھے ایک پرچون کی چھوٹی سی شاپ دکھائی دی جس کے باہر زرد بلب ٹمٹما رہا تھا۔ میں اُس شاپ کے سامنے سے گزرا تو مجھے خیال آیا کہ مجھے پرانی کوٹھی کے بارے میں معلوم کر لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے میں پرانی کوٹھی کی تلاش میں بھٹک جاؤں۔ چنانچہ میں مڑ کر شاپ پر پہنچ گیا۔

شاپ پر ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا جس کی عمر سولہ، سترہ سال تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو کتاب بند کر کے میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا چاہیے آپ کو؟'' لڑکے نے استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے گلا کھنکھارا اور کہا۔ ''مجھے ایک جگہ پہنچنا ہے۔ یہاں کوئی پرانی کوٹھی ہے۔''

''جی بالکل ہے۔'' لڑکے نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ کوٹھی چودھری حمزہ صاحب کی ہے۔ میں بتاتا ہوں۔''

وہ لڑکا کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر دکان سے باہر آ گیا اور اُس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا جدھر میں جا رہا تھا۔ ''آپ اس راستے پر چلتے جائیں۔ تھوڑی دور آپ کو ایک پل دکھائی دے گا۔ اس کی دوسری طرف ایک سڑک بائیں طرف مڑتی دکھائی دے گی۔ آپ اسی سڑک پر چلتے جائیں تو تھوڑی ہی دور آپ کو ایک کوٹھی دکھائی دے گی جس میں روشنیاں جل رہی ہوں گی۔ وہی پرانی کوٹھی ہے۔''

میں اُس لڑکے کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گیا۔ جیسے جیسے آبادی ختم ہوتی جا رہی تھی آگے گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں کوئی خونخوار کتا مجھ پر حملہ نہ کر دے۔ کتوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ وہ اِس ڈر سے انسان پر حملہ کر دیتے ہیں کہ وہ اُن پر نہ حملہ کر دے۔ بہرکیف، میں محتاط نظروں سے قرب و جوار میں دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ آبادی نہ ہونے کی وجہ سے وہاں روشنی کا انتظام بھی نہیں تھا۔ چاند کی روشنی درختوں سے چھن چھن کر زمین پر پہنچ رہی تھی۔

بیس، پچیس منٹ کی مسافت کے بعد میں پل پر پہنچ گیا۔ پل کی بائیں طرف ایک سڑک جا رہی تھی اور دائیں

بائیں کھیتوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ میں پل کراس کر کے سڑک پر پہنچا اور آگے بڑھنے لگا۔ دور دور تک ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بہ دستور فضا میں گونج رہی تھیں۔ جیسے ہی میں سڑک مڑا تو مجھے قدرے فاصلے پر ایک پڑی سی کوٹھی کسی ہیولے کی طرح دکھائی دی۔ وہ شاید دو منزلہ تھی اور اوپر کی منزل کے کسی کمرے میں لائٹ روشن تھی جبکہ نچلا پورشن روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کوٹھی وسیع احاطے پر پھیلی ہوئی تھی۔ کوٹھی سے قدرے فاصلوں پر بھی مکان تھے جن کی پیشانیوں پر زرد بلب ٹمٹما رہے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ یہی وہ کوٹھی ہے جہاں مجھے شانی نے بلایا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا کوٹھی کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی۔ پتا نہیں، میرے ساتھ کیا حالات پیش آنے والے تھے۔ بہرکیف، میں پرانی کوٹھی کی طرف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ میں گیٹ کے قریب پہنچ گیا۔ جہازی سائز گیٹ بند تھا اور اس کے بائیں پلر پر ''حمزہ لاج'' کی ایک نیم پلیٹ موجود تھی۔ اس کے نیچے ڈور بیل تھی جس کی روشنی جل رہی تھی۔

دیواریں کافی بلند تھیں اور حفاظتی اقدامات کے طور پر ان پر خاردار تاروں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ خاردار تاروں کی بدولت کسی بھی شخص کا دیوار پھاندنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ میں گیٹ پر رکنے کی بجائے پرانی کوٹھی کو جائزانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ایسا میں نے کیوں کیا تھا یہ میں بھی نہیں جانتا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا ہو۔ مجھے کوٹھی کے قرب و جوار میں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا تھا اور کوٹھی کے اندر بھی گہری خاموشی نے بسیرا کیا ہوا تھا۔ یہ میرا وہم تھا یا کچھ اور۔ بہرکیف، کچھ فاصلے پر جانے کے بعد مجھے جھاڑیاں دکھائی دیں تو میں اُن جھاڑیوں میں گھس کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں مسلسل پرانی کوٹھی کے گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔

شانی نے اسی کوٹھی میں حیدر الماس کو یرغمال بنا کر رکھا ہوا تھا اور وہ یقیناً میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ گیٹ پر کسی جگہ خفیہ کیمرا بھی لگا ہوا ہو اور جب میں گیٹ کے سامنے سے گزرا ہوں گا تو شانی نے مجھے واچ کر لیا ہو۔ میں ہر پہلو کو مدِنظر رکھ رہا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر شانی نے مجھے واچ کر لیا ہوگا تو وہ خود یا اس کے حواری کوٹھی سے باہر ضرور آئیں گے۔ میں موقع پاتے ہی کوٹھی میں گھسنے کی کوشش کروں گا۔

تقریباً پانچ، چھ منٹ ہی گزرے تھے کہ مجھے گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں جھاڑیوں کی اوٹ سے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا اور دو ہیولے سے باہر نکل آئے۔ میں پُرغور نظروں سے ان ہیولوں کو دیکھنے لگا۔ اُن میں ایک تو شانی تھا دوسرا کوئی اور تھا جسے میں آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

دونوں نے لمحہ بھر کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا پھر وہ دونوں بھرے انداز میں اُدھر ہی آنے لگے جدھر میں جھاڑیوں میں دبکا بیٹھا تھا۔

''شانی! کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ علی ہی تھا؟'' میری سماعت میں شانی کے ساتھی کی آواز ٹکرائی۔

''ہاں تاجور۔ مجھے پکا یقین ہے۔ وہ علی ہی تھا۔'' شانی نے جواباً کہا۔

''پھر وہ یہاں رکا کیوں نہیں؟''

''مجھے کیا پتا۔'' شانی جھنجلا کر بولا۔ ''شاید وہ میرے ساتھ کھیل، کھیل رہا ہے۔''

''تمہیں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔''

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔'' شانی نے تڑخ کر جواب دیا۔ ''وہ علی ہی تھا۔ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے میرے سامنے سے گزر گئے۔ میں نے شانی کے ہاتھ میں پستول دیکھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن مجھے اپنے کانوں میں واضح سنائی دے رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ شانی نے مجھے خفیہ کیمرے سے دیکھ لیا تھا اور اب وہ مجھے تلاش کرنے کے لیے کوٹھی سے باہر آ گیا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق میں اس کے ساتھ کھیل، کھیل رہا ہوں۔ میری نظریں مسلسل اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ جب وہ تھوڑی دور چلے گئے تو میں جھاڑیوں سے نکلا اور گرتا پڑتا چلتا ہوا کوٹھی کی طرف بڑھ گیا۔ کوٹھی کے قریب تاریک گوشے میں ہو کر میں نے شانی اور اس کے ساتھی تاجور کی طرف دیکھا جو دور سے ہی مجھے ہیولوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں نے ٹھنڈی سانس اپنے اندر انڈیلی۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے میں تاریک گوشے سے نکل کر کوٹھی میں داخل ہو گیا لیکن جلد بازی میں داخل ہونے کی وجہ سے میں گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کسی کو نہ دیکھ سکا اور اس سے بُری طرح سے ٹکرا گیا۔

(لمحہ بہ لمحہ بدلتے واقعات پر مشتمل داستان جاری ہے)

ادب شناس 01

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

ایک نیا سلسلہ ''ادب شناس'' شروع کیا گیا ہے۔ یہ نیا سلسلہ جو آپ کو معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی دے گا۔ ہر ماہ کسی ایک مشہور مصنف کی تحریر کا اقتباس دیا جائے گا۔ آپ ذہن پر زور دیں، اندازہ لگائیں کہ یہ اقتباس کس معروف مصنف کے قلم کا شہکار ہے۔ اس اعادہ سے تحریر شناسی پر عبور حاصل ہوتا رہے گا۔ درست جواب بھیجنے والے قاری کو چھ ماہ تک ''سرگزشت'' اعزازی طور پر بھیجا جائے گا۔ درست جواب 30 نومبر تک موصول ہونا ضروری ہے۔ بعد میں آنے والے کوپن تلف کر دیئے جاتے ہیں اگر ایک سے زیادہ قارئین کے جوابات درست ہوئے، قرعہ اندازی کے ذریعے انعام یافتہ کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اس ماہ کا اقتباس

''میں دیوسائی کا بھورا ہمالیائی ریچھ ہوں اور میرا نام بگ بوائے ہے۔ میں دیو سائی کا ایک پھول ہوں اور جیسے میرے رنگ ان دیکھے ہیں ایسے میرے نام ان گنت ہیں۔ میں دیوسائی کا وہ بادل ہوں جس کی شباہتیں طلسم ہیں۔ جھلکتی ہیں تو اس میدان پر بچھ جاتی ہیں اور میں خود دیوسائی ہوں، دنیا کا بلند ترین اور وسیع ترین خواب جس کے اوپر پہنچنے والوں کا سانس بلندی روکتی ہے۔

کیا ایک ریچھ کے لیے، ایک پھول کے لیے، ایک بادل کے لیے گھر سے نکل کر دربدر ہونا جائز ہے؟

قارئین کے مسلسل اصرار پر اس ماہ سے دو انعامی سلسلے شروع کیے جا رہے ہیں۔

انعام یافتگان کو 3-3 ماہ تک ادارے کی جانب سے سرگزشت بطور انعام بھیجا جائے گا

میرے خیال میں یہ تراشہ مصنف .... کی تحریر سے لیا گیا ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

کوپن کے ہمراہ جوابات مورخہ 30 نومبر 2020ء تک موصول ہونا ضروری ہے

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

چسپاں

سرورق دیکھ کر کوئی ایسا شعر منتخب کریں جو پوری طرح چسپاں ہو جائے۔ فیصلہ قارئین کریں گے کہ یہ شعر سرورق پر

چسپاں

ہوتا ہے یا نہیں! شعر الگ کاغذ پر صاف صاف لکھا ہو۔ ساتھ شاعر کا نام بھی ہو۔

نام ....

پتا ....

....

....

فون نمبر: ....

06

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

مرزا ثمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون 35895313 فیکس 35802551

انوکھی قسم

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
ارسال کردہ سچ بیانی عصمت کی ہے، ظہیر اور واجد کی ہے، عصمت کی ساس کی ہے۔ ان تمام کرداروں کے واقعات کو میں نے یکجا کر دیا ہے تھوڑا افسانوی رنگ بھی بھرا ہے کیونکہ سچ کڑوا ہوتا ہے، کہیں قارئین پڑھتے پڑھتے رک نہ جائیں اس لیے جملوں کو خوب صورت بنا دیا ہے۔ یہ سچ بیانی آئینہ ہے ہمارے دیہی معاشرے کی کہ آج بھی ایک کی سزا دوسرے کو دی جاتی ہے۔

فرح انیس
(کراچی)

سالگرہ مبارک ہو پیاری دادو میں دادو کے کمرے میں کیک کی پلیٹ لے کر داخل ہوئی۔ دادی جو پلنگ پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں ان کی بوڑھی آنکھیں مجھے دیکھ کر مسکرا دیں۔ میں کیک کی پلیٹ ان کے پلنگ پر رکھ کر ان کے گلے لگ گئی جس پر وہ مجھے ہمیشہ کی طرح بہت سی دعاؤں سے نوازنے لگیں ان کی محبت پر میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ میں ان کا ہاتھ تھام کے ان کے سامنے بیٹھ گئی یہ بتائیں کتنے برس کی ہوگئیں۔ میرے شرارت سے بولنے پر وہ بھی مسکرا دیں۔

''اتنی بوڑھی ہوگئی ہے تیری دادی مگر تو اب بھی یہ کیک لے کر ایسے آتی ہے جیسے میں کوئی چھوٹی سی بچی ہوں۔'' ان کی بات پر میرا منہ بن گیا۔ ''کیک سے عمر کا کیا تعلق؟ آپ کو ابھی بہت جینا ہے، میرے لیے۔'' میں ان کے سینے سے لگتی ہوئی محبت سے بولی۔

''ہاں تمہارے لیے ہی تو جی رہی ہوں۔'' دادو کھوئے کھوئے سے انداز میں بولیں۔

میں بغور ان کی آنکھوں کو دیکھنے لگی جو ہمیشہ کی مانند بجھی بجھی سی محسوس ہوئیں۔ دادو کی آنکھوں میں مجھے ہمیشہ نمی سی لگتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ان آنکھوں میں کوئی گہرا راز چھپا ہے۔

میں بہت کم عمر تھی جب سے میں نے کبھی اپنی دادو کو سفید رنگ کے علاوہ کوئی اور رنگ کا لباس زیب تن کیے نہیں دیکھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے جس دن میری بڑی بہن کی شادی تھی میں بضد تھی کہ دادو آج تو رنگین لباس پہنیں مگر وہ میری بات کو ہنس کر ایسے ٹال گئی تھیں جیسے میں کوئی نادان بچی ہوں۔

میرا نام زیبا ہے میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹی ہوں دو بھائی ہیں جو جاب کرتے ہیں جبکہ دو بہنوں کی شادی ہو چکی ہے۔ میرے والد کی وفات کچھ برس پہلے ہی ہوگئی تھی۔ میں اور امی اپنی دادو کے ساتھ رہتے ہیں۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے میں سب سے زیادہ دادو کے قریب اور ان کی لاڈلی تھی مگر ان سب کے باوجود بھی نجانے کیوں مجھے لگتا تھا دادو کے سینے میں کوئی گہرا راز دفن ہے۔ میں جب بھی ان کی آنکھیں بغور دیکھتی تو ان کی آنکھوں میں کرب نظر آتا تھا، کوئی گہرا کرب جس میں بہت سے راز چھپے ہوں مگر میں کبھی یہ معما حل نہیں کر سکی۔ میں ان کے لاکھ قریب تھی مگر احترام کی وجہ سے ایک جھجک آڑے آتی تھی جو میں اپنے دل کی بات کبھی زبان پر نہیں لا پاتی تھی۔

میں بہت ذہین تھی، مجھے اسکالرشپ ملی تھی۔ میں تعلیم کی غرض سے آسٹریلیا جا رہی تھی مگر امی کسی طور راضی نہ تھی مجھے آج بھی یاد ہے دادو نے امی کو مجھے آسٹریلیا بھیجنے پر راضی کیا تھا۔ میں تو اپنے مرحوم باپ کا خواب پورا کرنا چاہتی تھی کیونکہ پورے گھر میں سب سے زیادہ قابل میں ہی تھی میرے بابا اکثر امی سے کہا کرتے تھے۔ دیکھنا میری زیبا خوب پڑھ لکھ کر میرا نام روشن کرے گی مگر اب جب میں جانا چاہ رہی تھی تو امی کسی طور راضی نہ تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے وہ دن جب دادو امی کو مجھے باہر بھیجنے پر راضی کر رہی تھیں تو ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ ظہیر الدین کا بھی ارمان تھا کہ وہ ثاقب کو باہر بھیجے۔

ان کی بات پر امی کے چہرے پر بے انتہا حیرانی تھی امی کے ساتھ میں خود بھی دادو کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا میں نے کبھی اپنے دادا کا نام ان کے

لبوں سے نہیں سنا تھا۔

آج اتنے برس بعد دادا کا نام سن کر میں اور امی دونوں ہی چونک گئے تھے۔ وہ ہم دونوں کے چہرے پر حیرانی دیکھ کر خود بھی گم صم سی ہوگئی تھیں۔

یوں میں بہت سی یادیں لے کر پڑھائی کی غرض سے آسٹریلیا آگئی تھی وہاں بھی میں امی اور دادو کو بہت یاد کرتی تھی۔

مجھے سب سے زیادہ امی اور دادو سے محبت تھی مگر بعض اوقات مجھے دادو کی آنکھوں میں بسی اداسی بے چین کردیتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں۔ جب وہ مسکراتیں تو ان کی آنکھیں مجھے بہت خالی خالی سی معلوم ہوتی تھیں۔ میں اکثر امی سے جب بھی اس بابت ذکر کرتی تو وہ یہی بولتیں تمہارا وہم ہے مگر نجانے کیوں مجھے یہ وہم نہیں لگتا تھا۔

تعلیم حاصل کرکے جب میں وطن عزیز لوٹی تو دادو کی صحت کافی گر چکی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ کمزور ہوگئی تھیں۔

''دادو آپ نے اپنا خیال کیوں نہیں رکھا؟'' میں دادو کا ہاتھ تھام کے خفگی سے بولی۔

''اب تم آگئی ہو تم رکھنا میرا خیال۔'' وہ میرا ہاتھ چومتے ہوئے بولیں۔

دادو عمر کے اس حصے میں بھی کافی چاق و چوبند تھیں مگر اب لگتا تھا وہ خود ہی ٹھیک نہیں ہونا چاہتیں۔

''دادو آپ خود بے پروائی برت رہی ہیں۔ بستر پر لیٹیں۔'' دادو کو میں مصنوعی خفگی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جس پر دادو کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔

دادو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو پا رہی تھی، دن بہ دن وہ مزید بیمار ہوتی جارہی تھیں۔ میں اور امی دادو کی صحت کو لے کر کافی فکرمند تھے۔ میں کچھ دنوں سے دادو کے کمرے میں ہی سو رہی تھی۔

رات میں جلدی سوگئی تھی کہ رات کے کسی پہر اچانک میری آنکھ دادو کی سسکیوں سے کھلی۔ وہ بیڈ پر بیٹھیں دونوں ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہی تھیں۔ آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر ان کے جھریوں زدہ چہرے پر جذب ہو رہے تھے۔ میں بے چین ہوکر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دعا مانگنے کے بعد دادو میری طرف شفقت سے دیکھنے لگیں مگر ان کی آنکھوں میں ٹھہری اذیت آج مجھے بولنے سے نہ روک سکی۔

''دادو ایسی کون سی بات ہے جو آپ کی آنکھیں مستقل اداس رہتی ہیں۔'' میرے کہنے پر وہ آج بھی مسکرا کر مجھے ٹال جاتیں مگر میں مصر ہوگئی۔ دادو سمجھ گئی تھیں کہ آج میں نہیں سننے والی۔ کچھ دیر بعد وہ میرا ہاتھ تھام کے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ ان کے اس طرح سے رونے پر میں بوکھلا سی گئی تھی۔ ''دادو آپ مت روئیں آپ کی پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' میں ان کے دونوں ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولی مگر وہ کافی دیر اس ہی طرح روتی رہیں۔

میں نے پانی کا گلاس ان کے لبوں سے لگا دیا۔ کچھ گھونٹ لینے کے بعد وہ چپ ہوگئیں اور پھر اپنے کمرے کی بند کھڑکی کو تکنے لگیں جس کو وہ کھولنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ میں اگر کبھی کھولنا بھی چاہتی تو وہ منع کردیتی تھیں۔ وہ کھڑکی پر نظر گڑائے بولنے لگیں۔

میرا نام عصمت اکبر ہے ہم تین بھائی بہن تھے، گاؤں میں رہتے تھے۔ میرے دونوں بھائی مجھ سے چھوٹے تھے۔ دولت کی ریل پیل کے ساتھ اللہ نے حسن کی دولت سے بھی ہم بہن بھائیوں کو نواز اہوا تھا غرضیکہ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔

ہمارے برابر تایا کا گھر تھا۔ تایا کے حالات کچھ خاص اچھے نہیں تھے جبکہ ہماری کافی ساری زمینیں تھیں۔ میں چونکہ اکلوتی بیٹی تھی تو کافی ناز و نعم سے میرے ماں باپ نے مجھے پالا تھا۔

''عصمت بارہ سال کی ہوگئی ہے اکبر میاں، کیا سوچا تم نے اس کے بارے میں۔'' تایا صدیق حقہ پیتے ہوئے بابا سے پوچھنے لگے جو سوچوں میں گم تھے۔ انتامت سوچو اکبر میاں ہماری امانت ہمیں دے دو، تائی سعیدہ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''بھرجائی میں ذرا عصمت کی ماں سے مشورہ کرلوں پھر بتاتا ہوں۔'' بابا کی بات پر تایا تائی چپ ہوگئے۔

رات کھانے کے بعد بابا اماں سے بات کرنے لگے جس پر اماں بابا کی بات پر سوچ میں پڑ گئیں۔

''کیا سوچنے لگی ہو ندرت؟'' بابا امی سے مخاطب ہوئے۔

''میں سوچ رہی ہوں صدیق بھائی کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں ہیں۔ ہماری عصمت کو تو آسائشوں کی عادت ہے۔'' اماں کچھ ہچکچاتے ہوئے بابا سے بولیں۔

''تمہاری بات تو درست ہے مگر ظہیر الدین محنتی بچہ ہے اپنا خرچا خود اٹھاتا ہے۔ عمر میں بھی ہماری عصمت سے تیرہ سال بڑا ہے، اچھا سمجھدار ہے۔'' بابا کی اس بات سے تو اماں بھی متفق

تھیں۔

ظہیر الدین میرے تایازاد تھے۔خوبصورت پڑھے لکھے سنجیدہ مزاج کے ظہیر اماں بابا کو بھی بہت پسند تھے مگر اماں ان کے مالی حالات کی وجہ سے جھجک رہی تھیں۔اس کے ساتھ ساتھ ان کو تائی کے مزاج کی بھی فکر تھی۔تایا جتنے نرم خو اور اچھی عادات کے تھے تائی اتنی ہی تیز مزاج کی تھیں۔"تم سوچ لو آرام سے عصمت تمہاری بھی بیٹی ہے جو تم بولو گی وہ مجھے منظور ہے۔" بابا کی بات پر اماں سر ہلا کر رہ گئیں۔

"کیا سوچا پھر آپ نے بھرجائی؟" تایا اور تائی کچھ ہفتوں بعد پھر ہمارے ہاں موجود تھے،فکر نہ کرنا کبھی تمہاری بیٹی کو کسی چیز کی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔یہ سمجھنا عصمت اپنے تایا کے گھر نہیں اپنے باپ کے گھر جا رہی ہے۔" تایا کی بات پر اماں مسکرا دیں اور کچھ ماہ بعد ہی میں ظہیر الدین کی دلہن بن کر اپنے تایا کے گھر آ گئی۔ میں گڑیا گڈے سے کھیلنے والی اپنا بچپن ماں باپ کی دہلیز پر ہی چھوڑ آئی تھی۔

میں روز ہی اماں ابا سے ملتی تھی۔میری اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں واجد اور شکیل میں جان تھی۔دونوں بھائی بھی مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ظہیر الدین کی ایک ہی بہن تھیں فوزیہ جو کسی بھی طور ظہیر الدین جیسی نہ تھی۔شکل وصورت عادات و اطوار میں وہ بالکل تائی جیسی تھی جبکہ ظہیر الدین تایا جیسے خوبصورت اور نیک عادات کے مالک تھے۔ان کی بہ نسبت فوزیہ تائی جیسی قبول صورت اور مزاج کی کافی تیز تھی۔وہ ظہیر الدین سے پورے پندرہ برس چھوٹی تھی۔

میری شادی کے بعد میری ماں کو جو اندیشے تھے وہ سب دور ہو گئے تھے۔ظہیر الدین کی میرے لیے والہانہ محبت اور میرے چہرے کی مسکراہٹ ان کو اندر تک شاد کر دیتی تھی۔ظہیر الدین تعلیم یافتہ تھے کچھ وقت بعد ترقی کرتے چلے گئے۔

تایا نے کبھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی بہو ہوں،وہ ہمیشہ اپنی بیٹی فوزیہ کی طرح ہی سمجھتے تھے۔تایا کو لگتا تھا میرے آنے سے ان کے گھر کے حالات کافی خوشحال ہو گئے۔وہ اٹھتے بیٹھتے اس بات کا برملا اظہار کرتے تھے جس پر اکثر تائی کے چہرے پر ناگواری آ جاتی تھی۔

ابھی ہماری شادی کو چار سال ہی ہوئے تھے کہ تایا کا انتقال ہو گیا۔تایا کی موت سے مجھے کافی دھچکا لگا تھا کیونکہ سسرال میں میں سب سے زیادہ ان کے قریب تھی۔اب تائی کی جلی کٹی پر میری حمایت لینے والے تایا نہیں رہے تھے۔ظہیر الدین سے کچھ بھی کہنا بیکار تھا۔وہ مجھ سے اگر بہت محبت کرتے تھے تو

سید محمد جعفری

(1907ء...1972ء)

"شوخی تحریر" مزاحیہ نظموں اور قطعات کے شاعر سید محمد جعفری کو اردو کے طنزیہ و مزاحیہ شعراء میں اہم مقام حاصل رہا ہے۔راجپوتانہ کی ایک ریاست بھرت پور میں 27 دسمبر 1907ء کو سید محمد علی جعفری کے گھرانے میں جنم لینے والے سید محمد جعفری کا تعلق پہرسر کے سادات خاندان سے تھا۔سید محمد جعفری کے دادا سید مرتضیٰ فارسی زبان کے شاعر تھے۔"بیدار" تخلص تھا۔سید محمد علی جعفری 1906ء کو لاہور کے اسلامیہ کالج کے پرنسپل بنے تو انہوں نے اپنے بیٹے سید محمد جعفری کو بلوا لیا۔جہاں سے انہوں نے 1922ء میں میٹرک اور 1928ء میں ریاضی، کیمسٹری اور فزکس میں بی ایس سی آنرز کی ڈگری لی۔مصوری، ڈرائنگ اور خوش خطی کا شوق انہیں میؤ اسکول آف آرٹس (موجودہ نیشنل آرٹس کالج) لاہور لے گیا۔ان کے استاد و رہنما مصور مشرق عبدالرحمن چغتائی اور فیروز الدین تھے۔علم و فن کے سارے شعبوں پر دسترس رہی۔جہلم اور فیصل آباد کے اسکول و کالج میں مدرس رہے۔1940ء میں اطلاعات و نشریات کے شعبے سے منسلک رہے۔ بعد ازاں کراچی میں محکمۂ اطلاعات کے افسر اعلیٰ بنے۔ایک زمانے میں تہران میں کونسلر بن کر گئے۔ 1966ء میں ریٹائر ہوئے 7 جنوری 1976ء میں وفات ہوئی کراچی میں آسودۂ خاک ہیں۔ جب خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم تھے عید الضحیٰ کے موقع پر کراچی پولو گراؤنڈ میں نماز کا اہتمام کیا گیا۔صف اوّل میں وزراء کے مصلے محفوظ تھے۔اسی نماز کے دوران کسی نے خواجہ صاحب کے محافظوں میں سے کسی کی جیب بھی چرا لی تھی۔سید محمد جعفری نے اس موضوع پر ایک مسدس علامہ اقبال کے "شکوہ" کی پیروڈی میں لکھی اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

مولوی لوگ بھی تھے ان میں گنہ گار بھی تھے
عجز والے بھی تھے مستِ مئے پندار بھی تھے

ماں سے ان کو عشق تھا اور محبت کتنی بھی ہو مگر عشق ہمیشہ محبت پر حاوی آجاتا ہے۔

تائی دن کو رات بولتیں تو وہ بھی دن کو رات بولتے تھے۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور شادی کو چھ برس بیت گئے۔ ظہیر الدین میرا ہاتھ تھام کر محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

''جانتی ہو میں بہت خوش قسمت ہوں کہ اللہ نے مجھے تم جیسی بیوی سے نوازا۔''

میں جانتی تھی ظہیر الدین کو مہندی کس قدر پسند ہے اس لیے میرے ہاتھ ہمہ وقت مہندی سے رنگین رہتے تھے۔

''میں سوچ رہا ہوں شہر میں شفٹ ہو جائیں تاکہ وہاں ہم اپنے بیٹے کو اچھی تعلیم دے سکیں۔

وہ نزدیک ہی سوئے چار سالہ ثاقب کی پیشانی چومتے ہوئے بولے۔

''اماں سے پوچھیں ان کو اگر شہر جانے پر کوئی اعتراض نہ ہو۔'' میں کچھ سوچتے ہوئے بولی کیونکہ میں جانتی تھی ان کی یہاں پر تایا مرحوم کے ساتھ کتنی یادیں جڑی ہوئی ہیں اور ان کو گاؤں سے انسیت بھی بہت ہے۔ گاؤں سے انسیت تو ظہیر الدین اور مجھے بھی بہت تھی مگر بیٹے کے اچھے مستقبل کے خاطر ہمیں شہر جانا تھا۔

''اماں کیا سوچ رہی ہیں آپ چلے گیں نا ہمارے ساتھ شہر؟'' ظہیر الدین تائی سے بولے جو پان کی پٹاری سے پان نکال کر اس پر کتھا لگا رہی تھیں۔

''کیا بولوں کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' تائی چھالیا کے دانے منہ میں ڈالتی ہوئی بولیں۔ اماں جو تم بولو تمہارا حکم سر آنکھوں پر ہے۔ میں جانتی تھی ظہیر الدین کی جان اپنی ماں میں تھی اور یہ بات سب ہی جانتے تھے۔ تائی یہ بھی جانتی تھیں کہ اگر وہ شہر جانے سے منع کر دیں گی تو ان کا بیٹا بھی شہر جانے کا نام نہیں لے گا۔

''چلو ٹھیک ہے تم لوگ چلے جاؤ میں چکر لگاتی رہوں گی۔''

''اماں مگر یہاں میں اکیلے تم کو اور فوزیہ کو کیسے چھوڑ دوں؟'' ظہیر الدین فکر مندی سے بولے۔

''میں اکیلی نہیں ہوں میرے ساتھ اکبر اور ندرت ہے، برابر تو گھر ہے پھر کون سا اکیلا پن؟'' تائی کی بات پر ظہیر الدین چپ ہو گئے۔

''میں سوچ رہی تھی آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اپنے ساتھ شہر واجد اور شکیل کو لے جاؤں۔ وہ بھی شہر کی تعلیم حاصل کر لیں گے۔'' میں جھجکتے ہوئے بولی۔

''اچھی بات ہے ان کو بھی لے جاؤ۔'' تائی کی بات پر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کیونکہ مجھے ایسا لگ رہا تھا تائی سنتے ہی جھٹ سے انکار کر دیں گی حالانکہ ان دونوں کا سارا خرچ بابا ہی اٹھاتے مگر مجھے یہ اندیشہ تھا کہ وہ میرے دونوں بھائیوں کا میرے ساتھ رہنا گوارا نہیں کریں گی۔

شہر آنے کے بعد ظہیر الدین نے کافی اچھا گھر بنا لیا تھا جو مجھے بہت پسند آیا تھا۔ میں واجد، شکیل کا بھی اپنے ثاقب کی طرح دھیان رکھتی تھی۔ وقت کا پہیا اپنی رفتار سے چلتا رہا اور دس برس بیت گئے۔

''اماں اب آئی ہو تو آرام سے جانا۔'' ظہیر الدین تائی کے پاس بیٹھے ان کا ہاتھ تھامے محبت سے بولے۔

''میں یہاں کسی خاص مقصد سے آئی ہوں۔'' تائی مجھے بغور دیکھتی ہوئی بولیں۔

میں جوان کے آگے کسی رکھ رہی تھی چونک کر ان کو دیکھنے لگی۔

''فوزیہ کی کچھ فکر ہے تجھے؟'' تائی کی بات پر ظہیر الدین پریشان ہو کر ماں کا منہ تکنے لگے۔ میں بھی ناسمجھی سے تائی کو دیکھنے لگی۔

''کوئی رشتہ نہیں آتا سب کو اس کی واجبی صورت پر اعتراض ہوتا ہے تائی کی صاف گوئی پر نزدیک بیٹھی فوزیہ کا چہرہ بجھ سا گیا۔'' مجھے تائی کے اس طرح سے بولنے پر کافی افسوس ہوا تھا۔

فوزیہ اب پہلی جیسی تیز مزاج کی نہیں رہی تھی۔ لب و لہجے میں پہلے اس کے جو تلخی ہوا کرتی تھی اب وہ ہی زبان کافی نرم ہو چکی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہماری فوزیہ بہت پیاری ہے۔ لوگ ہی ناقدرے ہیں جو ایسی باتیں کرتے ہیں۔'' میں محبت فوزیہ کو دیکھتی ہوئی بولی فکر تو ظہیر الدین کو بھی تھی مگر وہ بھی کرتے۔

''ارے بیٹا اتنی پیاری ہے تو تم کیوں نہیں بنا بنا لیتیں میں تو منتظر رہی تمہاری ماں کو کبھی تو خیال آیا ہوتا۔'' تائی کی بات پر میں خاموش سی ہو گئی۔

''میں ویسے بھی اس ہی سلسلے میں بات کرنے آئی تھی تم اپنی ماں سے بولو کہ واجد کے لیے میری فوزیہ کا ہاتھ مانگے۔'' تائی کی بات پر میں پریشان سی ہو گئی تھی۔ میں واجد کی حسن

سے بخوبی واقف تھی اور فوزیہ کی آنکھوں میں نظر آتی واجد کی محبت بھی دیکھ چکی تھی مگر مشکل ہی تھا کہ واجد مانتا۔

''تم نے پھر کیا سوچا؟'' رات جب میں بستر پر لیٹی سوچوں میں گم تھی تو ظہیر الدین کمرے میں آکر مجھ سے بولے۔

''ابھی کچھ سمجھ نہیں آرہا کیا بولوں، کل گاؤں جاؤں گی اماں سے بات کرنے۔'' میں گہرا سانس بھرتی ہوئی بولی۔

☆☆☆

''آپا آپ کو کیا ہوگیا؟'' میری بات پر واجد اچھل گیا۔

''اس میں کیا برائی ہے فوزیہ اچھی لڑکی ہے تمہاری زندگی کو خوشحال بنادے گی۔'' میں رسان سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''جی مجھے پتا ہے وہ کتنی اچھی ہے۔'' وہ اس کی تیز زبان پر طنز سے بولا۔

''نہیں واجد وہ خود کو تمہارے خاطر بدل چکی ہے، تم جیسا سمجھ رہے ہو وہ ایسی بالکل نہیں رہی۔'' میں اسے یقین دلاتے ہوئے بولی۔

''وہ مجھے نہیں پسند، میرا اور اس کا شکل وصورت میں بھی کوئی مقابلہ نہیں۔'' واجد صاف گوئی سے بول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں بے بسی سے اماں کو دیکھنے لگی۔

''اماں تم سمجھاؤ۔''

''میں کیا سمجھاؤں بیٹا۔ وہ سننے پر راضی ہی نہیں۔ بولتا ہے کہ وہاں بہنوئی نے اپنے گھر میں رکھنے کی قیمت وصولی ہے۔'' اماں کی بات پر میں شرمندہ سی ہوگئی اس سے پہلے میں کچھ بولتی تائی کی آمد ہوگئی۔

''اپنوں میں کیا شرم جب میں بیٹے کے لیے تمہاری بیٹی کا ہاتھ مانگ سکتی ہوں تو کیا یہ نہیں بول سکتی کہ میری بیٹی کا بھی تم ہاتھ مانگ لو۔'' تائی اماں کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ان کی بات پر اماں زبردستی مسکرادیں۔ وہاں پر موجود ہم دونوں کو سمجھ نہیں آرہا تھا کیا جواب دیں کیونکہ ہم جانتے تھے واجد کبھی نہیں مانے گا۔

''کیوں نہیں بول سکتیں آپ، واجد بھی آپ کا ایسا ہے ظہیر ہے؟'' آپ بڑی ہیں ہماری آپ کو بالکل حق ہے کہ آپ مان سے بولیں۔'' ابا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

بابا کے فیصلے کے آگے دل نہ ہوتے ہوئے بھی واجد نے جھکا لیا مگر مجھے واجد کے چہرے پر خوشی کی رمق محسوس نہیں ہوئی۔ ظہیر الدین بھی اس شادی سے خوش تھے ابھی فوزیہ اور واجد کی شادی کو کچھ ماہ ہی گزرے تھے کہ ظہیر الدین گاؤں کسی کام سے گئے تھے واپسی میں ان کے ساتھ اماں ابا کو آنا تھا۔ اماں ابا کے آنے کا بیقراری سے مجھے بھی انتظار تھا مگر واپسی میں ظہیر الدین کی گاڑی کا تصادم سامنے سے آتے ٹرک سے ہوگیا جس کے نتیجے میں اماں اور ابا نے موقعے پر ہی دم توڑ دیا تھا جبکہ ظہیر الدین کافی زخمی ہوئے تھے، مجھے لگ رہا تھا مجھ پر کسی نے دکھوں کا پہاڑ توڑ دیا ہو۔ ماں باپ کی بیک وقت موت نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس حادثے میں ظہیر الدین کی ریڑھ کی ہڈی کافی متاثر ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھے اور بالکل بستر کے ہو کر رہ گئے تھے۔

''دو ہفتے ہوگئے، بھائی بھابی جی کو دنیا سے گئے ہوئے'' تائی جو گاؤں سے شہر آئی ہوئی تھیں اور پچھلے دو ہفتے سے ہمارے پاس ہی رہ رہی تھیں، انہوں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''یقین ہی نہیں آتا اماں ابا چلے گئے۔'' میں اپنی خالی ہتھیلیوں کو تکتے ہوئے بولی جو لگ رہا تھا حقیقت میں خالی ہی ہوگئی تھیں۔

''صبر کر بیٹی۔'' تائی میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''تائی میرے دل کو صبر ہی تو نہیں آتا، لگتا ہے ہر طرف اندھیرا ہے۔ جس ماں کی گود میں سر رکھ کے میں اپنی تکلیفوں پر سارے آنسو بہا دیتی تھی، جس باپ کا ہاتھ تھام کے مجھے جلتی دھوپ میں بھی تحفظ کا احساس ہوتا تھا وہ دونوں آج مجھے میسر نہیں ہیں۔'' میں بلک بلک کے رونے لگی۔ تائی مجھے گلے لگا کر تسلی دینے لگیں مگر مجھے لگا تھا ہر حرفِ تسلی بیکار ہے۔

میں دن رات ظہیر الدین کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ میرے لبوں پر ہمہ وقت شوہر کی تندرستی کی دعائیں ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر نے ظہیر الدین کا آپریشن بتایا تھا مگر اس میں رسک تھا۔ ڈاکٹرز نے بتادیا تھا کہ اگر آپریشن کامیاب ہوگیا تو وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکتے ہیں مگر یہ خدشہ بھی ظاہر کردیا تھا کہ آپریشن ناکام ہونے کی صورت میں وہ ساری زندگی کے لیے اپاہج ہوسکتے ہیں۔

میں نماز سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ تائی میرے پاس چلی آئیں۔ ''بیٹا مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' تائی میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''جی بولیں۔'' میں تائی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''ایک قسم کھاؤ۔'' وہ میرا ہاتھ تھامتی ہوئی بولیں۔

کیسی قسم میں پریشانی سے تائی کو دیکھنے لگیں۔

''اگر خدانہ کرے یہ آپریشن ناکام ہوگیا تو بھی تم میرے

بیٹے کو نہیں چھوڑو گی۔ میں جانتی ہوں میں بہت خودغرض ہورہی۔'' روتی ہوئی بولیں۔

ان کی بات پر میں تڑپ کے رہ گئی۔ ''میں مرنہ جاؤں جو کبھی ظہیرالدین کو چھوڑوں، مجھے ان سے محبت نہیں عشق ہے مگر میں پھر بھی آپ سے وعدہ کرتی ہوں کسی بھی موڑ پر زندگی کے ظہیرالدین کو نہیں چھوڑوں گی۔'' میں ان کا ہاتھ تھامتی ہوئی ان کو یقین دلاتے ہوئے ہچکیوں سے روتی ہوئی بولی۔

اللہ نے ہماری دعائیں سن لی تھیں۔ آپریشن کامیاب ہوگیا تھا۔ ظہیرالدین کچھ ماہ بعد دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے تھے۔ واجد اپنی بیوی کے ساتھ شہر میں ہی شفٹ ہوگیا تھا۔ شکیل پڑھائی کی غرض سے باہر ملک چلا گیا تھا۔ تائی کو بھی ظہیرالدین نے اپنے پاس ہمیشہ کے لیے شہر بلالیا تھا۔ سب اپنی زندگیوں میں مصروف ہوگئے تھے مگر میرے دل میں اکثر و بیشتر ماں باپ کی یاد جب اٹھتی تو وہ وقت میرے لیے بڑا کربناک ہوتا تھا۔

رات میں کسی کام سے اپنے کمرے سے نکلی تو تائی کے زور زور سے بولنے پر میں گھبرا کر ان کے کمرے کی طرف بڑھی جہاں فوزیہ ان کے پاس بیٹھی بری طرح سے رو رہی تھی۔ ''کیا ہوا خیر تو ہے؟'' میں قدرے گھبرائے لہجے میں بولی۔

''تمہارا بھائی مرگیا اس لیے رو رہی ہے۔'' تائی چیخ کر بولیں۔ ان کے اس طرح بولنے پر میرا دل لرز گیا۔

''اللہ نہ کرے فوزیہ۔'' تڑپ کر بولی۔

'' جب اتنی شوہر کی فکر کھا رہی ہے تو میرے پاس بیٹھ کر کیوں رو رہی ہو۔'' تائی اس کے بولنے پر تپ کر بولیں۔

ظہیرالدین بھی گھبرا کر وہاں آگئے تھے۔ تائی کی بات پر انہوں نے واجد کو فون کرکے گھر آنے کو بولا تھا تھوڑی دیر بعد واجد بھی وہاں موجود تھا۔

''فوزیہ کیا بول رہی ہے؟'' میں بھائی کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک بول رہی ہے میں نے دوسری شادی کرلی ہے۔ مجھے کبھی بھی یہ پسند ہی نہیں تھی۔'' واجد کی صاف گوئی پر میں حق دق اس کی صورت دیکھ رہی تھی جبکہ تائی اور ظہیرالدین کا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہورہا تھا۔

میری نظر فوزیہ پر پڑی جو اب رو نہیں رہی تھی بس ساکت چہرے سے بیٹھی تھی۔ مجھے اس لمحے اس پر بے انتہا رحم آیا اور اپنے بھائی سے نفرت محسوس ہوئی۔ واجد کے انداز میں خودسری دیکھ کر مجھے کافی افسوس ہورہا تھا وہ وہاں سے چلا گیا تھا اور اگلے دن ہی اس نے ہمارے سر پر طلاق کے کاغذات بھیج کر بم پھینک دیا تھا۔ طلاق کے بعد فوزیہ بہت زیادہ بیمار رہنے لگی تھی۔ مجھے اپنا آپ چور چور سا محسوس ہوتا تھا۔ تائی کے چہرے پر مجھے دیکھتے ہی ناگواری سی آجاتی تھی ظہیرالدین بھی کافی چپ چپ سے رہنے لگے تھے۔

''میں نے بہت محبت کی تھی بھابی واجد سے، میں نے سر تا پیر خود کو بدل لیا تھا مگر میں روز اوّل سے ہی ان کے دل پر کبھی چڑھی ہی نہیں۔ مجھے بہت افسوس ہوتا ہے، اماں نے کیوں زبردستی مجھے ان کی زندگی میں شامل کیا۔ میں خود بھی چاہتی تھی ان کی زندگی میں شامل ہونا مگر ان چاہا ہونے کا کرب انسان کے پورے وجود کو آہستہ آہستہ دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔'' وہ میرے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رودی۔ اس کے ساتھ میں بھی آنسو بہا رہی تھی۔ مجھے اس کا دکھ رلا رہا تھا۔

''مجھے معاف کردو فوزیہ۔'' میں بھرائے لہجے میں بولی۔

''نہیں بھابی اس میں آپ کا کیا قصور۔'' وہ میری بات پر بولی۔ مجھے واجد پر ملال تھا اس نے مصنوئی چمک دمک کے خاطر کیا ہیرا گنوا دیا تھا۔ فوزیہ کی بیماری نے ہم سب کو ہی فکر میں مبتلا کردیا تھا۔ میں اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے تھے۔ رپورٹ آنے پر لگ رہا تھا کہ کسی نے ہمارے پیروں تلے زمین نکال دی ہو۔ فوزیہ کو کینسر تھا وہ زیادہ عرصہ اس بیماری سے جنگ لڑ نہیں سکی اور زندگی کو شکست دے گئی۔ اس کی موت ایسا سانحہ تھا جس نے ہم سب کو توڑ کر رکھ دیا تھا، تائی فوزیہ کی موت کے بعد بالکل ٹوٹ کر رہ گئی تھیں۔ وہ خاموش ہوگئی تھیں۔ ان کی خاموشی مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ ظہیرالدین بھی کافی چپ چپ سے رہنے لگے تھے۔ ان کے انداز میں اب میرے لیے پہلے جیسی گرم جوشی نہیں رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں مجھے ڈھیروں شکوے نظر آتے تھے مگر وہ مجھ سے کچھ بولتے نہیں تھے۔ میرا دل چاہتا تھا جو بھی ان کے دل میں ہے وہ بول کر اپنی بھڑاس نکال لیں۔ میں جانتی تھی ان کے دل و دماغ میں مجھے لے کر بہت سی باتیں ہوں گی۔ میں ہر طرح سے بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصوروار تھی۔ فوزیہ کی موت میں واجد کا ہی ہاتھ تھا اس کی بے اعتنائی نے اسے اندر ہی اندر کھالیا تھا۔

میں اپنے کمرے میں لیٹی ظہیرالدین کا انتظار کررہی تھی جب کافی دیر ہوگئی اور وہ کمرے میں نہیں آئے تو میں اٹھ کر کمرے سے ان کو دیکھنے چلی گئی۔ باتوں کی آواز تائی کے کمرے سے آرہی تھی۔

تائی کی بات نے میرے قدم جکڑ لیے تھے۔ ''تمہاری بہن عصمت کے بھائی کی وجہ سے مرگئی اتنی اذیت سہی میری بیٹی نے اور تم اس کی بہن کو اتنے سکون سے رہنے دے رہے ہو۔ جس اذیت سے تمہاری بہن گذری اس کو بھی اس اذیت سے گزارو تا کہ اسے پتا چلے کہ کیا تکلیف ہوتی ہے۔'' تائی بے رحمی سے بولیں۔ ان کی بات پر میں نے اپنے چکراتے وجود کو تھامنے کے لیے دیوار کا سہارا لیا۔ میری سماعتیں ظہیر الدین کی بات کی منتظر تھیں۔ ''اماں مگر اس میں عصمت کا کیا قصور، اس کو بھی اتنا دکھ ہے جتنا ہمیں ہے۔'' شوہر کی بات پر میرے دل کو ڈھارس ملی تھی۔

''اس کو وہ دکھ کہاں ہوگا جو بیٹا ایک ماں کے دل کو ہوتا ہے ماں کا دکھ سب دکھوں پر حاوی ہوتا ہے، ٹھیک ہے بیٹا تم پھر اس گھر میں رہو اپنی بیوی کے ساتھ میں واپس گاؤں جاؤں گی۔'' تائی کی بات پر میرا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

''اماں آپ کیا چاہتی ہیں؟'' ظہیر الدین بے چارگی سے بولے۔

میرا دل چاہا میں اپنے کان بند کرلوں اور تائی کی آواز نہ سنوں مگر مجھے اپنی سزا سننی تھی یہ دنیا کا دستور ہے کہ زور ہمیشہ کمزور پر چلتا ہے، کرتا کوئی ہے بھرتا کوئی ہے۔ میں اپنی سزا سننے کے لیے مضبوطی سے کھڑی تھی مگر دل میرا لگ رہا تھا کسی بھی وقت ڈھے جائے گا۔

''ظہیر الدین کھاؤ میرے سر کی قسم، تم عصمت سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے وہ تمہاری بیوی رہے گی مگر اس گھر میں تم اس کے ساتھ کسی اجنبی کی طرح زندگی گزارو گے تم اس کی طرف دیکھو گے نہیں۔'' تائی کے فیصلے پر میں چکرا سی گئی۔

''اماں یہ کیسی بات کر رہی ہیں؟'' ظہیر الدین بے یقینی سے بولے۔

''ٹھیک ہے پھر اپنی ماں کا مرا منہ دیکھنا۔'' تائی کی سرد آواز گونجی۔ میں کمرے کے باہر کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ مجھے پھانسی کی سزا سنا دیتیں مگر پل پل مرنے کے لیے نہ بولتیں مگر وہ بھی تو مجھے اس درد سے آشنا کرنا چاہتی تھیں جس درد سے ان کی بیٹی گذری۔

❀❀❀

''آپا مجھے یقین نہیں آرہا کہ ظہیر بھائی ایسی حرکت کریں گے نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔ مجھے ظہیر بھائی جیسے دانشمند انسان سے ایسی توقع نہیں تھی۔'' واجد کال پر مجھ سے غصے میں بولا۔

''چھوڑو میرے بھائی تم یہ بتاؤ تم تو اپنی زندگی میں خوش ہو۔'' میں اس کی بات پر بولی، میری بات پر وہ چپ سا ہوگیا۔

''آپا زندگی گزارنے کو سب کا حق ہے اور میں شروع سے فوزیہ کو پسند نہیں کرتا تھا بس اس وقت یہ غلطی ہوئی کہ میں ابا کے فیصلے سے انکار کردیتا۔'' واجد بولا۔

''ہاں تم انکار کردیتے تو کم از کم تین زندگیاں برباد نہیں ہوتیں مگر تم تو خوش ہو نا اپنے گھر میں، خوش باش رہو ہنستے مسکراتے رہو، تم جیسے بھائی ہی تو ہوتے ہیں جن کی بہنوں کے دلوں سے صرف ان کے لیے آہیں ہی نکلتی ہیں۔ تم میرے بھائی ہو میرا خون، میں نے تمہارا خیال ایسے ہی کیا جیسے اپنی اولاد کا، تم یہ نہ سمجھنا میں تم کو جتا رہی ہوں مگر تم یہ سب کرتے ہوئے ایک بار کچھ تو سوچتے مگر تم نے تو بس اپنی زندگی کو خوشحال بنانا تھا چاہے دوسروں کے دل مقبرے بن جائیں مگر تم خوش رہو۔''

''مگر میں کیا کرتا۔ میرے سامنے اور کوئی راستہ نہ تھا۔''

واجد کی بات پر میں بے رحمی سے ہنس دی۔ ''تم نے بھی تو بس سزا سنائی تھی اور چلتے بنے اپنی دنیا بسانے، پلٹ کر تو دیکھ لیتے کہ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی جڑا تھا، تم نے اس کو چھوڑا بھی کس بنیاد پر کہ وہ کم صورت تھی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ وہ تمہاری خاطر کس قدر خود کو بدل چکی تھی۔''

''ٹھیک بول رہے ہو۔'' تم کو یہی کرنا چاہیے تھا جب ابا جی نے حکم دیا تھا تم کو سر جھکا کر اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے تھی بلکہ سر اٹھا کر اس وقت منع کردیتے، تمہاری اس نہ سے کچھ دن تکلیف ہوتی ابا کو مگر اتنی نہیں ہوتی جتنی آج ان کی روح کو تکلیف پہنچی ہوگی۔ تم نے تو بھائی ہونے کا حق ادا نہیں کیا مگر ظہیر الدین نے ضرور ادا کردیا۔ ان کے اس عمل سے کیا پتا ان کی ماں کے جلتے دل کو ٹھنڈک ہی پہنچ جائے اور میرا کیا ہے میرے نصیب میں تو اب جلنا عمر بھر کا ہے۔'' بولتے بولتے میرے گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹکنے لگا تو میں نے فون بند کردیا۔ فون رکھنے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

شکیل نے باہر شادی کرلی تھی۔ اس نے پاکستان لوٹ کر آنا ضروری نہیں سمجھا اور واجد نے شروع شروع میں بات کرنا چاہی مگر میرے سرد انداز پر اس نے پھر پلٹ کر کبھی کوئی رابطہ نہیں کیا کیونکہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ اس بہن کو اپنی زندگی سے خارج کرچکا تھا جس بہن نے اسے اتنی محبت چاہت دی، اپنے بچوں کی طرح چاہا یہاں تک کہ اس کے کیے کی سزا بھی بھگتی اور ایسی سزا جس میں روح تک بلبلا جاتی تھی۔ ظہیر الدین نے اماں کی قسم کے بعد مجھ پر کبھی نظر نہیں ڈالی۔

آہستہ آہستہ میں نے ان کے سامنے آنا بھی چھوڑ دیا۔ میں نے اپنی ذات کو کمرے تک محدود کرلیا تھا مگر کھانا پکانا اور جو ان سے وابستہ کام تھے خود کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ میں ابھی بیاہتا ہوں مگر میں ظہیر کے کمرے کی طرف رخ بھی نہیں کرتی تھی کیونکہ ظہیر الدین کو پسند نہیں تھا کہ میں اس طرف آؤں بھی۔

اماں کا کچھ برس بعد انتقال ہوگیا تھا۔ ثاقب کی شادی میں نے دور پرے کے رشتے داروں میں سادگی سے گھر پر ہی کردی تھی۔ دھوم دھام سے کرتی تو دنیا کو میرے اور ظہیر الدین کے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ ہوتا۔ نصرت میری بہت اچھی بہو ثابت ہوئی بیٹی کی کمی بھی نصرت کے آنے سے پوری ہوگئی تھی۔ کچھ وقت بعد نصرت میرے اور ظہیر الدین کے تعلقات کو جان گئی تھی مگر اس نے کبھی کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔ دوسری جانب ثاقب میرے اور ظہیر الدین کے تعلقات پر بہت دکھی رہتا تھا۔ ایک رات ظہیر الدین کی طبیعت کافی بگڑ گئی اس سے پہلے ثاقب ان کو اسپتال لے کر جاتا اس کی نوبت ہی نہ آئی اور ظہیر الدین خالق حقیقی سے جاملے اور اس دن میں نے اپنے کمرے کی اس کھڑکی کو بھی بند کردیا تھا جس سے چھپ کر میں ان کو خاموشی سے آتا جاتا دیکھتی تھی۔ میرے جینے کا واحد سہارا ان کو چپ چاپ اس کھڑکی سے دیکھنا ہی تو تھا مگر ان کی موت کے بعد وہ کھڑکی میں نے کبھی نہیں کھولی تھی کیونکہ اب اس کھڑکی سے دیکھنے کو میرے پاس کچھ بچا نہیں تھا۔ ظہیر الدین کی وفات کے بعد جب میں اس کمرے میں داخل ہوئی جس میں میری بہت ساری یادیں جڑی تھیں اور جس کو چھوڑے مجھے ایک عرصہ بیت گیا تھا، میں نے اس کمرے میں قدم رکھا تو مجھے محسوس ہوا میرے دل کے ساتھ اس کمرے کے در و دیوار بھی رو رہے ہیں۔ میں اس کمرے میں کھڑی ظہیر الدین کے ہونے کا احساس محسوس کر رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی سیل رواں جاری تھا میری نظر ظہیر الدین کے بستر پر رکھے تکیے پر پڑی جس کے نیچے سے سفید رنگ کا کاغذ جھانک رہا تھا۔ میں آہستگی سے بیڈ پر بیٹھ گئی اور اس کاغذ کو اٹھا کر کھول لیا۔ اس پر ظہیر الدین نے کچھ لکھا ہوا تھا میں اس کو پڑھنے لگی۔

”پیاری عصمت کیسی ہو یہ خط لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں کیونکہ میں اس قابل نہیں کہ تم سے مخاطب ہو سکوں مگر ایک دعا کرتا ہوں جیسا وقت اور جیسی زندگی میں نے گزاری خدا کسی دشمن پر بھی ایسا وقت نہ لائے۔ ماں کی قسم میرے ان قدموں کو تھامنے کی قسم جو تم تک آتے تھے مگر میرے دل کو نہ باندھ سکی جو تم کو ہی سوچتا تھا۔ میرے یہ ماہ و سال کیسے گزرے میں اگر لکھنے بیٹھوں تو شاید وہ احساسات بتا ہی نہ سکوں، ہاں ان احساسات کو میں صرف دو لفظوں کا نام دوں گا کرب و اذیت، میں جب صحن سے گزرتا تھا اور تم مجھے اپنے کمرے کی کھڑکی سے چھپ کر دیکھا کرتی تھیں تو میں نظروں کو اپنی سختی سے زمین کی جانب مرکوز کرلیتا تھا کہ اگر یہ تمہاری طرف اٹھ گئیں تو پلٹنے سے انکاری ہوجائے گیں۔ روز جیتا روز مرتا تھا۔ دل میں تم سے روز معافیاں مانگتا تھا مگر اماں کی اس قسم نے مجھے اندر سے ختم کردیا تھا۔ میں تمہارا مجرم ہوں ہو سکے تو معاف کردینا“

فقط تمہارا ظہیر الدین۔

”آنسو میری آنکھوں سے بہنے لگے جن کو میں اپنے سفید دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔ ظہیر الدین سے دوری کے بعد میں نے کبھی کوئی رنگ ہی نہیں پہنا تھا۔ ان کے دور ہونے سے میری زندگی کے تمام رنگ ختم ہوچکے تھے اور بس سفید رنگ میرے وجود کا حصہ بن گیا تھا اس سفید رنگ کی بڑی پاسداری کرنی پڑتی ہے، اس پر اگر ایک چھینٹ بھی آجائے تو یہ بڑا بد نما داغ لگتا ہے۔ بس میں نے بھی اس سفید رنگ کی پاسداری کی تھی۔ ایک قسم میں نے اپنی ساس سے کھائی تھی، ان کے بیٹے کو نہ چھوڑنے کی اور ایک قسم ان کے بیٹے نے کھائی تھی میرے ہوتے ہوئے بھی مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھنے کی۔ ہم دونوں ہی اس قسم کو آخری دم تک نبھاتے رہے۔ عورت کے لیے بڑی کرب کی بات ہوتی ہے جب وہ شوہر کے ہوتے ہوئے بھی بیوہ والی زندگی گزارے۔ میرا حال بھی اس بیوہ جیسا تھا جو شوہر کے ہوتے ہوئے بھی بیوہ تھی۔“

☆☆☆

”یہ کیسی انوکھی قسم تھی دادو جو آپ دونوں کو اتنا دور کر گئی۔“ دادو جو بولتے بولتے تھک سی گئی تھیں میری بات پر ان کے لبوں پر اداسی سی مسکراہٹ آگئی۔

”کچھ قسمیں ایسی ہوتی ہیں جن میں آپ کا دل چیخ چیخ کر اس قسم کو توڑنے کی دہائیاں دیتا ہے مگر حقیقت میں ان قسموں کی پاسداری کرنی پڑتی ہے!“

دادو کی بات پر میرا... دل جو پہلے ہی دکھی تھا اس پر مزید بجھ سا گیا آج مجھے دادو کی آنکھوں میں ٹھہرے دکھ کا مطلب سمجھ آچکا تھا۔

++

آہ.....!

محترم مدیر
السلام علیکم!
ایک اور سچ بیانی ارسالِ خدمت۔ یہ سچ بیانی اتنی پھیلی ہوئی ہے کہ اسے سمیٹنا مشکل تھا۔ دو دہائی پر مشتمل ہے۔ پہلے سوچا تھا کہ صرف مسز عباسی اور بینش کے حالات لکھوں گا تاکہ کہانی بڑھ نہ جائے۔ ایک بار لکھ کر تیار کیا تو خیال آیا کہ روبی کی کہانی الگ کردینے سے مزہ نہیں آرہا اسی لیے اسے بھی شامل کر لیا۔ اُمید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

عمران قریشی
(کوئٹہ)

زیب النساء اپارٹمنٹس کی عمارت سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ تین سال قبل جب میں نے اپارٹمنٹ کو چھوڑا تھا۔ تب روبی کے علاوہ وہاں کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ گیٹ کے پاس مجھے سونو کی شبیہہ دکھائی دی۔ وہ یہاں کھڑے ہوکر میرا انتظار کرتا تھا کیونکہ روبی کے پاس اس کے لیے وقت نہیں تھا۔ روبی نہایت سوشل شخصیت کی مالک تھی۔ خیراتی اداروں کے لیے رقم جمع کرنا، یتیم خانے کے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے جدوجہد کرنا۔ یہ سب اس کا نصب العین ہونے کے باوجود بھی زندگی کا مقصد نہیں تھا۔ وہ صرف سوشل رہنے کے لیے یہ سب کرتی تھی۔ کتنی حیرت کی بات تھی۔ خیراتی اداروں اور یتیم بچوں کی پرورش کا احساس رکھنے والی روبینہ علی اپنے گھر میں رہنے والے بغیر ماں کے بچے کے احساسات سے نا آشنا تھی۔ وہ ماں کی محبت کو ترستا رہا۔ آخر کار اسی آگ میں

جلتے ہوئے فنا ہوگیا۔ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی مسز عباسی نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟ مستقبل کا آغاز پُرجوش انداز کے ساتھ کرو اور ماضی کو بھلا دو۔“

میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”پاگل خانے سے واپس آنے والے مریض کو کون اپنی زندگی کا حصہ بناتا ہے۔ روبی تو ویسے بھی رکھ رکھاؤ کی بہت عادی ہے۔ میرے داغ دار ماضی کے ساتھ نا جانے مجھے قبول کرے گی یا نہیں۔“

مسز عباسی بولیں۔ ”اگر اس نے ایسا کیا۔ تب میرے پاس چلے آنا۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ ویسے کچھ دیر تک میں یہیں کھڑے ہو کر انتظار کروں گی۔ جب تم اپنی گیلری میں کھڑے ہو کر ہاتھ ہلاؤ گے تب میں جاؤں گی۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ زندگی ویسے ہی رواں دواں تھی جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ہاں زیب النساء اپارٹمنٹ میں ایک فرد کی کمی ہوگئی تھی۔ میں اسے بھلا دینا چاہتا تھا لیکن یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ گیٹ کو عبور کرکے میں عمارت کے اندر داخل ہوگیا۔ سیکیورٹی اہلکار تبدیل ہوگئے تھے۔ جن کی ڈیوٹی تھی وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ میں نے اپنا نام بتا کر روبینہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اہلکار نے انٹرکام پر نمبر ملایا اور چند لمحے گفتگو کے بعد مجھے بتایا کہ وہ نیچے آرہی ہے۔ برآمدے کے ساتھ لفٹ کا دروازہ تھا۔ اسے وہیں سے نمودار ہونا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ سونو کی پیدائش سے قبل میں نے مہوش کو اپارٹمنٹ کے کاغذات تحفے میں دیئے تھے۔ وہ کتنا خوش ہوئی تھی مگر ہماری خوشیوں کو دنیا والوں کی نظر لگ گئی۔ دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران اس کی طبیعت خراب ہوئی اور اسپتال پہنچنے کے دو گھنٹے کے بعد زچہ و بچہ کی موت واقع ہوگئی۔

لفٹ کا دروازہ کھلا اور خوبرو روبینہ برآمد ہوئی۔ اس کے چہرے کے خدوخال میں کوئی ردوبدل نہیں ہوا تھا۔ بال شانوں تک کٹے ہوئے، آنکھیں بڑی بڑی، ناک ستواں، ہونٹ پتلے۔ وہ ٹراؤزر اور شرٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے ساتھ دو ڈھائی سال کا لڑکا بھی تھا۔ لفٹ سے نکلنے کے بعد وہ تیر کی مانند میری طرف آئی۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا لیکن اس نے موقع نہیں دیا اور دبے دبے لہجے میں بولی۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟ واپس چلے جاؤ۔ یہاں اب تمہارے لیے [illegible] ختم ہوگیا ہے۔“

میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”پاگل خانے سے ڈسچارج ہونے کے بعد مجھے اور کہاں جانا چاہیے تھا۔ تم میری بیوی ہو اور یہ اپارٹمنٹ میری ملکیت ہے۔“

وہ بات کو درمیان میں کاٹتے ہوئے بولی۔ ”کون سی بیوی اور کس کی بیوی۔ ہمارے درمیان تین سال قبل طلاق ہوچکی ہے اور میں نے جاوید کے ساتھ شادی کرلی ہے۔“

مجھے اپنے سر پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بولے چلے جارہی تھی۔ ”تمہیں شاید سمجھنے میں دشواری پیش آئے۔ تاہم اگر پاگل خانے جانے سے قبل اپنی حالت کو دیکھ پاتے، تو بہ آسانی اندازہ لگا لیتے کہ تمہارے ساتھ کسی عورت کا زندگی گذارنا کتنا مشکل اور صبر آزما ہوسکتا تھا۔ میں نے مجبوراً تم سے طلاق لے لی۔ تم ناراض نہ ہونا لیکن اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔“

میں نے سر کو جھٹک کر معطل ہوتے ہوئے حواسوں کو بحال کرنے کی کوشش کی اور پوچھا۔ ”کارخانے کا کیا ہوا؟“

روبی کے چہرے پر ایک رنگ آکر گذر گیا۔ وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ ”تمہارے پاگل خانے جانے کے بعد اسے سنبھالنے والا یہاں کوئی نہیں تھا، اس لیے چند مہینوں کے دوران دیوالیہ ہوگیا۔ تب ہم نے اسے اونے پونے داموں فروخت کردیا۔“

میں چلّاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میری اجازت کے بغیر تم ایسا نہیں کرسکتیں۔ میں اس کا مالک ہوں۔ تم نے میرے ہوتے ہوئے اسے کیسے فروخت کردیا۔“

روبی نے میرے سوال کی جانب قطعاً دھیان نہیں دیا اور بے چین نگاہوں سے لفٹ کی جانب دیکھتے ہوئے پریشان لہجے میں بولی۔ ”خدا کے واسطے یہاں سے چلے جاؤ۔ جاوید کو پتا چلا تو میری زندگی تباہ ہوکر رہ جائے گی۔ تم نے جو کچھ پوچھنا ہے، اپارٹمنٹ کے نمبر پر فون کرکے پوچھ لینا لیکن دوبارہ یہاں مت آنا۔“

وہ جھٹکے کے ساتھ مڑ کر لفٹ کی طرف چلی گئی۔ میں بہت کچھ کہنا اور سننا چاہتا تھا لیکن اس نے موقع نہیں دیا۔

مجھے اور مسز عباسی کی لڑکی بینش کو آج صبح ہی پاگل خانے سے ڈسچارج کیا گیا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اسی لیے مسز عباسی نے پاگل خانے سے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔

روبی کے جانے کے بعد سیکیورٹی اہلکار مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں مڑ کر مسز عباسی کی گاڑی کی طرف آ گیا۔ وہ میری منتظر تھیں۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد انہوں نے پوچھا۔ ''تو اس نے تمہیں ٹھکرا دیا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں تین سال قبل ہم دونوں کے درمیان طلاق ہو چکی ہے۔ ایک پاگل آدمی کا کون انتظار کر سکتا ہے۔ وہ شادی کرنے کے بعد ایک بچے کی ماں بھی بن چکی ہے۔''

مسز عباسی کے چہرے پر حیرت کے تاثرات پیدا ہوئے۔ تاہم کچھ پوچھنے کی بجائے انہوں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور سڑک پر لے آئیں۔ وہاں ٹریفک کا اژدہام تھا۔ انہوں نے مضافات جانے والے راستے پر گاڑی ڈال دی۔ میرا دل پریشان تھا اور میں بات کرنا چاہتا تھا اس لیے افسردہ لہجے میں بولا۔ ''میں بہت بدنصیب ہوں مسز عباسی۔ میرے ساتھ اس سے قبل بھی ایسا ہوا ہے۔ زندگی جب ہنسنے لگتی ہے، تب اچانک ہی سب کچھ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ مجھے یہ شہر راس نہیں آیا۔ ماموں کا اصرار تھا کہ میں مہوش سے شادی کے بعد ان کی گارمنٹس فیکٹری کو سنبھالوں۔ مجبوراً یہاں آ گیا۔ مہوش شہر میں رہنے کے باوجود بھی گاؤں کی روایات کی پابند تھی۔ اس نے مجھے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں نے شہر میں رہنے والی لڑکی سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔ وہ میری خوشی میں اپنی خوشی کو تلاش کرتی تھی۔ ماموں کی وفات پر وہ بہت اپ سیٹ ہو کر رہ گئی۔ تب میں نے اپارٹمنٹ خرید کر اس کے نام کیا اور ہم گلشن اقبال والی کوٹھی کو چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ سونو یہیں پیدا ہوا لیکن دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران مہوش کی موت واقع ہو گئی۔ سونو صرف دو سال کا تھا۔ اسے سنبھالنے کے لیے مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت تھی۔ میں نے مجبوراً روبینہ سے شادی کر لی۔ جو میری بہت بڑی غلطی تھی۔ شادی سے پہلے سب کچھ ٹھیک ٹھاک دکھائی دیتا ہے، منافقت کا پردہ تو معاملہ طے ہونے کے بعد چاک ہوتا ہے۔ وہ شادی سے پہلے کچھ اور تھی اور شادی کے بعد اس کا کچھ اور ہی روپ سامنے آیا۔ ہر چند کہ اس نے کبھی بھی سونو کے ساتھ سوتیلی ماؤں جیسا سلوک نہیں کیا۔ تاہم اسے ایک ذمہ دار ماں کا پیار بھی نہیں دیا۔ دوستوں کے ساتھ پارٹیوں میں جانا۔ افتتاحی تقاریب میں مہمان خصوصی بننا۔ وہ بہت مصروف ہو گئی تھی۔ میرے اور سونو کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا اور وقت کی اس کمی اور دوری نے وہ سب کچھ کر دیا جس نے مجھے ہوش و حواس کی دنیا سے دھکیل کر اندھیروں کی اتھاہ گہرائیوں کا حصہ بنا دیا۔ اف خدایا۔ میں زندہ کیوں ہوں۔ مجھے اسی وقت مر جانا چاہیے تھا۔''

مسز عباسی نے پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے گاڑی کو سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا۔

میں نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور ڈیش بورڈ کی جانب جھک گیا۔ پھر نہایت درد بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں ان لمحات کو یاد نہیں کرنا چاہتا ہوں لیکن شاید ان سے چھٹکارا میرے لیے ممکن نہیں۔'' میرا چہرہ پسینے سے تر ہونے لگا۔

مسز عباسی نے بوکھلائے ہوئے انداز میں ڈیش بورڈ پر رکھی منرل واٹر کی بوتل اٹھائی اور میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے احساسات کو محسوس کر سکتی ہوں۔ تاہم مجھے معلوم نہیں کہ تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا؟ جس نے تمہیں تباہ و برباد کر دیا۔ بس اتنا کہوں گی کہ ہمت اور صبر سے کام لو۔ دنیا میں رہنے کے لیے بہت کچھ صبر اور خاموشی کے ساتھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی میری لڑکی کو دیکھ لو، وہ اتنی سی عمر میں پاگل خانے جا کر واپس آئی ہے۔ یہ اس کے کھیلنے کودنے کے دن تھے لیکن لوگوں نے اسے تماشا بنا کر نفسیاتی مریض بننے پر مجبور کر دیا۔ یہ میری اکلوتی اولاد ہے۔ اس کے پیدا ہونے پر جب ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ یہ گونگی اور بہری ہے، اسی دن سے میری پریشانیوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اچھی تعلیم دلائی۔ لوگوں سے ملنے جلنے پر مجبور کیا۔ وہ ان کے طعنوں کو سننے کے قابل نہیں تھی ورنہ خودکشی کر لیتی لیکن مجھے برداشت کرنا پڑتے تھے۔ کتنے لوگ میری موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے کہتے تھے۔ ''بینش چاند کی طرح پاک معصوم اور پریوں کی طرح خوبصورت ہونے کے باوجود بھی مکمل نہیں ہے۔ اس پر معذوری کا گرہن لگا ہوا ہے۔ میں نے سب کچھ خاموشی کے ساتھ برداشت کیا اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ لوگوں کی باتیں سننے کے قابل نہیں ہے۔'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئیں۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ طلاق کے بعد تمہارے اپارٹمنٹ میں کس حیثیت سے رہ رہی ہے۔ اسے فوراً وہاں سے باہر نکالو۔''

میں نے قیاس آرائی کی۔ ''پاگل خانے میں علاج کے دوران اس نے مجھ سے طلاق کے کاغذات پر دستخط

کروالیے تھے۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اپارٹمنٹ اور کارخانے کو بھی اپنے نام کروالیا ہو۔''

مسز عباسی بولیں۔ ''میں اپنے وکیل سے مشورہ کرتی ہوں۔ اسے کوٹھی پر بلالیتی ہوں تاکہ تفصیل کے ساتھ بات چیت ہوسکے۔'' انہوں نے ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا موبائل اٹھایا اور نمبر ملانے کے بعد رابطہ استوار ہونے پر وکیل کو کوٹھی آنے کے لیے کہا۔ گاڑی نے موڑ کاٹا اور رہائشی کالونی میں داخل ہونے کے بعد وسیع و عریض گیٹ کے سامنے رک گئی۔

☆☆☆

ایڈووکیٹ شمیم اختر کا شمار ملک کے مایہ ناز وکیلوں میں ہوتا تھا۔ ان کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ میرے معاملے پر نظرثانی کے بعد بولے۔ ''ہوش وحواس سے بیگانے انسان کے کسی بھی عمل کو قانون میں اہمیت حاصل نہیں۔ حتیٰ کہ اگر اس دوران اس سے قتل بھی سرزد ہوجائے تب سزا معاف کردی جاتی ہے۔ جائداد کی منتقلی والی بات تو بالکل بھی قابلِ ہضم نہیں۔''

مسز عباسی بولیں۔ ''تو پھر آپ کل ہی روبینہ کے خلاف مقدمہ دائر کردیجیے۔ ہمیں نہ صرف اپارٹمنٹ کے کاغذات واپس چاہیے بلکہ گارمنٹ فیکٹری کے مالکانہ حقوق بھی۔''

شمیم صاحب بولے۔ ''میرے خیال میں کورٹ کچہری کے چکر میں پڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ روبینہ عدالت جانے کی دھمکی پر ہی ہمارے حق میں دستبردار ہوجائے گی۔ عدالت جانے کی حماقت پر جہاں اسے سبکی کا سامنا کرنا پڑے گا وہاں جایداد کے ہاتھ سے جانے کے بعد ہتک عزت کے طور پر جرمانہ بھی بھرنا ہوگا۔ آپ مجھے کچھ وقت دیجیے۔ میں اس سے بات چیت کرنے کے بعد آپ سے دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔''

مسز عباسی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے۔ آپ بات چیت کرکے دیکھ لیجیے۔ اگر جائداد بہ آسانی مل جاتی ہے تو اس سے اچھی اور کیا بات .... ہوسکتی ہے۔ آپ کوشش کرکے دیکھ لیجیے۔ ہم کچھ انتظار کرلیتے ہیں۔''

شمیم صاحب نے معاملے کی باریک بینی پر مختصر بات چیت کی۔ پھر ضروری کاغذات جو میری فائل میں موجود تھے۔ ہمراہ لے کر رخصت ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد مسز عباسی مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ''جب تک تمہاری جائداد کا مسئلہ حل نہیں ہوجاتا۔ تب تک تم یہیں رہو... اور اگر مناسب جانو تو مجھے ان حالات سے آگاہ کردو جس کی وجہ سے تمہیں پاگل خانے جانا پڑا۔''

میرے چہرے پر کرب کے تاثرات پیدا ہوئے۔ میں وہ سب کچھ دہرانا نہیں چاہتا تھا جن کو سوچ کر ہی میری سانس سینے میں اٹکنے لگتی تھی لیکن مسز عباسی کے خلوص اور محبت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے انکار کرنا مناسب خیال نہیں کیا اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ہمکلام ہوا۔

''بات زیادہ لمبی نہیں... اور مجھے یقین ہے کہ اسے بیان کرتے ہوئے میں دوبارہ پاگل ہوسکتا ہوں مگر آپ کے اصرار کو رد نہیں کرسکتا۔ اس لیے بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مہوش کی وفات کے بعد سونو لی عمر غالباً تین سال تھی۔ میں اس کے لیے بہت پریشان تھا۔ میرے کارخانے میں کام کرنے والی روبی نے میری پریشانی کو بھانپ لیا اور میرے ساتھ اپارٹمنٹ آنا جانا شروع کردیا۔ وہ سونو پر خصوصی توجہ دیتی۔ اس کے کپڑے تبدیل کرتی۔ اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاتی پلاتی۔ رات گئے تک اسے بہلانے کی کوشش کرتی۔ اکثر و بیشتر اسے واپس جاتے ہوئے بارہ بج جاتے۔ میں اسے رخصت کرتے ہوئے اپنا قیمتی وقت برباد کرنے پر تاسف کا اظہار کرتا تھا۔ وہ جواب دیتی کہ اسے سونو کی نگہداشت میں خوشی محسوس ہوتی ہے... پھر کم وبیش روزانہ ایسا ہونے لگا کہ وہ آفس ٹائم میں مجھ سے اجازت لیے بغیر اپارٹمنٹ چلی جاتی۔ سونو کی دیکھ بھال کے لیے میں نے ایک بوڑھی آیا رکھی ہوئی تھی۔ روبی اس کے ہونے کے باوجود بھی سونو کے کپڑے تبدیل کرتی۔ استعمال والے کپڑوں کو دھوتی۔ اس کی ضرورت کی چیزیں قریبی دکان سے لے کر آتی۔ مجھے آیا کی زبانی سب کچھ معلوم ہوجاتا۔ میں اس کے احسان تلے دب کر رہ گیا تھا۔ مہوش کی وفات کے بعد دوبارہ گھر بسانے کی خواہش دم توڑ چکی تھی لیکن سونو کی خاطر میں نے روبی سے اکیلے میں بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے میرے فیصلے کا نہ صرف خیر مقدم کیا بلکہ مجھے یقین دلایا کہ وہ شادی کے بعد سونو کو اپنے بچوں کی طرح پیار کرے گی۔ ہم نے سادگی کے ساتھ شادی کرلی اور وہ دلہن بن کر میرے اپارٹمنٹ میں آگئی۔ میں ان دنوں کو کبھی بھی بھلا نہیں سکتا۔ آفس سے واپسی کے بعد ہم تینوں باہر نکل جاتے۔ سمندر کے کنارے واقع ریستوران میں کھانا کھاتے اور ٹھنڈی ریت پر چہل قدمی کرتے۔ کئی سال ہنستے مسکراتے گزر گئے پھر پتا نہیں اتنے سال بعد اسے کیا ہوا کہ

اس نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ وہ رات گئے تک اپارٹمنٹ سے باہر رہنے لگی۔ مجھے اپنی فکر نہیں تھی۔ میں سونو کی طرف سے بے پروائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تنہائی کا شکار ہونے لگا۔ نوکروں نے کھانا دیا تو کھالیا، نہیں دیا تو نہیں کھایا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ وہ ان کے رحم و کرم پر تھا۔ دن تیزی کے ساتھ گزرنے لگے۔ سونو آٹھویں سال میں قدم رکھنے کے بعد نہایت حساس اور سنجیدہ طبیعت کا مالک بن گیا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے اپنی ماں کے متعلق پوچھتا تھا۔ میرے پاس اس کو سمجھانے کے لیے وہ الفاظ نہیں تھے جن کی بدولت میں اسے مطمئن کر سکتا۔ تاہم وہ اتنی سی عمر میں باخوبی جان چکا تھا کہ روبی اس کی ماں نہیں ہے، اور مسز عباسی میں اس دن کو کبھی بھی بھول نہیں سکتا۔ جب اس نے مجھے آفس میں ویڈیو کال کی۔''

میں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ میری آنکھوں میں گذرے ہوئے اذیت ناک لمحے رقص کرنے لگے۔ مجھے اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جیسے میرے جسم میں سے آہستہ آہستہ جان کو باہر نکالا جا رہا ہو۔ جیسے آسمان سے نیچے گرنے والے وجود کو اچھی طرح یہ معلوم ہو کہ زمین پر گرنے کے بعد اس کا جسم پاش پاش ہونے والا ہو اور اس پر بے بسی کا عالم طاری ہو گیا ہو۔ مسز عباسی نے میز پر رکھی ہوئی بوتل میں سے پانی گلاس میں انڈیلا اور گلاس کو میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں پانی ختم کیا اور حواس بحال ہونے پر درد بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''سہ پہر کے چار ساڑھے چار بجے کا وقت تھا۔ میں آفس میں کام کر رہا تھا۔ مجھے اس کی ویڈیو کال موصول ہوئی، یہ ہر روز کا معمول تھا وہ دن میں ایک دو کال ضرور کرتا تھا۔ وہ کچن میں تنہا کھڑا تھا۔ میں نے کال کرنے کی وجہ دریافت کی۔ وہ چہرہ کیمرے کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''بابا میں چائے بنا رہا ہوں۔ میں نے صبح برکت سے بنانا سیکھی ہے۔''

باتوں کے درمیان اس نے چولہے کھول لیے۔ گیس نکلنے کی ہلکی پھلکی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔ کچن کی کھڑکیاں اور روشندان بند تھے۔ مجھے اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''چولہے سے دور ہو جاؤ۔ پائلٹ گیس کھلی ہوئی ہے۔''

اس نے میری بات کی طرف قطعاً دھیان نہیں دیا اور کیتلی میں پانی ڈالنے کے بعد اسے چولہے پر رکھ دیا۔ میں نے برکت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے بے پروائی سے بتایا۔ ''وہ سامان لینے اپارٹمنٹ سے باہر گیا ہوا ہے۔'' پھر کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بابا میرے ہاتھوں کی چائے پیو گے۔ میں نے صبح بھی بنائی تھی لیکن اس وقت چینی اور پتی برکت نے ڈالی تھی۔''

اس نے قریب رکھی ہوئی ماچس ہاتھ میں اٹھائی۔ مجھے چولہے میں سے گیس نکلنے کی آواز موبائل سے بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک دفعہ پھر چلاتے ہوئے اسے منع کرنے کی کوشش کی لیکن مسز عباسی اس نے میرے چیخنے پر توجہ نہیں دی۔ اُف میرے خدایا۔ میں اپنے آپ کو کتنا مجبور اور لاچار محسوس کر رہا تھا۔ میں نے بے اختیار ہو کر اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپا اور زار و قطار رونے لگا۔

مسز عباسی پتھر کے بت کی مانند بیٹھیں تھیں۔ میں نے ہچکیوں کے درمیان بتایا۔ ''اس نے میری بات نہیں مانی اور تیلی روشن کر دی۔ مجھے بھک کی آواز سنائی دی اور میں نے وہ کچھ دیکھا جس کو دیکھنے کے بعد میری آنکھوں کو پھٹ جانا چاہیے تھا۔ وہ جل رہا تھا اور میں مجبور و لاچار بنا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں مجھے اپنے دماغ پر ہتھوڑے کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔ مسز عباسی میں نے موبائل کو اٹھا کر دیوار پر دے مارا اور آفس سے نکل کر چیختا چلاتا ہوا گاڑی کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈرائیور گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے اسے اپارٹمنٹ کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ میرا آفس اپارٹمنٹ سے زیادہ دور نہیں تھا پھر بھی مجھے وہاں تک پہنچنے میں بہت دیر ہو گئی۔ اس نے آخری سانس میری بانہوں میں لیا تھا۔ میرا بچہ جل کر مر گیا اور مجھے پاگل خانے بھجوا دیا گیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا لیکن کسی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ زندگی کا کاروبار ویسے ہی چل رہا تھا جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا سوائے اس کے کہ وہ اب دنیا میں نہیں ہے۔'' میں دوبارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

مسز عباسی کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملانے لگے۔ وہ دلاسہ دینے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آ بیٹھیں پھر دستِ شفقت سر پر پھیرتے ہوئے بولیں۔ ''تم پر بہت ظلم ہوا ہے میں جانتی ہوں کہ اسے بھلانا ممکن نہیں۔ تاہم یاد رکھنے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ صبر کرو۔ اسی میں خدا کی رضا ہے۔''

میں زخم خوردہ لہجے میں بولا۔ ''اگر بینش کے ساتھ یہ

سب ہوتا تو کیا آپ اس کو بھی صبر کی تلقین کرتیں۔''

مسز عباسی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گذر گیا۔ وہ کھوکھلی آواز میں بولیں۔ ''اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ جب صبر کی حد پار ہو جاتی ہے۔ تب ہوش وحواس کی دنیا کو مجبور لاچار جسم خیر باد کہہ دیتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ پاگل خانے دماغ پر چوٹ لگنے کی وجہ سے گئی ہے۔ نہیں۔ اس پر بھی بہت بڑا ظلم ہوا تھا۔ تمہاری طرح اس سے بھی بچپن کو چھین لیا گیا اور چھیننے والا اور کوئی نہیں، میرا بھانجا تھا۔ وہ بچپن سے آوارہ طبیعت کا مالک تھا۔ میں اسے اپنی بہن کا بیٹا ہونے کے باوجود بھی قطعاً پسند نہیں کرتی تھی۔ تاہم بہن کے مرنے کے بعد مجھے مجبوراً اسے گھر میں جگہ دینا پڑی۔ میرا کام ایسا نہیں تھا کہ میں اس پر نگاہ رکھ سکتی۔ انہی دنوں تو میرے بوتیک نے ترقی کی راہوں پر آگے بڑھنا شروع کیا تھا۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ مقبول صاحب مجھے اپنی نئی فلم کے لیے خدمات کا موقع دیں گے۔ یہ فلم مکمل طور پر بیرونِ ملک بنانے کی تیاریاں کی جارہی تھیں اور مجھے تمام اداکاروں کے ملبوسات کا بھاری ٹھیکا اور ذمے داری دی گئی تھی۔ یہ میرے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات تھی، ایک گمبھیر چیلنج بھی تھا۔ اگر میں اس چیلنج پر پورا اتر جاتی تو میری بوتیک کی ساکھ میں چار چاند لگ جاتے اُس لیے میں نے اس چیلنج کی تکمیل میں دن رات ایک کر دیے اور وقتی طور پر مہر عباسی کو فراموش کر دیا۔ مجھے اس مصروفیت کے دوران تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ لگا۔ اس عرصے کے دوران میں ہیں وقتاً فوقتاً گھر کا چکر لگاتی رہی۔ حالات بظاہر نارمل رہے۔ لیکن کام مکمل کرنے کے بعد جب میں نے کوٹھی میں قدم رکھا تب بینش کی طبیعت کو ناساز پایا۔ میں نے پریشان ہو کر فیملی ڈاکٹر کو فون کیا۔ وہ چیک اپ کے لیے گھر آ گیا۔ مختصر چیک اپ کے بعد اس نے روح فرسا انکشاف کیا کہ بینش حاملہ ہے۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ حواس بحال ہونے کے بعد میں نے مہر سے موبائل پر رابطہ کیا۔ وہ اپنے دوستوں کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے تختی کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے اس سے بینش کے متعلق پوچھا۔ تب اس نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ بتایا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور جلد شادی کر لینا چاہتے ہیں۔ میں نے حتی الوسع برداشت سے کام لیتے ہوئے اسے جلد گھر آنے کی تلقین کی۔ وہ رات کو بارہ بجے کے بعد گھر آیا۔ میں نے اس کے ساتھ تفصیلی بات چیت کی۔ وہ شادی کرنے کے لیے آمادہ تھا اور میرے پاس مزید کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ بینش بھی اسے پسند کرتی تھی اُس لیے میں نے چند دنوں کی سوچ وبچار کے بعد ان دونوں کی شادی کرا دی۔ پہلا سال بہت اچھا گذرا۔ بینش کو لڑکا ہوا۔ میں نے بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا۔ فلم انڈسٹری سے متعلق تمام لوگوں کو مدعو کیا۔ بینش خوش اور مطمئن تھی۔ وہ اپنے بچے سے بہت پیار کرتی تھی۔ دوسرے سال وہ دوبارہ حاملہ ہوئی۔ انہی دنوں مہر نے گھر آنا ترک کر دیا، مجھے فکر لاحق ہوئی۔ میں نے بوتیک کے دو آدمیوں کو کچھ معاوضہ دے کر پتا لگانے کے لیے بھیجا کہ وہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔ انہوں نے جلد ہی مجھے بتایا کہ وہ تاج محل کے کمرا نمبر تین سو بارہ میں کسی غیر ملکی عورت کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ میں نے ہوٹل کا رخ کیا اور دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ وہ بہت چیخا چلایا۔ اسے میری مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ چند لمحوں کی تو تو، میں میں اور تلخ کلامی کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں شادی کر چکے ہیں اور جلد ہی لندن جانے والے ہیں۔ میرے سر پر آسمان گر پڑا۔ تاہم میں نے گم ہوتے ہوئے حواسوں کو جلد ہی یکجا کر لیا اور اسے کھینچ تان کر کوٹھی لے آئی۔ بینش کو پتا چلا۔ تب اس بے زبان نے واویلا مچانے کی ناکام کوشش کی۔ مہر ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اس نے میری آنکھوں کے سامنے بینش پر تشدد کیا۔ وہ بیرونِ ملک جانے کے لیے پاگل ہوا جارہا تھا اور اس پاگل پنے کے دوران میں نے ان دونوں کو اکیلے کمرے میں بھیجنے کی حماقت کر ڈالی۔ میرا خیال تھا کہ شاید بینش کی محبت اسے پگھلا دے گی اور کچھ نہیں تو اس کا بچہ ہی باپ کے پاؤں کی زنجیر بن کر اسے باہر جانے سے روک لے گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ صبح جب میں نے ان کے کمرے کا رخ کیا۔ تب وہاں افراتفری کا عالم پایا۔ بینش بچے کو گود میں اٹھائے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے بالوں کو ہٹایا۔ ماتھے سے خون نکل رہا تھا۔ اس پر تشدد کیا گیا تھا۔ خون کے چند دھبے بچے کے کپڑے پر بھی تھے۔ میں نے بچے کو اٹھایا، تب یہ جان کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ حواس بحال ہونے پر میں نے بینش کو اسپتال میں ایڈمٹ کر دیا۔ چند دنوں کے دوران اس کی کوکھ میں پلنے والا دوسرا بچہ بھی ختم ہو گیا۔ مہر اور وہ انگریز حرافہ ہوٹل چھوڑ کر بیرونِ ملک فرار ہو گئے۔ بینش کا دماغی توازن متاثر ہونے لگا۔ وہ جس عورت کے پاس بچہ

دیکھتی اس سے چھیننے کی کوشش کرتی۔ کسی بھی مرد پر اچانک حملہ کر دیتی۔ وہ اسے بچے کی موت کا ذمے دار گردانتی تھی۔ حد آخر اس نے نوکر پر چاقو سے حملہ کیا۔ نوکر زخمی ہوگیا۔ میں نے اس سے چاقو چھیننے کی کوشش کی تو اس نے اسی چاقو سے مجھ پر حملہ کر دیا مجبوراً مجھے اس کو پاگل خانے بھجوانا پڑا۔'' مسز عباسی چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئیں... پھر افسردہ لہجے میں بولیں:

''وہ صحت یاب ہونے کے بعد واپس تو آ گئی ہے۔ تاہم اپنے بچے کو ابھی تک بھلا نہیں سکی۔ میں نے اس کمرے کو مقفل کر دیا ہے جہاں وہ مہر کے ساتھ رہتی تھی۔ لیکن اس کی نگاہوں کا مرکز اب بھی وہی کمرا ہے۔ میں نے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ اس کی متلاشی نگاہیں بچے کو کوٹھی میں تلاش کر رہی ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کی فوراً شادی کر دی جائے یا پھر اس کی گود میں کوئی نومولود بچہ ڈال دیا جائے۔ تب وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گی۔''

میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ ''مہر کا کیا ہوا؟ اس نے دوبارہ رابطہ کیا۔''

مسز عباسی نے بتایا۔ ''اس نے گذشتہ سال طلاق نامہ بھجوایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مختصر خط بھی تھا۔ جس میں تحریر تھا کہ وہ غیر ملکی عورت سے شادی کر چکا ہے۔ اسے اس میں قطعی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ یہ سب شہرت حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ کبھی وقت نے ساتھ دیا تو معافی مانگنے کے لیے ضرور آئے گا۔ میں نے وہ خط آج بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔''

بینش کو طلاق کے متعلق معلوم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں.....!'' مسز عباسی نے جواب دیا۔ ''چند دنوں قبل جب ڈاکٹروں نے مجھے اس کے ڈسچارج ہونے کی خوشخبری سنائی تب بینش نے پہلا سوال مہر کے متعلق پوچھا۔ میں نے اسے نہ صرف طلاق کے کاغذات دکھائے بلکہ خط بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔ میں اس کا ردِعمل دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اور چند لمحے خط کا مطالعہ کرنے کے بعد میرے حوالے کر دیا۔ اس کی آنکھیں خزاں رسیدہ درخت کی مانند خشک تھیں۔ بولنے کے قابل تو وہ تھی ہی نہیں اس لیے اپنے تاثرات کو بھی پس پردہ رکھتے ہوئے سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

میں نے ایک ماں ہونے کے ناطے اس کی دماغی کیفیت کا باخوبی اندازہ لگا لیا۔ تاہم اس کے لیے کچھ بھی کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ اسے ایک عدد بچے کی خواہش تھی۔ میں نے تلاش شروع کر دی لیکن یہاں کون ایسا ہے جو اپنا بچہ کسی دوسرے کو دینے کے لیے تیار ہو جائے۔ مجھے یکسر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ تب میں نے دل میں پکا تہیہ کیا کہ اس کی جلد از جلد شادی کر دوں گی۔ وہ حسین جمیل اور پڑھی لکھی ہے، اسے دینے کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ اس کے عیب پر پردہ ڈال دے گا۔''

مجھے ان کی آنکھوں میں وہ التجا اور بے بسی دکھائی دی جو ان کے مقصد کی ترجمانی کر رہی تھی۔ ان کی ملتجیانہ نگاہوں کا مفہوم میں نے بہ آسانی پڑھ لیا لیکن سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی میں نے بے چارگی کے عالم میں آنکھیں چرا کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ مسز عباسی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سٹنگ روم سے متصل کچن میں کام کرتے ہوئے نوکروں کو مخاطب کر کے کھانے کے متعلق دریافت کیا، کھانا لگ چکا تھا اس لیے ہم دونوں ڈائننگ ٹیبل کی طرف آ گئے۔

☆☆☆

رات کو سوتے ہوئے مسز عباسی کی التجا مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی رہی۔ ان کا یہ احسان ہی میرے لیے کافی تھا کہ انہوں نے یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ میں تین سال پاگل خانے میں رہنے کے بعد واپس آیا ہوں۔ مجھے نہ صرف کوٹھی میں رہنے کی اجازت دی بلکہ اپنے وکیل کی خدمات دیتے ہوئے روبی سے گارمنٹ فیکٹری اور اپارٹمنٹ کی وصولی کے لیے مقدمے کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ میں انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بینش مجھ سے پندرہ بیس سال چھوٹی تھی۔ اس سے پاگل خانے میں شاذ و نادر ملاقات ہوتی تھی۔ تب میں سوچتا تھا کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس پر ایسا کیا سانحہ گذرا جسے برداشت نہ کر سکنے کے بعد وہ دماغی توازن کھو بیٹھی۔ تاہم یہ حقیقت تھی کہ وہ نہایت خوبصورت مشرقی حسن کا مکمل نمونہ تھی۔ کالے سیاہ بال، آنکھیں غلافی، ناک ستواں، منہ کا دہانہ تنگ اور جسم کے نشیب و فراز ہیجان خیز تھے۔ وہ گلاب کی کھلتی ہوئی تازہ کلی کی مانند تھی۔ پاگل خانے میں مردوں اور عورتوں کے لیے رہنے کا علیحدہ انتظام تھا۔ تاہم عید بقرعید کی کسی سالانہ

تقریب کے دوران انہیں یکجا کردیا جاتا تھا تب ملاقات ہوجاتی تھی۔ مسز عباسی ہمیشہ مجھ میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کرتی تھیں۔ گذشتہ سال انہوں نے عید کے موقع پر مجھے نئے کپڑے لاکر دیئے تھے۔ مجھے ان چیزوں کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ سب کچھ کھودینے کے بعد اب مجھے کوئی بھی خواہش نہیں تھی۔ پاگل خانے میں پاگلوں کی تین اقسام تھیں۔ پہلی وہ خطرناک پاگل تھے جنہیں کال کوٹھری کی حد تک محدود کرکے ان کا علاج کیا جاتا تھا۔ ان کا اسٹاف بھی علیحدہ تھا اور جہاں انہیں بند کیا جاتا تھا وہاں کوئی عام انسان نہیں جاسکتا تھا۔ دوسری قسم ان پاگلوں کی تھی جن پر پاگل پن کے دورے وقتاً فوقتاً پڑتے تھے، وہ دورے کے دوران خطرناک ہوکر کسی بھی انسان کو نقصان پہنچاسکتے تھے۔ ان پر بھی کسی حد تک پابندی لاگو تھی۔ شاذ و نادر ہی انہیں کمروں سے باہر لایا جاتا تھا۔ وہ پاگل خانے میں آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے تھے۔ تیسرے نمبر پر وہ پاگل تھے جو بے ضرر تھے۔ میرا اور بینش کا شمار انہی میں ہوتا تھا۔ یہ دنیا کے ستائے ہوئے تھے اور انہیں صرف اچھے ماحول اور مختصر علاج کی ضرورت تھی۔ انہیں پاگل خانے میں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی، یہ کہیں بھی آجاسکتے تھے لیکن عمارت سے باہر نکلنا ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ بینش سے اشاروں کی زبان میں بات کرنا بہت مشکل تھا۔ میں بہت سی باتیں اسے سمجھا نہیں سکتا تھا۔ تاہم وہ میرے اشاروں کو نہ صرف سمجھ لیتی تھی بلکہ اپنا اظہار خیال بھی مجھے سمجھا دیتی تھی ہر چند کہ یہ ملاقاتیں کسی مخصوص تہوار کی حد تک ہوتیں تھیں لیکن ہر ملاقات کے بعد یہ تجسس مزید تقویت حاصل کرلیتا تھا کہ نا جانے ظالم دنیا نے اس کے ساتھ ایسا کیا سلوک کیا تھا جس کی وجہ سے اسے پاگل خانے آنا پڑا تھا۔ اس احساس کے علاوہ مجھے بینش سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں اسے پسند ضرور کرتا تھا لیکن یہ پسند صرف اس کی مظلومیت اور بے چارگی کی حد تک محدود تھی۔ ہوسکتا تھا کہ بھولی بھالی لڑکی نے مسز عباسی کو ان ملاقاتوں کے متعلق اور نظریے سے بتایا ہو، لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ بات کو اگر آگے بڑھایا جاتا تب اس کے متعلق بینش کا مؤقف کیا ہوسکتا تھا۔ اگر وہ میرا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہوجاتی۔ تب پھر ہمارے درمیان صرف عمروں کا فرق رہ جاتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ فرق زندگی میں زہر گھولنے کے لیے کافی ہوتا۔ وہ ایک حساس لڑکی تھی۔ یہ تضاد اسے کبھی بھی مطمئن نہیں رہنے دے سکتا تھا۔ رہی میری بات تو میں دنیا کا ٹھکرایا ہوا ایسا انسان تھا جسے کسی بھی سہارے اور گھر بار کی اب ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ تمام رات جاگتے ہوئے گذر گئی۔

دوسرے دن بارہ بجے کے قریب شمیم صاحب کی آمد ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ روبینہ اور جاوید صاحب سے ملاقات کرکے آرہے ہیں۔ اس ملاقات کے دوران انہوں نے نہ صرف طلاق کے کاغذات کا مطالعہ کیا ہے بلکہ فیکٹری کے کاغذات پر موجود دستخطوں کا معائنہ بھی کیا ہے۔ ان تمام کاغذات پر آپ کے دستخط موجود نہیں ہیں۔ انگوٹھا لگا کر مقصد پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے جاوید صاحب اور روبینہ کو دھمکی دے دی ہے کہ اگر فیکٹری اور جائداد کے کاغذات میرے حوالے نہ کیے گئے تب میں نہ صرف ان کے حصول کے لیے مقدمہ دائر کروں گا بلکہ تین سال قبل ہونے والی بے معنی طلاق کو بھی چیلنج کروں گا جس میں شوہر کی مرضی شامل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ضروری کاغذات پر مالک کا انگوٹھا اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی دماغی حالت انگوٹھا لگاتے ہوئے قابل تفتیش تھی۔ مل کے کاغذات پر دستخط نہ ہونا کچھ معنی تو رکھتا ہے۔ انگوٹھے کی اہمیت ایک اَن پڑھ جاہل شخص کے معاملے میں قبول کی جاسکتی ہے، پڑھے لکھے شخص کے لیے قابل قبول نہیں۔ وہ دونوں بوکھلا گئے۔ میں نے انہیں سوچنے کے لیے ہفتے بھر کا وقت دے دیا ہے۔ اگر انہوں نے انکار کیا تو قانونی کارروائی کا آغاز کردوں گا۔

میں نے پوچھا۔ ''روبی نے بتایا تھا کہ کارخانہ کو دیوالیہ ہونے کے بعد فروخت کردیا گیا ہے۔ وہ جھوٹ تھا یا کارخانہ اب بھی اس کے نام پر موجود ہے۔''

''کارخانہ کو فروخت نہیں کیا گیا۔ اس کے کرتا دھرتا جاوید صاحب ہیں۔ وہ ادھیڑ عمر اور پڑھے لکھے انسان ہیں۔ تاہم روبینہ کا رویہ مجھے مشکوک اور غیر تہذیب یافتہ لگتا ہے۔ معاملے میں ہاتھ بھی اسی کا ہے۔ میں نے مزید بات چیت کا ارادہ ترک کردیا۔''

شمیم صاحب نے مسز عباسی سے پوچھا۔ ''بینش دکھائی نہیں دے رہی۔ اس کی طبیعت اب کیسی ہے۔''

''اتنا بڑا صدمہ جھیلنے کے بعد بچ کر رہ گئی ہے۔'' مسز عباسی نے بتایا۔ ''واپس زندگی کی طرف لوٹنے میں کچھ وقت لگے گا۔''

میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا۔ فروری کی نرم

گرم دھوپ سرسبز لان کی محاصرہ کیے ہوئے تھی۔ مالی گھاس کو پانی دے رہا تھا اور وہ لان کے پاس لگے ہوئے درخت کے قریب کھڑی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ سیاہ شلوار قمیص میں اس کا سوگوار حسن مزید نمایاں ہوکر رہ گیا تھا۔ مجھے مسز عباسی کی آواز سنائی دی۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ بینش کو چند دنوں کے لیے بھوربن بھیج دوں۔ آب وہوا تبدیل ہوگی تب دل و دماغ میں اچھے اثرات پیدا ہوں گے۔''

شمیم صاحب کی آواز سنائی دی۔ ''بھوربن والی کوٹھی خالی پڑی ہے۔ وہ وہاں اکیلی کیسے رہے گی۔''

''یہی تو مسئلہ ہے!'' مسز عباسی بولیں۔ ''میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں اس کے ساتھ جاسکوں اور یہاں سے اس کے ساتھ جانے والا کوئی نہیں ہے۔'' اس کے بعد کی گفتگو سرگوشیوں میں منتقل ہوگئی۔ مجھے جو مفہوم سمجھ میں آیا وہ کچھ یوں تھا۔

''علی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے.....؟''

''اچھا انسان ہے۔ تاہم پاگل خانے کا ٹھپا اس کے ماتھے پر لگ چکا ہے۔''

''ٹھپا تو بینش کے ماتھے پر بھی لگا ہوا ہے۔ اب اس خوف سے میں اسے گھر سے تو نہیں نکال سکتی۔''

''ان دونوں کی عمروں میں کافی حد تک تضاد پایا جاتا ہے، پھر کیا آپ مہر کے لگائے ہوئے زخم کو بھلا چکی ہیں۔ جو بھی کیجیے گا سوچ سمجھ کر اور بینش سے مشورے کے بعد کیجیے گا۔ نا جانے وہ اس کے متعلق کیا رائے رکھتی ہے۔'' مسز عباسی بولیں۔ ''میں حتمی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن کسی حد تک اندازہ ضرور لگا چکی ہوں کہ وہ علی کو نہ پسند نہیں کرتی۔ پاگل خانے میں ہونے والی چند ملاقاتوں کے دوران میں نے جب بھی اس سے کسی دوست کے متعلق دریافت کیا تب اس نے اشاروں کی زبان میں علی کے متعلق مجھے بہت کچھ بتایا۔ بھوربن والی کوٹھی خالی پڑی ہے۔ میں دونوں کو چند دنوں کے لیے وہاں بھیجنا چاہتی ہوں۔ آپ علی سے بات چیت کر لیجیے۔ نہ جانے اس کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔''

شمیم صاحب کی آواز سنائی دی۔ ''آپ اس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر رہی ہیں۔ ایک دفعہ جو ہوگیا کہیں دوبارہ نہ ہوجائے۔ مہر اور بینش کو بھی آپ نے تنہا چھوڑ دیا تھا اس نے جو کیا وہ آپ کے سامنے ہے۔''

''میں انہیں تنہائی میں رہنے کا موقع ضرور دوں گی۔ لیکن تنہائی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی مہلت نہیں دوں گی۔ وہاں نوکروں کے علاوہ عبدالرحمن چاچا بھی موجود ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ چند دنوں کی چھٹی لے کر ان دونوں کے ہمراہ بھوربن چلے جائیں۔ کچھ آرام بھی ہوجائے گا اور تفریح بھی۔ ان دونوں کو تنہائی میں ملنے کا موقع بھی دیجیے گا اور ان پر نظر بھی رکھیے گا۔ میرے خیال میں روبینہ والے معاملے میں بات چیت کے علاوہ عدالتی کارروائی ہونے کا امکان نہیں۔ وہ آپ موبائل پر کر سکتے ہیں۔''

یہ وہ گفتگو تھی جو مجھے وقفوں وقفوں میں سنائی دیتی رہی۔ میرا دماغ ماؤف ہوکر رہ گیا۔ کچھ سوچنا سمجھنا میرے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا۔

☆☆☆

رات کو کھانے کے بعد مسز عباسی نے مجھ سے اگلے اقدام کے متعلق دریافت کیا۔

میں نے بتایا۔ ''میں قبل از وقت کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوں۔ اگر روبینہ کا غذات دینے کے لیے آمادہ ہوگئی تب اپنی گلشن اقبال والی کوٹھی میں منتقل ہوجاؤں گا۔ آپ پر زیادہ بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ آپ کا یہی احسان میرے لیے کافی ہے کہ آپ نے کاغذات کی واپسی کے لیے اپنے وکیل کی خدمات بہم پہنچائیں۔''

''میں نے جو بھی کیا انسانیت کے ناطے کیا ہے۔ اس میں احسان مند ہونے والی کوئی بات نہیں۔ تاہم پھر بھی اگر میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو بینش کے ساتھ چند دنوں کے لیے بھوربن چلے جاؤ۔ وہاں تنہائی اور سکون ہے۔ اسے شادی کے لیے رضامند کرو۔ وہ تم سے مانوس ہے۔ تمہاری باتوں کو اہمیت دے گی۔''

میں پریشان لہجے میں بولا۔ ''میں اس سے بات چیت کیسے کروں گا۔ اشاروں کی زبان سے میں نابلد ہوں۔ اور وہ بول نہیں سکتی۔''

مسز عباسی اپنے پرس میں سے موبائل باہر نکالتے ہوئے بولیں۔ ''بینش موبائل کو استعمال کرنا جانتی ہے۔ تم اپنا مقصد میسج کے ذریعے بیان کر سکتے ہو۔ وہ اردو پڑھنا لکھنا جانتی ہے جواب ضرور دے گی۔ شمیم صاحب تم دونوں کے ساتھ بھوربن جائیں گے۔ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت

ہو تو انہیں بتا دینا۔ کوٹھی میں کام کرنے والے نوکروں کے علاوہ بابا عبدالرحمن بھی وہاں ہوں گے۔ وہ بھوربن کے ان تمام مقامات سے واقفیت رکھتے ہیں جن کے متعلق وہاں کے رہائشی بھی شاذ و نادر ہی جانتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اس کے لیے کوئی لڑکا دیکھا ہے؟''

''مجھے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس کے لیے خود مختار ہے۔ میں نے پاگل خانے کی تقریبات میں ہمیشہ محسوس کیا کہ وہ تمہاری معیت میں خوشی اور سکون محسوس کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے اس راز میں بھی تمہیں شامل کرلے کہ وہ آگے کیا کرنا چاہتی ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ عجیب کورکھ دھندا تھا۔ میں نے بینش کو ان نگاہوں سے کبھی نہیں دیکھا تھا جس کی خواہش مسز عباسی کر رہی تھیں۔ اس کی خوبصورتی اپنی جگہ لیکن کسی کو ہمسفر بنانے کے لیے کچھ جان پہچان کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعلقات اتنی جلدی پائیدار نہیں ہوجاتے۔ تاہم سونو کی یادوں سے چھٹکارے کے لیے مجھے سکون اور تنہائی کی اشد ضرورت تھی اور میں شور شرابے، نفسانفسی کی دنیا کو چھوڑ کر چند دنوں کے لیے پہاڑی علاقے کی طرف جانا چاہتا تھا اس لیے دوسرے دن ہی ہم دونوں شمیم صاحب کی ہمراہی میں بھوربن آگئے۔ کوٹھی چھ کمروں، وسیع و عریض لان اور مختصر کار پورچ پر مشتمل تھی۔ برآمدے میں سے چیڑ کے درخت اور ان کے درمیان بہتی ہوئی آبشار دکھائی دیتی تھی۔ نہایت پُرفضا اور پُرسکون مقام تھا۔ بابا عبدالرحمن کی عمر ساٹھ سے اوپر تھی۔ انہوں نے ہم تینوں کا استقبال انواع واقسام کے کھانوں سے کیا۔ آسمانوں پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش ہونے کی توقع تھی۔ رات کے کھانے کے بعد بینش اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شمیم صاحب مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''مسز عباسی کا گھرانا نہایت محبت کرنے والا پُرخلوص گھرانا ہے۔ مجھ پر ان کے بہت احسانات ہیں۔ وکالت کی تعلیم مجھے ان کے والد صاحب نے دلوائی اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے مستقل طور پر اپنے آپ کو اس گھرانے سے وابستہ کردیا۔''

باہر گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش کا آغاز ہوگیا۔ کوٹھی میں بجلی کی سہولت تھی لیکن گیس مفقود تھی نوکر نے آتش دان میں لکڑیاں ڈال کر اسے روشن کردیا۔

شمیم صاحب بتا رہے تھے۔ ''اس کوٹھی کے علاوہ ورثے میں ملی ہوئی مسز عباسی کی اور بھی بہت جائداد ہے۔ جن کی دیکھ بھال میرے ذمے ہے۔ بوتیک والا کام مصروف رہنے کا ایک بہانہ ہے۔''

میں نے شمیم صاحب کے سراپے کا بغور جائزہ لیا۔ ان کی عمر پچاس سے پچپن کے درمیان تھی۔ شخصیت پُروقار، آنکھوں پر نفیس چشمہ لگا ہوا تھا، سر کے بال سفید تھے۔ بابا عبدالرحمن نے بھاپ اڑاتے ہوئے کافی کے دو مگ ہمارے ہاتھوں میں تھما دیئے اور شمیم صاحب سے اجازت لے کر اپنے کوارٹر کی طرف چلے گئے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے میری طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ایک بات پوچھوں آپ سے۔ مسز عباسی کا گھرانا آپ کو کیسا لگا؟''

''آپ کی طرح مجھ پر بھی ان کے بہت احسانات ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں نے کبھی فرشتوں کو نہیں دیکھا۔ تاہم خیال ہے کہ ضرور مسز عباسی جیسا ہوگا۔''

شمیم صاحب نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر آپ اس گھرانے کو اپنالیں۔ بینش بہت اچھی لڑکی ہے۔ مسز عباسی اس کے لیے پریشان ہیں۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ آنے کے باوجود بھی اسے قبول نہیں کر رہی۔ آپ اسے نئی زندگی دے سکتے ہیں۔ دیکھیے انکار نہ کیجیے گا۔ یہ آپ کا اس گھرانے پر احسان ہوگا۔''

میں بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں کی عمروں کے درمیان بہت فرق پایا جاتا ہے، پھر اس فرق سے بھی قطعہ نظر مجھے معلوم نہیں کہ وہ میرے متعلق کیا رائے رکھتی ہے۔ اس سے اس موضوع پر بات کرلیجیے تو بہتر ہوگا۔''

شمیم صاحب بولے۔ ''وہ آپ کو پسند کرتی ہے۔ بھوربن آنے سے قبل مسز عباسی سے میری بات چیت ہوئی تھی۔ انہوں نے آپ دونوں کو یہاں اسی نیت سے بھیجا ہے تاکہ آپ دونوں ایک دوسرے کو جانچ اور پرکھ لیں۔ حتمی فیصلے کا اختیار آپ کو حاصل ہے۔ یہ چند دن آپ کے پاس سوچ و بچار کے لیے موجود ہیں۔ کوئی اچھا فیصلہ کرکے مجھے اس سے آگاہ کردیجیے گا۔'' انہوں نے کافی کا مگ ختم کرنے کے بعد اسے میز پر رکھ دیا، پھر سٹنگ روم کے سامنے دکھائی دینے والی گیلری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ''گیلری میں پہلا کمرا آپ کا اور دوسرا بینش کا ہے۔ آپ

موبائل پر میسج کے ذریعے اس سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ مسز عباسی نے اسے آپ کے متعلق بتا دیا ہے۔ وہ جواب ضرور دے گی۔ اب میں چلتا ہوں، صبح آپ سے مزید بات چیت کروں گا۔''

وہ کچن کے دوسری طرف واقع اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ بادلوں کی گرج چمک کا سلسلہ جاری وساری تھا۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرا نہایت خوبصورت اور مختصر سامان سے مزین تھا۔ دروازے کے سامنے بیڈ لگا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے وسیع وعریض کھڑکی تھی۔ سیدھے ہاتھ کی دیوار میں الماری اور الٹے ہاتھ کی طرف باتھ روم کا دروازہ تھا۔ بیڈ کے سامنے دروازے کے ساتھ چھوٹی سی ٹرالی پر ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ فریش ہونے کے بعد میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور بیڈ پر لیٹ کر حالات پر نظر ثانی کرنے لگا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ بینش بہت اچھی اور پڑھی لکھی لڑکی تھی لیکن میں ابھی تک سونو کی یادوں سے چھٹکارا نہیں حاصل کر پایا تھا۔ مجھے کچھ وقت درکار تھا۔ میری آنکھوں میں اس کے معصوم چہرے کی شبیہہ بسی ہوئی تھی۔ میں آنکھیں بند کرنے پر اسے اپنے سامنے کھڑا ہوا پاتا تھا۔ اس کی ایک ایک یاد میرے دل میں موجود تھی۔ شاید کارخانے کے ورکروں پر مشتمل مختصر جماعت کی ملاقات کا وہ دن تھا۔ ان میں سے چندنے جاتے ہوئے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال دیے۔ میں جب انہیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک گیا تب سونو نے بجھے ہوئے سگریٹ کا ٹوٹا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ عین وقت پر میں کمرے میں آ گیا اور میں نے بے اختیار اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا وہ مچل کر رویا تھا۔ یہ شاید میرا پہلا اور آخری تھپڑ تھا۔ میں نے خالی خالی نگاہوں کے ساتھ اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ پھر چہرے کو ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مار کھانے والا دنیا سے چلا گیا اور مارنے والا قبر کے دہانے پر کھڑا تھا۔ بھلا ایسی حالت میں کسی کا سہارا کیسے بن سکتا تھا۔ میں تو موت کا منتظر تھا کسی کو زندگی دینا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ نہ جانے کتنی دیر میں روتا رہا۔ میرا چہرہ اور قمیص کا دامن آنسوؤں سے لبریز ہو گیا۔ میں اٹھ کر باتھ روم کی طرف آ گیا۔ چہرے کو اچھی طرح پانی سے دھونے کے بعد میں نے تولیے کے ساتھ پونچھا۔ کچھ اطمینان محسوس ہوا۔ باہر نکلتے ہوئے مجھے کسی کی ہچکیاں لے کر رونے کی آواز سنائی دی۔ آواز باتھ روم کے اوپر بنے ہوئے روشندان میں سے آ رہی تھی۔ یہ روشندان بینش کے باتھ روم میں کھلتا تھا۔ میں تڑپ کر اس کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے رونے کی وجہ دریافت کی۔ وہ خاموش کھڑی اپنے پاؤں کے ناخنوں کی طرف دیکھتی رہی۔ میں مڑ کر کمرے کی طرف آ گیا۔ مسز عباسی کا دیا ہوا موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اٹھایا اور واپس بینش کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی خالی خالی نگاہوں سے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا موبائل سرہانے کے پاس رکھا ہوا تھا۔ میں نے میسج ٹائپ کیا۔

تم کیوں رو رہی ہو؟ معاملہ کیا ہے۔ اور میسج سینڈ کر دیا۔ ہلکی سی وائبریشن نے بینش کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے موبائل کو اٹھایا۔ اور میسج پڑھنے کے بعد حیرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے اسے سمجھایا کہ وہ میسج کا جواب دے۔ چند لمحے تذبذب کے عالم میں بیٹھے رہنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ لکھا تھا۔

''میرے بچے کو بچھڑے ہوئے تین سال ہونے والے ہیں۔ وہ مجھے بہت یاد آتا ہے۔''

میں بیڈ کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور میسج ٹائپ کیا۔

''کتنی حیرت کی بات ہے۔ آج کے دن میرا بیٹا بھی مجھ سے جدا ہوا تھا۔ چند لمحے قبل اسے یاد کر کے میری آنکھوں میں بھی آنسو چھلک پڑے تھے۔'' میں نے میسج سینڈ کر دیا۔ فوراً جواب موصول ہوا۔

''اسے کیا ہوا تھا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''اس کی المناک موت کو میں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ بس اتنا کہوں گا کہ وہ حادثاتی موت مر گیا اور میں جیتے جی مر گیا۔ تمہارے اور میرے رونے سے وہ دونوں واپس نہیں آئیں گے۔ پھر رونے کا کیا فائدہ؟''

اس نے جواب دیا۔ ''رونا میرے اختیار میں ہے اور اس سے مجھے کوئی منع نہیں کر سکتا۔''

میں نے میسج پڑھنے کے بعد اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ حزن وملال کی تصویر بنی دکھائی دے رہی تھی۔ سیاہ آنکھوں پر جھکی ہوئی پلکیں آنسوؤں کی بدولت بھیگ کر ایک دوسرے کے ساتھ چپک گئی تھیں۔ رخساروں پر بہنے والے

آنسوؤں نے ایک راستہ سا بنا دیا تھا۔ اس کے گال بار بار رگڑنے کی بدولت گلابی ہو رہے تھے۔ ہونٹ بسمل پرندے کی طرح کانپ رہے تھے۔ میں کتنی دیر بے خودی کے عالم میں اس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ نظروں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے اس نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور غصیلے لہجے میں میسج ٹائپ کیا۔ ''میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز آپ کمرے سے باہر چلے جائیے۔''

زوردار آواز کے ساتھ بادل گرجا۔ بینش نے بیڈ پر لیٹنے کے بعد کمبل کو سر تک اوڑھ لیا۔ میں نے طویل سانس لی اور اپنے کمرے میں آگیا۔

☆☆☆

دوسری صبح مطلع صاف ہوگیا۔ سنہری دھوپ نے ڈھلی ہوئی پہاڑی وادی کا محاصرہ کرلیا۔ آسمان نکھری ہوئی نیلاہٹ کے درمیان دلفریب دکھائی دے رہا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد شمیم صاحب نے ہم دونوں کو بابا عبدالرحمٰن کے ساتھ پہاڑی چشمے کی جانب جانے کے لیے کہا۔ بینش جانا نہیں چاہتی تھی لیکن شمیم صاحب کے منے اس کی ایک نہ چلی اور مجبوراً اسے ہامی بھرنا پڑی۔ باہر طوفانی بارش نے کیچڑ کی کیفیت نمایاں کردی تھی۔ تاہم گھاس کی بہتات کیچڑ کو اپنے اندر چھپانے کی کوششیں کررہی تھی۔ پہاڑ کوٹھی سے زیادہ دور نہیں تھا اور چیڑ کے درختوں کی وجہ سے وہاں کیچڑ بھی کم تھا اس لیے ہم تینوں بہ آسانی اوپر چڑھتے چلے گئے۔ چڑیوں کی مسحور کردینے والی آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا۔ بابا عبدالرحمٰن اپنے ساتھ فلاسک میں کافی بنا کر لائے تھے۔ چند بسکٹوں کے ڈبے بھی ہمراہ تھے۔ یہ تمام سامان ایک چھوٹی سی باسکٹ میں محفوظ تھا کچھ آگے جانے کے بعد درختوں کے فاصلے میں دوری پیدا ہونے لگی اور پھر ایک مختصر میدان کی صورت نمایاں ہوئی۔ یہاں گھاس کا غالیچہ بچھا ہوا تھا اور پہاڑی چشمہ درمیان میں سے گزرتے ہوئے نیچے کی طرف جارہا تھا۔ درختوں کے پتوں میں سے دھوپ چھن کر ماحول کو نیم روشن کررہی تھی۔ وہاں دو تین درختوں کے کٹے ہوئے تنے پڑے ہوئے تھے اور پہاڑ کا ماحول گھنٹیوں کی مترنم آوازوں سے گونج رہا تھا۔ ہلکی بانسری کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ بابا عبدالرحمٰن نے باسکٹ کو احتیاط کے ساتھ ایک درخت کے تنے کے پاس رکھ دیا... پھر بولے۔ ''چھینو کی بھینسیں چراہ گاہ میں ہوں گی۔ بانسری وہی بجا رہا ہے۔ میں اس سے دودھ لے آتا ہوں۔ آپ دونوں یہاں بیٹھ جائیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بینش کھوئی کھوئی نگاہوں سے ویران جنگل کے سرسبز درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے جیب سے موبائل نکالا اور میسج ٹائپ کیا۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' جواب موصول ہوا۔

''میں مہر کے ساتھ یہاں متعدد بار آچکی ہوں۔ یہ جگہ اسے بہت پسند تھی لیکن مجھے اس کی تنہائی ہمیشہ کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔''

میں نے میسج ٹائپ کیا۔ ''تم اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ ہوسکتا ہے تمہاری محبت اسے واپس آنے پر مجبور کردے۔''

بینش نے جواب دیا۔ ''وہ واپس آبھی گیا تب بھی کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ ہمارے درمیان طلاق ہوچکی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''بچے کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ کیا وہ ایک حادثہ تھا یا پھر قتل تھا۔'' اس دفعہ جواب کچھ تاخیر کے ساتھ موصول ہوا۔

''نہ جانے وہ حادثہ تھا یا قتل۔ جو بھی تھا اس نے مجھ سے میری زندگی چھین لی۔ وہ لندن جانے کے لیے بے چین تھا اور مجھے اپنی سوتن کا چہرہ اس کی آنکھوں میں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے جب اس سے اپنی سوتن کے متعلق پوچھا تو اس نے تحقیرانہ الفاظ میں مجھے بتایا کہ وہ میری طرح گونگی نہیں ہے اور سب سے بڑھ کر لندن کی رہنے والی ہے جس سے شادی کے بعد اسے بہ آسانی وہاں کی نیشنلٹی مل سکتی تھی۔ ہم دونوں تمام رات لڑتے رہے۔ صبح اس کے جانے سے قبل میں نے بچے کو اس کے آگے رکھ کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس نے میرے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ بچہ سر کے بل زمین پر گرا۔ اس نے غصے میں مجھے تشدد کا نشانہ بنایا۔ میں بے ہوش ہوگئی، جب ہوش آیا تب سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔''

پہاڑ کا ماحول اس کی ہچکیوں سے گونجنے لگا۔ میں نے درد بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپا اور زار و قطار رونے لگی۔ میں نے بے اختیار ہوکر اس کے سر پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی۔ وہ تڑپ کے پیچھے ہٹ گئی اور وحشت بھری نگاہوں سے پہاڑ کی بلندیوں کی جانب دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ میسج ٹائپ کیا۔

''وہ مجھے بہت یاد آتا ہے۔ میں تمام رات سکون کی

نیند سو نہیں سکتی۔ مجھے اس کے بے چین ہو کر رونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جیسے وہ بھوک سے بلک کر مجھے پکار رہا ہو۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ جاتی ہوں اور خالی کمرا دیکھنے کے بعد میرا دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ میں اسے کبھی بھی بھلا نہیں پاؤں گی۔

قدموں کی آہٹ سنائی دی اور بابا عبدالرحمٰن دودھ کا برتن ہاتھوں میں تھامے نمودار ہوا۔ ماحول کی تشنگی کو محسوس کر کے وہ چشمے کے پاس خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے دوبارہ مسیج ملا۔

''میں واپس کوٹھی جانا چاہتی ہوں۔ یہ جگہ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ان درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوگا اور دوبارہ مجھ سے سب کچھ چھیننے کی کوشش کرے گا۔ پلیز مجھے واپس کوٹھی لے چلو۔''

میں نے بابا عبدالرحمٰن کو سامان اٹھانے کے لیے کہا اور پہاڑ سے نیچے اترنے لگا۔

اس واقعے کے بعد بینش نے موبائل بند کر دیا۔ وہ مجھ سے بات چیت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شام کو شمیم صاحب اسے زبردستی سٹنگ روم میں لائے تھے۔ ہم تینوں چائے پیتے ہوئے لوڈو کھیلنے لگے، ہر چند کہ وہ بے دلی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ کوٹھی سے باہر جانے کے نام سے ہی اس پر وحشت کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ وہ اپنے خول میں بند ہو کر زندگی گذارنا چاہتی ہے۔ مجھے اس پر بہت ترس آتا تھا۔ وہ اپنے دکھ کا اظہار کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر مرتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اس کی جانب حتی الوسیع کوشش کی لیکن موبائل بند ہونے کی وجہ سے مجھے کوشش میں کامیابی نہ ہو سکی۔ وہ چھبیس فروری کی سرد رات تھی۔ نو بجنے والے تھے۔ میں نے کمرے میں آنے کے بعد حسب معمول بینش کو مس کال دی۔ غیر متوقع طور پر اس کا موبائل آن تھا۔ بیل جانے لگی، مجھے معلوم تھا کہ وائبریشن کی خفیف حرکت اسے اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ اسکرین پر نگاہ پڑتے ہی مجھے تاریخ دکھائی دی۔ دل کو دھچکا لگا اور میں نے موبائل کو آف کر دیا۔ آج سونو کی سالگرہ کا دن تھا۔ کتنی حیرت کی بات تھی اس کی اور میری پیدائش کا دن ایک ہی تھا۔ آج اگر وہ زندہ ہوتا تو اس کی عمر گیارہ سال ہوتی۔ عمر پوری ہونے کے بعد زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن اس سے منسلک یادیں اور لمحے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ میں اسے کبھی بھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ میرے دل میں زندگی کو ختم کرنے کی شدید تمنا پیدا ہوئی۔ سائیڈ ٹیبل پر چھوٹی سی باسکٹ میں کچھ پھل رکھے ہوئے تھے۔ ان کے قریب چھری پڑی تھی میں نے چھری کو اٹھایا اور اپنے الٹے ہاتھ کی ہتھیلی پر دھار کو پھیلا دیا۔ سرخ تازہ خون بہنے لگا۔ مجھے درد کا رتی برابر بھی احساس نہیں ہوا۔ زخم کا درد اس درد کی نسبت کم تھا جس کا سامنا دل کو کرنا پڑ رہا تھا۔ اس دفعہ میں نے ہاتھ کو زخم دینے کے بجائے چھری کو کلائی کے پاس رکھ دیا۔ اچانک ہی سونو کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا۔ وہ نہایت بے چین دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کرب اور وحشت تھی۔ لبوں پر التجا رقص کر رہی تھی۔

''بابا ایسا نہ کرو۔ مجھے بہت اذیت ہوتی ہے۔ اسے دور پھینک دو۔ خدا کے واسطے اسے دور پھینک دو۔ وہ چلّانے لگا۔ میں نے گھبرا کر چھری کو دروازے کی طرف پھینک دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

کسی نے اچانک ہی میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں ہڑبڑا کر پلٹا۔ بینش کو سامنے دیکھ کر میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور تاسف کے ملے جلے تاثرات تھے اور نگاہیں اس خون کی لکیر پر مرتکز تھیں جو میری ہتھیلی سے ہوتے ہوئے بیڈ کی چادر کو رنگین کر رہی تھی۔ اس نے تڑپ کر باتھ روم کا رخ کیا۔ میں پریشان نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ واپس آئی تو اس نے ہاتھوں میں پانی سے بھیگا ہوا دوپٹا پکڑا ہوا تھا۔ یہ وہی دوپٹا تھا جو چند لمحے قبل وہ سر پر اوڑھے ہوئے تھی اس نے گیلے دوپٹے سے میرے ہاتھوں کا زخم صاف کیا اور کچھ حصہ پھاڑ کر پٹی کی صورت میں باندھ دیا۔ خون نکلنا رک گیا۔ چند لمحے میری طرف بے معنی انداز میں دیکھتے رہنے کے بعد وہ مڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ پھر فوراً موبائل لیے نمودار ہوئی۔ اس نے میسج ٹائپ کر کے مجھ سے ہاتھ کاٹنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے بتایا۔ آج میرے لڑکے کی سالگرہ ہے اگر وہ میرے پاس ہوتا تو گیارہ سال کا ہو چکا ہوتا۔ بینش میسج پڑھنے کے بعد دکھ بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے دوسرا میسج ٹائپ کیا۔

تم یہ نہ سمجھنا اولاد کے دکھ میں اکیلی تڑپ رہی ہو۔ ہم دونوں کا دکھ سانجھا ہے لیکن ہر دکھ کے بعد ایک خوشی بھی ہوتی ہے۔ مہوش کی موت کے بعد سونو کی اپنائیت اور اس کی دردناک موت کے بعد مجھے یقین ہے کہ کوئی نا کوئی خوشی منتظر ہوگی۔

بینش کے چہرے پر قوس و قزح پیدا کرنے والی دلفریب لہر نمودار ہوئی اور وہ مڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ دوسرے دن میں نے اس کے رویے میں واضح تبدیلی محسوس کی۔ وہ خاموش تھی۔ تاہم اس کا انگ انگ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ میری ذات سے سمجھوتا کر چکی ہے۔ اس کے چہرے پر اداسی اب بھی تھی لیکن اب اس میں شدت نہیں رہی تھی۔ اداسی نے دم توڑنا شروع کر دیا۔ اس صبح اس نے خود باہر جانے کے ارادے کا اظہار میسج کر کے کیا۔ بابا عبدالرحمن کی طبیعت ناساز تھی اس لیے ہم دونوں اکیلے کوٹھی سے باہر نکل آئے۔ میں راستوں سے ناواقف تھا لیکن اسے معلوم تھے۔ وہ تمام دن ہم نے پہاڑی علاقے میں گھومتے ہوئے گزار دیا۔ شمیم صاحب کی جہاندیدہ نگاہیں سب کچھ جانچ رہی تھیں۔ انہوں نے فون کر کے مسز عباسی کو خوش خبری سنا دی۔ وہ کال میری موجودگی میں کی گئی تھی۔ خوش خبری سننے کے بعد مسز عباسی چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر رہ گئیں۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ سب کچھ اتنا جلدی ہو جائے گا۔ شمیم صاحب نے انہیں بتایا ہم جلد واپس آجائیں گے۔ تاہم شاید ان دونوں کا دل بھور بن سے ابھی تک اکتایا نہیں ہے۔ آپ میسج کر کے بینش سے اس کی رضامندی دریافت کرلیں۔ مسز عباسی نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

اگلے ہفتے ہم تینوں شہر واپس آگئے۔ انہی دنوں مجھے شمیم صاحب کے موبائل پر روبی کی کال موصول ہوئی۔ شمیم صاحب نے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھ سے بات چیت کرنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ میں نے موبائل تھاما اور ٹیرس کی طرف آگیا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے جب فون کرنے کی وجہ دریافت کی۔ تب، وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

''تم کبھی بھی میرے نہیں تھے۔ ہماری شادی صرف ضرورت اور مجبوری پر مشتمل تھی۔ تمہیں ساتھی کی بجائے آیا کی ضرورت تھی جو تمہارے بچے کو سنبھال سکے۔ میں سب کچھ باخوشی برداشت کر لیتی اگر تم مجھے وہ حیثیت دیتے جس کی میں مستحق تھی لیکن تمہاری نگاہوں میں بچے اور اس کی پرورش کے علاوہ اور کسی کی بھی رتی برابر اہمیت نہیں تھی۔ میں نے تمہارے ساتھ وہ چند سال نہایت اذیت کے عالم میں گزارے۔ تم نے مجھے کوئی خوشی نہیں دی۔ میں اولاد کے لیے ترستی رہی لیکن تمہیں اس کی پروا نہیں تھی۔ تب میں نے تمہیں اور تمہارے بچے کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اگر مجھے دینے کے لیے تمہارے پاس کچھ نہیں تھا تو میں کیوں تمہارے لیے قربانی دیتی۔ اب جب میری زندگی مکمل ہونے والی تھی تب تم نے اسے دوبارہ تباہ و برباد کر کے رکھ دیا لیکن میں وہ سب نہیں ہونے دوں گی جو تم چاہتے ہو۔ مجھے تمہاری جائداد کی ضرورت نہیں ہے میں جلد ان کے کاغذات تمہیں بھجوادوں گی۔'' کال اچانک ہی ختم ہوگئی۔ میں ہکا بکا کھڑا ہاتھوں میں پکڑے ہوئے موبائل کو دیکھ رہا تھا جو کچھ بھی ہوا نہایت غیر متوقع ہوا۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں مل سکا۔ تاہم اس نے جو کچھ بھی کہا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ سونو کی نگہداشت کے دوران میں نے واقعی اس کے وجود کو نظر انداز کیا تھا۔ اگر بدلے میں اس نے مجھے اور سونو کو نظر انداز کر کے معاملے کو چکانے کی کوشش کی تو اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ تاہم اب وہ جاوید اور بچے کے ساتھ خوش تھی۔ میں نے دل میں تہیہ کیا کہ اپارٹمنٹ کے کاغذات اس سے واپس نہیں لوں گا۔ میں نے سٹنگ روم میں آکر شمیم صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔ انہوں نے دوسرے دن زیب النساء اپارٹمنٹس کی طرف جانے کی یقین دہانی کروائی اور کوٹھی سے باہر چلے گئے۔ رات کا کھانا کھاتے ہوئے مسز عباسی نے مجھے مبارکباد دی اور اگلے لائحہ عمل کے متعلق پوچھا۔ میں نے گلشن اقبال والی کوٹھی میں منتقل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ خاموش ہو کر رہ گئیں۔ اگلے دن بہت بڑی تقریب کا انتظام کیا گیا۔ یہ تقریب کوٹھی کے لان میں منعقد ہوئی۔ اس میں فلم لائن سے تعلق رکھنے والے افراد کی اکثریت تھی۔ تقریب رات گئے تک جاری رہی اور اختتام پر مسز عباسی نے میری اور بینش کی شادی کا اعلان کر دیا۔ مبارکبادوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد تمام شرکاء نے رخصت کی اجازت طلب کی اور پانچ بجے کے قریب ہم تینوں تھک ٹوٹ کر کمروں کی طرف آگئے۔ دوسرے دن میری آنکھ تاخیر سے کھلی۔ دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ موبائل کی گھنٹی بج رہی تھی اسکرین پر شمیم صاحب کا نمبر تھا۔ میں نے موبائل آن کیا۔ انہوں نے خوش خبری سنائی۔

''میں روبی سے جائداد کے کاغذات واپس لے آیا ہوں۔ گلشن اقبال والی کوٹھی اب بھی آپ کے نام ہے۔ فیکٹری کے کاغذات پر دستخط نہیں۔ انگوٹھا لگا کر انہیں منتقل کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ میں چند دنوں میں

کاغذات کی درستگی کے بعد آپ کو فیکٹری کی چابیاں اور اصلی کاغذات دینے کے لیے کوٹھی آؤں گا۔ اس وقت فیکٹری وقتی طور پر آپ کے دست راست رفیق صاحب کے اختیار میں دے دی گئی ہے۔'' میں نے افسردہ انداز میں موبائل کو بند کردیا۔ مجھے شدت کے ساتھ چچا اور مہوش کی یاد ستانے لگی۔ کتنا سکون اور امن تھا ان دنوں گلشن اقبال والی کوٹھی میں۔ مہوش ایک گھریلو اور پردہ دار عورت تھی۔ روبینہ اور اس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مہوش شاپنگ کے لیے باہر جانے کو بھی معیوب خیال کرتی تھی اور روبی ہوٹلوں میں ہونے والے فنکشنوں کی صدارت کرتی تھی۔ مہوش متعدد نوکروں کے ہونے کے باوجود بھی میرے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کرتی تھی۔ روبی گھر کے کاموں کی طرف توجہ دینے کی بجائے ہمیشہ گھر سے باہر رہنے کو ترجیح دیتی تھی۔ بہرکیف جو بھی ہوا اچھا نہیں ہوا تھا۔ اب ایک دفعہ پھر برسوں سے سوئی ہوئی زندگی نے انگڑائی لینے کی کوشش شروع کردی تھی۔ بینش مجھ سے مطمئن تھی۔ وہ رات گئے تک میسج کرتی تھی۔ اپنی پسند اور ناپسند کے متعلق مجھے بتاتی۔ میری پسند دریافت کرتی۔ اس نے کوکنگ کی کلاسوں میں جانا شروع کردیا تھا۔ مجھے کھانے میں جو کچھ پسند تھا.... میرے لیے وہ سب کچھ اپنے ہاتھوں سے بنانا چاہتی تھی۔

انہی دنوں شمیم صاحب نے فیکٹری کے کاغذات اور گلشن اقبال والی کوٹھی کی چابیاں لاکر میرے ہاتھوں میں تھمادی۔ مسز عباسی اور بینش نے مجھے مبارکباد دی۔ میں نے دوسرے دن سے مل جانا شروع کردیا۔ وہاں کے حالات ناگفتہ تھے۔ ورکر کام کرنے کے بجائے گپ شپ میں مصروف تھے۔ اکاؤنٹ میں دھاندلیوں کی وجہ سے مالی حالات کمزور دکھائی دیتے تھے۔ ڈسپلن نہ ہونے کے برابر تھا۔ رفیق صاحب نے مجھے بتایا کہ جاوید صاحب مہینے میں دو ایک بار ہی آفس کا چکر لگاتے تھے اور چند لمحے وقت گذاری کے بعد واپس چلے جایا کرتے تھے۔ ہاں روبینہ کا فون کم و بیش روزانہ آتا تھا لیکن ان تین سالوں کے دوران وہ خود کبھی آفس نہیں آئی۔ میں نے تمام کام بہ احسن و خوبی سنبھال لیے۔ مالی حالات کمزور ہونے کی وجہ سے مجھے نہایت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بینک سے قرضہ لیا گیا اور فیکٹری چلانے کی کوششوں کا آغاز کردیا گیا۔ تین سال قبل فیکٹری کی ساکھ کا یہ عالم تھا کہ اس کے نام کو سن کر لوگ گارمنٹس خرید لیتے تھے۔ یہ ساکھ اب بھی کسی نہ کسی حد تک مارکیٹ میں پائی جاتی تھی۔ بات صرف اعتماد کو دوبارہ بحال کرنے کی تھی اور چند دنوں کی کوششوں سے میں اسے بحال کرسکتا تھا۔ بینش کا وجود میری ہمت بڑھانے کے لیے کافی تھا۔ وہ تمام دن مجھے میسج کرتی، مل کے حالات اور کام کی تفصیل دریافت کرتی۔ کام کے متعلق مشورہ دیتی۔ کھانے میں بہت اہتمام کرتی۔ میری پسند کی چند ڈشز جن میں اسے عبور حاصل ہوگیا تھا ان کی تیاری میں گھنٹوں لگا دیتی تھی۔ میں رات کو جب تھکا ہوا کوٹھی میں داخل ہوتا تب کھانوں میں خلوص کو دیکھنے کے بعد میری آدھی تھکن اتر جاتی تھی۔

مسز عباسی نے مجھے گلشن اقبال والی کوٹھی میں منتقل ہونے سے وقتی طور پر روک دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ رخصتی کے بعد ہم دونوں کو وہاں منتقل ہونا ہی ہے تب تک ان کی کوٹھی میں پیدا ہونے والی رونق کو یونہی رہنے دیا جائے۔ کارخانے کی مصروفیات اور میری پرزور سفارش کو مدنظر رکھتے ہوئے شادی کی تاریخ آگے بڑھادی گئی تھی۔ اس سے اگلے ہفتے مجھے رفیق صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ روبی کے شوہر جاوید صاحب شراب کے نشے میں دھت ہوکر بالکونی سے نیچے گر کر ہلاک ہوگئے ہیں۔ مجھے نہایت افسوس ہوا۔ میں روبی کو دلاسہ دینے کے لیے اپارٹمنٹ کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن اس لیے ارادہ ترک کردیا کہ وہ تمام کیے دھرے کا ذمے دار مجھے گردانے کے بعد طیش میں آکر بینش کو بدظن کرسکتی تھی۔ اسی رات میں نے مسز عباسی سے بات چیت کی اور انہیں بتایا کہ میں اگلے ہفتے بینش سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے شادی کی تیاریاں نہ ہونے کا عذر پیش کرتے ہوئے انکار کرنے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں جاوید صاحب کی موت کے متعلق بتانے کے بعد اپنے دماغ میں پیدا ہونے والے خدشے سے آگاہ کردیا، وہ پُرشفقت لہجے میں بولیں۔

''میں تمہاری پریشانیوں کو محسوس کرسکتی ہوں مجھے معلوم ہے کہ زندگی نے تمہیں سب کچھ دینے کے بعد یکلخت سب کچھ چھین لیا ہے۔ اب تم خوفزدہ ہونے والے اس شخص کی طرح ہو جس نے موت کے منہ میں جانے کے بعد غیر متوقع طور پر دوبارہ زندگی کو پالیا ہو۔ موت کو اتنے قریب سے دیکھنے کے بعد زندگی پر سے تمہارا اعتماد اٹھ گیا ہے اور دماغ پر سب کچھ دوبارہ چھن جانے کا خوف مسلط ہوکر رہ گیا ہے۔'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئیں... پھر دوبارہ بولیں۔ ''تم فکر مت کرو۔ میں کوشش کروں گی کہ اگر

انتظامات ہفتے بھر میں مکمل نہ ہو سکے تب دوسرے ہفتے میں ضرور تم دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دوں۔ تاہم تمہیں انتظامات میں میری مدد کرنا ہوگی تاکہ کام جلد از جلد مکمل ہو جائیں۔''

میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دوسرے ہفتے ہم دونوں کی شادی نہایت دھوم دھام سے ہوگئی اور میں بینش کے ساتھ گلشن اقبال والی کوٹھی میں آ گیا۔ فیکٹری کے معاملات ابھی تک تسلی بخش نہیں تھے۔ قرضہ سر پر چڑھا ہوا تھا جب تک اتر نہیں جاتا تب تک اس کی طرف سے غفلت برتنا ممکن نہیں تھا اسی لیے میں نے ہنی مون پر باہر جانے کو نظر انداز کر دیا۔ روبی میرے حواسوں پر سوار تھی۔ رفیق صاحب نے مجھے بتایا کہ چند دن قبل اس نے فون کر کے بینش کے موبائل نمبر کے متعلق دریافت کیا تھا انہوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ اس اطلاع کے فوراً بعد میں نے مہنگا اور نئے ماڈل کا موبائل خرید کر بینش کو گفٹ کر دیا۔ اس موبائل میں سم نئی تھی اسی لیے نمبر بھی تبدیل ہوگیا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے زیب النساء اپارٹمنٹ کا رخ کیا۔ سیکورٹی آفس سے روبی کے متعلق دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شوہر کی حادثاتی موت کے بعد اس نے اپارٹمنٹ کو فروخت کر دیا ہے اور نا جانے کہاں چلی گئی ہے۔ میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا اور کوٹھی واپس آ گیا۔ چند دنوں کے بعد رات کو دس بجے کے قریب دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں اور بینش کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔ نوکر نے دروازہ کھولا، وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کی گود میں بچہ اور دوسرے ہاتھ میں مختصر بیگ تھا۔ وہ نوکر کو دھکیلتے ہوئے سٹنگ روم میں آ گئی۔ بینش تفہیمی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ روبی کرخت لہجے میں بولی:

''تو یہ ہے تمہاری گونگی بیوی۔ جس کے حسن کے چرچے بہت مشہور ہیں۔ وہ مجھے افواہوں سے زیادہ دکھائی نہیں دیتے۔ اچھے کپڑے اور میک اپ نے معمولی صورت پر پردہ ڈالنے کی بہترین کوشش کی ہے ورنہ سب کچھ صاف دکھائی دے رہا ہے۔''

میں نے غصیلے لہجے میں اس سے آنے کی وجہ دریافت کی۔ وہ تلخ لہجے میں بولی۔

''میں چند باتیں اس کی موجودگی میں کرنا چاہتی ہوں۔ میرے متعلق تم سے پوچھے گی ضرور۔ اسے بتا دینا کہ میرے گھر کو برباد کرنے کے ذمے دار تم ہو۔ سب کچھ چھن جانے کے بعد میرے شوہر نے شراب نوشی شروع کر دی اور اسی شراب نوشی نے اس کی جان لے لی۔ میں تباہ و برباد ہوگئی ہوں لیکن خوش تم بھی نہیں رہو گے۔ میں نے بینش کے پہلے شوہر کا نمبر اور ایڈریس حاصل کر لیا ہے اور ایک تفصیلی خط میں اسے بینش کی شادی، تمہارے اور اپنے تعلقات کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جلد بینش سے بات چیت کرے گا۔''

میں نے ساتھ کھڑی ہوئی بینش کی طرف دیکھا وہ ہونقوں کی مانند کبھی مجھے اور کبھی روبی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''بینش اور اس کے درمیان طلاق ہو چکی ہے وہ کچھ نہیں کر سکتا اور اگر اس نے کرنے کی کوشش کی تو اسے منہ کی کھانا پڑے گی۔''

روبی استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''اپارٹمنٹ کی فروخت کے بعد میں نے مختلف وکیلوں سے تفصیلی ملاقات کی اور چند قانونی نقطوں پر نظر ثانی کرنے کے بعد مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ پریگننسی کے دوران طلاق نہیں ہوتی، بینش اور مہر کے تنازعے کے دوران بینش پریگننٹ تھی اسی لیے وہ اب بھی اس کا شوہر ہے اور ایک شوہر کے ہوتے ہوئے دوسرے کو رکھنا شرعی طور پر عورت کے لیے جائز نہیں۔ قانون سراسر بینش کو قصوروار گردانتے کے بعد سزا کا مستحق قرار دے گا۔''

میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''تمہیں ان باتوں کے متعلق کیسے معلوم ہوا۔ کیا تم نے تحقیق کی ہے، کیا تمہارے پاس اتنا فالتو وقت تھا کہ تم کسی کے ذاتی معاملات پر توجہ دے سکو۔''

روبی دوبارہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی پھر دروازے سے قدم باہر نکالتے ہوئے بولی۔ ''جو کچھ بھی کیا میرے وکیل نے کیا۔ میں اپارٹمنٹ کو کبھی بھی فروخت نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے وکیل کی خدمات حاصل کرنے کے لیے اسے فروخت کرنا پڑا۔ تاہم مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے شوہر کی موت کا بدلہ تم سے لے لیا۔''

وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد بینش نے میز پر رکھا ہوا موبائل اٹھایا اور میسج ٹائپ کیا۔ وہ

روبی کے متعلق دریافت کررہی تھی۔ میں نے بتایا۔

”یہ میری دوسری بیوی روبی تھی۔ میرے پاگل خانے جانے کے بعد اس نے نہ صرف شادی کرلی... بلکہ میری تمام جایداد بھی اپنے نام منتقل کرنے کی ناکام کوششیں کی۔ بینش نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ مسز عباسی اسے میرے حالات سے آگاہ کرچکی تھیں، اسے میری پہلی اور دوسری بیوی کے متعلق سب کچھ معلوم تھا۔

اگلے دن بینش کی طبیعت خراب ہوگئی اور تفصیلی چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے مجھے خوش خبری سنائی کہ وہ پریگننٹ ہے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ میں نے وقتی طور پر روبی کو نظر انداز کردیا۔ تاہم بینش نے مسز عباسی کو اس کے متعلق سب کچھ بتادیا۔ روبی کی انتقامی کارروائی سے آگاہ کرنے کے بعد پوچھا کہ طلاق کے وقت بینش کی پریگننسی کس اسٹیج پر تھی تو انہوں نے بتایا کہ وہ ان دنوں واقعی حاملہ تھی اور ہاتھا پائی کے بعد بچے کی موت واقع ہوئی تھی۔ میں نے طلاق کے کاغذات دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔ جب واپس آئیں تو انہوں نے اتھوں میں فائل پکڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے فائل مجھے دے ی۔ فائل کے اندر چند کاغذات تھے جن کی رو سے طلاق کی انونی حیثیت واضح ہوتی تھی۔ وہ مکمل اور مستند تھے۔ رات کا کھانا ہم دونوں نے مسز عباسی کے ساتھ کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے میں نے دل میں تہیہ کیا کہ اگر لڑکا ہوا تو میں س کا نام سونو رکھوں گا۔ سونو کی دردناک موت چند لمحوں کے لیے تازہ ہوئی لیکن جلد ہی دنیا میں آنے والے نومولود نے س کی جگہ لے لی اور میں نے دماغ کو مختلف سوچوں کے میرے میں مشغول کردیا۔ مثلاً مہر کو ہم دونوں کی شادی کے متعلق معلوم ہونے پر اس کا ردِعمل کیا ہوسکتا ہے۔ بینش نا ف اس کی بیوی رہ چکی تھی بلکہ خالہ کی لڑکی بھی تھی۔ شاید شتعل ہونے کے بعد رشتے میں رکاوٹ بننے کی کوشش رتا۔ حمل کے دوران واقعی طلاق نہیں ہوتی۔ وہ بات کو ں دینے کے لیے اس حربے کو استعمال کرسکتا تھا لیکن ق کے کاغذات مکمل تھے۔ ہر چند کہ عدالتی کارروائی نہیں نے پائی تھی لیکن مہر کے دستخط اور رجسٹرار کی مہر کاغذات جود تھی۔ اگر وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی کوشش کرتا سے منہ کی کھانا پڑتی۔ اس کے علاوہ بینش بھی میرے ھ تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے عدالت میرا کچھ بھی بگاڑ سکتی تھی۔ اب میں جو واقعہ بیان کرنے والا ہوں۔ اس

کے متعلق مجھے بعد میں مسز عباسی سے معلوم ہوا۔

مہر کو روبی کا خط جلد ہی مل گیا۔ جب سے وہ لندن آیا تھا یہ اس کا پہلا خط تھا۔ بھیجنے والے کے نام سے بھی وہ واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا، تو ایک طویل خط اس کے سامنے تھا۔ جیسے جیسے وہ مضمون پڑھتا گیا۔ ویسے ویسے اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوتے گئے۔ تحریر کے اختتام پر پہنچنے سے پہلے وہ چند سال قبل کی خوبصورت اور دلفریب یادوں میں کھو کر رہ گیا۔ اسے بینش کی رفاقت اور محبت بھرے دن شدت کے ساتھ یاد آنے لگے۔ دیارِ غیر میں ان کی قدر سے وہ باخوبی آشنا ہوگیا تھا۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں تھا۔ سب کو ان کی حیثیت اور رتبے کے لحاظ سے تولا جاتا تھا۔ زندگی اتنی تیز اور مصروف تھی کہ شوہر کو بیوی اور بیوی کو شوہر کی بیماری کے متعلق ان دونوں میں سے کسی ایک کی موت کے بعد معلوم ہوتا تھا۔ مشرق کا حسن محبت، احساس اور انسانیت کی قدر میں پوشیدہ تھا۔ بینش اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ چند دوستوں کی معیت میں جب اس نے پہلی دفعہ شراب پی، تب ہوش وحواس سے بیگانہ ہونے کے بعد بے سدھ ہوکر صوفے پر گر گیا۔ صبح آنکھ کھلنے پر جب اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو صبح کے سات بجنے والے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر گاڑی کی طرف چلا آیا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ اسے گھر پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں لگا۔ جب اس نے کمرے میں قدم رکھا تب بینش کو کرسی پر سوتے ہوئے پایا۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا ٹھنڈا پڑا تھا۔ مہر کو اس پر سخت غصہ آیا۔ وہ اس کے پاؤں کی زنجیر بنتی جارہی تھی۔ اس کے لیے کہیں بھی آنا جانا دشوار ہونے لگا تھا۔ اگر چلا جاتا تو یہ احساس اسے تنگ کرتا رہتا تھا کہ وہ کھانے پر اس کا انتظار کررہی ہوگی۔ مجبوراً اسے دس بجے سے پہلے کوٹھی واپس آنا پڑتا تھا۔ اس دن اس نے بینش کو کھری کھری سنائیں اور بات حد سے آگے بڑھنے کے بعد موبائل کو بند کردیا تاکہ وہ مزید میسج نہ کرسکے۔ یہ وہ آخری حربہ تھا جو ہمیشہ کارگر ثابت ہوتا تھا۔ موبائل اس کے لیے رابطے کا ذریعہ تھا۔ اگر یہ رابطہ منقطع ہوجاتا تو وہ اندھیروں میں بھٹک کر تنہائیوں کی وادی میں گم ہوسکتی تھی اسی لیے پریشان ہوکر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیا کرتی تھی۔ اب مہر کو ان لمحات کا احساس ہورہا تھا۔ یہاں ان کے متعلق سوچنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کی بیوی کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ صبح اٹھ کر

[illegible] وہ کہاں جاتی تھی۔ [illegible] کی تلاش میں باہر نکل جاتا تھا۔ چند دن قبل اسے چھوٹی سی نوکری مل گئی تھی۔ تنخواہ محدود اور کام سخت تھا۔ تاہم گذارا بہ آسانی ہوجاتا تھا۔ انہی دنوں اس کا بیوی کے ساتھ جھگڑا ہوا۔ وہ رات کو شراب کے نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے بوائے فرینڈ کو فلیٹ میں لے آئی تھی۔ مہر نے لڑکے کو دھکے مار کر فلیٹ سے باہر نکال دیا۔ ہوش وحواس بحال ہونے کے بعد اس کی بیوی نے وہ واویلا مچایا جس کی اسے توقع نہیں تھی۔ چند دنوں کے دوران دونوں میں طلاق ہوگئی۔ نوکری ملنے کے بعد مہر کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی اسی لیے اس نے قریبی بلڈنگ میں فلیٹ لے لیا۔ اب روبی کا خط اس کے ہاتھوں میں تھا اور بینش کے موبائل نمبر پر اس کی نگاہیں مرتکز تھیں۔ یہ نمبر روبی نے کوٹھی کے نوکر کو رقم دے کر حاصل کیا تھا۔ اس نے میسج ٹائپ کیا۔

شادی مبارک ہو۔ مجھے تاعمر افسوس رہے گا کہ میں نے تمہاری کبھی بھی قدر نہیں کی۔ تاہم اب یہاں بالکل تنہا ہوں۔ ہوسکے تو مجھے معاف کردینا۔ میں تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔ فوراً ہی جواب موصول ہوگیا۔ یہ صرف پانچ الفاظ پر مشتمل تھا۔

آیندہ مجھے میسج نہیں کرنا۔“

☆☆☆

گارمنٹس فیکٹری نے پاؤں پر کھڑا ہونا شروع کردیا۔ اور مجھے اب کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہا۔ بینش کوٹھی میں میری منتظر رہتی تھی۔ وہ میری مصروفیت سے آگاہ تھی۔ اس لیے زیادہ اصرار نہیں کرتی تھی۔ تاہم میرا دیر سے آنا اور اس کا اکیلے کھانا کھانا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے ایک دو دن پہلے شہر کے بڑے ڈاکٹر کے کلینک سے الٹرا ساؤنڈ کروایا تھا۔ کوکھ میں پلنے والا بچہ لڑکا تھا۔ صنف معلوم ہونے کے بعد میں بہت خوش ہوا۔ تاہم بینش نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کچھ دنوں سے خاموش رہنے لگی تھی۔ میں نے اس کی خاموشی کو پہلے بچے کی یاد سے منسوب کرکے زیادہ کریدنے کی کوششیں نہیں کی۔ چند دنوں کے بعد اس کے رویے میں چڑچڑاپن اور جھنجلاہٹ پیدا ہونے لگی۔ وہ بات بات پر مجھ سے لڑنے جھگڑنے لگی۔ ایسے عالم میں اسے کوٹھی میں تنہا چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے میں آفس سے چھٹی نہیں لے سکتا تھا۔ ہر

چندکہ رفیق صاحب نہایت قابلِ اعتماد اور ذمے دار انسان تھے۔ تاہم کارخانے کے معاملات اس وقت نہایت نازک اور حساس حالات سے دوچار تھے اسی لیے میں نے چند دنوں کے لیے مسز عباسی کو کوٹھی میں بلالیا۔ آہستہ آہستہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ بینش مجھ سے بے رخی کا برتاؤ کرنے لگی ہے۔ پہلے جب میں کوٹھی واپس آتا تھا تب اسے اپنا منتظر پاتا تھا۔ اب وہ سرِشام سونے کے لیے بیڈروم میں چلی جایا کرتی تھی۔ میں ناشتا اکیلے کرتا تھا۔ حالانکہ وہ صبح جلدی اٹھنے کی عادی تھی۔ اس کے باوجود بھی ناشتے کی میز پر آنے کو اس وقت تک نظر انداز کرتی تھی جب تک میں آفس نہیں چلا جاتا تھا۔ انہی دنوں غیر متوقع طور پر اس کا موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ چند منٹوں کے دوران موبائل پر متعدد میسج موصول ہوئے۔ میں نے میسج پڑھ لیے۔ وہ اس کے سابقہ شوہر مہر علی عباسی کے تھے۔ میسج میں ملک واپس آنے کے متعلق بتایا گیا تھا اور اگلے چند میسجوں میں اس نے اپنی محبت کو سراہنے کے لیے بینش کا شکریہ ادا کیا تھا۔ یعنی وہ بھی معاملے میں ملوث تھی۔ میرا دماغ گھومنے لگا اور اپنی حیثیت مجھے کم تر محسوس ہونے لگی۔ مجھے نہایت خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا جارہا تھا۔ وہ اب بھی مہر کی محبت میں گرفتار تھی۔ اگر اس کے پاس سابقہ شوہر کا نمبر موجود تھا۔ تب پھر یہ سوچنا بعید از قیاس نہیں تھا کہ مسز عباسی تمام معاملے سے آگاہ تھیں اور بینش کو مہر کا نمبر انہوں نے ہی دیا ہوگا۔ میں نے ان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور واپس آفس چلا آیا۔ وہاں بھی میرا دماغ مختلف سوچوں کے گھیرے میں رہا۔ وہ میری محبت، میں کبھی بھی گرفتار نہیں تھی۔ عمروں کے فرق کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کے لیے مجبور کیا گیا تھا لیکن وہ مجبور نہیں تھی۔ انکار کرنا اس کے اختیار میں تھا۔ مجھے اچانک ہی روبی کے خط کا خیال آیا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ مہر کو بینش کا نمبر اس نے خط کے ذریعے بھیجا ہو۔ اس نے رفیق صاحب سے بھی نمبر حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے فوراً اس سوچ کو مسترد کردیا۔ بینش کے نمبر سے میرے علاوہ صرف مسز عباسی واقف تھیں۔ روبی کو اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔ مسز عباسی کی حیثیت مشکوک تھی۔ میں نے ان سے بات چیت کرنے کا تہیہ کیا اور کوٹھی واپس آگیا۔ وہ سٹنگ روم میں بیٹھیں فون پر بات چیت کررہی تھیں۔ قدموں کی چاپ سن کر انہوں نے گھبراہٹ کے عالم میں ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا اور پریشان نگاہوں

سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے پوچھا۔

''مہر کا فون تھا؟'' انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے دوبارہ پوچھا۔

''اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ کیا وہ واپس آرہا ہے؟'' اس دفعہ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو اس میں قباحت کیا ہے۔ یہ اس کی خالہ کا گھر ہے۔ وہ جب آنا چاہے آسکتا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' بینش کمرے میں سے نکل کر سٹنگ روم میں آگئی اور غوں غاں کرتے ہوئے اشاروں سے مسز عباسی کو کچھ سمجھانے لگی۔ انہوں نے پریشان ہو کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''کیا یہ دوبارہ مہر سے شادی کرنا چاہتی ہے۔''

مسز عباسی نے پھٹ پڑنے والے لہجے میں بتایا۔ ''ہاں اس نے نہ جانے اسے کیا پٹی پڑھائی ہے کہ یہ دوبارہ اس سے شادی کرنے کے لیے رضا مند ہوگئی ہے۔ مجھے افسوس ہورہا ہے کہ میں اسے پاگل خانے سے واپس کیوں لائی۔ وہیں پڑا رہنے دیتی تو اچھا ہوتا۔''

بینش نے اپنا رخ میری طرف کیا اور ٹھوڑی پکڑتے ہوئے ملتجیانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ پھر قریبی صوفے پر بیٹھتے ہوئے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔ ''مسز عباسی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ان باتوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ اب مجھے سب کچھ چھن جانے پر افسوس نہیں ہوتا۔ یہ میرے لیے ایک عام سی بات ہے۔ شاید میں اذیت پسند بن چکا ہوں۔ آپ مہر کو بلا لیجیے۔ میں بات چیت کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

مسز عباسی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ سب کچھ غیر متوقع طور پر ہوگیا تھا۔ اتنی جلدی معاملہ طے ہونے کی انہیں توقع نہیں تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''وہ کب واپس آرہا ہے۔''

''اگلے ہفتے۔'' انہوں نے بتایا۔ ''وہ میری کوٹھی میں رہے گا۔ مجھے اس سے اب بھی کوئی سروکار نہیں۔ میں اسے اب بھی پسند نہیں کرتی ہوں۔ یہ صرف بینش کی بے جا ضد ہے جو مجھے اس کا دوبارہ سامنا کرنے کے لیے مجبور کررہی ہے۔''

میں صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اسے یہیں بلا لیجیے۔ بات چیت میں آسانی رہے گی یا یوں کہہ لیجیے کہ معاملے کو ختم کرنے میں وقت ضائع نہیں ہوگا۔ بینش جو چاہتی ہے میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' بات کے اختتام پر میں سٹنگ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں آگیا۔

رات کا کھانا کسی نے بھی نہیں کھایا۔ بینش کروٹ بدل کر میرے قریب لیٹ گئی۔ اس کے سیاہ گھنے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ مخروطی انگلیوں میں انگوٹھیاں جھلملا رہی تھیں، یہ انگوٹھیاں میں نے اسے منہ دکھائی کے وقت دی تھیں۔ میں نے بے زاری کے ساتھ کروٹ بدلی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا موبائل اٹھا کر میسج ٹائپ کیا۔

''کیا اس نے تمہارے ساتھ خود رابطہ استوار کیا یا تم نے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی۔''

جواب موصول ہوا۔ ''وہ وہاں تنہا ہے۔ اس کی بیوی اسے چھوڑ کر جا چکی ہے اور وہ اپنے رویے پر پشیمان ہونے کے بعد مجھے دوبارہ اپنانے کا متمنی ہے۔''

میں نے میسج ٹائپ کیا۔ ''تب پھر تمہاری نگاہوں میں میری حیثیت کیا تھی۔ کیا تم نے اپنی مرضی کے ساتھ مجھ سے شادی نہیں کی۔ اگر کی تو یہ سب کیوں کررہی ہو؟''

جواب موصول ہوا۔ ''ہماری شادی مجبوری پر مشتمل تھی۔ میں اپنے بچوں کی حادثاتی موت کو بھلا نہیں پارہی تھی اور آپ اپنے بچے کی موت پر پاگل ہوئے جارہے تھے۔ ہمارے رشتے کی وجہ صرف غموں کا اشتراک تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ تو اب بھی ہے۔ تم نے روش کو بدل کر دکھوں میں کمی کے بجائے مزید اضافہ کردیا۔ مجھے بتاؤ کہ میں اب کیا کروں۔''

جواب موصول ہوا۔ ''روبی آج بھی آپ کی منتظر ہے اسے اپنا لیجیے۔ مہر کو میرا نمبر اسی نے بھجوایا ہے۔ اسے غلط نہیں سمجھے گا۔ وہ اگر آپ کو میرے ساتھ خوش نہیں دیکھنا چاہتی تو اس میں بدنیتی کے بجائے اس کی محبت کا عمل دخل زیادہ ہے۔ اس سے دوبارہ شادی کرلیجیے، آپ بہت خوش رہیں گے۔''

میں نے غصے کے ساتھ موبائل بند کردیا اس سے مزید بات چیت فضول تھی۔ وہ مہر کی محبت میں پاگل ہوئے جارہی تھی۔

☆☆☆

اگلے ہفتے وہ واپس آگیا۔ بینش کا ہم عمر اور خوبصورت شخصیت کا مالک تھا۔ کھانے کے بعد ہم دونوں کو بات چیت کے لیے تنہائی کا موقع دیا گیا۔ تب وہ شرمسار

لہجے میں بولا۔

''مجھے اپنے رویئے پر نہایت شرمندگی کا احساس ہورہا ہے۔ بینش نے جب مجھے آپ کے متعلق بتایا تو میں نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا اصرار تھا کہ میں اس کے اور اپنے بارے میں آپ سے بات کروں۔ یہ میرے لیے آزمائش سے کم نہیں تھا اس لیے میں نے خالہ سے بات کرنے کے بعد انہیں مجبور کیا کہ وہ معاملے کو آگے بڑھانے میں میری مدد کریں۔''

میں نے جواب دیا۔''جو بھی ہوا۔ اچھا نہیں ہوا۔ میری کاروباری حلقے میں عزت اور ساکھ سب متاثر ہوکر رہ جائے گی۔ تاہم چند دنوں سے اس کے رویئے کو جانچتے ہوئے اندازہ لگا چکا ہوں کہ وہ اب میرے ساتھ کبھی بھی خوش نہیں رہ پائے گی اس لیے میں اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس وقت تک نہیں جب تک اس کی کوکھ میں پلنے والا بچہ دنیا میں آنکھ نہیں کھول لیتا۔''

مہر پریشان لہجے میں بولا۔''لیکن میں یہاں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے جلد لندن واپس جانا ہے۔ آپ اسے طلاق دے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بچے کی پیدائش کے بعد اسے چھوڑنے کے لیے خود یہاں آؤں گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''یہ نہیں ہوسکتا۔ اسے طلاق بچے کی پیدائش کے بعد ملے گی۔ مجھے اس پر اعتماد نہیں۔ وہ طلاق کے بعد بچہ میرے حوالے کرنے سے منکر بھی ہوسکتی ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔''مہر حتمی لہجے میں بولا۔''بینش اب آپ کے ساتھ نہیں رہے گی۔ وہ آج ہی خالہ کے ہمراہ ان کی کوٹھی میں چلی جائے گی۔ یوں سمجھئے کہ وہ اب آپ کے لیے نامحرم ہے۔''

''نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔''میں غصیلے لہجے میں بولا۔''وہ کوٹھی سے باہر نہیں جاسکتی۔ میں اپنے ہونے والے بچے سے دور نہیں رہنا چاہتا ہوں۔ وہ نادانستگی میں اس کے ساتھ کچھ بھی کرسکتی ہے۔''

مہر سرد لہجے میں بولا۔''اگر آپ نے زیادہ اصرار کیا۔ تب مجھے مجبوراً قانون کا سہارا لینا ہوگا۔ خلع کے کاغذات جمع کروانے کے بعد بھی وہی ہوگا جو میں آپ کو کہہ رہا ہوں۔''

اس کی بات میں دھمکی پوشیدہ تھی۔ میں اشتعال میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ وہ جس حقارت اور تحکمانہ انداز میں بات کررہا تھا وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھائی۔ بینش میری بیوی تھی۔ مجھے اس پر اختیار حاصل تھا۔ طلاق کے بعد وہ جہاں جاتی مجھے اعتراض نہیں ہوتا۔ وہ رات بینش نے مسز عباسی کے کمرے میں گذاری۔ میں نے صبح ناشتا نہیں کیا اور آفس چلا آیا۔ تمام دن میرا دماغ بینش اور مہر کی پیدا کردہ الجھنوں میں الجھا رہا۔ سرِشام میں نے رفیق صاحب کو کام سنبھالنے کے لیے کہا اور کوٹھی آگیا۔ وہ تینوں سٹنگ روم میں بیٹھے تھے اور کمرا مہر کے قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ بینش موبائل تھامے میسج کررہی تھی۔ میرے چہرے پر غصے اور تاسف کے ملے جلے تاثرات پیدا ہوئے۔ مجھے مسز عباسی سے یہ اُمید نہیں تھی۔ وہ نہایت خوش اور مطمئن دکھائی دے رہی تھیں۔ میں سٹنگ روم کے سائیڈ پر بنے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ تب مہر کے الفاظ نے میرے قدم روک دیئے۔

''خلع کے کاغذات مکمل ہوگئے ہیں۔ شمیم صاحب کی واقفیت نے وقت کی کمی کو پورا کردیا۔ کل آپ کو کاغذات مل جائیں گے اور پرسوں بینش کی منتقلی کے بعد میں واپس لندن چلا جاؤں گا۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض ہو تو بتا دیجیے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا کمرے میں آگیا۔ میں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا اور شمیم صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ استوار ہونے کے بعد ان سے اپنی قانونی حیثیت کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے بتایا۔''خلع کا مقدمہ دائر ہونے کے بعد بینش آپ کے اختیار سے باہر ہوگئی ہے۔ چونکہ مقدمہ اس کی طرف سے دائر کیا گیا ہے اس لیے لامحالہ عدالت فیصلہ بھی اس کے حق میں سنائے گی۔''

میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔

دو دنوں کے بعد مہر لندن چلا گیا اور جانے سے قبل بینش کو مسز عباسی کی کوٹھی میں چھوڑ گیا اور میں ایک دفعہ پھر تنہا ہوکر رہ گیا لیکن مجھے اب اس کی عادت ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو آفس اور گھر تک محدود کرلیا۔ بینش سے مجھے کوئی گلہ شکوہ نہیں تھا۔ ہمارا رشتہ بے جوڑ تھا۔ وہ مجھ سے بہت چھوٹی تھی۔ میں نے اس سے شادی کرکے غلطی کی تھی لیکن اس غلطی کا حاصل مجھے دوبارہ زندگی دینے والا تھا۔ میں شدت کے ساتھ نومولود کی آمد کا منتظر تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں بہت سے بچوں کی تصویریں لاکر لگا دیں۔ رنگ

برنگے کھلونوں سے کمرا بھر دیا۔ اس کے کپڑے اور فیڈر سب مکمل تھے۔ میرے بیڈ کے ساتھ وہ خوبصورت پالنا رکھا ہوا تھا جس کی مختصر گلابی چھت پر چاند ستارے لٹکے ہوئے تھے۔ اس کی آمد اور بینش کے بیرونِ ملک جانے کے بعد پرورش کی تمام ذمے داری مجھ پر منتقل ہونے والی تھی۔ میں ان میں کوتاہی نہیں برتنا چاہتا تھا۔ ہر اتوار کو میں لیڈی ڈاکٹر کو ہمراہ لے کر مسز عباسی کی کوٹھی جاتا۔ لیڈی ڈاکٹر بینش کا تفصیلی چیک اپ کرتی اور زچہ و بچہ کی صحت کو مدِنظر رکھتے ہوئے دوائیوں، خوراک اور احتیاطی اقدامات میں ردو بدل کرتی تھی۔ بینش کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ تمام وقت مہر کو میسج کرتی تھی۔ اس نے رات کو سونا ترک کر دیا تھا اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑنے لگے تھے۔ ہونٹ خشک پتوں کی مانند سوکھ کر اکڑ گئے تھے لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ وہ سجنا سنورنا مہر کی حد تک محدود کر چکی تھی اور چونکہ وہ ملک میں نہیں تھا اس لیے اپنی ذات کو نظر انداز کر کے بے پروا ہو گئی تھی۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا تھا۔ مجھے گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ گذرے ہوئے لمحات شدت کے ساتھ یاد آتے تھے۔ جب وہ میرے ہمراہ خوش اور مطمئن تھی، کھانے پر میرا انتظار کرتی تھی۔ میری پسند... اور ناپسند کو ملحوظِ نظر رکھتی تھی اور اب کتنی بے پروا تھی۔ جیسے اس کی نگاہوں میں گذرے ہوئے وقت کی حیثیت ایسے خواب سے زیادہ نہ ہو جسے اس نے آنکھ کھلنے کے بعد فراموش کر دیا ہو۔ مجھ سے لاتعلقی کا اظہار کرنے کے لیے وہ اپنے آپ کو موبائل پر مگن کر لیتی تھی۔ جیسے اس کا وجود تو کمرے میں ہو لیکن روح کہیں اور منتقل ہو گئی ہو۔

پھر وہ دن قریب آ گیا جس کا مجھے شدت کے ساتھ انتظار تھا۔ نرس نے جب بچہ مسز عباسی کے حوالے کیا تب ان نے بے دردی کے ساتھ ان سے چھین لیا۔ میری نہائیوں کا مداوا میری گود میں تھا۔ مجھے اب اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ میں نے بچے کو گاڑی میں منتقل کیا اور کوٹھی میں گیا۔ بچے کے لیے آیا کا بندوبست میں نے چند دن قبل کر لیا تھا۔ اس کی عمر پچاس سے اوپر تھی اور اپنے کام میں ماہر تھی۔ کارخانے کے حالات اب تسلی بخش ہو گئے تھے۔ میں نے تمام معاملات رفیق صاحب کے سپرد کر دیے اور خود زیادہ وقت بچے کے ساتھ گزارنے لگا۔ اگلے ہفتے میں طلاق کے کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے عدالت بلایا گیا۔ چونکہ معاملے میں دونوں فریقین کی مرضی پائی جاتی تھی اس لیے جلد ہی طلاق کی کارروائی مکمل ہو گئی۔ نا جانے کیوں مجھے شدت کے ساتھ احساس ہونے لگا تھا کہ میں سر سے پاؤں تک اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ ہر چند کہ یہ محبت یک طرفہ تھی۔ تاہم انجانے میں ہی سہی وہ میری زندگی کا ایک حصہ بن کر رہ گئی اور اب مجھے اپنی زندگی نامکمل محسوس ہونے لگی تھی۔ دوسرے دن اس کی بیرونِ ملک روانگی تھی میں ائرپورٹ چلا آیا۔ تاہم میں نے اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ بس دور کھڑا اس کے وجود کو اپنی آنکھوں کے راستے دل میں اتارتا رہا۔ وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھی۔ سیاہ بال کمر سے نیچے تک چلے گئے تھے اور وہ سن گلاسز لگائے ہوئے تھی۔ یقیناً اس نے مہر سے ملاقات کے لیے اہتمام کیا تھا۔ شاید بہت کچھ سوچا بھی ہو گا شادی کب اور کہاں کرنی ہے۔ ہنی مون کے لیے کون سے شہر کا انتخاب کرنا ہے۔ فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہوئی، بینش نے مسز عباسی کو گلے لگا کر الوداع کیا۔ نادانستگی میں اس کے چہرے کا رخ میری طرف ہوا۔ اس نے وقتی طور پر سن گلاسز کو اتارا ہماری آنکھیں چار ہوئیں اس کی آنکھوں میں چند لمحے کے لیے حیرت کا تاثر پیدا ہوا۔ جس پر جلد ہی اجنبیت کی چادر تن گئی اور اس نے لاتعلقی کے ساتھ چہرے کو دوسری جانب پھیر لیا۔ پھر تیز قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی مسافروں میں گم ہو گئی اور میں اداس چہرہ لیے گاڑی کی طرف آ گیا۔ کچھ ہی دیر میں جہاز گاڑی کے اوپر سے گذر کر نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھے بھری دنیا میں تنہا کر گئی ہو۔ جیسے میرے جسم میں سے جان نکال کر ہمراہ لے گئی ہو۔ میں نے سر کو جھٹک کر اپنی کیفیت پر قابو پایا اور گاڑی کو اندرون شہر جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔

☆☆☆

پھر میں نے اپنے آپ کو بچے کی حد تک محدود کر دیا۔ دودھ پیتے بچے کی پرورش کرنا آسان کام نہیں اور پھر اگر اس کے سر پر ماں کا سایہ نہ ہو تب دانتوں پیسنا بھی آ سکتا ہے لیکن میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے میں نے پیچھے ہٹنے کی کوشش نہیں کی۔ کارخانے کے معاملات علیحدہ تھے، مجھے ہفتے میں ایک دفعہ آفس جانا پڑتا تھا۔ باقی کے چھ دن میں اور سونو اکٹھے ہوتے تھے۔ بینش کے بیرونِ ملک جانے کے بعد مسز عباسی کی کوئی خبر موصول نہیں ہوئی۔ میں نے ایک دفعہ کوٹھی جا کر معلومات کرنے کی کوشش کی۔ چوکیدار نے بتایا کہ چند ماہ قبل مسز عباسی بیرونِ

ملک شفٹ ہوگئی ہیں اور انہوں نے کوٹھی کرائے پر چڑھا دی ہے، میں واپس آگیا۔ وقت اس تیزی سے گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا اور سونو گھٹنوں چلتے چلتے ہوش کی دنیا میں آتا چلا گیا تب میں نے مزید بہتر تربیت کے لیے اسے اسکول میں داخل کردیا اس طرح مجھے آدھے دن کی فراغت مل گئی۔ میں نے آفس کو وقت دینا شروع کردیا لیکن پہلے والے حادثے سے خوفزدہ تھا اس لیے سونو کو کوٹھی میں تنہا نہیں چھوڑتا۔ میں اس کے اسکول سے واپس آنے سے آدھا گھنٹا قبل کوٹھی آجاتا تھا۔ وہ نہایت ذہین اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ اکثر مجھ سے ماں کے متعلق پوچھتا تھا۔ میں اسے کسی مغالطے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس کی اُمیدوں کو ختم کرنے کے لیے میں نے اسے صاف الفاظ میں بتادیا تھا کہ اس کی ماں مرچکی ہے۔ اسے دھچکا ضرور لگا تھا تاہم اس نے جلد ہی صدمے پر قابو پالیا تھا اور دوبارہ ماں کے متعلق دریافت نہیں کیا۔

زندگی مخصوص ڈگر پر آگے بڑھنے لگی۔ مجھے اب بھی یہ خدشہ لاحق تھا کہ وہ ڈگر سے ہٹے گی ضرور۔ گذشتہ تین دفعہ ایسا ہوچکا تھا۔ سونو کے ساتھ رہتے ہوئے میں اس خدشے کو فراموش کردیتا تھا لیکن تنہائی میں یہ خوف دل و دماغ پر غالب ہونے لگتا تھا۔ ہفتے کی شام ہم دونوں ساحل سمندر کے کنارے گذارتے تھے۔ رات کا کھانا قریبی ریستوران میں کھانے کے بعد ہم قریبی سینما میں کارٹون فلم دیکھنے آجاتے تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ خاموش خاموش رہتا تھا۔ یقیناً ماں کے متعلق سوچتا تھا۔ میں جتنی بھی کوشش کرلیتا، اس کے دل و دماغ میں سے احساس محرومی کو نکال نہیں سکتا تھا۔ ہر چند کہ وہ میرے ساتھ ہنستا کھیلتا تھا۔ تاہم بعض اوقات خاموش ہوکر سوچوں میں گم ہوجایا کرتا تھا۔

پھر مجھے عدالت کی جانب سے نوٹس موصول ہوا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح ہے۔ سونو کے اسکول جانے کے بعد میں نے کپڑے تبدیل کیے اور آفس روانگی کے لیے کوٹھی سے باہر نکلنے لگا۔ تب مجھے کوریئر نے وہ لفافہ تھمادیا، میں نے پڑھے بغیر اسے گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ اس دن آفس میں کام معمول کی نسبت زیادہ تھا۔ بارہ بجے کے قریب مجھے فراغت نصیب ہوئی تب مجھے لفافے کا خیال آیا۔ میں نے چپڑاسی کو کار سے لفافہ لانے کے لیے بھیجا۔ وہ جلد لے آیا۔ میں نے لفافے پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ عدالت کا نوٹس تھا۔ مضمون پر نگاہ ڈوڑاتے ہی میرے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں، وہ بینش کی جانب سے تھا۔ بچے کی واپسی کے لیے اس نے مجھ پر مقدمہ دائر کردیا تھا۔ میں نے اسے پھاڑ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ وہ میرے جسم میں سے دوڑتے ہوئے خون کا آخری قطرہ چھیننے کے لیے ملک سے واپس آگئی تھی۔ میرے موبائل میں مسز عباسی کی کوٹھی کا فون نمبر موجود تھا۔ میں نے نمبر ملایا۔ فون مسز عباسی نے ہی اٹھایا۔ رسمی بات چیت کے بعد میں نے نوٹس کے متعلق پوچھا۔ دوسری جانب چند لمحوں کے لیے خاموشی طاری ہوگئی، پھر ان کی آواز سنائی دی۔

''بچہ اب تک غالباً آٹھ سال کا ہوگیا ہوگا۔ کیا ماں کو یاد نہیں کرتا؟''

میں نے غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ ''اسے ضرورت نہیں۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ وہ اس کی پیدائش کے فوراً بعد مرگئی تھی اس لیے اس کے واپس آنے کی اُمید رکھنا فضول ہے۔''

مسز عباسی کی آواز سنائی دی۔ ''بچے باپ کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں جب اسے معلوم ہوگا کہ تم نے اس سے جھوٹ بولا ہے تو وہ دلبرداشتہ ہوکر تم سے دور جانے کی کوشش کرے گا۔''

میں تلخ لہجے میں بولا۔ ''میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ طلاق کے بعد بینش اس کے لیے مرگئی تھی۔ اس نے آٹھ سالوں کے دوران پلٹ کر بچے کی خبر نہیں لی کہ وہ کس حال میں ہے۔''

مسز عباسی میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولیں۔ ''بینش اور مہر کو ان آٹھ سالوں کے دوران اولاد نہیں ہوئی۔ چند عرصہ قبل ڈاکٹروں نے ناامیدی کا اظہار کردیا۔ اسے اولاد چاہیے... ورنہ ایک دفعہ پھر پاگل خانے چلی جائے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم بچہ دینے سے انکار کردو گے اس لیے میں نے شمیم صاحب کو نوٹس جاری کرنے کے لیے کہہ دیا۔''

میں نے غصے سے موبائل کو بند کردیا۔ سوا بارہ بجے والے تھے۔ سونو کی چھٹی ڈیڑھ بجے ہوتی تھی میرے پاس کچھ وقت باقی تھا اس لیے میں اٹھ کر اپنے قانونی وکیل فردوس عالم کے آفس آگیا۔ انہیں حالات کی تفصیل آگاہ کرنے کے بعد میں نے اپنی پوزیشن کے متعلق پوچھا وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولے:

''بظاہر کیس معمولی نوعیت کا ہے اس لیے آپ

حیثیت مستحکم ہے۔ بینش دودھ پیتے بچے کو چھوڑ کر لندن چلی گئی۔ اس نے آٹھ سالوں کے دوران اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ایک بھی فون نہیں کیا اور اب جب اسے اولاد کی ضرورت ہے تب وہ اسے لینے کے لیے ملک واپس چلی آئی۔ میرے خیال میں ایک دو پیشیوں کے دوران ہی عدالت آپ کے حق میں فیصلہ دے دے گی۔''

میں نے بتایا۔ ''بینش کا وکیل آپ کا ہم پلہ ہے۔ آپ اسے ترنوالہ نہ سمجھیے۔ اور کیس پر مکمل دھیان دیجیے۔''

فردوس صاحب نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پوچھا۔ ''بینش نے بچہ اپنی مرضی سے آپ کو دیا تھا... یا پھر آپ کی ضد کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے دینے کے لیے رضامند ہوئی تھی۔''

''وہ اپنے سابقہ شوہر کی محبت میں پاگل ہو رہی تھی۔ اسے میری یا پھر بچے کی قطعی پرواہ نہیں تھی۔ جب میں نے بچہ اپنے پاس رکھنے کی شرط عائد کی... تب اس نے فوراً ہامی بھر لی۔''

فردوس صاحب نے پوچھا۔ ''اس معاملے میں کوئی قانونی کارروائی یا پھر عدالتی دستاویز جس کی رو سے وہ اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کی مجاز نہ ہو؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔ سب معاملہ زبانی کلامی طے پایا۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی کہ میں نے قانون کی مدد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''تو پھر کل سے میں قانونی کارروائی کا آغاز کر دیتا ہوں۔ مجھے آپ کے چند کاغذات جن میں شناختی کارڈ کی کاپیاں سرفہرست ہیں دستیاب ہوں گی۔ تاہم میری کوشش ہوگی کہ مقدمہ مخالف پارٹی کی جانب سے دائر ہو۔ یہ ہمارے حق میں مفید ہوگا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور چند قانونی پیچیدگیوں پر نظر ثانی کرنے کے بعد کوٹھی آ گیا۔ رات کو مسز عباسی کا فون آیا انہوں نے میری مرضی دریافت کی۔ ''میں نے بتایا کہ بچہ کسی صورت میں بھی بینش کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ چاہے اس کے لیے مجھے عدالت ہی کیوں نا جانا پڑے۔'' مسز عباسی بولیں۔ ''تو پھر مقدمے بازی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ شمیم صاحب کیس کی تیاری مکمل کر چکے ہیں۔ جلد عدالت کے کمرے میں ملاقات ہوگی۔''

میں نے جھٹکے کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں خوف جنم لینے لگا تھا کہ سونو مجھ سے جدا ہونے والا ہے، اس کے بغیر میرے لیے ایک پل بھی سانس لینا ممکن نہیں تھا۔ میں نے ایڈووکیٹ فردوس عالم کا انتخاب نہایت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ملک میں دو نام ایسے تھے جو ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔ شمیم صاحب اور فردوس عالم ان دونوں کے کریڈٹ پر ایسے متعدد کیس گولڈ میڈل کی صورت میں جگمگا رہے تھے... جن میں انہوں نے اپنی ذہانت کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فردوس صاحب

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید میر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

عدالت میں شمیم صاحب کے دانت کھٹے کرنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ اس کے باوجود بھی ایک خوف تھا جو مجھے اندر ہی اندر پانی میں گھلنے والے نمک کی طرح پگھلنے پر مجبور کررہا تھا۔ شام کو میں نے فردوس صاحب کو اپنی اور مسز عباسی کی گفتگو سے آگاہ کردیا۔ انہوں نے مجھے دوسرے دن اپنے کاغذات آفس پہنچانے کے لیے کہا۔ اگلے ہفتے کیس کی تاریخ پر مشتمل نوٹس موصول ہوا۔ میں نے نوٹس فردوس صاحب کے حوالے کردیا۔ انہوں نے نوٹس کو فائل میں رکھنے کے بعد کاغذات عدالت بھجوادیے۔ شام آٹھ بجے سے نو بجے کے درمیان ہماری ملاقات کم وبیش روزانہ ہوا کرتی تھی۔ وہ کیس کی تیاری کے لیے مجھ سے نہایت باریک بینی کے ساتھ سوال پوچھتے تھے۔ یہ سوالات اتنے نپے تلے ہوتے تھے کہ میں ان کی ذہانت کی داد دینے پر مجبور ہوجایا کرتا تھا۔ اگلے ہفتے کیس کی شروعات ہوئیں۔

☆☆☆

عدالت کا کمرا تماش بینوں سے بھرا ہوا تھا۔ اگلی رو میں شمیم صاحب اور فردوس صاحب براجمان تھے۔ ان کے پیچھے مسز عباسی، مہر اور بینش بیٹھے تھے۔ میں نے بینش کے سراپے کا جائزہ لیا وہ آٹھ سال میں پہلے جیسی ہی تھی۔ رتی برابر فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہماری نگاہیں لحظہ بھر کے لیے چار ہوئیں۔ اس نے مخصوص بے اعتنائی کے ساتھ چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ نہ جانے یہ میرا وہم تھا یا پھر حقیقت تھی۔ تماش بینوں میں مجھے روبینہ کا چہرہ بھی دکھائی دیا۔ جج ملحقہ کمرے میں کاغذات پر مشتمل فائل کا مطالعہ کررہے تھے۔ فردوس صاحب کے کہنے کے مطابق ان کے پاس طلاق کے متعدد کیس تھے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے زیادہ تر تاریخ کے انتظار میں ان کی میز پر پڑے تھے۔ کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اٹھ کر عدالت کے کمرے میں آگئے۔ تماش بین ان کے احترام میں کرسی چھوڑ کر کھڑے ہوگئے اور وہ اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد متعلقہ وکیل کی طرف تفہیمی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ شمیم صاحب کرسی سے اٹھ کر جج کی میز تک آئے۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل جج کی میز پر رکھ دی اور تماش بینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''میری موکل بینش عباسی کی جانب سے اپنے لڑکے سفیان علی ولد علی مہتاب کی واپسی کے لیے مقدمہ دائر کیا گیا ہے۔ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان آٹھ سال قبل طلاق ہوئی تھی۔ بعد ازطلاق بینش نے اپنے کزن مہر علی عباسی کے ساتھ شادی کرلی اور بیرونِ ملک شفٹ ہوگئی۔ اب وہ بچے کی واپسی کی خواہش مند ہے۔ جج نے فائل کا معائنہ کیا اور شمیم صاحب کو مقدمہ آگے بڑھانے کے لیے کہا۔ شمیم صاحب بولے: ''میں مقدمے کا آغاز کرتے ہوئے علی مہتاب جو کہ بینش کے سابق شوہر ہیں انہیں کٹہرے میں آنے کی درخواست کرتا ہوں۔''

میں اٹھ کر کٹہرے میں آگیا۔ شمیم صاحب نے پوچھا۔ ''آپ کا نام علی مہتاب ولد احمد علی موجودہ رہائش گلشن اقبال اور ذاتی ملکیت زیب گارمنٹس ہے۔ پہلی بیوی کا نام مہوش زیب، دوسری روبینہ علی اور تیسری میری مؤکل بینش عباسی ہے۔ میں نے ناموں میں غلطی کی ہو تو آپ درست کرسکتے ہیں۔

میں نے بتایا۔ ''نام درست ہیں۔''

شمیم صاحب نے اپنا رخ جج کی طرف کیا... اور بولے۔ ''مہوش زیب کے بطن سے علی مہتاب کو دو لڑکے ہوئے۔ پہلا سفیان علی جبکہ دوسرا پیدائش کے بعد وفات پاگیا۔ ان کی دوسری شادی روبینہ علی سے ہوئی... اور سفیان علی کی حادثاتی موت کے بعد انہیں تین سال پاگل خانے میں زیرِ علاج رہنا پڑا۔ میں اس حادثے کے متعلق ان سے دریافت کرنا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے ان کے لڑکے کی موت واقع ہوئی۔''

میرے اندر زلزلے کے اثرات پیدا ہوئے اور میں نے رحم طلب نگاہوں سے فردوس صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی چھوڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ ''مجھے اپنے مخالف وکیل کے تقاضے پر اعتراض ہے۔ اس حادثے کا تعلق مقدمے سے نہیں ہے۔ برائے مہربانی اس کے متعلق پوچھنے سے اجتناب کیا جائے۔''

جج کے کچھ کہنے سے قبل شمیم صاحب بولے۔ ''اس حادثے کا تعلق باقاعدہ طور پر مقدمے سے پایا جاتا ہے۔ ایک نااہل اور غیر ذمے دار باپ کی غفلت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ علی مہتاب کو اس کے متعلق بتانا ہی ہوگا۔''

فردوس صاحب بولے۔ ''اس کے باوجود میں اپنے مؤکل کی دماغی حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے عدالت سے اپیل کرتا ہوں کہ اس حادثے کے متعلق نہ پوچھا جائے۔ میرے مخالف وکیل نے پاگل خانے میں علاج سے متعلق رپورٹ فائل میں درج کی ہے تو آپ دیکھ سکتے ہیں رپورٹ کے مطابق مریض کا دماغ حادثے کی یاد سے دوبارہ متا

ہوسکتا ہے۔''

شمیم صاحب بولے۔ ''ٹھیک ہے۔ میں حادثے کی تفصیل بیان کرنے پر زور نہیں دیتا۔ تاہم اس بات کو بیان کرنے پر کس وپیش سے کام نہیں لوں گا کہ وہ حادثہ ایک باپ کی غفلت اور غیر ذمے داری کا منہ بولتا ثبوت تھا۔''

میں نے جذباتی لہجے میں بتایا۔ ''وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ اس میں غفلت یا پھر غیر ذمے داری کا پرتو بھی موجود نہیں تھا۔ مہوش کے مرنے کے بعد مجھے ایک ایسی بیوی کی تلاش تھی جو ایک ماں بن کر میرے بچے کی نگہداشت کرسکے۔ مجھ سے انتخاب میں غلطی ہوئی۔ میں نے روبی سے شادی کرلی۔ شادی کے بعد اس نے کبھی بھی سونو کو ماں کی ممتا دینے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ اس سے بے پروائی کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں سونو کی موت واقع ہوئی اور مجھے پاگل خانے جانا پڑا۔''

شمیم صاحب نے پوچھا۔ ''حادثے کے وقت آپ کہاں تھے؟''

''میں آفس میں تھا۔ ان دنوں کام کی زیادتی کی وجہ سے آفس کو زیادہ وقت دینا پڑ رہا تھا۔''

شمیم صاحب جج کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''علی مہتاب صاحب کی تیسری بیوی بینش عباسی سے ان کی دوبارہ اولاد ہوئی۔ لڑکے کا نام پہلے لڑکے کے نام پر سفیان علی عرف سونو رکھا گیا۔ حالات وواقعات پہلے جیسے تھے۔ بچے کی نگہداشت کے لیے انہیں ایک دفعہ پھر اپنے کام کی مصروفیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے گھر اور سونو کو وقت دینا پڑا۔ تاہم اس دفعہ انہوں نے شادی کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ آفس کے معاملات اپنے سیکریٹری کے حوالے کرتے ہوئے بچے کو مکمل توجہ دینے کی کوشش کی۔ میں سمجھتا ہوں۔ پہلے بچے کی موت سے قبل انہوں نے یہ جذباتی اقدام نظرانداز کیوں کیا۔ کیا اس میں دوسری شادی کرنے کا شوق پنہاں تھا یا پھر انہیں اپنے آفس میں کام کرنے والی ورکر روبینہ علی سے محبت ہوئی تھی۔ میرے اس پوائنٹ کو نوٹ کیا جائے۔ ان دونوں صورتوں کے دوران انہوں نے نہ صرف اپنے اکلوتے لڑکے کو نظرانداز کیا بلکہ روبینہ علی عرف روبی کے حقوق پورے کرنے میں بھی نااہلی کا مظاہرہ کیا۔'' میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن شمیم صاحب جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''میں روبینہ سے کٹہرے میں آنے کی درخواست کرتا ہوں۔''

جج نے اجازت دے دی۔ میں کٹہرے سے نکل کر اپنی کرسی کی طرف آگیا اور پچھلی رو سے روبینہ نکل کر کٹہرے میں کھڑی ہوگئی اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔ شمیم صاحب نے پوچھا۔ ''روبینہ علی ولد مومن علی۔ آپ نے اپنے شوہر علی مہتاب کی ہمراہی میں کتنا عرصہ گذارا اور اس عرصے کے دوران آپ نے شوہر کو ازدواجی حقوق کے معاملات میں کیسا پایا۔''

روبینہ بولی۔ ''طلاق ہونے کے بعد مجھے اس سے کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ تاہم ازدواجی حقوق پورے نہ کرنے میں اس نے جس نااہلی کا مظاہرہ کیا۔ میں اسے بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مہوش زیب یا پھر بینش عباسی سے اس کی ایک ایک اولاد ہوئی لیکن میں اس نعمت سے محروم رہی۔ اس نے مجھے ہمیشہ نظرانداز کیا۔ اولاد کے بغیر عورت ادھوری تصور کی جاتی ہے اس نے نہ صرف مجھے اس حق سے دور رکھنے کی کوشش کی بلکہ سونو کو بھی اس میں ملوث کرنے کے بعد کھودیا۔ اگر وہ میرے حقوق میں کوتاہی نہیں کرتا تو میں اس کے بچے کو اپنا سمجھ کر غفلت نہ برتتی۔''

شمیم صاحب نے پوچھا۔ ''علی مہتاب کی آفس ٹائمنگ کیا تھی اور کیا ان اوقات کے دوران سونو اپارٹمنٹ میں اکیلا ہوتا تھا۔''

روبی نے بتایا۔ ''وہ عموماً نو بجے آفس جاتا تھا۔ سونو کا اسکول آٹھ بجے لگتا تھا۔ اسے اسکول لے جانے کے لیے وین لگائی گئی تھی۔ اس کی واپسی دوپہر کو ڈیڑھ بجے ہوتی تھی۔ تاہم علی چھ بجے سے پہلے واپس نہیں آتا تھا۔ ان اوقات کے دوران سونو اپارٹمنٹ میں اکیلا ہوتا تھا۔''

شمیم صاحب جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''ان چند واقعات کے دوران آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ علی مہتاب ایک غیر ذمے دار باپ رہ چکے ہیں۔ انہوں نے تین شادیاں کیں لیکن کسی بھی بیوی کے حقوق پورے نہیں کیے۔ پہلی بیوی کے بچے کی موت کے ذمے دار بھی وہی ہیں... اور اگر غیر ذمے داری کا یہ سلسلہ چلتا رہا تو دوسرے بچے کی موت بھی ان کے ہاتھوں سے واقع ہوگی۔ میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ بچے کو موت سے قبل ماں کے حوالے کردیا جائے، بصورت دیگر ان پر پہلے بچے کی موت کا مقدمہ بھی دائر کیا جاسکتا ہے۔''

میرے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ روبی کٹہرے .... سے نکل کر اپنی کرسی کی طرف چلی گئی۔ جج نے فردوس

صاحب کی طرف تفہیمی نگاہوں سے دیکھا۔ فردوس صاحب اٹھ کر کٹہرے کی طرف آگئے۔ انہوں نے اپنی فائل جج کے حوالے کی۔ پھر بینش کو کٹہرے میں آنے کے لیے کہا۔ چونکہ وہ بول نہیں سکتی تھی اس لیے مترجم کو بھی اس کے ساتھ کٹہرے میں آنے کی دعوت دی گئی۔ وہ ادھیڑ عمر شخص گونگے بہرے بچوں کے اسکول میں ٹیچر تھا۔ بینش کا استاد رہ چکا تھا اور وہ اس کی بہت عزت کرتی تھی۔ فردوس صاحب نے جج کو بتایا۔ ''بینش بول اور سن نہیں سکتی اس لیے مترجم کو ساتھ بلایا گیا ہے۔''

جج نے تاسف بھری نگاہوں سے بینش کی طرف دیکھا... پھر کارروائی کو آگے بڑھانے کی اجازت دے دی۔ فردوس صاحب نے پہلا سوال پوچھا۔ ''آپ کی جانب سے میرے مؤکل علی مہتاب پر بچے کی واپسی کے لیے مقدمہ دائر کیا گیا ہے۔ کیا آپ مقدمے کی نوعیت کے متعلق معلومات رکھتی ہیں؟''

مترجم نے انگلیوں کے اشاروں سے سوال بینش کے دماغ میں منتقل کیا۔ اس نے جواب دیا۔ ''ہاں۔ میں بچے کی خواہش مند ہوں۔''

''آپ کو آٹھ سال اس کی ضرورت محسوس کیوں نہیں ہوئی۔'' فردوس صاحب نے پوچھا۔ ''آٹھ سال اسے نظر انداز کرنے کا کوئی معقول جواز ہے آپ کے پاس۔ اگر ہے تو بیان کردیں۔''

مترجم نے سوال بینش کی جانب منتقل کیا اور ملنے والے جواب کو بہ آواز بلند دوہرا دیا۔

''میں آٹھ سال قبل اپنا بچہ سابقہ شوہر کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ مجھے مجبور کیا گیا تھا کہ طلاق اسی صورت میں ہوگی۔ جب میں بچہ باپ کے حوالے کروں گی۔''

''ان آٹھ سالوں کے دوران آپ نے بچے کی قطعاً خبر لینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ کہیں ایسا تو نہیں آپ کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔''

بینش کی جانب سے جواب موصول ہوا۔ ''یہ بھی میرے شوہر کی شرط تھی کہ بچے سے رابطہ نہ رکھا جائے۔''

فردوس صاحب طنزیہ لہجے میں بولے۔ ''آپ کو ان کی شرائط کا بہت لحاظ ہے لیکن خوشی غمی کا کوئی احساس نہیں۔ شاید آپ کو اندازہ نہیں، آپ ان سے ان کی کل متاع چھیننے کی کوششیں کررہی ہیں۔''

بینش خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے جواب کا انتظار کرنے کے بعد فردوس صاحب نے اگلا سوال پوچھا۔ ''آپ کی پہلی شادی مہر عباسی سے ہوئی۔ اس شادی سے آپ کو دو بچے ہوئے۔ پہلا صحت مند تھا... اور دوسرے کی حمل کے دوران موت واقع ہوگئی۔ آپ موت کی وجہ بیان کریں گی۔''

سوال منتقل ہونے کے بعد بینش کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ چند لمحے رنج و الم کی تصویر بنے رہنے کے بعد اس نے بتایا۔ ''وہ ایک حادثہ تھا۔ میں اس کے متعلق بتانے کے قابل نہیں ہوں۔ برائے مہربانی دوسرا سوال پوچھا جائے۔''

فردوس صاحب طنزیہ لہجے میں بولے۔ ''اس رات دو بچوں کی موت واقع ہوئی۔ اگر میں چاہوں تو اپنے مخالف وکیل کی طرح آپ کے شوہر پر بھی قتل کا مقدمہ دائر کرسکتا ہوں۔ تاہم میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں مدعے سے ہٹنا نہیں چاہتا۔ آپ کو حادثے کے متعلق تو بتانا ہی ہوگا۔''

بینش شش و پنج میں پڑ گئی۔ جج نے وقت کی کمی کے متعلق بتاتے ہوئے مقدمے کو آگے بڑھانے کی تنبیہ کی۔ تب وہ درد بھرے چہرے کے ساتھ اشاروں کی زبان میں بولی۔ ''میرا شوہر بیرونِ ملک جانے کے لیے غیر ملکی عورت کے ساتھ دوسری شادی کا خواہش مند تھا۔ میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ ہمارے درمیان تلخ کلامی ہوئی جو بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی کی صورت اختیار کرنے لگی۔ میں دودھ پیتے بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے تھی۔ ہاتھا پائی کے دوران مجھے دھکا لگا اور میں منہ کے بل زمین پر گری۔ بچے کی موت موقع پر ہی واقع ہوئی اور حمل چند دنوں کے بعد اسپتال میں ضائع ہوگیا۔''

فردوس صاحب نے طویل سانس لیتے ہوئے جج کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''صاف قتل کا کیس ہے۔ ہاتھا پائی کے دوران ایک نہیں بلکہ دو بچوں کی موت واقع ہوئی۔''

فردوس صاحب کی تمام بات چیت مترجم بینش کو منتقل کررہا تھا۔ اس نے بے چینی کے انداز میں بات کاٹتے ہوئے بتایا۔

''وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ اس میں میرے شوہر کی مرضی شامل نہیں تھی۔ وہ مجھے دھکیل کر کمرے سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ میرے آڑے آنے کی وجہ سے اسے زور آزمائی کرنا پڑی اور غیر متوقع طور پر حادثہ پیش آگیا۔ اگر آپ سا

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224
راولپنڈی	03335205014	بوروالہ	03347193958
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952

منڈی بہاؤالدین	03460827027	منڈی بہاؤالدین	0331-7619788
سیالکوٹ	0524568440	مغل آباد	0301-7681279
میرپور AK	03460397119	ڈسکہ	0300-9463975
اٹک سٹی	057210003	سمبڑیال	0333-8604306
دیپالپور	03004059957	کوٹ رادھا کشن	03004992290
لیہ	03002373988	مانسہرہ	0333-5021421
قصبہ ڈنگہ	03083360600	حجرہ شاہ مقیم	03006969881
عارف والا	03008758799	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459
لورالائی	03023844266		
کوٹلہ ارب علی خان	03016299433		
جلالپور پیروالا	03338303131		
ہری پور	03321905703		
چکوال	03348761952		
وہوا	03346383400		
حافظ آباد	03006885976		
کوہاٹ	03325465062		
ایبٹ آباد	0992335847		
چترکی	03454678832		

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

میرے شوہر پر مقدمہ دائر کیا۔ تب میں اسے معاف کرتے ہوئے مقدمہ کو ختم کرنے کی اپیل کروں گی۔''

فردوس صاحب بولے۔ ''مجھے حیرت محسوس ہو رہی ہے کہ اس ہاتھا پائی کو نظر رکھنے کے باوجود بھی آپ بچے کو اس خونی انسان کے ساتھ رکھنا چاہتی ہیں۔ جس نے اپنے بچے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ کو زدوکوب کرنے کی کوشش کی۔ سفیان علی تو اس کے لیے غیر ہے۔''

بینش خاموش رہی۔ فردوس صاحب نے جج کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''میرے پوائنٹ کو نوٹ کیا جائے۔ دو بچوں کا قاتل ذمے دار باپ کیوں کر ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کی پرورش میں نااہل ثابت ہو چکا ہے۔ میرے خیال میں بچہ اس کے حوالے کرنا سراسر ناانصافی ہوگی۔ تاہم عدالت اپنا مؤقف بیان کرنے کی مجاز ہے۔ میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔''

جج نے چند لمحے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل پر کچھ نوٹس مرتب کیے... پھر اگلے دن دوبارہ پیشی کا وقت دینے کے بعد اٹھ کر بغلی کمرے میں چلے گئے۔

دوسرے دن دوبارہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ شمیم صاحب نے آٹھ سالہ سفیان علی کو کٹہرے میں آنے کی اجازت طلب کی۔ میں اسے کٹہرے تک چھوڑ آیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات تھے۔ شمیم صاحب دلاسہ دینے والے لہجے میں بولے۔ ''بیٹا آپ کو پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ میں آپ سے چند سوال پوچھوں گا۔ آپ بلاتامل ان کے جواب سر کو نفی میں یا پھر اثبات میں ہلا کر دے سکتے ہیں۔ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ آپ کے والد صاحب آپ کو دن کا کتنا وقت دیتے ہیں۔ پانچ گھنٹے، دس گھنٹے یا پھر بارہ گھنٹے۔''

سونو نے جواب دیا۔ ''اسکول سے آنے کے بعد بابا تمام وقت میرے ساتھ گزارتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر انہیں آفس سے کال کر کے بلایا بھی جاتا ہے تو وہ انکار کر دیتے ہیں۔''

شمیم صاحب نے پوچھا۔ ''آپ کو ہوم ورک کون کرواتا ہے۔ بابا یا پھر ٹیوٹر۔''

سونو نے بتایا۔ ''ٹیوٹر۔ بابا میرے لیے شام کو اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کرتے ہیں۔ ان کے پاس ہوم ورک کروانے کے لیے اتنا وقت نہیں بچتا کہ کھانا تیار کرنے کے بعد مجھے ہوم ورک بھی کروا سکیں۔ تاہم وہ رات کو سونے سے قبل ہوم ورک چیک ضرور کرتے ہیں۔''

شمیم صاحب نے پوچھا۔ ''شاید آپ کو اپنے باپ سے بہت پیار ہے۔ ہر بچے کو ہوتا ہے لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے آپ سے بہت بڑا جھوٹ بولا ہے کہ آپ کی ماں مر چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ سامنے والی رو میں بیٹھی ہوئی ہے۔''

سونو نے بینش کی طرف سرسری طور پر دیکھا۔ تاہم کہا کچھ نہیں۔ شمیم صاحب دوبارہ بولے۔ ''درحقیقت آپ کا باپ نہایت خودغرض اور مفاد پرست انسان ہے۔ وہ آپ کو ماں کے پاس بھیجنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے آپ سے جھوٹ بولا کہ وہ مر چکی ہے۔''

سونو غصے سے چیخ اٹھا۔ ''آپ میرے بابا کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتے۔ میں یہ سب نہیں سن سکتا۔''

شمیم صاحب خاموش ہوگئے۔ سونو کٹہرے سے نکل کر میرے پاس آگیا۔ میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے اور مجھے آٹھ سال کی محنت رنگ لاتی نظر آنے لگی۔ عدالت کے کمرے میں کمبھیر خاموشی طاری ہوگئی۔ جج نے فردوس صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کارروائی کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔ انہوں نے بینش کو کٹہرے میں بلانے کی اجازت طلب کی۔ بینش کے ہمراہ مترجم بھی کٹہرے میں آگیا۔ فردوس صاحب نے پوچھا۔

''علی مہتاب سے طلاق اور مہر عباسی سے دوبارہ شادی کے بعد آپ کو آٹھ سال کے دوران اولاد نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ بیان کیجیے۔''

مترجم نے سوال بینش کی جانب منتقل کیا اور اس کا جواب عدالت کے سامنے دوہرا دیا۔

''مہر کو بچوں سے دلچسپی نہیں۔ اس بنا پر ہم کافی عرصہ پرہیز کرتے رہے لیکن مجھے بچوں سے پیار ہے اس لیے میری ضد کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مہر نے سفیان علی کو لینے کے لیے مقدمہ دائر کر دیا۔''

فردوس صاحب نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ نے کیا بتایا۔ مہر کو بچوں میں دلچسپی نہیں۔'' صاحب میرے پوائنٹ کو نوٹ کیا جائے۔ بینش صاحبہ شوہر کو بچوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ لینے کی خواہش مند ہیں۔ یہ سراسر بچے کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ مہر اسے باپ کا پیار بھی نہیں دے سکے گا اس میری عدالت سے درخواست ہے کہ میرے مؤکل علی مہتا سے بچے کو نہ چھینا جائے۔''

بینش خاموش رہی۔ وہ سر جھکائے کٹہرے میں زمین کو گھور رہی تھی۔ فردوس صاحب جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''ایک خودغرض ماں کا دوسرا گھناؤنا جھوٹ چند ڈاکٹری رپورٹوں کی صورت میں میرے پاس موجود ہے۔ میں عدالت کو ان رپورٹوں کے مطالعے کی درخواست کرتا ہوں۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل جج کی میز پر رکھ دی اور تمام بینوں کی طرف چہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''مجھے ان رپورٹوں کے حصول کے لیے بیرونِ ملک اپنے چند دوستوں کا سہارا لینا پڑا۔ گزشتہ روز ای میل کے ذریعے ان رپورٹوں کی دستیابی ہوئی اصل رپورٹ سفارت خانہ کے ذریعے آرہی ہے۔ ان رپورٹوں کے مطالعے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ بینش صاحبہ گزشتہ چند سالوں سے اولاد کے حصول کے لیے علاج کروا رہی تھیں اور دو ماہ قبل ڈاکٹروں نے انہیں لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ علاج میں ناکامی نے انہیں پاگل کردیا۔ وہ بچے کی خواہش مند تھیں۔ لیکن قدرت نے مکافاتِ عمل کے دوران انہیں اس نعمت سے یکسر محروم کردیا۔ تب انہیں سفیان علی کی یاد نے ستایا اور انہوں نے اپنے شوہر سے مشورے کے بعد مقدمہ دائر کردیا۔ میری عدالت سے درخواست ہے کہ خدارا بچے کو ایک خودغرض اور مفاد پرست ماں کے حوالے نہ کیا جائے۔ یہ بچے پر بھی ظلم ہوگا اور بچے کے باپ پر بھی۔

جج نے ڈاکٹری رپورٹ کا معائنہ کرنے کے بعد فائل فردوس صاحب کے حوالے کردی۔ پھر اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل پر چند نوٹس مرتب کرنے کے بعد مقدمے کا فیصلہ دوسرے دن سنانے کا کہہ کر عدالت برخاست کردی۔

تیسرے دن کی کارروائی سرسری ثابت ہوئی۔ شمیم صاحب نے میرے آفس ورکر اور کوٹھی کے چند ملازموں کا بیان پیش کیا۔ فردوس صاحب نے پاگل خانے کے کچھ ڈاکٹروں اور یونٹ کے ان افراد کو جن کا تعلق مسز عباسی اور بینش سے تھا۔ عدالت کے کٹہرے میں بلایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بینش کی دماغی حالت اب بھی مناسب نہیں ہے۔ جج ان دونوں کے بیانات میں سے مختصر نوٹس فائل پر درج کرتا رہا۔ یہ آخری پیشی تھی۔ مقدمہ اتنا پیچیدہ نہیں تھا۔ بچے کو ماں یا باپ دونوں میں سے ایک کے پاس منتقل کرنا تھا۔ تاہم بچے کا ماں یا باپ دونوں سے تعلق رہنا نہایت ضروری تھا۔ اگر فیصلہ ماں کے حق میں ہوتا تو باپ کو بچے سے ملنے کے لیے مختصر وقت کی اجازت دینا ضروری تھی... اور اگر بچہ باپ کے حوالے کیا جاتا تو ماں کا اس سے ملنا نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ یہ تمام باتیں مجھے فردوس صاحب نے گزشتہ دنوں بتائی تھیں اور ان کے کہنے کے مطابق ہمارا پلڑا بھاری تھا۔ چونکہ بچہ میرے ساتھ پلا بڑھا تھا اور وہ مجھ سے مانوس تھا۔ ماں نے آٹھ سالوں کے دوران اس کی خیریت بھی دریافت نہیں کی تھی۔ چند دنوں قبل ملنے والی ڈاکٹری رپورٹ نے اسے تقریباً پاگل کرکے رکھ دیا تھا اور اسے اپنی حماقت کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس لیے وہ بچہ کے حصول کے لیے ملک واپس آگئی تھی۔ جج نے نوٹ قلمبند کیے اور ان کی روشنی میں اپنے فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے بولے:

''بچے کی پرورش میں ماں اور باپ دونوں کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ ایک کی کمی بھی اس میں احساس محرومی کو پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ تاہم بعض اوقات کچھ مجبوریوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ماں باپ کو بحالتِ مجبوری علیحدہ ہونا پڑتا ہے۔ تب بچے کو بہت بڑے امتحان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ کیس میں چونکہ بچہ باپ کے ساتھ پلا بڑھا ہے اس لیے باپ کا حق بنتا ہے کہ آئندہ بھی بچے کو اپنے پاس رکھے۔ ماں نے غیر ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے بچے پر اپنے گزشتہ شوہر کو ترجیح دی اس لیے بچے کی حق دار نہیں ہے۔ میں باپ کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے بچے کو ساتھ لے جانے کی اجازت دیتا ہوں۔''

میرے چہرے پر گہرے سکون کی چادر تنتی چلی گئی۔ جج کی آواز سنائی دی۔ تاہم فیصلے پر اثبات کی مہر لگانے سے قبل میں بچے کی مرضی کو بھی ملحوظ نظر رکھنا چاہوں گا۔ سفیان علی کو کٹہرے میں بلایا جائے تاکہ اس کے بیان کی روشنی میں کارروائی کو آگے بڑھایا جاسکے۔ میں نے سونو کو کٹہرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کٹہرے میں جا کھڑا ہوا۔ جج نے پوچھا۔ ''میرے خیال میں تمہارے لیے اس بات کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوگا کہ ماں یا باپ میں سے کسی ایک کے انتخاب کے لیے اپنی مرضی کو بیان کرسکو لیکن مجبوری ہے۔ تمہیں بیان دینا ہی ہوگا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر بتاؤ کہ تم ماں کے ساتھ بیرونِ ملک جانا چاہتے ہو یا پھر باپ کے پاس یہیں رہنا چاہتے ہو۔''

عدالت کے کمرے میں بیٹھے تمام تماش بینوں کی نگاہیں آٹھ سالہ سفیان علی کے چہرے پر مرتکز ہوگئیں۔ بینش کے چہرے پر حسرت بھری اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میرے

چہرے پر اطمینان بھرے تاثرات تھے۔ جج دوبارہ بولا۔ ''جو بھی بیان دینا۔ اپنی خواہش کو مدِنظر رکھتے ہوئے دینا۔ یاد رکھنا تمہارا فیصلہ حتمی حیثیت کا اختیار رکھے گا۔ میں ایک دفعہ پھر تم سے پوچھتا ہوں۔ تمہیں باپ کا ساتھ عزیز ہے یا پھر ماں کی ممتا۔ جس کی خواہش تمہارے دل میں ہے۔ بغیر جھجک کے بیان کردو۔''

سونو نے اگلی رو میں بیٹھی ہوئی بینش کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرے پر بے چارگی رقص کررہی تھی پھر اس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرتکز ہوگئیں۔ نا جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اس کی آنکھوں میں اجنبیت کا تاثر نمایاں ہونے لگا ہو۔ جیسے وہ مجھے پہچاننے سے انکاری ہو۔ میں نے سر کو جھٹک کر خیالات کو منتشر کردیا۔ وہ باآہستگی بولا۔ ''میرے بابا نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ میری ماں میری پیدائش کے دوران مرگئی۔ شاید وہ مجھے ماں کے پاس بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے جھوٹ نے مجھے بدظن کردیا اس لیے میں ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔''

میرے چہرے پر زلزلے کے تاثرات پیدا ہوئے۔ وہ اپنی عمر سے بڑھ کر بات چیت کررہا تھا۔ شاید یہ وہ احساس محرومی تھی جس نے اسے اپنی عمر سے بڑھ کر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کردی تھی۔ بینش کا مترجم اسے سونو کی بات چیت سے آگاہ کررہا تھا۔ وہ خوشی سے مغلوب ہوکر اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے بے اختیار سونو کو اپنے گلے سے لگالیا۔

جج نے بینش کے حق میں کیا فیصلہ سنایا۔ مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔ کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی اور دماغ ماؤف ہوکر رہ گیا تھا۔ بینش سونو کو کھینچتے ہوئے ہال کمرے سے باہر نکلنے لگی۔ اس نے پیچھے مڑکر میری طرف دیکھا۔ میری نگاہیں اس پر مرتکز تھیں۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور اس نے بے اعتنائی کے ساتھ آنکھیں پھیرلیں۔ میں سانس نہیں لے رہا تھا۔ شاید پتھر کا بن کر رہ گیا تھا۔ عدالت کا کمرا خالی ہوگیا۔ فردوس صاحب میرے قریب کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر تاسف بھرے تاثرات تھے۔ انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ رو رہے ہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''روتا تو وہ ہے جس کے پاس کچھ ہوتا ہے، میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ مقدمے سے قبل میں نے دل میں تہیہ کیا تھا کہ اس دفعہ سب کچھ چھیننے کے بعد پاگل خانے جانے کی بجائے قبرستان کو ترجیح دوں گا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ شاید میرا مقدر ہی پاگل خانہ ہے۔ میں واپس وہیں جارہا ہوں۔''

فردوس صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا اور میں کرسی سے اٹھ کر عدالت کے دروازے کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

آپ شاید سمجھ رہے ہیں کہ کہانی یہاں ختم ہوگئی۔ جی نہیں۔ اصل کہانی تو اگلے دن کے اخبارات میں تھی۔ اس آٹھ سالہ بچے نے ایک ایسا قدم اٹھایا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ وہ بچے جو محرومی کا شکار ہوتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر وقت سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان میں سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت کچھ زیادہ آجاتی ہے۔ اگلے ہی دن اس نے فردوس صاحب کو نہایت خاموشی سے فون کرکے مسز عباسی کے بنگلے کے باہر بلوایا اور سب کی نظر بچا کر بنگلے کے باہر نکل گیا، پھر فردوس صاحب کے مشورے پر اس نے پریس کلب جاکر باضابطہ پریس کانفرنس کردی کہ ''عدالت نے میری خواہش پر فیصلہ دیا گو کہ میں نابالغ ہوں۔ ایک بچہ ہوں لیکن جن حالات سے گذرا ہوں اس کی وجہ سے مجھ میں پرکھنے کی صلاحیت آچکی ہے۔ میں عدالت کے فیصلے کو غلط نہیں کہتا مگر میری خواہش ہے کہ میں اسی شہر میں رہوں گا۔ اگر ممی کو منظور ہے تو وہ میری خاطر یہیں رہیں۔ ساتھ ہی ساتھ میری خواہش ہے کہ ہفتے میں چار دن میرے ساتھ بابا بھی رہیں گے میں مہرعلی کے ساتھ نہیں رہ سکتا اس لیے تین دن میری خاطر ممی میرے ساتھ اکیلی رہیں گی۔''

اخبارات نے اس خبر کو نمایاں کرکے شائع کیا۔ میں نے پریس کانفرنس سنتے ہی اسی وقت پی سی ایچ ایس میں ایک بنگلا خرید کر سونو کے نام کردیا اور فردوس صاحب کی معرفت سونو کو پیغام بھجوادیا کہ یہ گھر اس کا ہے چاہے تو وہ بینش کے ساتھ رہے یا میرے لیے وقف ایام گزارنے کے لیے یہاں آجایا کرے۔

سونو نے یہی کیا اور اس بنگلے میں وہ اس عمر میں اکیلا رہ رہا ہے۔ میں نے اس کے لیے نوکروں کا انتظام کردیا ہے۔ اس بنگلے میں تین دن بینش رہتی ہے اور چار دن میں۔ مجھے یقین ہے جلد وہ کلی طور پر میرا ہوجائے گا کیونکہ مہرمسلسل بینش پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ پاکستان میں نہیں رہ سکتا ہے۔

رقیب

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
یہ سچ بیانی بالکل سچی ہے بس میں نے اسے افسانوی انداز میں لکھا ہے تاکہ پڑھنے والے کو بوریت محسوس نہ ہو اور بالکل کہانیوں جیسی یہ روداد لگے۔

کنول انصاری
(کراچی)

آج میں آپ کو محبت کی ایسی سنسنی خیز کہانی سنا رہی ہوں جو آپ کو چونکا دے گی اور آپ جسے ساری زندگی فراموش نہ کرسکیں گے۔ اس سے وہی لطف اندوز ہوں گے جو محبت کرنا جانتے ہیں۔ آپ میری اس کہانی کو ایک ہی نشست میں پڑھیں تبھی بات بنے گی۔ تو چلتے ہیں کہانی کی طرف۔

یوں آپ نے محبت کی ایسی سینکڑوں داستانیں سنی ہوں گی جو دکھ بھری ہوں گی، ان میں سوز و گداز بھی ہوگا اور احساس محرومیاں بھی..... درد و رنجش بھی اور تلخیاں بھی۔ لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ ایسی دلچسپ، سنسنی خیز، کہانی ہرگز

آپ نے سنی نہیں ہوگی۔ بعض اوقات ہماری آپ کی زندگی میں ایسے اچانک اور غیر متوقع واقعات رونما ہوتے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ہستی یا فرد ایسا کردار ادا کرجاتا ہے جو اس کے دکھ یا سکھ کا باعث بن جاتا ہے۔

اس محبت بھری حکایت میں بھی ایک ہستی ایسی ہے کہ جس نے دو دلوں کے درمیان ایک اہم کردار ادا کیا ہے وہ کردار مرغے کا ہے۔ مرغا..... جی ہاں مرغا.....

یہ وہ مرغا نہیں ہے جو آپ کسی آدمی کو بناتے ہیں یا استاد اسکول میں بچوں کو بناتے ہیں۔ میں کسی انسانی مرغے کی بات نہیں کررہی ہوں۔ میں اس مرغے کی بات کررہی ہوں جو بانگ دیتا ہے۔ اس میں اتنی حیرت کی، چونکنے، سننے اور ہنسنے والی کیا بات ہے۔ اس مرغے نے محبت میں جو کردار ادا کیا ہے وہ آپ کو عجیب لگے گا۔ اس مرغے کی وجہ سے ہی اس کہانی نے جنم لیا ہے۔

یہ پانچ برس پہلے کی بات ہے ان دنوں میں نواب شاہ کے وسطی علاقے میں چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ ہمارے پڑوس میں جو خوبصورت اور قدیم طرز کا مکان تھا اس کا احاطہ بہت ہی وسیع و عریض تھا۔ اس میں پہلے ایک میمن خاندان رہتا تھا۔ ان کے کراچی چلے جانے کے بعد یہ گھر کوئی دو مہینے تک خالی رہا۔ کسی نے اسے اس لیے کرایہ پر نہیں لیا کہ مالک مالکان نے اس کا کرایہ بڑھا دیا تھا۔ جو کوئی بھی آتا دیکھتا، مول تول کرکے چلا جاتا۔ یہ گھر اس لیے بھی کرائے پر نہیں اٹھ رہا تھا کہ اس میں صرف تین بڑے بڑے کمرے تھے جبکہ ایسے ہی تین کمروں کی مزید گنجائش تھی۔ مالک مکان تھا کہ اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ آخر ایک روز میرے شوہر نے اسے سمجھایا تھا کہ اس طرح تو مکان کبھی بھی کرائے پر اٹھ نہ سکے گا۔ تم ہزاروں کا نقصان اٹھاؤ گے، آخر کار اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ وہ کم کرائے پر نہ دے کر اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ اس کے ایک ہفتہ بعد ہی مکان کرائے پر اٹھ گیا تھا۔ اسے ایک بنگالی خاندان نے لیا جو بنگلہ دیش بننے سے کئی برس قبل آکر کراچی میں آباد ہوگیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کنبہ تھا۔ دو میاں بیوی تھے اور ان کا ایک چار برس کا بیٹا تھا جو بے حد خوبصورت اور گول مٹول تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر خاصی جاذبیت تھی۔ ان کے پاس زیادہ ساز و سامان نہیں تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا اور خوبصورت سا مرغیوں کا ڈربا بھی لائے تھے جو مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس میں صرف دیسی مرغیاں تھیں۔ مکان کا احاطہ مرغوں کے کام آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے یہ گھر شاید اس ڈربے کی وجہ سے پسند کیا تھا تاکہ مرغیاں آرام سے دانہ چگ سکیں۔

کرایہ دار کی بیگم کا نام کنول تھا۔ کنول تیس یا بتیس برس کی تھی وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی پُرکشش اور پُرشباب تھی۔ بنگالی حسن و جمال کا ایک نادر نمونہ تھی۔ اس کے ریشمی بال گھنے، چمکیلے اور بھونرا جیسے سیاہ تھے۔ اس کی بڑی بڑی روشن اور سیاہ آنکھیں خوبصورت اور جادو بھری تھیں کہ ان میں ڈوب جانے کو دل کرتا تھا۔ چہرے کے نقش و نگار بھی تیکھے اور دل میں اتر جانے والے تھے۔ ایسی موہنی صورتیں یوں بھی ذرا کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ بڑی خوش اخلاق، خوش مزاج تھی۔ وہ بہت جلد میری عزیز ترین سہیلی بن گئی۔

میں نے کئی مہینوں سے ایک بات جو بڑی شدت سے محسوس کی تھی وہ یہ تھی کہ وہ مرغیوں سے زیادہ مرغے کا خیال رکھتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے دانہ کھلاتی تھی لیکن مرغیوں کی اتنی پروا نہیں کرتی تھی جتنی مرغے کی کرتی تھی۔ یہ مرغا تھا جیسے اس کا گھر اور مخلص دوست تھا۔ وہ رات دن اس کی نگہداشت کی فکر میں لگی رہتی تھی۔ اپنے پیارے بچے سے کہیں زیادہ اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔

یہ مرغا جوان نہیں تھا بوڑھا ہو چلا تھا۔ نہ تو مرغیوں کے پاس جاتا تھا اور نہ ہی اب اسے ان سے کوئی دلچسپی رہی تھی۔ وہ بوڑھا ضرور تھا لیکن کسی شیر کی طرح تھا۔ اب بھی اس میں رعب باقی تھا۔ ایک روز کسی دوسرے گھر کا مرغا غلطی سے اس بنگلے میں آگیا۔ وہ جوان اور صحت مند تھا۔ کمپاؤنڈ میں آتے ہی ایک مرغی کے پیچھے دوڑا تھا کہ اس بوڑھے مرغے نے آنے والے مرغے کو دیکھ لیا جو مرغی کو دبوچ بیٹھا تھا۔ وہ غصے سے اس پر پل پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی ایسی درگت بنادی کہ وہ بری طرح لہولہان ہوگیا اور اسے بھاگنا پڑا۔ اس روز کے بعد اس مرغے نے بھولے سے بھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔

ایک روز دوپہر کے سناٹے میں، میں کنول سے ملنے گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوگئی اور بڑی گرم جوشی سے بولی۔ ”میں تمہیں خود بلانے کا سوچ رہی تھی! میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔“

”کیا بھائی جان سے کسی بات پر ناراضگی ہوگئی ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ان سے کبھی کوئی ناراضگی نہیں ہوتی ہے۔ البتہ مرغے کی وجہ سے میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔'' وہ یک لخت اداس سی ہوگئی۔

''مرغے کی وجہ سے؟'' اس کی بات سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ''کیا ہوا تمہارے مرغے کو؟ کیا وہ بیمار ہوگیا ہے؟''

''تمہارے بھائی جان کہہ رہے تھے کہ مرغا اب بہت بوڑھا ہوگیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی دن مرجائے اسے ذبح کردیا جائے؟'' کنول نے افسردگی سے بتایا۔

''ٹھیک ہی تو کہتے ہیں بھائی جان!'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''اس میں اس قدر رنجیدہ اور جذباتی ہونے کی کیا بات ہے۔ ان سے کہو کہ وہ کوئی دوسرا مرغا لے آئیں۔ مرغوں کی کوئی کمی ہے کیا؟''

''مجھے اس بات سے کب انکار ہے کہ وہ غلط کہتے ہیں۔'' وہ دل گرفتہ لہجے میں کہنے لگی۔ ''اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ مرغا واقعی بہت ہی بوڑھا ہوچکا ہے اور پھر اب تو وہ مرغیوں سے ملنا جلنا تو درکنار ان کے قریب بھی پھٹکتا نہیں ہے۔ اب ان مرغیوں کے لیے کسی جوان مرغے کی ضرورت ہے۔ جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اس طرح ایک مرغی خانے میں دو مرغے بھی نہیں رہ سکتے۔ یہ مرغا کسی اور مرغے کو ایک پل بھی ٹکنے نہیں دے گا۔ گو یہ بوڑھا ہوگیا ہے لیکن اس میں اب بھی اتنی طاقت ہے کہ کسی جوان اور کڑیل مرغے کو بھگا دے لیکن میں کسی قیمت پر اس مرغے کو ذبح ہونے نہیں دوں گی اس لیے میں نے رات اپنے شوہر سے کہا ہے کہ ان مرغیوں کو کسی ایسی جگہ لے جا کر چھوڑ دیں جہاں کوئی مرغا ہو۔''

میں اس کی زبان سے بچکانہ باتیں سن کر اپنی ہنسی روک نہ سکی اور ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''آخر تم اس مرغے کے لیے اس قدر جذباتی کیوں ہورہی ہو؟''

''اس لیے کہ یہ مرغا مجھے اپنی جان سے کہیں عزیز ہے، اس نے مجھ پر جو احسان عظیم کیا ہے۔''

''یہ مرغا؟ تمہارا محسن ہے؟'' میں نے حیرانی سے اس کی شکل دیکھی۔ ''میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس مرغے نے تم پر کیا احسان کیا ہے؟''

''ہاں..... یہ میرا محسن ہے۔'' اس نے اپنی لانبی گھنیری پلکیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ بات میں نے کسی کو بھی نہیں بتائی۔ صرف اور صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔'' اس نے سانس لینے کے لیے توقف کیا۔ ''اگر یہ مرغا میری زندگی میں نہیں آتا تو آج میری کہانی اور ہوتی۔ اس لیے یہ مجھے عزیز از جان ہے۔''

اس کے جواب نے میرے اشتیاق کو بڑھا دیا۔ میں نے کہا۔ ''کیا تم مجھے اپنے محسن مرغے کی کہانی نہیں سناؤ گی؟''

اس کے حسین اور شہابی چہرے پر حیا سرخی بن کر کسی لہر کی طرح دوڑ گئی۔ میں نے اس کے بشرے سے محسوس کیا کہ اسے اپنی کہانی سناتے ہوئے شرم اور جھجک بھی محسوس ہورہی تھی پھر اس نے میرے شدید اصرار پر کہانی کا آغاز اس طرح سے کیا۔

یہ پانچ چھ برس پہلے کی بات ہے کہ اس وقت میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے والدین کے ساتھ ٹنڈو آدم میں رہتی تھی۔ بنگلہ دیش سے آنے کے بعد وہیں سکونت اختیار کی ہوئی تھی۔ میرے والد آج بھی ٹنڈو آدم کے ایک وڈیرے کے ہاں ملازم ہیں۔ میری دو بڑی بہنیں جن کی بنگالیوں سے شادیاں ہوچکی ہیں۔ ان کے شوہر کراچی میں موسیٰ کالونی میں مچھلیاں فروخت کرتے ہیں میرے والد کو ٹنڈو آدم اس لیے پسند آیا کہ بنگلہ دیش کے کلشم، ٹنڈو آدم سے بڑی مشابہت رکھتا ہے۔ بچپن ہی سے ہماری جسمانی نشوونما اس غضب کی تھی کہ ہمارے چرچے ہونے لگے۔ اس بے مثل حسن کی وجہ سے میری دونوں بہنوں کی شادی جلدی ہوگئی تھیں۔ والد نے اتنا جہیز نہیں دیا تھا جتنا انہیں دینا چاہیے تھا۔ ایک غریب کے پاس تھا ہی کیا دینے کے لیے۔ اب میں بھی سولہ برس کی ہوچکی تھی۔ اب والد والدہ میری شادی کے بارے میں سوچنے لگے تھے کیونکہ یہ عمر بڑی خطرناک ہوتی ہے لڑکی کے لیے۔ یہ اندھی جوانی بے لگام سرکش گھوڑی کی طرح ہوتی ہے۔ بقول میری سہیلیوں، رشتے داروں اور آئینے کے، میں اپنی دونوں بڑی بہنوں سے کہیں زیادہ حسین اور دل کش تھی اور چڑھتی جوانی نے مجھے خوب سے خوب تر بنا دیا تھا۔ میرے لیے بڑے اچھے اچھے اور اعلیٰ گھرانوں سے رشتے آنے لگے تھے۔ میرے والد چونکہ دونوں بیٹیوں کی شادی کرکے نہ صرف قلاش ہوچکے تھے بلکہ مقروض بھی ہوگئے تھے اس لیے میرا رشتہ دینے سے صاف انکار کردیا تھا۔

میں خود بھی شادی کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لیے کہ مجھے دنیا کے تمام مردوں سے نفرت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ

میں نے جب سے ہوش سنبھالا مرد ذات کو ظالم اور جابر پایا۔ میں مردوں کو شقی القلب سمجھتی تھی۔ میں نے ایک بڑی عجیب سی بات محسوس کی کہ دوسری لڑکیاں مردوں کو اتنا ظالم نہیں سمجھتی تھیں جتنا میں سمجھتی تھی۔ میری طرح وہ مردوں کے مظالم سے متاثر بھی نہ تھیں۔ خصوصاً وہ عورتیں جو مردوں کے ظلم کی چکی میں پس رہی تھیں۔ دور کیوں جاؤں۔ میرے والد کا سلوک میری ماں کے ساتھ اس قدر ظالمانہ تھا کہ آج بھی تصور کرتی ہوں تو میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ میری غریب بہنیں جب کبھی اپنی سسرال سے میکے آتیں۔ ان کے سفید پڑتے ہوئے چہروں سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنے شوہر کی مجرم ہوں اور میکے پناہ لینے آئی ہوں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جو ذرا ذرا سی بات پر میری ماں کو نا قابل تحریر گالیاں نہ سننا پڑتی ہوں۔ کبھی کبھی تو والد انہیں روئی کی طرح دھنک دیتے تھے جب کہ ان کی ازدواجی زندگی کو چوبیس برس ہو رہے تھے۔ یہ ایک طویل عرصہ تھا جو میری ماں بھگت رہی تھی۔

صرف میرے گھر ہی میں نہیں گاؤں کے اور دوسرے گھروں میں بھی شوہروں نے اپنی بیویوں کے ساتھ ایسے ظلم وستم روا رکھے ہوئے تھے وہ جیسے بیویاں نہ تھیں بے زبان جانور تھیں جو اپنے شوہروں کا ظلم وستم، صبر اور خاموشی سے سہہ لیتی تھیں۔ ان مظلوم عورتوں میں اتنی ہمت اور جرأت نہ تھی کہ سراپا احتجاج بن جاتیں، بغاوت کردیتیں۔ دو ایک عورتیں بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گئیں تو ان پر یہ الزام تھوپا گیا کہ وہ اپنے آشناؤں کے ساتھ فرار ہوگئی ہیں لیکن بعد میں وہ غلط ثابت ہوا۔ وہ شوہروں کے ظلم وستم سے تنگ آکر فرار ہوکر کراچی شہر میں اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں پناہ لے کر گھروں میں کام کاج کرکے گزر بسر کرنے لگی ہیں۔

انہی وجوہات کی بنا پر میں شادی سے انکاری تھی۔ میری سہیلیاں لڑکوں میں دلچسپی لیتیں اور میں مرغیوں بطخوں میں، سب سے بڑی اور کشادہ جگہ مرغیوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ دو تین مرغے اور پچیس تیس مرغیاں تھیں۔ ماں اور میں نے کچھ کام مخصوص کر رکھے تھے۔ مرغیوں اور مرغوں کی دیکھ بھال میرے ذمے تھی۔ میں روز انہیں دانہ ڈالتی اور انڈے اٹھا کے ٹوکری میں رکھتی تھی۔ جو مرغیاں کڑک ہوجاتی تھیں ماں انہیں حاجی سائیں کے ہاتھ بیچ آتی تھیں۔ ان کی جگہ ننھے منے چوزے لے آتی تھیں۔ اس طرح ان مرغیوں کی جگہ یہ چوزے لے لیتے تھے۔ ان چوزوں کی ایک ماں کی طرح حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ میں نے کبھی بھی ان مرغوں کا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا مجھے رکھنا چاہیے تھا اس لیے کہ ان مرغوں میں مجھے ان مردوں کی فطرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی نظر آتی۔ وہ مرغیوں کو نہ صرف بہت تنگ کیا کرتے تھے بلکہ اپنی خنجر جیسی تیز اور بے حد نوکیلی چونچ سے انہیں لہولہان بھی کردیتے تھے اس لیے میں انہیں مرغیوں کے مقابلے دانہ کم ہی کھلاتی تھی۔ وہ کسی مرغی پر حملہ آور ہوتے تو میں انہیں بید سے ڈرا کر مرغی کو رہائی دلاتی تھی۔

ہمارے پڑوس میں سائیں خادم بابا رہتے تھے جو گاؤں کی مسجد کے معلم تھے اور پیش امام بھی تھے۔ ان کا بیٹا اویس نواب شاہ کے گورنمنٹ کالج میں پڑھتا بھی تھا اور وہاں جزوی ملازمت بھی کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے دفتر سے ایک مہینے کی رخصت پر ٹنڈو آدم آیا تاکہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کچھ دن گزارے۔ اویس میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ ہم پرائمری تک ساتھ رہے تھے۔ ہم دونوں کیرم بورڈ، لوڈو کھیلتے تھے اور گڈے گڑیا کی شادیاں بھی کرتے تو اس کے دوست لڑکے براتی اور میری سہیلیاں ساس سالیاں بن جاتی تھیں پھر کسی بات پر لڑائی جھگڑا ہوتا تو میں روٹھ جاتی تھی اور وہ مجھے منانے لگتا تھا۔ جب میں نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو وہ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ اتفاق تھا کہ ہم دونوں کے درمیان برسوں اس لیے سامنا نہ ہوسکا کہ میری ماں اس سے پردہ کرنے کو کہتی تھی۔ اب جب وہ آیا تو اسے دیکھ کر میرا سینہ دھک سے رہ گیا اور دل کے دھڑکنے کی رفتار اس قدر تیز ہوئی کہ بہت دیر بعد قابو میں آئی۔ اس کی کڑیل جوانی غضب کی تھی وہ خوبصورت تھا، دراز قد بھی، اس کی قامت نے اس کی وجاہت میں بے پناہ اضافہ کردیا تھا۔ شہر میں رہ کر سونے پر سہاگا ہوگیا تھا کیونکہ اس کی عمدہ جامہ زیبی نے اسے بے حد اسمارٹ بنادیا تھا۔

دل میں ایک انجانی سی خواہش ہوتی تھی کہ اسے نظروں کے سامنے بٹھا کر ایک ٹک دیکھتی رہوں۔ لمحے بھر کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں پھر خود ہی دل ناداں کو سمجھاتی تھی کہ یہ بھی دنیا کے مردوں میں سے ایک ہے۔ اس کے نزدیک عورت محض ایک کھلونا ہے۔ پگلی! اگر تم نے اس کی محبت میں گرفتار ہوکر اس سے شادی کرلی تو وہ تمہارے ساتھ بھی وہی ظالمانہ سلوک کرے گا جو ہر مرد اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ تمہیں بری طرح ذرا ذرا سی بات

پر مارتا پیٹتا رہے گا، بے ہودہ گالیاں نہ صرف تمہیں بلکہ تمہارے ماں باپ کو بھی دے گا، تم کو بیوی کی بجائے اپنی ملکیت سمجھے گا۔ تم ایک مرغی کی طرح اس کے گھر کے ڈربے میں قید ہو کر رہ جاؤ گی۔

ایک روز میں مرغیوں کو صحن میں کھڑی دانہ ڈال رہی تھی کہ وہ ہمارے گھر میں داخل ہوا۔ اس وقت باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ماں گھر پر موجود نہیں تھیں، وہ کسی کام سے گئی ہوئی تھیں۔ وہ جب کبھی بھی باہر جاتیں تو بتا کر نہیں جاتی تھیں۔ والد تو دن ڈوبنے کے بعد ہی گھر آیا کرتے تھے۔ وہ جب بھی گھر آتا تھا ماں کی موجودگی ہی میں، لیکن آج میں اس وقت اکیلی تھی۔ جب سے وہ گاؤں آیا تھا تب سے میں ایک بات بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ وہ مجھے دیکھنے، مجھ سے ملنے اور باتیں کرنے کے لیے کسی نہ کسی بہانے گھر آتا تھا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی گھر آیا تھا ماں موجود ہوتیں اور میں اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھتی تک نہ تھی۔ یوں وہ اپنے دل میں حسرتیں لیے چلا جاتا تھا۔ میں نے اس کے گھر اس روز سے جانا بند کر دیا تھا جب سے وہ آیا تھا۔ میں حتی الامکان خود کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ میں گھر پر اکیلی ہوں اس لیے اس نے کس قدر بے تکلفی سے کہا۔ ''تم ہمارے گھر کیوں نہیں آتی ہو؟ کیا تمہیں منع کیا ہوا ہے؟''

میں نے تیوریوں پر بل ڈال کر اس کی طرف گھور کے دیکھا۔۔۔۔ ''میں کیوں آؤں..... مجھے بہت سارے کام ہوتے ہیں۔ مرغیوں کو دانہ ڈالنا ہوتا ہے۔''

''رات میں نے اور میری ماں، بہنوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لے آیا جائے، پھر تو آجاؤ گی نا؟'' وہ وزدیدہ نظروں سے میرے چہرے کو دیکھتا اور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''کیا.....!'' میرے اندر غصے کی شدید لہر اٹھی، میری جگہ کوئی اور لڑکی تو یہ سن کر خوشی سے پاگل ہو جاتی۔ گاؤں کی بہت ساری لڑکیاں اسے پانے کی آرزو میں پاگل ہوئی جا رہی تھیں۔ بہت سے گھرانے اسے داماد بنانے کے آرزومند تھے۔ میری ماں کی بھی دلی تمنا تھی کہ وہ اس گھر کا داماد بن جائے اس لیے جب بھی وہ ہمارے ہاں آتا تو ماں اس کے آگے بچھ جاتی تھی۔ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''خبردار.....! تم نے آئندہ جو یہ بات زبان سے نکالی۔''

''میں یہ بات اپنی زبان سے نہیں نکالوں گا تو کوئی اور نکالے گا؟ اگر کسی اور نے تم سے یہ بات کہی تو میں اس کی زبان کھینچ لوں گا۔'' وہ بولا۔

''تم کون ہوتے ہو یہ بات زبان سے نکالنے والے؟'' میں تنک کر بولی۔ ''اپنی حد میں رہو۔''

''کون میں..... میں بہت کچھ ہوتا ہوں۔'' وہ تکرار کے انداز میں کہنے لگا۔ ''تمہارے بچپن کا ساتھی۔ ہم جماعت، پڑوسی اور تمہارے خوابوں کا شہزادہ..... بچپن میں تم مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ شادی بیاہ کا کھیل کھیلتے تھے تو تم میری دلہن بن جاتی تھی اس لیے اب میں تمہیں ساری زندگی کا ساتھی بنا لینا چاہتا ہوں۔''

''تم میرے کچھ نہیں لگتے ہو اور نہ ہی میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ گاؤں میں ایک سے ایک نوجوان لڑکیاں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک لڑکی سے شادی کر لو۔''

''اس گاؤں میں کیا، ساری دنیا میں ہزاروں اور لاکھوں لڑکیاں موجود ہیں مگر ان میں تمہاری جیسی ایک بھی نہیں ہے اس لیے میں صرف اور صرف تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں نے صاف صاف اپنی ماں سے کہہ رکھا ہے کہ مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔ میرا دماغ مت چاٹو۔ یہاں سے اب فوراً چل دو۔ ماں آتی ہی ہوگی۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''ہم دونوں کو تنہا دیکھ کر جانے کیا سوچے۔''

''کیا تم کسی اور لڑکے سے محبت کرنے لگی ہو؟'' وہ یک لخت رنجیدہ ہو گیا۔ ''بالفرض اگر ایسا ہے تو پھر میں تمہاری راہ میں دیوار نہیں بنوں گا۔''

''مجھے کسی لڑکے سے محبت ہے اور نہ ہی مجھے شادی کرنی ہے، یہ میرا قطعی فیصلہ ہے، لہٰذا تم مجھے تنگ مت کرو۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

''کیا تم ساری زندگی شادی نہیں کرو گی؟'' میں نے اپنا سر ہلایا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دنیا کی حسین ترین لڑکی ساری زندگی شادی نہ کرے۔''

''ہونے کو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں بہت ساری عورتیں شادی کے بغیر بڑی خوش و خرم زندگی گزار رہی ہیں۔''

''آخر تم کس لیے شادی کرنا نہیں چاہتی ہو؟'' اس

نے مجھے عجیب معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''اس لیے کہ تم مرد جب کسی کے شوہر بنتے ہو تب تمہاری حقیقت، خصلت اور فطرت کا پتا چلتا ہے۔ اصل چہرہ جو ظاہری چہرے کے پیچھے چھپا ہوتا ہے وہ سامنے آتا ہے جو انتہائی بھیانک اور مکروہ ہوتا ہے۔ تم ظالم اور بے رحم بن جاتے ہو۔ ساری دنیا کے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔'' میں ایک ہی سانس میں کہہ گئی اس لیے کہ سینے میں سانسوں کا جو تلاطم تھا وہ پھولنے لگا تھا ورنہ اور کچھ کہنے والی تھی۔

''یہ پاگل پن تم پر کب سے سوار ہوا ہے؟'' وہ حیران ہوا جا رہا تھا۔ ''اول فول بکے جا رہی ہو؟''

''میرے اس فیصلے کو تم کچھ بھی کہہ لو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ فیصلہ میں نے آج نہیں بلکہ ایک برس پہلے ہی کر لیا تھا اس لیے بہت سارے رشتے لوٹا دیئے۔''

''مجھ سے بڑا پاگل اس دنیا میں کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ توقف کر کے سنجیدگی سے بولا۔ ''تم نے ہی مجھے پاگل بنایا ہے۔ اس پاگل کے ساتھ ایک پاگل ہی گزارہ کر سکتی ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں بھی اس لڑکی سے شادی کروں گا جس نے مجھے پاگل کیا ہے اور جو خود بھی دنیا کی سب سے بڑی پاگل ہے۔''

''میں دیکھتی ہوں کہ تم مجھ سے کیسے شادی کرتے ہو؟'' میں نے اسے چیلنج کے انداز میں گھورا۔ ''زہر کھا کر مر جاؤں گی پر تم سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔''

میری اس بات پر اس کے چہرے پر زردی سی چھا گئی۔ جانے کیوں مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا، پھر چند ساعتوں کے بعد چلا گیا۔ جاتے جاتے میرے دل پر ایک انجانے دکھ کی سل رکھ گیا۔ رات میں جب سونے کے لیے دراز ہوئی تو اپنے دل کو ٹٹولا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اویس میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ وہ اچھی طبیعت کا اور نرم خو بھی تھا۔ جوان ہو کر اس میں بڑی کشش اور مردانہ وجاہت پیدا ہو گئی تھی جو لڑکیوں کے دلوں پر بجلیاں گراتی ہوگی۔ میں نے اپنے دل کے کسی کونے میں اس کے وجود کو محسوس تو کیا..... مگر اس نفرت کا کیا کرتی جو مردوں کے خلاف تھی اور میری رگ رگ میں زہر کی طرح سرایت کر گئی تھی۔ یہ نفرت اویس کے وجود پر غالب آ گئی تھی۔

یہ بات میں بہت اچھی طرح جانتی، سمجھتی اور محسوس کرتی تھی کہ اویس مجھے ٹوٹ کر چاہتا ہے اس کی محبت میں شدت ہے۔ گو اس نے اپنی زبان سے اظہارِ محبت نہیں کیا تھا۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ الفاظ سے ہی اظہارِ محبت ہو۔ اس کی محبت تو حرکات و سکنات، نگاہوں کی زبان اور بشرے سے ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ آج جو اس نے شادی کی بات کی تھی یہ ایک طرح سے اظہارِ محبت ہی تو تھا۔ اس کے اور میرے درمیان دوستی اور بے تکلفی بچپن سے ہی بہت زیادہ تھی لیکن ادھر چند برسوں سے وہ بات نہیں رہی تھی۔ یہ میرا قطعی فیصلہ تھا کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ کوئی تیسرے دن اویس معلوم نہیں کہاں سے ایک اعلیٰ نسل کا مرغا لے آیا۔ وہ مرغا کیوں لایا؟ کس لیے لایا؟ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک روز اس نے مجھ سے کہا کہ اگر تمہیں یہ مرغا پسند ہے تو لے لو۔ میں تمہیں یہ تحفے میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ اسے میری طرف سے تمہاری مرغیوں کے لیے محبت بھرا تحفہ سمجھو۔ مرغیاں اس کا قرب اور محبت بہت پسند کریں گی جس طرح لڑکیاں کڑیل جوانوں کو پسند کرتی ہیں۔ یہ ان کا تصوراتی محبوب اور کمزوری بن جائے گا لیکن میں نے اس کا مرغا لینے سے انکار کر دیا جو عام مرغوں کے مقابلے میں جسامت میں بڑا تھا۔ ایسے اعلیٰ نسل کے مرغے دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ یوں بھی کیسا ہی مرغ کیوں نہ ہو مجھے ان سے سخت نفرت تھی۔ یہ مرغا جو دیکھنے میں ہی لڑنے والا لگتا تھا اس کی ٹانگوں پر جو نوکیلے کانٹے تھے وہ ایک خاص انداز سے مڑے ہوئے تھے۔ اس کے پنجے بہت مضبوط ہی نہیں خطرناک بھی تھے۔

وہ مرغا نہیں کوئی وحشی درندہ تھا۔ اس نے پہلے ہی دن آس پاس کے تمام مرغوں پر اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ بیک وقت دو مرغوں سے لڑ کر انہیں اس قدر لہولہان کر دیا تھا کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ میرے گھر کے ایک مرغے کو بھی شدید زخمی کر دیا تھا۔ دوسرے مرغے کی بھی ایسی درگت بنتی اگر میں ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے نہ دوڑتی۔ اس مرغے کو لڑنے کا صرف شوق ہی نہیں بلکہ جنون بھی تھا۔ اس میں جو دیوانگی تھی اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ صرف لڑنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔

ان پانچ چھ گھروں میں سب سے اچھی، خوبصورت اور عمدہ نسل کی مرغیاں صرف ہمارے ہی گھر میں تھیں۔ مجھے ان خوبصورت مرغیوں سے ایک طرح کا جذباتی لگاؤ تھا۔ یہ جذباتی وابستگی اس لیے بھی تھی کہ مجھے ان میں مظلوم عورتوں کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

دنیا میں مظلوم، بے بس، لاچار اور ظلم و ستم کی چکی میں

پسی ہوئی ہستی عورت ذات کے سوا کون ہوسکتی ہے۔ عورت کی ساری زندگی فرض شناسی، اطاعت گزاری اور ایثار و قربانی میں گزر جاتی یہی بات ایک طرح ان مرغیوں میں موجود تھی جو ایک درد آشنا کی طرح میں محسوس کرتی تھی۔

یہ مرغیاں ایک طرف تو اپنی دنیا میں گم رہتی ہیں وہ بے حد معصوم، سیدھی سادی سی نظر آتی ہیں۔ دوسری طرف بنی نوع انسان کے لیے باقاعدگی سے انڈے دیتی ہیں۔ انڈوں سے بچے نکالنے کے لیے اندھیرے میں انڈوں پر بیٹھی رہتی ہیں اور ان انڈوں کی حفاظت بھی کرتی ہیں۔ جس طرح ایک عورت کو بچہ جنم دینے کے لیے جس آزمائش اور تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے۔ اپنا چین وسکون اور آرام حرام کرنا پڑتا ہے اس طرح انہیں بھی انہی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بھوک پیاس بھی برداشت کرتی ہیں تو دوسری طرف نہ آرام کی پروا کرتی ہیں اور نہ ہی روشنی کی، اپنے جسم کی گرمی پہنچا کر اپنے بچوں کے جسم میں زندگی کی روح پھونکتی ہیں۔ ان میں ممتا ہوتی ہے، وہ ایک عورت کی طرح اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہیں۔ بچے جب تک بڑے اور کسی قابل نہیں ہوجاتے۔ زمین پر بکھرے ہوئے اناج اور دانوں کو چن چن کر لاتی ہیں اور انہیں کھلاتی ہیں۔ اپنے بچوں کی خاطر اپنی جان کی حفاظت کی ذرا بھی پروا اور فکر نہیں کرتی ہیں۔ کیسا ہی بڑا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہو وہ اپنے پر کھول کے ان خطرات کا مقابلہ کرتی ہیں۔ عورت بھی اپنے شوہر اور بچوں کے لیے اسی طرح سے اپنی زندگی کو قربان کردیتی ہے۔ عورت کو کیا صلہ ملتا ہے؟ اسے ہر ایک عذاب سے گزرنا پڑتا ہے۔

چونکہ ہمارے گھر کا عقبی دروازہ کھلا رہتا تھا اس لیے اویس کا مرغا دندناتا ہوا گھر کے آنگن میں گھس آتا تھا۔ گھر کے اندر اور باہر جو مرغیاں گھومتی پھرتی اور دانہ چگتی تھیں ان کی شامت آجاتی تھی۔ اس میں ایک مرد کی سی خودغرضی اور وحشیانہ پن ہوتا تھا۔ اندر آتے ہی دانہ اس طرح چگنے لگتا تھا جیسے یہ اس کے باپ کا مال ہو پھر وہ کسی مرغی کی طرف کوندا بن کر لپکتا، اس کا یہ انداز کسی وحشی درندے کی طرح ہوتا تھا۔ مرغی اس کی گرفت میں آجاتی تو پھر وہ اس کے وحشیانہ پن سے نہیں بچتی تھی۔ اپنی من مانی کرکے سرفراز ہو کر فاتحانہ انداز سے چلا جاتا تھا۔

میں نے ایک نئی مرغی ایک عورت سے خریدی جو اس نے نواب شاہ کے میلے میں خریدی تھی۔ یہ مرغی ایک نایاب نسل کی تھی میں نے اسے بڑی حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔ کوئی دو تین مرتبہ اس مرغے نے میری پیاری مرغی پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی جسے میں نے ہر بار ناکام بنادیا تھا اور اسے ڈنڈے سے دھمکا کر باہر بھگا دیا تھا۔

ایک روز میں سہ پہر کے وقت بیدار ہوئی تو مجھے صحن سے مرغیوں کی بری طرح کڑکڑانے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے کھڑکی سے صحن میں جھانکا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ہوا یہ تھا کہ وہ مرغا میری سب سے پیاری اور خوبصورت مرغی کو بری طرح دبوچے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر اگے پر اپنی خنجر جیسی تیز چونچ کی نوک سے نوچ رہا تھا۔ اس پر ایک وحشیانہ پن سوار تھا۔ جتنی دیر میں، میں اپنے بال اور لباس درست کرکے نکلی اور ڈنڈا لے کر پہنچی وہ اپنا کام کرکے جاچکا تھا۔ مرغی کی درگت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے مرغی کو اٹھا کر ڈربے میں بند کردیا تاکہ وہ آرام سے رہے۔

دوسرے دن وہ مرغا پھر آیا جو میری مرغی کے ساتھ درندگی کرگیا تھا۔ میری پیاری مرغی جو دانہ چگ رہی تھی اسے دیکھ کر اس کی طرف تیزی سے بڑھی جیسے وہ اس کی محبت کے اندھے جنون میں مبتلا ہوگئی ہو۔ اگر میں پتھر اٹھا کر اس مرغے پر نہ دے مارتی تو میری مرغی کا دوبارہ حشر نشر ہوجاتا۔ اس کے سر کا زخم ابھی تک بھرا نہیں تھا۔ مجھے اپنی مرغی پر سخت غصہ آیا تھا جس کی عقل ٹھکانے نہیں آئی تھی۔ اس روز اس کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا جو بربریت اور درندگی ہوئی تھی اس کا کوئی اثر اس نے نہیں لیا تھا بلکہ اس کی اسیر اور دیوانی ہوگئی تھی۔ جیسے اس پر مرغے نے جادو کردیا ہو۔

ہر بات کی حد ہوتی ہے۔ مجھ سے برداشت نہ ہوسکا تو میں نے اسی روز شام کے وقت اویس کو روک کر دھمکی آمیز لہجے میں وارننگ دی۔ ''تم اپنے مرغے کو سنبھالو..... نہیں تو میں اسے کسی دن ذبح کردوں گی۔''

''وہ کس لیے؟'' اس نے حیرت سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''میرے مرغے نے کیا کیا؟''

میری رگوں میں لہو ابلنے لگا۔ اگر فطری شرم و حیا آڑے نہ آتی تو میں اسے مرغے کی شرافت کے کارنامے ایک ایک کرکے گنواتی۔ اسے وہ تمام مرغیاں دکھاتی جو اس درندہ صفت مرغے کے ستم سے نہ بچ سکی تھیں۔ اس نے ان سب کا حشر نشر کردیا تھا سب کے سر کے بال نوچ کر رکھ دیئے تھے۔ میں برافروختہ ہوکر بولی۔ ''تمہارا کمینہ، ذلیل مرغا میری مرغیوں کا سارا اناج کھا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ

بدسلوکی کرتا پھرتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ اس شیطان کو اپنے گھر میں باندھ کر رکھو..... ورنہ..... میں..... '' میں نے دانستہ اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔

''وہ مرغا ہے۔'' اویس نے شوخ لہجے میں کہا۔

''مرغا بھی ایک مرد کی طرح ہوتا ہے۔ اس غریب کا دل تمہاری حسین، مرغیوں پر آگیا ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ اسے کیا سمجھاؤں؟ یہ دل کے معاملات اور جوانی کے تقاضے ہوتے ہیں۔ دل پر پہرے نہیں بٹھائے جاسکتے ہیں۔''

''اسے ڈربے میں بند رکھو۔'' میں نے اس کی شاطرانہ باتوں سے جل کر تیز و تند لہجے میں جواب دیا۔

''اس کم بخت کو کیا میرے گھر کی مرغیاں ہی ملیں؟ وہ دوسرے گھر میں کیوں نہیں جاتا ہے؟''

''میں اتنا ظالم نہیں ہوں کہ اس کی راہ میں سماج کی دیوار بنوں۔ تم اچھی طرح اس بات سے واقف ہو کہ کیا چند کیا پرند کیا انسان سب ہی حسین چیزوں پر مرتے ہیں۔'' وہ کسی فلمی اداکار کے انداز میں بولا۔ ''اتفاق سے اسے بھی وہی گھر پسند ہے جو اس کے مالک کو پسند ہے۔''

''میں آخری بار تمہیں تنبیہہ کیے دے رہی ہوں کہ اپنے آپ کو اور اپنے مرغے کو سنبھالو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' میرا بدن غصے سے کانپنے لگا۔

''یہ دل ایک ایسی چیز ہے جو سنبھالے نہیں سنبھلتا۔'' اس نے آنکھیں بند کر کے سینے پر دل کی جگہ ہاتھ رکھ کر ایک گہرا سانس لیا۔ ''یہ عشق بھی کیا چیز ہے؟ وہ مرغا جانباز عاشق ہے، وہ سچا عاشق ہے۔''

اس کے دوسرے دن میری دیرینہ سہیلی انور امجد سے ملنے آئی۔ اس کی شادی کو ایک برس کا عرصہ ہوا تھا۔ اس کا سسرال کھسر میں تھا۔ وہ دس بارہ دنوں کے لیے اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے آئی تھی۔ میں نے اسے دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا۔ کھانے سے فراغت پا کر ہم دونوں آنگن میں آگئیں اور جامن کے پیڑ کے نیچے جو چوکی پڑی تھی اس پر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر تک ہم سہیلیوں کی محبت کے بارے میں باتیں کرتی رہی تھیں کہ کس کا عشق کس سے چل رہا ہے۔

ہم دونوں کچھ دیر تک دوسروں کی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے پوچھا۔ ''تمہارے شوہر کس مزاج کے ہیں؟ ایک سال کی ازدواجی زندگی میں انہیں کیسا پایا؟''

''یوں تو وہ سخت مزاج کے ہیں لیکن دل کے بہت ہی اچھے میری ہر بات اور فرمائش پوری کر دیتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور میرا ہر طرح سے خیال بھی رکھتے ہیں۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے دریافت کیا۔ ''دیکھ انورا..... ہم دونوں ایک دوسرے کی ہمراز ہیں۔ کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ سچ سچ بتانا۔ کیا تم اپنے شوہر اور اس زندگی سے خوش ہو؟''

''میری جان! مجھے تم سے جھوٹ بولنے اور کوئی بات چھپانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' وہ دلکش انداز سے مسکرا دی اور پلکیں جھپکائے بغیر بولی۔ ''میں نے تو تم سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ میں اپنی اس ازدواجی زندگی سے صرف خوش ہی نہیں ہوں بلکہ بہت ہی خوش ہوں۔ ان کی ڈانٹ اور کڑوی کسیلی باتیں سہہ لیا کرتی ہوں۔''

''جانے کیوں مجھے یقین نہیں آتا ہے؟'' میں کہنے لگی۔ ''کیونکہ شادی شدہ زندگی ایک گورکھ دھندا ہے۔ عورت مجبوری کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ مرد کو عورت سے محبت نہیں ہوتی ہے بلکہ اسے اپنی غرض پوری کرنی ہوتی ہے۔ وہ اس کی قیمت کپڑے، لتے اور کھانا مہیا کر کے پوری کرتا ہے۔ عورت بے وقوف ہوتی ہے اس کے عوض گرم جوش اور والہانہ پن سے پیش آتی ہے۔''

''یہ فطری امر ہے جو ازل سے ہوتا آرہا ہے۔'' اس نے میرا گال تھپتھپایا اور بولی۔ ''تم اس انداز سے مت سوچو ..... یہ بات غلط ہے کہ مرد کو صرف عورت کے حسن و شباب سے غرض ہوتی ہے۔ وہ اسے کھلونا بنالیتا ہے۔ یہ جسمانی ملاپ نہیں بلکہ ایک روحانی بندھن ہوتا ہے۔ دو دلوں کا ایسا ملاپ جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔''

''جب تمہیں تمہارا شوہر کسی بات پر ڈانٹتا اور مارتا پیٹتا ہے، گالیاں دیتا ہے تو کیا تمہیں برا نہیں لگتا ہے؟''

''میرے شوہر نے آج تک کسی بھی غلطی اور کوتاہی پر مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا البتہ ڈانٹ ڈپٹ ضرور کی ہے۔ میری ناراضگی پر نہ صرف مجھے منایا بلکہ معافی بھی مانگی ہے۔ میرے دل میں اس کے خلاف کسی قسم کی نفرت اور برائی پیدا نہیں ہوئی بلکہ ہمارے درمیان محبت بڑھتی ہی گئی۔''

''تمہاری یہ باتیں میرے لیے ناقابل فہم ہیں؟'' میں تمسخر کے انداز میں بولی۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ شوہر کے ظالمانہ رویے سے محبت میں کمی کے بجائے اضافہ ہو جاتا ہے؟ کیا یہ غیر فطری امر نہیں ہے؟''

''جب تمہاری شادی ہوگی تب تمہیں اس بات کا پتا چلے گا۔'' اس کے بھرے بھرے گداز گلابی ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''قدرت نے یہ بڑا عجیب وغریب نظام بنایا ہے۔ دنیا کے مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں، سخت اور سنگ دل۔ اس کے برعکس عورت پھول کی طرح نازک مگر وہ اندر سے ایک چٹان کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔ دنیا کی نرمی گرمی سہہ لیتی ہے، اپنے ظالم شوہر کا ہر ظلم سہہ لیتی ہے اس لیے کہ اس ظلم کو سہنے میں جو کیف اور لطف آتا ہے اس کا تصور شوہر نہیں کرسکتا اور پھر شوہر کی ڈانٹ ڈپٹ، اس کے ہاتھ سے پٹنے اور گالیاں سننے میں ایک عجیب سی لذت محسوس ہوتی ہے۔ اس کیفیت میں ایک طرح کی روحانی مسرت پوشیدہ ہے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے؟''

''میں اس بات کو نہیں مانتی کہ ایک عورت شوہر کی ڈانٹ ڈپٹ اور جوتے کھا کر بھی مسرت بھری زندگی گزارے، وہ تو کسی دن گھر اور شوہر کو چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔''

''اچھا یہ بتاؤ میری جان! کیا کبھی میری اور تمہاری ماں گھر، شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر بھاگیں؟'' میں نے اس کی بات سن کر نفی میں سر ہلایا تو اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''آخر کیوں نہیں بھاگیں؟ تمہارے والد اور میرے والد کو تم نے کبھی نرمی اور محبت سے پیش آتے دیکھا؟ وہ باپ اور شوہر کم ایک آمر زیادہ لگتے ہیں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ایک طوفان سا آجاتا ہے۔ بیوی بچے سب سہم جاتے ہیں اس کے باوجود کبھی تمہاری ماں نے تمہارے باپ کے خلاف نفرت کا اظہار کیا؟ جب تک عورت نے مرد کی حاکمیت کو تسلیم کیا، اسے آقا بنایا، اس وقت تک گھر کا نظام اور ازدواجی زندگی پُرمسرت رہی۔ جب عورت نے مرد کی حاکمیت کے خلاف آواز بلند کی اور آزادی کی تحریک چلائی اس کے پاس کچھ نہ رہا، طلاق، رسوائی اور ذلت اس کا مقدر بن گئے۔

ماں کے آنے کی وجہ سے میں نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد انور اچلی تو گئی لیکن میرے ذہن میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ میں تو کوئی دو دن تک اس کی باتوں کے ہر پہلو پر غور کرتی اور سوچتی رہی تھی کہ کیا اس کی باتوں کا یقین کرلوں مگر میرا دل اس کی کسی بھی بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ ظلم سہنے میں بھی ایک خاص قسم کی لذت ملتی ہے وہ ابتداء ہی سے ایک دقیانوس قسم کی لڑکی تھی۔ بہت بڑی احمق اور بے وقوف بھی..... جب اس سے شوہر کے ظلم وستم کے موضوع پر بات ہورہی تھی اس دوران میرے اور اس کے گھر کے ماحول اور حالات نظروں میں گھوم رہے تھے۔ اس کے اور میرے باپ کی سخت گیری میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ بھی اس کی ماں پر ہاتھ اٹھاتا تھا، جوتے سے دھنک کے رکھ دیتا تھا۔ میری ماں گالیاں سننے اور جوتے کھانے کے بعد کسی کمرے کے کونے میں سسک سسک کر روتی تھی۔ باپ اس سے دو ایک دن تک بات نہیں کرتا تھا۔ تیسرے دن میری ماں اور باپ کے درمیان جیسے صلح ہوجاتی تھی۔ باپ اس طرح پیش آتا تھا کہ جیسے ان کے درمیان کچھ ہوا ہی نہیں۔ لگتا تھا کہ میری ماں کے دل میں جو نفرت کا غبار تھا وہ دھل گیا، ماں صبح کمرے سے باہر آتی تو اس کے چہرے پر بشاشت ہوتی تھی۔ وہ باپ سے بڑی محبت، رغبت اور مسکرا کر بات کرتی تھی۔ میری ماں حالات سے سمجھوتا کرلیتی تھی۔ باپ کا جو سلوک تھا اس سے دلبرداشتہ ہو کر اپنے میکے بھی نہ جاسکتی تھی میری نانی اور تین ماموں تھے جو آسودہ حال تھے لیکن وہ کبھی بھی نہیں گئی۔ اگر وہ میری نانی ماموں سے باپ کی شکایت کرتی تو وہ میرے باپ کو رگید کر رکھ دیتے اور ایسی باتوں سے میری ماں کی اپنے میکے میں بھی کوئی عزت نہ رہتی۔

☆☆☆

میں نے گھر کا عقبی دروازہ بند کرکے رکھنا شروع کردیا تھا اگر کسی وجہ سے دروازہ کھلا رکھتی تو تمام ڈربوں کے دروازے اچھی طرح سے بند کردیتی تھی۔ مرغا دن رات چکر لگانے لگا تھا۔ وہ بڑا مایوس اور ناکام ہوجاتا تھا۔ ہم دونوں جیسے ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے تھے۔ وہ جب بھی گھر کے آنگن میں یا باہر دکھائی دیتا تھا میں اسے بھگائے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ میں نے دو ایک مرتبہ اس خیال سے بھی پکڑنے کی کوشش کی تھی کہ اسے ذبح کردوں۔ کم بخت ہاتھ نہیں آتا تھا۔ وہ اتنا تیز دوڑتا تھا کہ میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ ایک روز ابا کے کچھ دوست کھانے پر آرہے تھے۔ ابا نے کہا کہ دو تین مرغیاں ذبح کرکے پلاؤ پکا دینا۔ میں ان پیاری پیاری خوبصورت مرغیوں کو کس دل سے ذبح کرتی۔ میں نے گھر میں پلے ہوئے موٹے تازے اور اناپرست دونوں مرغوں کو ذبح کرادیا اور ان کا مرغ پلاؤ پکایا۔ انہیں ذبح کرکے ایک طرح سے میں نے دنیا کے مرغوں اور مرغوں جیسی فطرت کے مردوں سے انتقام لیا تھا۔

یہ بات ابا تک پہنچی تو وہ بری طرح بگڑے تھے کہ مرغوں کو ذبح کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر ماں یہ کہتی کہ ان مرغیوں کو انہوں نے ذبح کیا ہے تو ان کی شامت آجاتی چونکہ جرم میں نے قبول کرلیا تھا اس لیے ابا نے صرف ذرا سا ناراضگی کا اظہار کیا تھا کہ کہیں سے دو عمدہ نسل کے مرغے مل گئے تو خرید لینا، مرغی خانے کے لیے مرغے ضروری ہیں۔

ایک روز میری ماں سہ پہر کے وقت اویس کی ماں سے ملنے اس کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ وہ جب کبھی بھی اس کے ہاں جاتی تھیں تو خاصی دیر تک بیٹھ کر آتی تھیں کیونکہ ان دونوں میں بڑی محبت اور گہری دوستی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو حالِ دل بھی سناتی تھیں۔ اس روز بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس وقت نہا لینا چاہیے اس وقت تالاب پر مردوں اور لڑکوں کو آنے کی سخت ممانعت تھی اس لیے لڑکیاں، عورتیں نہانے، کپڑے، برتن دھونے کے لیے بھی آتی تھیں۔ اس گرمی میں صرف دو لڑکیاں تھیں۔ ہم تینوں نے بڑی دیر تک آزادی سے نہایا۔ نہانے میں آزادی ہو تو ایک عجیب سی فرحت اور لذت محسوس ہوتی ہے۔ میں نہا کے آئی مجھے انور اکے تحفے کا خیال آیا، وہ جب کبھی میکے آتی تھی میرے لیے زیر جامے، میک اپ اور سینڈلیں لے کر ضرور آتی تھی۔ اس مرتبہ وہ میرے لیے سفید لان کا سوٹ لائی تھی جو اس گرمی میں بڑا آرام دہ تھا اور ہر لحاظ سے موزوں بھی تھا۔ میں نے وہ سوٹ الماری سے نکالا اور اس کا دوپٹا بستر پر رکھ دیا۔ میں نے یہ سوٹ پہن کر سنگار میز کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ناقدانہ نظروں اور زاویے سے اپنے آپ کو دیکھا تو دل خوش ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں نے پھولوں کا لباس پہنا ہوا ہے لیکن دوسرے لمحے احساس ہوا کہ یہ لباس مناسب نہیں ہے کیونکہ اس لباس سے میرا بدن، خدوخال اور تناسب یوں جھلک رہے تھے جیسے کانچ کی صاف و شفاف بوتل میں کوئی مشروب چمکتا ہو۔ اس لباس میں اپنے باپ کے سامنے تو کیا ماں کے سامنے بھی جا نہیں سکتی تھی۔ ماں بھی بے حجابی اور بے حیائی کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ مجھے خود اس لباس میں اپنے آپ سے شرم آنے لگی تھی۔ میں کسی بے نیام تلوار کی طرح لگ رہی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اپنے لمبے چمکیلے، ریشمی اور سیاہ بالوں کو جھاڑا۔ ان بالوں کی چوٹی اتنی لمبی تھی جو میرے کولہوں پر کسی چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ میرے بالوں اور چوٹی پر لڑکیاں خصوصاً شادی شدہ عورتیں رشک کرتی تھیں کیونکہ بچوں کی پیدائش کے بعد ان کے بال جھڑ جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے زلف سنگال کا خطاب دیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ بالوں میں کنگھی کرنے کے بعد دوسرا کوئی جوڑا نکال کے پہن لوں گی۔ ابو تو دن ڈوبنے کے بعد آتے تھے، ماں کے آنے میں بھی خاصی دیر باقی تھی۔

میں آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ اویس میرے کمرے میں بے آواز داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میرا سینہ دھک سے رہ گیا تھا اور لمحے بھر کے لیے دل دھڑکنا بھول گیا اس لیے کہ میں گھر میں اکیلی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ اس تنہائی میں مجھے اکیلا پاکر وہ اس طرح دبوچ لے گا جس طرح اس کا مرغا میری مرغی کو دبوچ کر بے بس کر دیتا ہے۔ میرے سارے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ میں اتنی خوفزدہ ہوگئی تھی کہ حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی۔ نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت ہوسکی کہ بستر پر رکھا ہوا دوپٹا اٹھا کر سینے اور شانے پر پھیلا لوں۔ میرا بستر چند قدم پہ تھا لیکن وہ میلوں کی مسافت محسوس ہو رہا تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت و جامد مورتی بنی ہوئی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں ایک تیز وحشیانہ چمک دیکھی۔ اس کے بشرے سے اس کے دلی ارادوں کو بھانپنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا مرغا اویس کا روپ دھار کے سامنے آکھڑا ہوا ہے اور میں اس کے سامنے ایک کمزور، نازک سی مرغی ہوں۔ وہ اس طرح میرا حشر نشر کردے گا جس طرح مرغیوں کا کرتا ہے۔ مجھے قابو میں کر کے بے بس کر کے مطلب براری کے بعد فاتحانہ غرور سے سینہ تان کر چلا جائے گا۔

اویس ایک دراز قد اور کڑیل نوجوان تھا۔ میرے لیے فرار کی کوئی راہ تدبیر نہیں رہی تھی۔ میں مرغی سے بھی بدتر تھی۔ وہ میرے قریب آکر رکا تو مجھے ایسا لگا کہ بس اب میں غش کھا کر گرنے والی ہوں۔ میرے سارے بدن میں سنسنی دوڑنے لگی۔

''کنول!'' وہ میرے پاس آکر بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''آج میں تم سے آخری بار پوچھنے آیا ہوں کہ تمہارا فیصلہ کیا ہے؟ اس لیے کہ میری ماں میری شادی کسی دوسری جگہ کرنا چاہتی ہیں۔''

اس کا آخری جملہ سن کر میرے دل کو انجانا سا صدمہ ہوا پھر مجھے جو مردوں سے نفرت تھی وہ مجھ پر غالب آگئی۔

میں بولی۔ ''تم اپنی ماں کی پسند سے شادی کرلو۔ یہ میرا مخلصانہ ہی نہیں بلکہ دوستانہ مشورہ بھی ہے۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے شانے تھام لیے تو میرا سارا جسم سنسنا گیا کہ وہ اس انکار کو سن کر بے قابو ہوجائے گا۔ میں جس لباس اور جس حالت میں تھی وہ تنہائی میں ایک مرد کو بہکانے سے روک نہیں سکتی تھی۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''میں صرف اور صرف تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں..... اس لیے کہ تم میرا خواب رہی ہو اور آج بھی ہو۔ میں تمہارے سوا کسی اور لڑکی کو شریکِ حیات بنانے کا تصور تک نہیں کرسکتا۔''

''مگر میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ میں یہ بات ایک ہزار مرتبہ سنا چکی ہوں۔ یہ شاعرانہ باتیں رہنے دو..... اور میرے شانے سے ہاتھ ہٹاؤ۔''

''اگر تم نے مجھ سے شادی نہیں کی تو میں کسی نہر میں ڈوب کر مرجاؤں گا۔'' اس نے مجھے بری طرح جھنجوڑ دیا۔

''میں زہر کھالوں گا۔ میں نے زہر خرید کر رکھا ہوا ہے۔''

''میری بلا سے..... وہ دن میرے لیے بڑی مسرت کا ہوگا۔'' میں نے اس کے ہاتھوں کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ۔ تم بالکل اپنے مرغے کی طرح لگ رہے ہو۔''

پھر وہ اچانک مجھ پر جھک گیا۔ یہ قصور تنہائی، اس انکار اور لباس کا بھی تھا جس میں میں ملبوس تھی اس نے مجھے دو آتشہ بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی امڈ آئی ایک وحشیانہ پن سوار ہوگیا اور میں بے بس سی ہوگئی وہ جیسے مرغا بن گیا تھا۔ میں بھی مسلسل اس کے جکڑ کو توڑنے کی کوشش کرتی رہی۔ جیسے ہی اس کے مضبوط بازوؤں کا حصار کمزور ہوا تو اس سے فائدہ اٹھالیا اور ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کرالیا۔ وہ مجھے اس طرح گھورنے لگا جس طرح اس کا مرغا میری مرغیوں کو گھورتا تھا۔ اس کی آنکھیں لال ہورہی تھیں۔

''نکل جاؤ یہاں سے..... دفع ہوتے ہو کہ نہیں.....'' میں ہذیانی انداز سے چیخی۔ ''نہیں تو شور مچا کے ساری دنیا کو اکٹھا کرلوں گی۔''

پھر وہ ایک پل بھی نہیں رکا۔ بجلی کی سی سرعت سے کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے باہر جاکے دروازہ بند کیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ امی آجائیں اور میری اس حالت کو دیکھ کر شک میں پڑ جائیں کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی مجھ سے فائدہ اٹھا کے گیا ہے۔

میں نے کمرے میں آکر سنگار میز کے آئینے میں خود کو دیکھا تو نہ صرف میری سانسیں بلکہ بال اور لباس بھی بے ترتیب ہورہا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کرکے الماری سے جوڑا نکالا۔ لان کا جوڑا اتار کے دوسرا جوڑ پہنا اور اس جوڑے کو کپڑوں میں ٹھونس دیا... پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر ہلکا سا میک اپ بھی کیا تاکہ چہرے پر جو نشان ہیں وہ چھپ جائیں۔

رات جب میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوئی نیند مجھ سے کسی محبوب کی طرح روٹھ گئی تھی۔ میں آج کے واقعہ کے بارے میں سوچنے لگی تو میرے بدن میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ میں اویس کے بغیر ادھوری ہوں۔ گھڑی بھر کے لمس نے مجھے بدل دیا ہے۔ میں چشم تصور میں اپنے آپ کو اویس کے سخت بازوؤں کی گرفت میں محسوس کرنے لگی۔ انور ا کی باتیں بھی یاد آنے لگیں۔ طرح طرح کے خیالات میرے دماغ کی ندی میں تیرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی طرح گردش کرنے لگے تھے۔ کبھی اوپر آکر سطح آب پر تیرنے لگتے، کبھی پانی کی تہ میں اتر جاتے۔ ''عورت کیا مرد کی خدمت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے؟ کیا وہ مرد کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی ہے؟ آخر اسے ایک مرد کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ کیا ایک عورت کی اس غلامی میں جیت ہے؟ اگر میں نے اویس سے شادی کرلی تو کیا اس میں میری جیت ہوگی؟''

بستر پر بے چینی سے آدھی رات تک کروٹیں بدلتی رہی پھر نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ علی الصباح میری آنکھ شور سے کھل گئی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پوری طرح صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ میں نے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز سنی۔ میں نے گردن گھما کے اس سمت دیکھا۔ وہ مرغا کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھا مجھے تیز و تند نظروں سے گھور رہا تھا جیسے میرے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کررہا ہو، احتجاج کررہا ہو کہ میں نے مرغیوں پر پہرے کیوں بٹھادیئے ہیں؟ ان سے ملنے کیوں نہیں دیتی؟ یہ مرغا آج ہی میرے کمرے کی چوکھٹ پر نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار اپنی بھیانک آواز میں بانگ دے کر میری نیند خراب کرچکا تھا۔ اس کی موجودگی سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھے ایک مرد کی طرح گھور رہا ہو۔ اس کے گھورنے سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ مجھے حکم دے رہا ہو کہ مرغیوں کے

ڈربے کے دروازے کھول دو۔ میں نے جھک کر چپل اٹھائی اور اس کی جانب اچھال دی۔ وہ کھڑکی سے باہر کود گیا۔ سورج نکلنے کے بعد ابا اپنے کام پر چلے گئے۔ میں مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی کہ ماں نے میرے پاس آکر کہا۔

''تم نے ابھی تک کسی مرغے کا بندوبست نہیں کیا اور نہ ہی کسی سے کہہ رکھا ہے۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ مرغیوں نے انڈے دینے بند کردیے ہیں۔ یہ سب بیماروں کی طرح لگ رہی ہیں۔ ایک طرف پڑی رہتی ہیں۔ تمہارے والد بھی کہہ رہے تھے کہ انڈوں کی آمدنی بہت کم ہوگئی ہے اور پھر یہ مرغے کے نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں لڑتی رہتی ہیں۔ مرغی خانے کی رونق مرغے کے دم سے ہوتی ہے۔ تم نے تو اویس کے مرغے کا بھی داخلہ بند کردیا ہے۔ جب تک کسی دوسرے مرغے کا بندوبست نہیں ہوجاتا اس مرغے کو یہاں آنے دو! تاکہ مرغیاں انڈے دینے لگیں۔''

میں نے ماں سے کوئی بحث تکرار نہیں کی اس لیے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔ ادھر اویس نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ زندگی کا ایک رخ واضح اور روشن ہوگیا تھا جو اب تک میری نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ اب ماں کی باتوں سے دماغ سے وہ گپ اندھیرا چھٹنے لگا تھا جس میں مجھے کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ مرغے نے ان مرغیوں کو ایک آمر کی طرح کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ جب وہ مرغیوں کی طرف رخ کرتا تو وہ آپس میں لڑنا بند کردیتی تھیں۔ اس مرغی خانے کے نظام کو قابو میں رکھنے کے لیے ایک ظالم اور جابر کی ہی ضرورت تھی۔ اب مجھے مرغے کی افادیت کا احساس ہونے لگا تھا۔

ادھر میں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ مرغا جارحانہ انداز سے دیوار پھلانگ کر آنگن میں گھس آیا پھر اس نے شوخیاں اور مستیاں شروع کردیں۔ اس نے سب سے پہلے میری پیاری اور سب سے خوبصورت مرغی کا تعاقب کیا۔ یہ مرغی آسانی سے اس کے ہاتھ نہیں لگی، وہ اسے تگنی کا ناچ نچانے لگی۔ آخر کار اس مرغے نے میری مرغی کو پالیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنی فتح ونصرت کا نشان بانگ دے دے کر منا رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں اس روز سے یہ مرغا مجھے بہت پیارا اور خوبصورت لگنے لگا۔ اس سے روز بہ روز انسیت بڑھنے لگی اس لیے کہ وہ اویس کے گھر کا مرغا تھا۔ ایک روز میں گھر پر تھی۔ اویس اپنے مرغے کی تلاش کے بہانے میرے گھر میں آگیا۔ اس روز بھی اتفاق سے ماں گھر پر نہیں تھیں۔ میں اس سے نفرت سے نہیں بلکہ محبت سے پیش آئی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ اس نے بلا جھجک کہہ دیا کہ وہ اپنی ماں کو رشتے کے لیے بھیجے گا۔

جمعے کے روز اس کی ماں اور بہنیں رسمی طور پر ہمارے گھر آنے والی تھیں کہ جمعے کی نماز میں کسی انتظامی امور اور مذہبی مسئلے پر میرے ابا اور اویس کے ابا کے درمیان اس قدر سخت اختلاف پیدا ہوگیا جس نے بڑی سنگین صورت اختیار کرلی۔ میں نے یہ بھی سنا کہ دونوں اس قدر مشتعل اور جذباتی ہوگئے تھے کہ ان کے درمیان ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ نمازی درمیان میں نہ آتے تو خون خرابا کی نوبت آجاتی۔ جب میرے ابا نے اویس کے رشتے کے بارے میں سنا تو انہوں نے بڑی نفرت، حقارت اور غصے سے صاف انکار کردیا جبکہ پہلے وہ داماد بنانے کے خواہاں تھے۔ ادھر اویس کے والد نے بھی اپنے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ ان کی زندگی میں کنول کبھی اس گھر کی بہو نہیں بنے گی۔

اس اچانک اور غیر متوقع افتاد نے اویس کو نہ صرف بہت پریشان بلکہ تفکر اور اداس کردیا تھا۔ ہم نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک چھوٹے سے اختلافی مسئلے پر دو دوستوں کے درمیان اچانک نفرت کی دیوار کھڑی ہوجائے گی۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی یہ عداوت اس کے..... مستقبل کو تاریک کرکے رکھ دے گی۔ اویس نے اپنے باپ کو بہت سمجھایا، ادھر میری ماں نے بھی میرے کہنے پر ابا کو..... لیکن یہ مذہبی اختلاف تھا جس میں لوگ جذباتی بن جاتے ہیں اور اسے اپنی انا بنا لیتے ہیں اس لیے ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی جھکنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ یہ بات اتنی بڑی بھی نہ تھی کہ وہ دونوں ہی انتہا پسندی کا مظاہرہ کریں۔ گاؤں کے بزرگوں نے ان دونوں کو بہت سمجھایا اور صلح کرانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ اپنی اپنی بات پر اڑے رہے۔

ادھر میری اور اویس کی محبت تیزی سے پروان چڑھنے لگی تھی۔ ہم باہر ملنے لگے تھے۔

جس جگہ ہم ملتے تھے یہ جگہ اونچی اور گھنی جھاڑیوں سے گھری تالاب کے عقب میں تھی۔ وہ لڑکیاں، عورتیں جو تالاب میں نہانے کے بعد کپڑے بدلتی تھیں یہاں آجایا کرتی تھیں۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد تالاب پر نہ مرد، لڑکے آتے تھے اور نہ ہی لڑکیاں عورتیں..... میں اویس کے ساتھ

بیٹھی اس کی محبت بھری باتیں سن رہی تھی کہ اچانک مجھے مرغے کے بانگ دینے کی آواز سنائی دی، ہم دونوں تڑپ کر کھڑے ہوگئے۔ بدحواس ہوکر آواز کی سمت دیکھا۔ مرغا کھڑا ہوا ہمیں سماج کی نظروں سے گھور رہا تھا۔ یہ مرغا کباب میں ہڈی بن گیا تھا۔ اویس کا چہرہ غصے سے تمتما گیا۔ اویس نے زمین پر سے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کے تاک کر آہستہ سے، اسے دے مارا جو وہ اس کی کمر پر لگا۔ پتھر زور سے تو نہیں لگا تھا پھر بھی اس نے ہمیں نفرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کی نگاہیں جیسے کہہ رہی تھیں کہ تم نے دو مہینے تک میری راہ میں دیواریں کھڑی کیں۔ میری خواہش، ارمانوں اور حسرتوں کو بے رحمی سے کچل دیا۔ تمہاری بے رحمیت کیسے بھول سکتا ہوں۔ کبھی بھی نہیں بھولوں گا۔ تم کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو؟ میں بھی تمہاری راہ کا پتھر بن جاؤں گا۔ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس تک نہ ہوا۔ جبکہ اس طرح پتھر مارنے سے کتا بھی بھاگ جاتا ہے۔ اس کا ڈھیٹ پن دیکھ کر اویس نے دوسرا پتھر اٹھالیا پھر وہ اپنی زبان میں جیسے بڑبڑاتا ہوا میرے گھر کے عقبی دروازے کی طرف چلا گیا تاکہ اس کا انتقام میری کسی مرغی سے لے سکے۔ اس کا یہ شاہانہ تکبرانہ انداز دیکھ کر ہم اپنی ہنسی روک نہ سکے۔

لیکن تھوڑی دیر میں پتا چل گیا کہ مرغے نے ہم پر احسان کیا ہے۔ اگر مرغا نہ آجاتا تو ہم پکڑے جاتے۔ گاؤں کی چھ سات لڑکیاں تالاب کی طرف آرہی تھیں۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی جھاڑیوں کی طرف بھی کپڑے بدلنے آجاتا اور ہمیں دیکھ لیتا۔ مرغے کی وجہ سے ہمارا پردہ رہ گیا تھا۔ اویس جھکے جھکے جھاڑیوں سے دوسری طرف نکل گیا تھا۔ اب ہم نے ملنے کے لیے ایک نئی جگہ کا انتخاب کیا۔ یہ جگہ بہت محفوظ تھی اور ہمارے گھروں سے کس قدر فاصلے پر تھی۔ یہ ایک اناج کا گودام تھا جو میرے ابا نے ایک بیوپاری کو کرائے پر دے رکھا تھا۔ وہ اس گودام میں غلہ، بھوسا، گھاس، خالی بوریاں، تیل گھی کے خالی کنستر رکھتا تھا۔ ایک کونے میں ایک چارپائی تھی اس پر بستر بچھا ہوا تھا وہ کبھی کبھی دوپہر کے وقت ستانے آتا تھا۔ ہم دونوں اس چارپائی پر دنیا جہاں سے بے نیاز بیٹھے اپنی محبت کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے کہ اویس پر شیطان غالب آگیا۔ وہ زور زبردستی پر آمادہ تھا۔ میں اس کی جکڑ سے چھوٹنے کی کوشش کررہی تھی کہ اچانک مرغا کٹ کٹ کرتے ہوئے تشریف لے آیا۔ پھر وہ، ایک طرف کھڑے ہوکر ہمیں اس طرح سے دیکھنے لگا جیسے ہماری حرکات وسکنات کو نوٹ کررہا ہوتا کہ ہمارے والدین کو ہماری ان چوری چھپے ملاقاتوں کی رپورٹ کرسکے... پھر پتا نہیں اس نے کیا سمجھا کہ اپنی جگہ سے اچھال بھری اور سیدھے اویس کے سر پر پنجا مارتے ہوئے دوسری جانب کود گیا۔ اویس کی چیخ نکل گئی۔

گودام کی یہ جگہ کسی قدر ویران اور سنسان تھی۔ اس سے نصف فرلانگ پر کھیل کا میدان تھا۔ اس میدان میں لڑکے سہ پہر کے وقت کرکٹ کھیلنے کے لیے آتے تھے۔ اس وقت بھی وہاں لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ دوسری جانب کودنے کے بعد مرغے نے اپنے پروں کو اس طرح پھڑ پھڑانا شروع کردیا جیسے ساری دنیا کو خبر کررہا ہو کہ دیکھو میرا مالک اور اس کی پڑوسن کیا گل کھلا رہے ہیں؟ اس مرغے نے بوریوں کے اوپر پہنچ کر ہمارے خلاف محاذ بنایا ہوا تھا۔ اس نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا تھا اس نے زور زور سے بانگیں دینا شروع کردیں۔ گاؤں کے شریر لڑکے مرغیوں کو ذبح کرکے پکا لیتے تھے جو ویرانے میں دانہ چگ رہی ہوتی تھیں۔ وہ اس مرغے کو پکڑنے کے لیے تاک میں تھے کیونکہ اس نے ان کے مرغوں اور مرغیوں کی درگت بنا رکھی تھی اس لیے وہ اس کی طرف دبے پاؤں، بے آواز اور غیر محسوس انداز سے بڑھے، ہمیں ان لڑکوں کے آنے کی مطلق خبر نہ ہوسکی۔

دن ڈوبنے سے پہلے پہلے ہماری سنسنی خیز کہانی جنگل کی آگ کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ اس کہانی کو جس طرح نمک مرچ لگا کر پیش کیا گیا اس نے کہانی میں بڑی سنسنی پیدا کردی تھی۔ اس کہانی کا خطرناک پہلو یہ تھا کہ میں اپنی عزت کھو بیٹھی ہوں۔ میں پاک دامن نہیں رہی۔ حالانکہ ہم دونوں نے سختی سے اس بات سے انکار کیا اور تردید کی تھی کہ ہم آلودہ حالت میں نہیں تھے لیکن اس تردید کا کوئی یقین نہیں کررہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس سیاہ کاری کا نتیجہ جلد آنے والا ہے۔

یہ کہانی میرے گھر تک کیسے نہ پہنچتی۔ اتفاق سے میرے ابا مالک کے کسی کام سے کچھ دنوں کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے۔ میری آپا گھر آئی ہوئی تھی۔ ماں پر تو بجلی سی آگری تھی۔ اس وقت میں نے اپنی آپا کو سارا احوال سنایا۔ ماں نے میری بہن کی بات اور اس کے سمجھانے کا یقین کرلیا۔ بات یہیں ختم ہوجاتی اگر مرغا اپنی ٹانگ نہیں اڑاتا۔ مرغے نے مجھے ذلیل اور رسوا

کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ بگر ایک احسان بھی کیا تھا کہ میری دوشیزگی باقی رہ گئی تھی ورنہ تو میں اپنی نظروں میں گر جاتی۔

ہمارے گاؤں میں یہ بات عام تھی کہ رات کے وقت مرغا بانگ دے تو یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اس گاؤں کی کوئی کنواری لڑکی کسی ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس بات پر سارے گاؤں والوں کا ایمان تھا تو میری ماں کا کیسے نہیں ہوتا۔ یوں بھی عورتیں مردوں کے مقابلے میں بڑی توہم پرست ہوتی ہیں، ان بانگوں کا سن کر میری ماں نے میری چوٹی پکڑ لی ان کے پیروں پر گر کے میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں آج بھی پاک دامن ہوں۔ میری اس بات کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ یہ سمجھیں کہ اپنا گناہ چھپانے کے لیے جھوٹی قسمیں کھا رہی ہوں۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ میں خدا اور دنیا والوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہوں۔ گھر کی عزت خاک میں ملادی ہے۔ میں اپنی اس بے گناہی کا ثبوت کہاں سے لاتی۔ اس گاؤں کے تمام مرغے بانگیں دے دے کر۔ رف سارا گاؤں سر پر اٹھا لیتے تھے گویا میرے گناہ کی گواہی دیتے رہتے تھے۔

میں نے کوئی دو تین مرتبہ بڑی کوشش کی اس مرغے کو پکڑ کر ذبح کردوں۔ اس کی وجہ سے میں گاؤں میں بری طرح بدنام ہوچکی تھی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی بلکہ میں خود بھی اپنی نظروں میں اتنی گر چکی تھی کہ آئینے میں اپنی صورت دیکھتی تو وہ اتنی گھناؤنی اور مکروہ لگتی کہ آئینے کے سامنے سے ہٹ جاتی۔ میری سہیلیوں اور محلے کی لڑکیوں نے بھی ہمارے ہاں اپنی آمد و رفت بند کردی تھی۔ وہ لڑکیاں جو میرے حسن اور قیامت خیز اٹھان سے بہت جلتی تھیں انہوں نے مجھے اور بدنام کیا تاکہ میری شادی ہی نہ ہوسکے۔ یہ سب اس مرغے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسے دیکھتی تو میرا خون کھول اٹھتا وہ میرے مرغی خانے میں روز ہی آکر اپنی غرض پوری کرکے میرا منہ چڑا کے نکل جاتا اور میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کے رہ جاتی۔

اس واقعے کے چوتھے روز میرے ابا لاہور سے واپس آگئے۔ انہوں نے مجھے ایک بڑے کمرے میں بند کرکے باہر سے تالا لگا دیا اور امی نے ان کے پیروں پر گر گڑا کے میرے لیے معافی مانگی... ورنہ تو میں کاری ہوچکی ہوتی۔ اماں نے ابا سے کہا تھا کہ لڑکی کو مار کے اپنے ہاتھ خون سے رنگ کر اور پھانسی چڑھنے سے فائدہ۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے مشورہ کرو۔ اویس کے باپ کو بھی ذلیل و خوار کرو۔ مجرم کو بھی اس کے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔ یہ کیا کہ بدنامی کا طاق میری بیٹی کے گلے میں پڑا رہے۔ اس کے منہ پر جو کالک لگی ہے وہ اسی لڑکے کی وجہ سے ہے۔ اماں کی بات میرے ابا کی کھوپڑی میں آگئی۔ دوسرے دن گاؤں کے ایک بزرگ کے گھر پر میرے اور اویس کے گھر والے جمع ہوئے۔ اس روز یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں میرے اور اویس کے والد میں خون خرابا نہ ہوجائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئی۔ کئی گھنٹے تک بحث و تکرار ہوتی رہی۔ ایک بزرگ نے یہ فیصلہ دیا کہ لڑکے نے چونکہ لڑکی کو کسی قابل نہیں چھوڑا ہے لہٰذا کل ہی وہ اس سے شادی کرے گا۔ سزا کے طور پر لڑکی کے ماں باپ نہ تو جہیز دینے کے پابند ہوں گے اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی لین دین ہوگا۔ مہر کی رقم بھی پچاس ہزار سے کم نہیں ہوگی۔ لڑکا شادی کرتے ہی اپنی بیوی کو لے کر اس گاؤں سے نکل جائے گا تاکہ گاؤں کے لڑکے، لڑکیوں پر ان کا سایہ نہ پڑے۔

میری شادی اس طرح ہوئی جس طرح ایک لاوارث لڑکی کی، کی جاتی ہے۔ گھر والوں کے سوا نہ تو رشتہ داروں نے شرکت کی اور نہ ہی پڑوسیوں نے اور نہ ہی تحفے تحائف دیئے گئے، نہ ہی خوشیاں منائی گئیں۔ میری ساس، سسر اور نندوں نے بات کرنا تو درکنار مجھے دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔ اتفاق سے آپا اور باجی آئی ہوئی تھیں انہوں نے خوب پیار کرکے گلے سے لگا کر کہا کہ ہمارے گھر کے دروازے ہمیشہ تم دونوں کے لیے کھلے رہیں گے... پھر ہم دونوں دوسرے دن کراچی کے لیے روانہ ہوگئے۔ چلتے وقت اویس نے مرغے کو ساتھ لے لیا اس لیے کہ یہ مرغا ہمارا محسن تھا۔

ہم پانچ برس سے پُرمسرت ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ شادی کے دو برس بعد ایک لڑکے کو جنم دے کر مرغے کو جھوٹا ثابت کردیا۔ اس کے جھوٹ ہی نے ہم دونوں کو ملایا تھا۔ اگر یہ مرغا میری زندگی میں نہ آتا تو میں ہمیشہ کنواری ہی رہتی۔ میرا یہ محسن میری نگاہوں کے سامنے ہی رہتا ہے اور میں اسے نظروں سے کیا دل سے بھی اوجھل ہونے نہیں دیتی ہوں۔

++

محافظ

جناب مدیراعلیٰ
السلام علیکم!
زیرنظر روداد میری پیشہ وارانہ زندگی کا انوکھا ترین واقعہ ہے اسی لیے اسے کہانی کا روپ دینے کے لیے میں نے اپنا نام نہیں دیا ہے۔ یہ کہانی ایسی انوکھی ہے کہ اختتام پر آپ بھی چونک جائیں گے۔

سحر نسیم
(لاڑکانہ)

مجھے لانگ روٹ پر بس کا سفر بہت اچھا لگتا ہے۔ طرح طرح کے لوگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چھوٹی بڑی دکانیں، ان کے سامنے کھڑے ہوئے گاہک۔ یا چھوٹے چھوٹے چائے کے ہوٹلز۔ ان میں کرسیوں یا بینچوں پر بیٹھے ہوئے لوگ۔

یہ میرا مشغلہ ہے۔ سفر کرنا اور لوگوں کو دیکھنا۔ اور جب کسی اسٹاپ پر بس رک جائے تو پھیری والوں کی آمد۔ ان کی آوازیں۔ یہ سب مجھے بہت ہانٹ کرتے ہیں۔ اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ دیکھتا رہوں اسی لیے میں ٹرین یا پلین سے زیادہ بس کے سفر کو ترجیح دیتا ہوں۔

زندگی بہت قریب محسوس ہوتی ہے۔

ایک اور منظر بھی ہے جس نے ہمیشہ مجھے کھینچا ہے۔ اور وہ ہے لق ودق میدان میں جہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا۔ کسی ٹیلے یا کسی پتھر پر بیٹھا ہوا وہ تنہا انسان۔ پوری دنیا سے بے نیاز۔ جس کو دنیا کی کوئی پروا نہ ہو۔ میں اکثر یہی سوچتا ہوں کہ یہ بندہ اس ویرانے میں اکیلا بیٹھا کیا کر رہا ہے؟ اس کی زندگی کیسے گزرتی ہوگی؟

مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔ خاص طور پر شام کا منظر۔ جب پرندے اپنے آشیانوں کو واپس آرہے ہوں اور کسی چھوٹی سی مسجد سے مغرب کی اذان بلند ہو رہی ہو۔ اس سفر میں بھی یہ سارے مناظر نگاہوں کے سامنے سے گزرے تھے۔

اب بس اپنے سیدھے راستے پر جا رہی تھی۔ دور دور تک ایک کالی سڑک تھی جس کے ارد گرد کے مناظر اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بس مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں بھی تھیں۔ مرد بھی تھے۔ ہر عمر کے لوگ تھے۔

چلتے چلتے بس کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ اچانک رک گئی۔ اونگھتے ہوئے مسافر ایک دم سے چونک کر جاگ گئے تھے۔

بس کا کنڈکٹر سامنے آیا۔ اس نے اعلان کیا۔ ''ہوشیار ہو جائیں۔ ہماری بس کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا ہے۔''

اب ہوشیار کیا ہونا تھا۔ سارے مسافروں کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ کچھ عورتوں نے رونا شروع کر دیا تھا۔ اتنی دیر میں تین ڈاکو بس میں داخل ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحے تھے۔ وہ سب کھلے چہروں والے تھے۔ یعنی ان میں سے کسی نے ڈھاٹا وغیرہ نہیں باندھ رکھا تھا۔

لیکن چہرے ایسے تھے کہ دیکھ کر دہشت ہو رہی تھی۔

ان میں سے ایک ڈرائیور کے سر پر سوار ہو گیا۔ اس نے ہدایت کی کہ بس کو کچے میں اتار دیا جائے۔ ڈرائیور بھی مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے بس کو کچے میں اتار دیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد بس کو روک دیا گیا۔

بس کے اندر کی لائٹ روشن تھی۔ سڑک فاصلے پر تھی۔ وہاں سے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

تین مزید ڈاکو بس میں گھس آئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ڈاکوؤں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ بس میں پہلے سے تین تھے۔ اب تین اور ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک مرکزی حیثیت کا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈاکو اسی کے اشارے پر کام کر رہے تھے۔

دو کے ہاتھوں میں بڑے بڑے تھیلے تھے۔ ''چلو۔ جو کچھ ہے۔ اس میں ڈالتے جاؤ۔'' اسی نے حکم دیا۔

وہ مسافروں کے پاس جاتے رہے اور مسافروں سے سب کچھ بٹورتے رہے۔ موبائیل۔ گھڑیاں۔ نقدی۔ پرس۔ عورتوں سے زیورات۔ غرض کہ جو کچھ بھی مسافروں کے پاس تھا، وہ ان کے تھیلوں میں جاتا رہا۔

ایک ڈاکو میرے پاس بھی آ گیا۔ ''چل بھائی۔ جو کچھ بھی ہے۔ ڈال دے اس میں۔''

میں نے اپنا موبائیل اور جیب میں جتنے پیسے تھے۔ وہ سب نکال کر ان کے تھیلے میں ڈال دیے۔ میری گود میں میرا بیگ تھا۔

''اس میں کیا رکھا ہے؟'' ایک نے پوچھا۔

''اس میں جو کچھ ہے۔ وہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔'' میں نے کہا ''اس کو میرے ہی پاس رہنے دو۔''

''اوئے۔ ایسی کون سی چیز ہے جو ہمارے کام کی نہیں ہے۔'' اسی نے پوچھا۔ جس کی حیثیت دوسروں سے الگ تھی جو اس گروہ کا سردار معلوم ہوتا تھا۔

''اس میں میری کتابیں ہیں اور یہ کتابیں میری زندگی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا۔'' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''لکھنے پڑھنے والا بندہ معلوم ہوتا ہے۔ کسی اسکول میں پڑھاتا ہے؟''

''میں کسی اسکول میں نہیں پڑھاتا۔ کہانیاں لکھتا ہوں۔''

''ارے واہ۔ یہ تو بہت زبردست بات ہوئی۔ تم کہانیاں لکھتے ہو؟''

''ہاں۔ یہی میرا کام ہے۔'' میں نے کہا۔

''بابا۔ پھر تو تم میری بھی کہانی لکھو گے۔'' اس نے کہا۔

میں چپ رہا۔ ظاہر ہے مجھے اس کی کہانی کیا معلوم تھی۔

''بولو بابا۔'' اس نے پوچھا۔

''کیسے لکھوں؟'' میں نے کہا۔ ''اس کے لیے تو سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہاں بس میں تمہاری کہانی کیسے لکھ سکتا ہوں؟''

''کوئی بات نہیں بابا۔ تم ہمارا مہمان بن کر ہمارے ساتھ چلو گے۔'' اس نے کہا۔

''تمہارے ساتھ؟'' میں یہ سن کر بہ ظاہر پریشان ہو گیا

تھا۔ ویسے بھی مجھے زبردست موقع مل رہا تھا۔ انہیں پاس سے دیکھنے کا۔ ان کا مشاہدہ کرنے کا۔

''ہاں۔ ہمارے ساتھ۔ ہم تم کو بہت آرام سے رکھیں گے۔ سب ملے گا بابا۔ بس ہماری کہانی لکھنی ہوگی۔''

یہ میرے لیے ایک اعصاب شکن مرحلہ تھا۔ پوری بس میری طرف دیکھ رہی تھی۔ سب پریشان اور خوف زدہ تھے۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک فیصلہ کرلیا۔ ''میں چلوں گا... اور تمہاری کہانیاں بھی لکھوں گا۔ لیکن میری ایک شرط ہو گی۔''

''شرط؟'' وہ ہنس پڑا۔ ''کیا تم شرط رکھنے کی پوزیشن میں ہو؟''

''ہاں۔ میں ایک لکھنے والا ہوں، اور جب تک اندر سے اطمینان نہ ہو۔ میں نہیں لکھ سکتا۔ آزادی سے لکھتا ہوں۔''

''چلو بابا بتاؤ۔ کیا شرط ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''شرط یہ ہے کہ تمہارے آدمیوں نے بس والوں سے جو کچھ بھی لیا ہے۔ وہ سب واپس کردو گے، اور بس کو جانے کی اجازت دے دو گے۔'' میں نے کہا

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ بھڑک اٹھا۔

''یہی شرط ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم مجھے زبردستی بھی اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو لیکن مجھ سے لکھا نہیں جائے گا۔ بے دلی سے لکھوں گا۔ اب تمہاری مرضی۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''منظور ہے۔ میں یہی سمجھوں گا کہ ایک بس ہاتھ سے نکل گئی۔'' پھر اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''چلو سب کا مال واپس کرو۔''

میں ان سب کا ڈسپلن دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ کسی نے چوں تک نہیں کی۔ سردار نے جو حکم دیا تھا اس پر عمل کرنے لگے۔ ایک ایک مسافر کو اس کا سامان واپس کرنے لگے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اس طرح ان کا نقصان ہو رہا ہے، نہ جانے دوسری بس کب ملے یا نہ ملے۔ بس سردار نے جو کہہ دیا تھا اس پر عمل کرنا ضروری ہوگیا تھا۔

سارا سامان واپس کردیا گیا۔ مجھے بس سے نیچے اتار لیا گیا۔ مسافر عقیدت اور احترام کی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک بوڑھا مسافر میرے پاس آگیا۔ ''بیٹا تم کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔ ان لوگوں کا کیا بھروسا۔ اگر تم کو نہ چھوڑیں تو؟''

''محترم مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ مجھے چھوڑ دیں گے۔ ذرا... آپ ان کا ڈسپلن تو دیکھیں۔ کون ہاتھ میں آیا ہوا مال اتنی آسانی سے واپس کرتا ہے لیکن خود دیکھ لیں۔ جوان کے سردار نے کہہ دیا وہ حرفِ آخر ہے اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ میں ان کی کہانیاں لکھ لینے کے بعد اپنے لوگوں میں واپس چلا جاؤں گا۔ کیوں کہ یہ اپنی بات کے دھنی لوگ ہوتے ہیں۔''

کچھ... عورتیں اور مرد بھی میرے پاس آگئے۔ وہ سب شکریہ ادا کررہے تھے۔ سب کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے ایسی قربانی کیوں دی ہے۔ میں بھی دوسرے مسافروں کی طرح اپنی چیزیں ان کے حوالے کرکے واپس جا سکتا تھا۔

سردار نے اعلان کیا۔ ''چلو سب بس میں بیٹھ جاؤ بس جانے والی ہے۔''

سارے مسافر میرا شکریہ ادا کرکے بس میں بیٹھ گئے۔ بس روانہ ہوگئی۔ سب ہاتھ ہلاتے ہوئے جارہے تھے۔

بس کے جانے کے بعد سردار نے میرے پاس آکر پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے بابا؟''

''میرا نام سحر نسیم ہے بھائی۔'' میں نے بتایا۔

''واہ۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''تمہارا نام بھی نازک نازک سا ہے بابا۔ لیکن تمہارا دل شیر جیسا ہے... ورنہ کون دوسروں کے لیے اتنی ہمت کرتا ہے بابا۔ تم نے اپنے آپ پر ظلم کرکے دوسروں کو واپس بھجوا دیا ہے۔ کمال ہے بابا۔ کمال ہے۔''

''نہیں بھائی۔ اس میں کوئی کمال نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔''

''یہ کیسے کہہ سکتے ہو بابا؟''

''کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں کہانیاں لکھتا ہوں اسی لیے لوگوں کو پہچان بھی لیتا ہوں اور تمہیں بھی پہچان لیا ہے۔''

''کیا پہچان لیا ہے بابا؟''

''یہی کہ تم اپنی بات کے دھنی انسان ہو۔'' میں نے کہا۔

''واہ۔'' وہ ہنس پڑا۔

''ہمارا سفر شروع ہوا۔ یہ سفر رات کے گھپ اندھیرے میں ہو رہا تھا۔ نہ جانے کہاں۔ سب پیدل چل رہے تھے۔ اب ان کی تعداد کا اندازہ ہوا تھا۔ یہ سب میرے خیال میں تیس چالیس لوگ تھے۔ یعنی اچھی خاصی تعداد تھی... اور سب مسلح تھے۔ مختلف قسم کے چھوٹے بڑے ہتھیار ان کے پاس تھے۔

پہلے اس قسم کے کئی گروہ ان جنگلوں میں ہوا کرتے تھے لیکن اب بہت کم رہ گئے تھے۔ البتہ پچھلے کئی مہینوں سے ایک گروہ نے ان علاقوں میں اپنی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ اس گروہ کو جانو کا نام دیا گیا تھا۔ جانو اس گروہ کے سردار کا نام تھا۔

سردار اس وقت میرے ساتھ ہی چل رہا تھا۔ راستہ بہت خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔ اچانک ایک آدمی نے اس سردار کو مخاطب کیا۔ ''سردار جانو۔ میں نے سنا ہے کہ بخش کا اس علاقے سے ٹرانسفر ہو گیا ہے۔''

یہ بات کنفرم ہو گئی کہ وہی جانو تھا جس کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔

''ہاں ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ دوسرا بندہ آنے والا ہے۔'' سردار نے کہا۔

راستہ پھر خاموشی سے طے ہونے لگا۔ بہت مہیب سفر تھا۔ گھنا جنگل۔ اندھیرا گھپ اور خونخوار ڈاکوؤں کا ساتھ۔

ہم بہت دیر تک چلتے ہوئے درختوں کے درمیان ایسی جگہ آ گئے جہاں ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ اس میں دو تین عارضی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں روشنی کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ دو تین ہنڈے جل رہے تھے۔ میں نے دیکھا ایک طرف چولہے بھی جل رہے تھے۔ یعنی ان کے کھانے کا انتظام ہو رہا تھا۔

''میرو۔'' جانو نے اپنے ایک ساتھی کو آواز دی۔ ''بابا پہلے ہمارے مہمان کو کچھ کھلاؤ پلاؤ پھر اس سے باتیں ہوں گی۔ ابھی تو یہ تھکا ہوا آیا ہے۔''

مجھے ایک جھونپڑی میں لے جایا گیا۔

وہاں ایک چارپائی تھی۔ ایک کرسی بھی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ ایک میز تھی۔ جس پر ایک پانی کا بھرا ہوا جگ رکھا تھا۔ میں نے اپنا بیگ ایک طرف رکھ دیا۔ اس میں واقعی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔

میرا یہ سفر میرے کام آنے والا تھا۔ مجھ سے کہا بھی گیا تھا کہ میں اس راستے پر سفر نہ کروں۔ اس پر خطرہ ہے لیکن میں نے منع کرنے والوں کی بات نہیں مانی تھی۔ اور اب اس جنگل میں ان ڈاکوؤں کے رحم کرم پر تھا۔

میری بھی کیا زندگی رہی ہے۔ ایڈونچر سے بھری ہوئی۔ اور ہر ایڈونچر کے بعد ایک شاندار کہانی تیار ہو جاتی ہے۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں واقعی کہانیاں لکھتا ہوں لیکن میری کہانیاں عام طور پر سچی ہوتی ہیں۔ میں اپنی کہانیوں میں اپنا ایڈونچر شامل کر دیتا ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ میں اپنے ایڈونچر کی کہانیاں لکھتا ہوں۔ جیسے اس ایڈونچر کی کہانی ہونے والی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ اگر میں لکھ سکا تو ایک اچھی کہانی تخلیق ہو جائے گی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک ڈاکو اندر آ گیا۔

''چلو بابا، تم کو سردار نے بلایا ہے۔''

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ اسی میدان میں جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ ایک بڑی سی چٹائی بچھائی گئی تھی۔ یہ ان کا دسترخوان تھا۔ بہت سے ڈاکو بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں جانو بھی تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے آواز لگائی۔ ''آؤ بابا۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔''

میں اسی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے میں جنگل میں ہونے والی کسی کی شادی کی تقریب میں آیا ہوں۔

ذرا سی دیر میں کھانا لگا دیا گیا۔ روٹیاں تھیں اور گوشت کا سالن تھا۔ ''شروع کرو بابا۔ ایسا سالن تم نے زندگی میں نہیں کھایا ہوگا۔''

واقعی وہ سالن ایسا ہی تھا کہ میں نے زندگی میں نہیں کھایا ہوگا۔ جس نے بھی بنایا تھا اس کے ہاتھ میں بلا کا ذائقہ تھا۔

''بہت مزے دار ہے۔'' میں نے تعریف کی۔ ''جس نے بھی بنایا ہے کمال کر دیا ہے۔''

''ہمارا ساتھی ہے بھیرو۔ وہ ایسا ہی بناتا ہے۔'' پھر اس نے آواز دی۔ ''بھیرو۔ اوئے بھیرو۔''

جس طرف کھانا بنایا جا رہا تھا۔ اس طرف سے ایک آدمی نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ وہی بھیرو تھا۔ ''جی سردار۔''

''بابا۔ یہ ہمارا رائٹر مہمان تمہارے کھانے کی تعریف کر رہا ہے۔''

''مہربانی سائیں۔'' اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

بھیرو چلا گیا۔ اس دوران جانو بہت غور سے میری طرف دیکھتا رہا تھا۔ ''بابا۔ یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''یہ ایک بڑا زخم لگا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''گولی رگڑ کھاتی ہوئی گزر گئی تھی۔ زندگی تھی کہ بچ گیا... پھر اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرانی پڑی جس سے میرا چہرہ ہی بدل کر رہ

گیا۔"

"واہ بابا۔ واہ۔ یعنی تمہارے ساتھ بھی گولی وولی کا کھیل ہوتا رہتا ہے۔" اس نے کہا۔

"نہیں، ہمارے ساتھ کہاں سے ہوگا۔ میں اس دن ایک بینک میں گیا تھا کہ وہاں لوٹنے والے گھس آئے۔ کسی نے مزاحمت کی تو انہوں نے گولی چلادی۔ میں ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ اس کے باوجود گولی میرے چہرے کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔"

"ٹھیک کہتے ہو بابا۔ یہ گولی یہ نہیں دیکھتی کہ سامنے والا رائیٹر ہے یا کون ہے۔" اس نے کہا... اور خود ہی اپنے اس جملے پر قہقہہ لگانے لگا۔

آس پاس بیٹھے ہوئے ڈاکو بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ جنگل کی خاموشی میں ان ڈاکوؤں کے قہقہے ایسے لگ رہے تھے جیسے بہت سے بھوت مل کر ہنس رہے ہوں۔

کھانا ختم ہوا تو جانو نے کہا۔ "ہاں بابا۔ اب کیا پروگرام ہے۔ کہانی شروع کروں یا آج رات آرام کرو گے؟"

"جانو۔ میں یہاں کام سے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یعنی تمہاری کہانی لکھنے۔ آرام ورام کہاں کروں گا۔"

"بابا۔ تم تو شیر دل بندہ ہے۔" جانو نے کہا۔ "ورنہ دوسرے تو ہمت ہار جاتے ہیں۔"

"تمہاری طرف سے اطمینان ہے نا اسی لیے اتنی ہمت ہوگئی ہے۔" میں نے کہا۔

"بابا۔ ایک بات بتاؤ۔ تمہارے پاس قلم کاغذ تو ہوگا نا۔" اس نے پوچھا۔

"تم اس کی فکر مت کرو۔ میں تم سے جو بھی سنوں گا۔ یاد رکھوں گا۔ میرا ذہن کمپیوٹر کی طرح ہے۔ کوئی بات کبھی نہیں بھولتا۔ مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ تم ایک بار نیم کے درخت پر چڑھ گئے تھے اور اپنے ٹیچر کو دھمکی دے رہے تھے کہ اس نے اگر تمہارے نمبر نہیں بڑھائے تو تم کود جاؤ گے۔" میں نے کہا۔

جانو یہ سن کر سکتے میں رہ گیا تھا۔ ہوش میں آیا تو اس نے میرا گریبان تھام لیا۔ "بتاؤ۔ کون ہو تم؟ تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ بتاؤ۔"

"اس لیے کہ اس وقت میں بھی اسی درخت کے نیچے کھڑا تھا۔" میں نے بتایا۔

"تم؟ خدا کے لیے بتاؤ بابا۔ کون ہو تم؟"

"تمہارا دوست آفتاب۔" میں نے بتایا۔

"آفتاب؟" وہ حیران رہ گیا تھا۔ "تم آفتاب کیسے ہو

سید محمد مہدی رئیس امروہوی کا پورا گھرانا چشم بددور شعر و سخن اور صحافت پر مامور چار دانگ عالم میں مشہور رہا۔ سید محمد تقی جنگ کے مدیر، رئیس امروہوی جنگ کے قطعہ نگار، سید محمد عباس عالمی ڈائجسٹ، انشاء کے منتظم اشاعت، سید محمد اصغر جون ایلیا سسپنس ڈائجسٹ کے کالم نگار، شاعر، چار مجموعوں کی شہرت۔

رئیس امروہوی نے چالیس برس تک جنگ میں روزانہ قطعہ لکھا۔ "الف" سے شعری مجموعہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ "بحضرتِ یزداں"، "پس غبار"، "ملبوسِ بہار"، "انجم السحر"، "قطعات رئیس امروہوی"، "ضمیر خانہ"، "حکایات نے" (غزلیں) تک کا سفر، شعری سرمایہ دے گیا۔ جنگ میں جنسیات و نفسیات پر مبنی کالموں کے مجموعے "عالم ارواح"، "عجائب نفس"، "مظاہر نفس"، "ٹیلی پیتھی"، "ہپناٹزم" کون سا موضوع ان کی گرفت میں آکے کتاب نہ بنا؟ اچھے مرزا ڈائجسٹوں میں قسط وار پھر کتاب "المیہ مشرقی پاکستان" (دو حصے) لکھ گئے۔ صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے حامل رئیس امروہوی 12 ستمبر 1914ء امروہہ ضلع مراد آباد میں علامہ سید شفیق حسن ایلیا کے گھر پیدا ہوئے اور 22 ستمبر 1988ء کو حادثے میں وفات پا گئے۔ سخی حسن قبرستان میں تمام برادران و خویش ایک ہی احاطے میں مدفون ہیں۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں، از سید محمد قاسم

سہیل واسطی

(1922ء... 1987ء)

اردو کے شاعر سہیل واسطی کا اصل نام سید محمد عابد امروہوی تھا۔ ضلع مراد آباد امروہہ میں 1922ء میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے وقت نوعمری میں کراچی چلے آئے۔ سہیل واسطی کے نام سے مشہور اردو کے شاعر و ادیب کا انتقال 10 جولائی 1987ء کو کراچی میں ہوا۔ یہیں سپرد خاک کیے گئے۔

مرسلہ: نعمان اشرف، کراچی

سکتے ہو؟ وہ تو بہت خوبصورت تھا۔ بالکل آفتاب کی طرح۔''

''جانو۔ میں نے بتایا نا کہ میرا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ پلاسٹک سرجری ہوئی ہے میری۔ کیا تم میری آواز سے بھی نہیں پہچانے۔ کیا مجھے اسکول کی کیفٹین کی مالکہ کو بلانا پڑے گا جو ہم دونوں کو پسند آئی تھی۔ جو ہمیں روز سموسے کھلایا کرتی تھی۔''

جانو نے مجھ سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ خود میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔

''بس کر یار۔'' میں نے اس کے شانے پہ تھپکی دی۔ ''ہوش کر ورنہ تیرے بندے کیا کہیں گے کہ سردار بچوں کی طرح رو رہا ہے۔''

''ارے۔ ان کو کیا معلوم کہ سردار کیوں رو رہا ہے۔ سردار کا بچپن لوٹ آیا ہے۔ میرے دوست۔'' اس نے میرا ہاتھ چومنا شروع کر دیا۔

بہت دیر بعد وہ قابو میں آیا تھا۔ اس نے مجھے بے قابو کر دیا تھا۔ اسکول کے زمانے میں وہی میرا دوست تھا۔ وہ شروع ہی سے بے باک اور نڈر تھا۔ میری خاطر وہ لڑکوں سے بھڑ جاتا۔ میری حفاظت کیا کرتا۔ کیوں کہ میں بہت خوبصورت تھا۔ اسکول کا ہر لڑکا یہ چاہتا تھا کہ میں اس سے دوستی کر لوں لیکن جانو کسی کو میرے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔

''میرے دوست۔ تم نے یہ کون سی راہ اختیار کر لی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''یہ کانٹوں بھرے راستے ہیں۔ جن پر تم چل رہے ہو۔''

''ہاں۔ میں بھی یہ جانتا ہوں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن اس راہ پر مجھے لے جایا گیا ہے۔ تنگ آ کر میں نے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ اور اب تو اس راستے پر اتنی دور نکل آیا ہوں کہ واپسی ناممکن ہے۔''

''تیرے گھر والوں کا کیا حال ہے۔ چاچا اور چاچی کے بارے میں بتا۔''

''تو تو شہر چلا گیا تھا اسی لیے تجھے حالات نہیں معلوم۔ میرے گھر میں تھا کون۔ ماں باپ کے علاوہ ایک میں ایک میرا چھوٹا بھائی۔ جو نیم دیوانہ تھا۔ اس کا ذہن کام نہیں کرتا تھا۔ وہ دن بھر کھیتوں میں بھٹکتا رہتا۔ الٹی سیدھی حرکتیں کیا کرتا پھر بھی اسے مار دیا گیا۔''

''مار دیا گیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں یار۔ وڈیرے کے بیٹوں نے مار دیا۔'' اس نے بتایا۔ ''ان کے پاس دو خونخوار کتے تھے۔ میرا پاگل بھائی ایک دن بھٹکتا ہوا ان کی حویلی کی طرف جا نکلا۔ انہوں نے اس بے چارے پر تفریح میں کتے چھوڑ دیے۔''

''ہاں یار۔ ان کی تفریح ایسی ہی ہوتی ہے۔ کمزوروں کی چیخیں ان کے لیے نشے کا کام کرتی ہیں۔ ان کو مزہ آتا ہے۔ وہ ہنستے رہتے ہیں۔ پہلے بھی دو تین بندے اسی طرح ان کی تفریح کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ لاکھن کا کیس تو یاد ہو گا تمہیں؟''

''ہاں یاد ہے۔ اس پر گھوڑا چڑھا دیا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ حرکت تو خود وڈیرے نے کی تھی۔''

''ہاں۔ سب ایک طرح کے ظالم ہیں۔ چاہے وڈیرہ ہو یا اس کے بیٹے ہوں۔ سب کمزوروں کو مار کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ لاکھن کے گھر والوں کو کچھ پیسے دے دیے گئے تھے۔ بس کہانی ختم۔ بے چارہ لاکھن اپنی جان سے گیا۔ ویسا ہی میرے پاگل بھائی کے ساتھ ہوا۔ مر گیا وہ۔ اور جب میرے ماں باپ روتے پیٹتے ہوئے وڈیرے کے پاس پہنچے۔ تو یہ کہا گیا کہ بچے تو اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ خود اس پاگل کو اس حویلی کی طرف نہیں آنا تھا۔ ماں باپ کو کچھ پیسے دے دیے گئے۔ وہ تو چپ ہو گئے لیکن میں چپ ہونے والا نہیں تھا۔

مجھے تو بدلہ لینا تھا۔ مجھے اپنے بھائی سے بہت محبت تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں ان دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ ایک دن وہ دونوں مجھے اپنے گھوڑوں پر سوار کھیتوں کے درمیان جاتے ہوئے مل گئے۔ میں ان کو دیکھ کر ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا... اور وہاں سے تاک کر پتھروں سے ان کو نشانہ بنا لیا۔ تو تو جانتا ہے کہ بچپن ہی سے میرا نشانہ کیسا رہا ہے۔''

''ہاں جانتا ہوں تو اونچے اونچے درختوں کے پھل پتھر مار کر گرا لیا کرتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''بس یار دونوں کے سر پھٹ گئے۔ وہ گھوڑوں سے گرے۔ جبکہ ان کے گھوڑے بھاگ لیے تھے۔ ان کے گرتے ہی میں ان پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے انہیں اتنا مارا اتنا مارا کہ بے ہوش کر دیا۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ ماں باپ روتے رہ گئے لیکن وڈیرے کے سامنے کچھ نہ چلی۔ عدالت نے مجھے خطرناک قرار دے کر پانچ سال کے لیے جیل بھیج دیا۔''

''ہاں۔ یہ تو مجھے معلوم ہو گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''بس یار اس کے بعد کیا ہونا تھا۔ جیل میں ماکھو مل

گیا۔ بدنام ڈکیت۔ اور میں اس کے ساتھ شامل ہوگیا... آج اُس مقام پر ہوں جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''واپسی کا راستہ ہے جانو۔ تیری معافی ہوسکتی ہے۔ تیری سزا بہت کم ہوسکتی ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ میں کرواؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''تو۔'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''تو کیسے کروائے گا؟''

''جانو۔ تجھے معلوم ہے نا کہ اس علاقے کے ایس پی کا ٹرانسفر ہوگیا ہے۔''

''ہاں۔ ایسی خبریں ہمیں نہیں معلوم ہوں گی تو کس کو ہوں گی؟''

''اور یہ بھی سن لیا ہوگا کہ اس علاقے میں نیا ایس پی آنے والا ہے۔''

''ہاں۔ یہ خبر بھی ملی ہے لیکن تیرا کیا واسطہ؟''

''واسطہ یہ ہے جانو کہ وہ نیا ایس پی میں ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کیا کہہ رہا ہے یار؟''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ نیا ایس پی میں ہی ہوں۔ شہر جا کر میں پولیس میں چلا گیا تھا۔ ترقی کرتا ہوا ایس پی تک پہنچ گیا... پھر حکومت کی طرف سے ایک ٹاسک دیا گیا کہ میں جانو گروہ کا پتا چلا کر اسے گرفتار کروادوں۔ میں جانو گروہ کی کہانیاں سن چکا تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ تم ہوگے۔ میں پلاننگ بنا کر بس میں عام مسافر کی طرح بیٹھ گیا۔ اتفاق سے تم اور تمہارا گروہ آگیا۔ میں نے کہانی لکھنے کی بات کی' اور میں نے بتایا کہ میں کہانیاں لکھتا ہوں۔''

''تو کیا تم کہانیاں نہیں لکھتے؟''

''لکھتا ہوں' لیکن وہ میرا شوق ہے اور پولیس کی نوکری میرا پیشہ بھی ہے، میرا فرض بھی ہے۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے آئے اور کنفرم ہوگیا کہ وہ جانو وہی میرے بچپن کا یار جانو ہے۔ اب میں بہت بڑی الجھن میں ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟''

''دیکھو دوست تم وہی کرو... جو تمہارا فرض بنتا ہے۔'' جانو نے کہا۔ ''میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔''

''یعنی تمہیں گرفتار کرلوں؟''

''نہیں یہ بھی نہیں ہوسکتا۔'' جانو نے کہا۔ ''میرے گروہ میں بہت سے لوگ شامل ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا سردار ایک شیر دل بندہ ہے۔ وہ اتنی آسانی سے گرفتار نہیں ہوسکتا۔''

''اس لیے تم فرار ہوجاؤ۔''

''جانو۔ یہ کیسا مشورہ دے رہے ہو؟''

''میں تمہارے اور اپنے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں رات کو تمہیں موقع دے دوں گا۔ تم نکل جانا۔''

''تمہیں گرفتار کیے بغیر۔''

''ہاں۔ لیکن میں اپنے یار کو خالی ہاتھ تو نہیں جانے دوں گا۔ تم دو دنوں کے بعد مجھے گرفتار کرلینا۔ دو دن کے بعد بابا نوردین کا عرس ہوتا ہے۔ میں اس میں ضرور جاتا ہوں۔ بھیس بدل کر۔ میرے ساتھ میرے کئی ساتھی بھی ہوتے ہیں۔ اس بار میں ہری پگڑی باندھ کر جاؤں گا۔ میرے گلے میں ایک تعویذ بھی ہوگا... جو باہر ہی جھول رہا ہوگا' بس تم مجھے وہاں گرفتار کرسکتے ہو۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرا دوست مجھے کیسا مشورہ دے رہا تھا۔ میں اگر اس کو اس طرح گرفتار کرلیتا تو میری ساکھ بن جاتی۔ ویسے بھی میری ساکھ بنی ہوئی تھی لیکن جانو کی گرفتاری ایک بڑا کارنامہ ہوتی۔

''ٹھیک ہے جانو۔'' میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گا۔'' میں نے کہا' اور اسی رات میں جانو کے اڈے سے فرار ہوگیا۔ پورا موقع جانو نے فراہم کیا تھا۔ اس نے اپنی دوستی کی لاج رکھی تھی۔

اور اب مجھے بھی اپنی دوستی کی لاج رکھنی تھی۔

اسے گرفتار نہیں کرنا تھا۔ گرفتاری اس کی توہین تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے جرائم ایسے نہیں تھے کہ اسے عدالت معاف کردیتی۔ جیل بھیج دیتی... اور جیل کی ذلت برداشت کرنا اس جیسے کے لیے۔ موت کے برابر تھا۔

اسی لیے جانو میرے دوست میں نے سوچ لیا ہے کہ میں تمہیں گرفتار نہیں کروں گا۔ بلکہ گولی مار کر دنیا بھر کے عذاب سے نجات دلوادوں گا۔ مجھے معاف کردینا دوست۔ معاف کردینا۔

تم ہر جگہ میرے محافظ رہے تھے۔ اس بار میں تمہاری آن اور ساکھ کی حفاظت کررہا ہوں۔

++

انعام

محترم السلام علیکم !
عرصہ بعد ایک سچ بیانی ارسال کررہا ہوں۔ اسے قلمبند کیے عرصہ گزر گیا ہے لیکن کہیں بھیجنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ ایک ہفتے قبل جب یہ خبر ملی کہ ان صاحب کا انتقال ہو گیا ہے تو سوچا کہ سرگزشت میں بھیج دوں تاکہ لوگ سبق حاصل کریں۔
خورشید زمان
(پشاور)

وہ ایک طوفانی رات تھی۔
بہت تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ سردی بھی اپنی انتہا پر تھی۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ایک دلچسپ کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ میری عادت رہی ہے کہ جب موسم کے تیور اتنے بگڑے ہوں اور سردی شدید ہو تو اس وقت مجھے اپنے بستر پر نیم دراز ہو کر کتابیں پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے، ایک سکون سا ملتا ہے۔
میں نے اس سلسلے میں بھی اپنے آپ کو ٹرینڈ کر رکھا ہے۔ فلسفہ یا کوئی خشک موضوع پڑھنا ہو تو دوپہر کے وقت پڑھتا ہوں اور جب ایسی رات ہو، ایسا ماحول ہو تو ایڈونچر پڑھتا ہوں، یا ایسا کوئی ناول جس میں اسی قسم کی کسی رات کا ذکر ہو۔
میں نے ابھی کتاب کے چار پانچ ہی صفحات پڑھے ہوں گے کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔ کئی دنوں سے دروازے کی گھنٹی خراب تھی۔ کئی بار سوچا کہ اس کو ٹھیک کروالوں لیکن سستی کی وجہ سے یا مصروفیت کی وجہ سے ٹھیک نہیں کروا سکا تھا۔ ویسے بھی میرے پاس کم ہی لوگ آیا کرتے تھے اور جو آتے وہ کم از کم رات کے وقت نہیں آتے تھے۔
اسی لیے آنے والا دستک دے رہا تھا۔ بہرحال اٹھنا ہی پڑا۔ جا کر دروازہ کھولا تو تیز ہوا کا ایک جھونکا پوری شدت کے ساتھ اندر در آیا۔ ایک آدمی دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس کے جسم پر سردی سے بچاؤ کا مناسب لباس بھی نہیں تھا۔
''میں۔ میں کچھ دیر کے لیے پناہ چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ یہ لیں ایڈونچر شروع ہو گیا تھا۔
میرے سامنے دو آپشن تھے یا تو میں صاف منع کر دوں یا پھر اسے اندر بلالوں۔ اتنی دیر میں بارش بھی شروع ہو چکی تھی اور ویسے بھی وہ ایک مہذب انسان ہی دکھائی دے رہا تھا اسی لیے میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔
اتنی دیر میں وہ بارش سے بھیگ چکا تھا۔ اندر آ کر اس نے ایک جھرجھری سی لی۔
''بیٹھ جاؤ'' میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم بھیگے ہوئے ہو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔''
اس نے کچھ نہیں کہا۔ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
وہ ایک اچھی عمر کا آدمی تھا۔ شیو بڑھی ہوئی لیکن بڑھی ہوئی شیو یہ نہیں بتا رہی تھی کہ وہ کوئی لاابالی یا آوارہ گرد قسم کا آدمی ہے بلکہ یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ باقاعدہ شیو کرنے کا عادی ہے اور فی الحال کسی وجہ سے اس نے شیو نہیں بنائی ہے۔ اس کا لباس سلیقے کا تھا۔ یعنی وہ ایسا آدمی تھا جس کے ساتھ ایسی رات میں گپ شپ کی جا سکتی تھی۔
میں نے اسے چائے دینے سے پہلے ایک تولیا لا کر دے دیا۔ ''یہ لو۔ اس سے اپنا سر پونچھ لو۔ بھیگ گئے ہو۔ اور سردی بھی ہو رہی ہے۔''

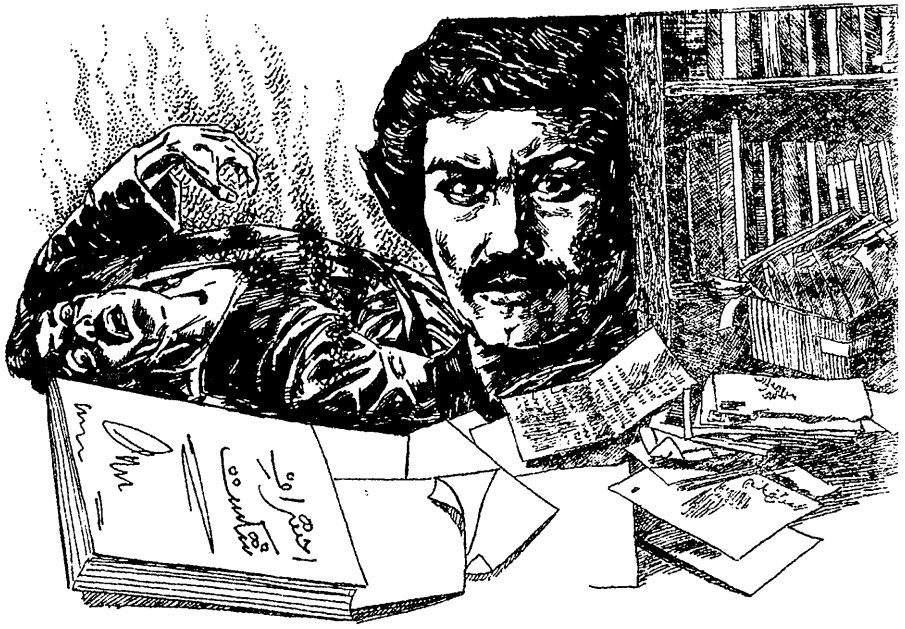

اس نے شکریہ ادا کر کے تولیا لے لیا۔ میں اسے چھوڑ کر کچن کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب چائے لے کر واپس آیا تو وہ آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی حالت بہت بہتر معلوم ہو رہی تھی۔

''آپ کا شکریہ۔'' اس نے چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت واقعی اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔''

''میں خود بھی اپنے لیے چائے بنانے کی سوچ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا ہوا تم آ گئے۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔''

چائے پینے کے دوران وہ خاموش ہی رہا تھا۔ میں نے بھی اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔

چائے ختم کر لینے کے بعد اس نے کہا۔ ''میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اس سردی اور ایسی رات میں میں ٹھٹھر کر مر جاؤں گا لیکن آپ کی مہربانی کہ آپ نے مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔''

''نہیں یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس علاقے کی طرف کیسے آنا ہوا... ورنہ عام طور پر اس طرف کوئی نہیں آتا۔''

میں نے یہ ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ ایک ایسا علاقہ تھا جو ابھی آباد نہیں ہوا تھا۔ بہت کم مکانات بنے ہوئے تھے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے۔ میرا سب سے قریبی پڑوسی بھی بہت دور تھا۔

''میں کسی کی تلاش میں آیا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کس کی تلاش میں۔ تم مجھے بتا سکو تو شاید میں کسی کام آ جاؤں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں نہیں۔ اس کا نام منور ہے۔ منور رانا۔'' اس نے بتایا۔

میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ جیسے وہ کچھ یاد بھی کرتا جا رہا ہو۔ ''میں کئی برسوں کے بعد واپس آیا ہوں۔ باہر چلا گیا تھا۔ یہاں آ کر جب اس کا پتا کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس علاقے میں رہنے لگا ہے۔ میں کئی دنوں پہلے دن کے وقت اس علاقے میں اس کو تلاش کرتا ہوا آیا تھا۔ یہاں معلوم ہوا کہ یہ ایک غیر آباد علاقہ ہے۔ گنتی کے چند مکانات آباد ہیں اور ان میں سے کسی میں منور رانا نہیں رہتا۔''

''تم گھوم پھر کر دیکھ لو۔'' میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے وہ مل ہی جائے۔''

''نہیں وہ یہاں نہیں ہے۔ یہاں صرف تین ہی مکان

آباد ہیں۔ ایک کسی سراج کا ہے، دوسرا کسی بٹ کا ہے اور تیسرا تمہارا مکان ہے۔''

''کیا تم میرا نام جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ تم خورشید زمان ہو۔'' اس نے بتایا۔

''تمہارے مکان کے گیٹ پر تمہارے نام کی تختی لگی ہے۔ تم کسی اخبار میں کالم وغیرہ لکھتے ہو۔''

''کمال ہے۔ یہ بتاؤ۔ اتنی معلومات تم نے کیسے حاصل کرلیں؟''

''گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''اس علاقے کے چوکیدار نے ساری تفصیل بتائی ہے۔''

''اور تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام آصف ہے۔ آصف حسنین۔'' اس نے بتایا۔

''ایک بات بتاؤ۔ تمہیں منور رانا کی کیوں تلاش ہے؟ میں نے پوچھا۔ ''معاف کرنا یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے معلوم کرنے کا حق تو نہیں ہے پھر بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرے دوست۔ تم نے میرے ساتھ بھلائی کی ہے اسی لیے یہ راز تمہیں بتا رہا ہوں۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس شخص نے مجھے برباد کردیا ہے۔ مجھ سے میری محبت چھین لی تھی۔ شادی کرلی تھی اس سے جس سے میں نے محبت کی تھی۔ جس کو میں نے اپنی زندگی کے لیے پسند کیا تھا۔ جس وقت شادی ہو رہی تھی۔ میں ملک سے باہر تھا۔ وہیں پتا چلا کہ لڑکی کے گھر والوں نے زبردستی اس کی شادی منور رانا سے کردی ہے۔''

''کیا منور رانا کو معلوم تھا کہ تم جس کو پسند کرتے ہو۔ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔''

''ہاں، معلوم تھا اسے۔ غزالہ خود اس کے پاس گئی تھی۔ اس نے رو رو کر اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اس سے شادی نہ کرے لیکن اس کے باوجود اس نے شادی کرلی۔ غزالہ کے والدین پر اس شخص کے کچھ احسانات تھے۔ اس کا بدلہ اس نے غزالہ سے شادی کرکے لیا تھا۔''

''کیا غزالہ اس شخص سے شادی کے بعد خوش رہی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ میں ملک سے باہر تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں کہیں کا نہیں رہا تھا۔ خورشید صاحب دکھ اس بات کا ہے کہ غزالہ کی شادی تو ہونی تھی۔ سوال یہ ہے کہ جب منور کو معلوم ہوگیا تھا کہ غزالہ کسی اور کی محبت ہے تو پھر اس نے جانتے ہوئے شادی کیوں کی۔ اس شادی سے انکار کیوں نہیں کردیا۔ یہ بھی تو ممکن ہوسکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔''

''دیکھو آصف۔ تمہاری کہانی یہاں تک آگئی ہے کہ تم اس شخص کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہو لیکن تم نے ایک بار بھی غزالہ کا نام نہیں لیا کہ تمہیں اس کی بھی تلاش ہے۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ وہ مرچکی ہے۔ یہ مجھے باہر ہی پتا چل گیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس شخص نے اسے اتنے دکھ دیئے ہوں گے کہ وہ مرگئی۔''

''خیر یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ جب وہ تمہیں مل جائے تو پھر کیا کروگے؟''

''میں اسے'' اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ''کچھ نہیں۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''اب کیا کرسکتا ہوں۔ اب تو بے چاری کی کہانی ہی ختم ہوگئی۔ ہاں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ میں اس سے مل کر اس سے یہ پوچھوں کہ میری غزالہ نے مجھ سے بے وفائی تو نہیں کی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے یاد تو رکھا تھا نا اس نے، یا بالکل بھول گئی تھی۔ پتا نہیں۔ میں کیا چاہتا ہوں؟ وہ پھر کشمکش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

میں کسی حد تک اس کی اندرونی حالت سمجھ رہا تھا۔

وہ نفسیاتی مریض بن گیا تھا۔ یہ اس کی محبت کی انتہا تھی۔ اس نے نہ جانے کتنے سال باہر گزارے تھے پھر بھی اس لڑکی کی یاد کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا جس نے اس کو چھوڑ کر کسی اور سے شادی کرلی تھی۔

غزالہ نے یہ شادی زبردستی نہیں کی تھی بلکہ اپنی خوشی سے کی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی اور یہ میں اس لیے جانتا ہوں کہ منور رانا میں ہی ہوں۔ خورشید زماں میرا فلمی نام ہے۔ کیوں کہ میں ایک کالم نگار تھا اور ہوں۔ میں ایک مشہور آدمی تھا۔ میرے پاس اپنا گھر تھا۔ گاڑی تھی۔ سب کچھ تھا میرے پاس۔ میں یہ جانتا تھا کہ میرے والدین جس لڑکی سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں وہ آصف نام کے نوجوان سے محبت کرتی ہے۔

میں نے شادی سے پہلے ایک دن غزالہ کو فون کیا تھا۔

میں ایک دوسرے مزاج کا انسان ہوں۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی سے مل کر صورتِ حال واضح کرلوں۔ ایسا نہ ہو کہ میں دو دلوں کو جدا کرنے کا سبب بن جاؤں۔

وہ میرے بلانے پر ملنے آگئی۔ میں نے ایک ہوٹل میں ملنے کا اہتمام کیا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''غزالہ جانتی ہو تمہیں یہاں بلانے کا مقصد کیا ہے؟''

''جہاں تک میں سمجھ رہی ہوں۔ آپ مجھ سے مل کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔ آج کل یہ عام سی بات ہوگئی ہے۔ شادی سے پہلے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے ملاقات کر لیتے ہیں۔''

''یہ تو ہے لیکن کچھ معلوم بھی کرنا تھا۔''

''ہاں کہیں۔''

''پہلے یہ بتاؤ کہ تم میرے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''بہت کچھ۔ آپ ایک کامیاب انسان ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ایک مشہور انسان ہیں، معاشرے میں آپ کی عزت ہے اور کیا چاہیے؟''

''میں نے یہ سنا ہے کہ تم کسی لڑکے سے محبت کرتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ میرا یہ سوال سن کر خاموش ہوگئی۔ اس نے گردن جھکا لی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اس کے بارے میں جو سنا تھا وہ ٹھیک ہی تھا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھیں منور صاحب۔ اگر آپ کا اشارہ آصف کی طرف ہے تو مجھے اقرار کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے کیوں کہ مجھے اندازہ ہے کہ آپ کم از کم ان لوگوں میں سے نہیں ہوں گے ...جو خود تو چاہے کچھ بھی کرتے پھریں لیکن بیوی ایسی چاہتے ہیں جو آسمان سے اتر کر سیدھی ان کے پاس آگئی ہو۔''

''تمہارا اندازہ صحیح ہے، میں ایسے لوگوں میں نہیں ہوں۔ میں نے ہر ایک کو انسان کے تناظر میں دیکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہر ایک کے ساتھ اس قسم کے واقعات ہوا کرتے ہیں۔''

''اس کا نام آصف تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ ملک سے باہر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی ہم پر اتنی مہربان بھی ہو۔ نہیں ہوسکی۔ کوئی بات نہیں۔ بے وفائی اسی وقت ہوتی ہے جب کسی ایک کے ہوتے ہوئے کسی اور کو بھی

سید محمد جرار تقوی

(1931ء...1991ء)

پاکستان نیوی میں بحیثیت اسٹور کلرک ملازمت کا آغاز کرکے انسپکٹر آف اسٹور کے عہدے تک ترقی پاکر 1979ء میں ریٹائر ہونے والے سید محمد جرار تقوی 1931ء میں محلہ دانشمند امروہہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید مطیع الحسنین تقوی تھا۔ امروہہ کے سید اشرف دانشمند کے حسب و نسب سے تعلق رکھنے والے سید محمد جرار تقوی کی ابتدائی تعلیم کا مرحلہ امروہہ کے مختلف مدارس میں مختلف اساتذہ اور علماء کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ 1948ء میں پاکستان آئے اور انٹر کامرس کا امتحان پاس کرنے کے بعد نیوی میں ملازم ہوگئے ریٹائرمنٹ کے بعد کئی ایک پرائیویٹ اداروں سے وابستہ رہ کر معاشی جدوجہد میں مصروف رہے۔ جب سے شعر کہنے شروع کیے حمد و نعت، منقبت و سلام اور مذہبی موضوعات پر قطعات تک ہی محدود رہے۔ 22 فروری 1991ء کو کراچی میں راہی ملک عدم ہوئے۔

امیدوں پہ رکھا جائے۔ دوسری طرف بات یہ ہے کہ میرے والدین کسی بات پر میری شادی آصف سے نہیں کرنا چاہتے۔ انہوں نے آپ کو پسند کرلیا ہے۔ میرے لیے محبت کی اہمیت تو ہے لیکن اپنے ماں باپ کی بھی اہمیت ہے اسی لیے میں آپ سے ملنے آگئی ہوں۔''

غزالہ نے بہت اچھی باتیں کی تھیں۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوگی۔ اس نے شادی کے بعد یہ ثابت بھی کردیا تھا۔ وہ وفا پرست تھی، خدمت گزار تھی۔

وہ ساری خوبیاں تھیں جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ اگر اچھی بیوی ہو تو گھر جنت بن جاتا ہے۔ غزالہ نے میرے گھر کو جنت بنادیا تھا۔ اس نے شادی کے بعد کبھی آصف کا نام نہیں لیا۔ اس نے مکمل طور پر خود کو میرے لیے وقف کردیا تھا۔

لیکن اب میں یہ سب اس پاگل انسان کو بتا نہیں سکتا تھا۔ اس نے تو غزالہ کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ اس کو وفا کا پیکر سمجھنے لگا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کے شوہر

سے انتقام لینے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ جس کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ وہ اس سے کبھی پیار نہیں کرتی تھی۔ اس کو تجھ سے زیادہ آرام دہ زندگی کا خیال تھا۔ دولت کی چاہت تھی۔ تو ٹوٹ کر رہ جاتا۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ اب ان باتوں کا فائدہ ہی کیا تھا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ غزالہ نے کبھی اسے یاد نہیں کیا تھا بلکہ کبھی اس کا نام بھی آجاتا تو مذاق اڑایا کرتی تھی۔ طنز کرتی تھی۔ نہ جانے یہ سب سن کر اس کا کیا حال ہوتا اسی لیے میں نے کچھ نہیں بتایا۔

اس پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔

بارش کا زور کچھ کم ہونے لگا تھا۔ آصف نے میری طرف دیکھا۔ ''ایک بات بتائیں۔ آپ کیا اکیلے رہتے ہیں۔ معاف کیجیے۔ میں ایک ذاتی سوال کر رہا ہوں۔''

''ہاں۔ اب تو اکیلا ہی ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اولاد کوئی نہیں ہے۔''

''اوہ۔ افسوس ہوا سن کر۔ کب انتقال ہوا؟

''تین سال ہوئے۔'' میں نے بتایا۔ ''میں نے اس کے بعد شادی نہیں کی۔ کیوں کہ وہ بہت اچھی تھی۔ اس کی یادیں ہی ہر وقت ساتھ رہتی ہیں اسی لیے کسی اور کی طرف دیکھنے کی اجازت ہی نہیں دیتیں۔''

مجھے غزالہ یاد آنے لگی تھی۔ آصف کے حوالے سے اس کا جو بھی رویہ ہو لیکن مجھ سے شادی کے بعد اس نے اپنی خدمت اور اپنی وفا پرستی سے میری دنیا ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''منور۔ میں چاہے جیسی بھی ہوں لیکن ہر حال میں ایک مشرقی عورت ہوں اور ہمارے یہاں شوہر سے وفا ایمان کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی آصف میری زندگی میں آیا ہو لیکن اب وہ میرے لیے مر چکا ہے۔ اب صرف آپ ہیں۔''

میں یہ سب اس آصف کو کیسے بتاتا وہ تو یہ سمجھ کر آیا ہوگا کہ اس کی محبوبہ نے مرتے وقت تک اس کی یاد کی شمع جلا کر رکھی ہوگی۔ اس کا نام لے لے کر اس کی یاد میں آنسو بہاتی ہوگی۔ میں کیسے بتاتا کہ بھائی میرے وہ محبوبہ تو تھی لیکن ایک بیوی بھی تھی اور وہ بھی مشرقی گھر کی ایک عورت، اسی لیے اس کے نزدیک شوہر ہی سب کچھ تھا۔

میں یہ سب اسے نہیں بتا سکتا تھا۔ اس کو دلاسا بھی نہیں دے سکتا تھا۔

بارش مکمل رک گئی تھی۔ آصف نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ بہت افسردہ ہو رہا تھا۔

اس وقت مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے اس سے کہا ''آصف۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ کیا تمہیں جان کر خوشی نہیں ہوگی؟''

''جی بتائیں؟''

''غزالہ بہت اچھی تھی۔ بہت اچھی، وہ وفا پرست تھی۔ باوقار تھی۔ اس میں اتنی خوبیاں تھیں۔ جو کسی میں بہت کم ہوا کرتی ہیں۔''

''جانتا ہوں میں۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''کیا تمہیں اس بات پر حیرت نہیں ہوئی کہ میں غزالہ کے بارے میں کیسے جانتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کوئی حیرت نہیں ہوئی، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ تم ہی منور رانا ہو۔'' اس نے کہا۔

''کیا'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کیسے جانتے ہو؟''

''منور۔ بات یہ ہے کہ تم اپنے قلمی نام سے مشہور ہو۔ تم نے اپنے گھر کے گیٹ پر اسی قلمی نام کی پلیٹ لگا رکھی ہے لیکن تم یہ بھول گئے کہ تمہارے اس ڈرائنگ روم کی میز پر غزالہ کی تصویر فریم کی ہوئی رکھی ہے۔'' اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں آکر دو باتوں کا پتا چل گیا۔ ایک بات تو یہ ہے کہ منور رانا ہی خورشید زماں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تم نے بھی اس سے محبت کی تھی۔ اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ اس کو ہمیشہ خوش رکھا۔ محبت کرنے والوں کو اپنے اطمینان کے لیے اس سے زیادہ اور کیا چاہیے کہ وہ جس سے محبت کر رہے ہوں اس کا کوئی اور بھی خیال رکھے۔ اسے خوش رکھے۔ محبت کرنے والے تو اس ماں کی طرح ہوتے ہیں جس کو اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ کوئی اور بھی ہے جو اس کے بچے سے پیار کر رہا ہے۔ اگر اس کا بچہ خوش ہے تو وہ خوش ہو جاتی ہے۔ اسے وہ لوگ اچھے لگتے ہیں جو اس کے بچے سے پیار کرتے ہوں اسی لیے میں بھی بہت خوش ہو کر واپس جا رہا ہوں کہ غزالہ تمہارے ساتھ بہت خوش رہی تھی۔ تم نے اس کا خیال رکھا تھا۔ شکریہ۔''

وہ چلا گیا۔ میں نے اسے ہمیشہ یاد کیا ہے اور مجھ پر محبت کی نئی جہتیں کھل گئی ہیں۔ محبت کرنے والوں کے لیے محبوبہ کا حصول ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ محبت ہی حصول ہے۔ محبت ہی انعام ہے۔

++

نفرت

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم !
میں کافی عرصے سے سوچ رہا ہوں کہ اس انوکھے کردار کے حالات قلم بند کروں لیکن لکھ نہیں پارہا تھا لیکن آج اس کے حالات کو میں نے لکھ ہی لیا، آپ خود پڑھیں کہ وہ کتنا عجیب شخص تھا۔
حسن جواد
(لاہور)

وہ ایک عجیب کردار تھا۔
اس سے میری ملاقات ایک پارک میں ہوئی تھی۔
میں شام کا وقت اسی پارک میں گزارا کرتا تھا۔ تنہا انسان تھا اسی لیے شام کے وقت پارک میں چلا جاتا اور کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھا کرتا۔
بچے مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کو اچھلتے کودتے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر ایک مہربان سی مسکراہٹ آجایا کرتی۔ کبھی کبھی دل کرتا کہ میں بھی ان کے ساتھ جا کر شامل

ہو جاؤں۔

ان کے ساتھ اچھلوں قہقہے لگاؤں۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کا ہر شخص بچوں سے پیار کرتا ہے۔

اس آدمی کے رویئے کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ ایک بچے کا بال اتفاق سے اس کی بینچ کے پاس آکر رک گیا۔ اس آدمی نے وہ بال اٹھا لیا۔ اتنے میں دو تین بچے اس کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ ''انکل بال دے دیں۔'' ایک بچے نے کہا۔

میرا خیال تھا کہ وہ آدمی بال اس بچے کو واپس کر دے گا۔ اس کے برعکس اس نے کسی بھیڑیئے کی طرح غرّانا شروع کر دیا۔ ''میں اس بال کو پھاڑ کر پھینک دوں گا۔'' اس نے کہا۔

''انکل پلیز۔'' ایک بچے نے استدعا کی۔

''اس بار تو واپس کر رہا ہوں لیکن آئندہ سے بال اس طرف آئی تو اچھا نہیں ہوگا۔'' اس نے بال اچھال کر ایک طرف پھینک دی۔

میں اس آدمی کے رویئے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بچوں سے ایسی بے زاری اور نفرت میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ مجھے اس آدمی پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ اس سے بات بھی کی جائے۔

میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچاس سے زیادہ ہی ہوگی۔ بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر ہلکی ہلکی جھریاں تھیں۔ اس کا لباس سلیقے کا تھا۔ اس کے سفید بال بھی سنورے ہوئے تھے۔ بہ ظاہر وہ ایک پڑھا لکھا انسان معلوم ہو رہا تھا لیکن کیا فائدہ ایسی تعلیم کا جو انسان کو کلچرڈ نہ بنا سکے۔

دو چار دنوں کے بعد میرا گذر اسی پارک کی طرف ہوا۔ وہ آدمی اسی بینچ پر بیٹھا تھا جہاں اس دن بیٹھا تھا۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف ڈالی اور اپنی مخصوص بینچ پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد کچھ بچے پھر کھلتے ہوئے اس طرف آگئے۔ وہ اس آدمی کو دیکھ کر کچھ بولتے ہوئے ہٹ گئے۔ جب کہ وہ شخص بڑبڑانے لگا تھا۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ میں نے صاف سن لی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''لعنت ہو۔ جس طرف جاؤ۔ بچے ہی بچے ہوتے ہیں۔ یہ کمبخت کہیں چین نہیں لینے دیتے۔''

اس کے نفرت بھرے انداز کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ کیسا آدمی تھا جس کو بچوں کا وجود تک گوارہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بچے اس بینچ کو خالی دیکھ کر واپس آگئے۔

وہ بچے اس آدمی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

''توبہ ہے کتنے خطرناک انکل ہیں۔'' ایک بچہ کہہ رہا تھا۔ ''میں تو ان سے بہت ڈرتا ہوں۔''

نہ جانے مجھے کیا سوجھی۔ میں نے اس بچے کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''بیٹے پریشان نہ ہو۔ میں ویسا انکل نہیں ہوں۔ میں دوسری قسم کا انکل ہوں۔ میں تو بچوں سے پیار کرتا ہوں۔''

اس کو جب اطمینان ہوا تو وہ دو اور بچوں کے لے کر میرے پاس آگیا۔ ''جی انکل۔'' اس نے پوچھا۔

''بیٹے ایک بات بتاؤ۔ کیا تم لوگ ان انکل کو جانتے ہو۔ جن کے پاس تمہاری بال چلی گئی تھی؟''

''جی انکل۔ جانتے ہیں۔ وہ یہاں آکر بیٹھا کرتے ہیں۔'' اس بچے نے کہا۔

''کیا تم سب ان سے ڈرتے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی ہاں انکل۔ وہ بہت خطرناک ہیں۔ ہم بچوں کو بہت ڈانٹتے ہیں۔ وہ ہم کو پسند نہیں کرتے۔''

یہ تو خود میں اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی چکا تھا کہ وہ شخص بچوں کے ساتھ کتنا بے رحم ہے۔

''انکل۔ کیا وہ آپ کے دوست ہیں؟'' ایک بچے نے پوچھا۔

''ارے نہیں ایسا آدمی میرا دوست کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ رہتے کہاں ہیں۔''

''میں جانتا ہوں انکل۔'' ایک بچے نے آواز لگائی۔ ''وہ میرے ہی محلے میں رہتے ہیں۔''

''اور تم کہاں رہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بلاک تیرہ میں رہتا ہوں انکل۔'' اس نے بتایا۔

وہ پارک کئی بلاکس کے درمیان تھا اسی لیے کئی بلاکس کے بچے کھیلنے کے لیے اسی پارک میں آجایا کرتے تھے۔

میں نے سوچا کہ اگر اس آدمی نے میرے سامنے کبھی

کسی بچے کے ساتھ سختی کی تو میں اس سے جھگڑا کرلوں گا۔ اس کو سمجھاؤں گا کہ بچے خدا کی سب سے بڑی نعمت ہیں۔ ان کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا سلوک کرنا چاہیے۔

اس کے بعد وہ کئی دنوں تک پارک میں نظر نہیں آیا۔ بچے اس کی غیر موجودگی میں اطمینان سے کھیلتے رہے۔ میں نے اس بچے سے پوچھا جو تیرہ نمبر بلاک میں رہتا تھا۔

''بیٹے وہ تمہارے خطرناک انکل کہاں ہیں؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کچھ سوچ کر اس سے کہا۔ ''کیا تم مجھے ان کا گھر دکھا سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں انکل۔ کھیل کے بعد چلتا ہوں۔''

کھیل ختم ہوا تو وہ بچہ مجھے اپنے ساتھ اپنے بلاک میں لے آیا۔ یہاں اوسط درجے کے گھر بنے ہوئے تھے۔ اس بچے نے ایک مکان کی طرف اشارہ کر دیا۔ ''وہ گھر ہے انکل۔''

اتنا بتا کر وہ اپنے راستے چلا گیا۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اگر وہ آدمی مل بھی گیا تو اس سے کیا کہوں گا۔ بہرحال میں نے دروازے پر دستک دے دی۔ دروازہ اسی نے کھولا تھا۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس نے مجھے کئی بار پارک میں دیکھا ہوگا اسی لیے حیران ہو رہا تھا۔

''میں آپ کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''میری خیریت؟''

''جی ہاں۔ کیوں کہ میں کئی ہفتوں سے پارک کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں میں آپ کو دیکھتا ہوں۔ لیکن چار پانچ دنوں سے دکھائی نہیں دیے تو مجھے خیال آیا کہ آپ بیمار نہ ہوں۔ بس یہی معلوم کرنے آ گیا تھا۔''

کچھ سوچ کر اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔ ''آئیں۔ اندر آجائیں۔''

اس نے مجھے ایک چھوٹے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اس ڈرائنگ روم کی شیشہ لگی الماری میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ یعنی وہ ایک باذوق انسان تھا۔ کتابوں سے دلچسپی رکھنے والے کسی شخص کا دل اتنا سخت بھی ہو سکتا ہے؟

''تشریف رکھیں۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ کو یہاں دیکھ کر حیرت ہوئی ہے۔ ورنہ کون کسی کا خیال رکھتا ہے؟''

''نہیں یہ تو انسانی فرض ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ آپ کا ادبی ذوق بھی تقریباً ویسا ہی ہے... جیسا میرا ہے۔ میں یہاں ایسی بہت سی کتابیں دیکھ رہا ہوں جو میرے مطالعے میں بھی رہتی ہیں۔''

''یہ جان کر خوشی ہوئی۔ کوئی تو اس علاقے میں ایسا ملا جو میرا ہم ذوق ہو۔'' اس نے کہا۔ ''رکیں۔ میں چائے لے کر آتا ہوں۔ پھر اطمینان سے بات ہوگی۔''

میرے منع کرنے کے باوجود وہ چائے لینے اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ناشتے کا سامان بھی لے آیا تھا۔ ''ارے یہ کیا۔ یہ سب کیوں لے آئے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس یوں ہی۔ چائے کے ساتھ ساتھ یہ سب بھی چلتا ہے۔ گپ شپ بھی ہوتی رہے گی۔ ہاں، میں نے ابھی تک آپ کا نام نہیں پوچھا۔'' اس نے کہا۔

''میرا نام فراز ہے۔ میں نے بتایا۔ حسن فراز۔''

''اور میرا نام نظیر ہے۔ نظیر حسین۔ ایک عرصے سے اسی محلے میں ہوں۔ اب تو بھول ہی گیا ہوں کہ میں یہاں کب آیا تھا۔''

''اور جناب کا مشغلہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''لیکچرار رہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''اردو ادب میں ماسٹر کیا تھا۔ ایک اچھی آفر ہوئی اور میں نے ایک کالج جوائن کر لیا۔ میری شادی ہوئی۔ دو بچے بھی ہوئے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ دونوں بہت ذہین اور پڑھنے میں بہت تیز۔ شاید یہ کہنا بہت عجیب ہوگا کہ میں نے دونوں سے بہت محبت کی، اور یہ کوئی خاص بات بھی نہیں ہے۔ ہر باپ اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے۔ میں نے بھی کی لیکن میری محبت دیوانگی کی حد تک تھی۔ اسی دوران بیوی کا انتقال ہو گیا، اور دونوں کی پرورش کی ذمے داری میرے سر آ گئی۔ میں نے ایک نوحہ بھی لکھا تھا۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو سنا دوں۔''

''ضرور سنائیں۔'' میں نے کہا۔ اس کے بارے میں میرا تاثر بدلتا جا رہا تھا۔

''آخر کو میری موت کا سامان کر گئے۔'' اس نے سنانا شروع کیا۔ ''آخر کو میری موت کا سامان کر گئے... تم کیا گئے کہ گھر کو ہی ویران کر گئے۔''

''تم نے کہا تھا کہ ساتھ نبھائیں گے عمر بھر..... وعدہ خلافی تم تو میری جان کر گئے۔''

''بچوں کی پرورش کا فرض مجھ کو سونپ کر..... تم تو میری نجات کا سامان کر گئے۔''

''واہ۔'' میں نے تعریف کی۔ ''بہت اچھا شعر ہے۔''

''بس بھائی۔ یہی ہوا۔ میں نے ماں بن کر دونوں کی پرورش کی۔ ہاں۔ ایک بات اور۔ اس دوران میں نے بچوں کو گھر پر پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ پیسوں کا مسئلہ نہیں تھا۔ صرف اپنے آپ کو بہلانے کا سلسلہ تھا۔ بیوی کی موت کے بعد تنہائی میری ساتھی ہو گئی تھی نا۔ اسی لیے۔''

''آپ نے دوسری شادی کا نہیں سوچا۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں اس سلسلے میں میرے خیالات کچھ اور ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ درست ہے کہ دوسری شادی کے نتیجے میں بیوی مل جاتی ہے لیکن وہ برسوں کی قربت تو نہیں ملے گی نا جس قربت کے ہم عادی ہو چکے ہوتے ہیں اسی لیے شادی نہیں کی۔ حالانکہ آفر بھی تھیں۔ بہر حال دونوں بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ میں بچوں کو پڑھاتا بھی رہا۔ اور ان بچوں سے بھی محبت ہو گئی۔ آپ نے شاید میرے بارے میں یہ تاثر لیا ہو گا کہ مجھے بچوں سے نفرت ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بچوں سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

میں بچوں سے اس کی محبت کا نمونہ دیکھ چکا تھا۔ دل تو چاہا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ میں نے آپ کی محبت دیکھ لی ہے لیکن خاموش ہی رہا۔

لیکن میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

مجھے اس سے باتوں میں دیر ہو گئی تھی اسی لیے میں اس سے اجازت لے کر اس کے گھر سے روانہ ہو گیا۔

اس کی کہانی کا سرا ابھی تک ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس نے یہ تو بتا دیا تھا کہ اس کے دو بچے تھے جن کی پرورش اس نے خود کی تھی۔ کیوں کہ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا لیکن پھر کیا ہوا تھا۔

یہ ابھی پتا نہیں چلا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ پارک میں دکھائی دے گیا۔

میں اس وقت ایک بینچ پہ بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔

وہ میرے پاس ہی آ کر بیٹھ گیا۔ سلام دعا کے بعد اس نے کہا۔ ''فراز صاحب۔ اس دن آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں بچوں سے کیوں دور رہنے لگا ہوں؟''

''جی جناب۔ میں نے اس لیے نہیں پوچھا کہ یہ آپ کا اپنا ایسا کوئی معاملہ ہو گا۔''

''نہیں جناب۔ یہ صرف میرا ہی نہیں بلکہ سب کا معاملہ ہے۔'' اس نے کہا ''کیا ہوتے ہیں یہ بچے۔ بیوفا نالائق بے مروت۔ لاکھ محبت کرو۔ سینے سے لگا کر رکھو۔ لیکن وقت آتا ہے تو چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ جیسے میرے بچے چھوڑ کر چلے گئے۔ یا وہ چلے گئے جن کو میں پڑھایا کرتا تھا۔ کسی نے پلٹ کر بھی نہیں پوچھا کہ میں زندہ بھی ہوں یا مر گیا۔ بیٹی اپنی سسرال جا کر بھول گئی۔ بیٹا جب سے بیرونِ ملک گیا اس نے پوچھا بھی نہیں۔ رہے وہ بچے جو پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان کا بھی یہی حال ہوا ہے۔ سب بے مروت ہیں اسی لیے میں نے بچوں سے محبت کرنی چھوڑ دی ہے۔ کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتا۔ خدا جانے کب کوئی بچہ اچھا لگنے لگے اور میں اس سے محبت کرنے لگوں پھر وہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے اور میں روتا رہ جاؤں۔ نہیں اب بار بار دکھ برداشت کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ لوگ مجھے بے رحم سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں۔'' وہ بول کر چپ ہو گیا۔

بہ ظاہر تو وہ چپ ہی ہو گیا تھا لیکن اس کی آواز گونج رہی تھی۔ جو بھی ملتا ہے جدا ہونے کے لیے ملتا ہے۔ تو میں کیوں بار بار اپنی جان کو عذاب میں ڈالوں... اور مجھے ایک شعر یاد آنے لگا تھا۔ چکور خوش ہے کہ بچوں کو آ گیا اڑنا ..... اداس بھی ہے کہ دن آ گئے جدائی کے۔

کاش میں کسی طرح اسے سمجھا سکتا کہ زندگی اسی طرح اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ آنے اور جانے کا ایک سلسلہ لگا ہوا ہے۔ وقت روکنے سے نہیں رکتا اسی لیے بہتر ہے کہ لمحہ موجود کو اپنے سینے سے لگا لیا جائے، اسی سے پیار کیا جائے۔ اسی پر اکتفا کیا جائے۔

اس نے پارک آنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے بھی اس کی طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ نہ جانے اب کتنے بچے اس کی راہ میں آتے ہوں گے۔ اس کے سامنے کھیلتے ہوں گے... اور وہ ان سے بے زاری کا اظہار کرتا ہو گا۔

++

کھیل

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
یہ ایک ایسے شخص کی روداد ہے جس نے زندگی کو کھیل سمجھ کر جینا شروع کیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ شخص کوئی اور نہیں میرا شوہر ہے یعنی اس سرگزشت کا ایک کردار میں خود بھی ہوں اسی لیے میں نے اپنی حالاتِ زندگی کہانی کے انداز میں لکھ دی ہے کہ آپ بھی اس سے کہانی کی طرح لطف اٹھا سکیں۔
انجم شوکت
(فیصل آباد)

اب نہ تو میرا دل دھڑکتا تھا اور نہ ہی میری پیشانی عرق آلود ہوتی تھی جب مجھے لڑکے والوں کے سامنے چائے لے جانے کو کہا جاتا۔ اب میں اس کی عادی ہو چکی تھی۔ تیز نظریں بھی مجھ پر اثر انداز نہ ہوتیں، حالانکہ لڑکے والے مجھے اس طرح دیکھتے تھے جیسے میں آٹھواں عجوبہ ہوں۔ دیکھتے تو دیکھتے ہی رہ جاتے تھے اس لیے کہ میں بلا مبالغہ بہت حسین و جمیل تھی، گھورنے کا باب بند ہوتا تو پھر مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی۔ میں ان کے ہر سوال کا جواب بڑے سکون و اطمینان سے دیتی۔ ہر بات کا خندہ پیشانی سے سامنا کرتی۔ جب میں وہاں سے اٹھ کر آتی تو امی ابو ان کے سوالات کی زد میں

آجاتے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا جیسا ایک ڈیڑھ برس سے ہو رہا تھا۔ جب میں مہمانوں کے لیے چائے، سموسے اور بسکٹ لے کے گئی تو لڑکا، اس کی دو بہنیں، بڑی بہو، ماں باپ کے چہرے کھل اٹھے۔ البتہ بڑی بہو کی آنکھوں میں حسد و جلن محسوس ہوئی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ وہ بہت حسین تھی اور نہ ہی پُرکشش لیکن اس نے بھڑکیلا لباس جو پہن رکھا تھا وہ بے حد قیمتی تھا اور سونے کے زیورات سے لدی پھندی تھی۔

میں ان کے سوالات کی گرفت سے نکل کے اپنے کمرے میں آگئی پھر میں یہ دیکھنے کے لیے اپنے کمرے کے دروازے کی جھری سے بیٹھک میں جھانکنے لگی کہ وہ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں... کیونکہ میں جانتی تھی کہ آج بھی وہی ہوگا جو ایک ڈیڑھ برس سے ہوتا آرہا ہے، اس کے لیے میں اور میرے گھر والے بھی ذہنی طور پر تیار تھے۔

لڑکے کی ماں نے کہا۔ ''ہمیں آپ کی لڑکی بہت پسند آئی، بڑی پیاری ہے۔''

''چودھویں کے چاند کا ٹکڑا ہے، ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہے۔'' ایک بہن نے دل کھول کے میری تعریف کی۔

''ہمیں ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی، میرے بھیا اور ابو کو لڑکی بہت پسند آئی ہے۔'' دوسری بہن نے ترجمانی کی۔

''بہو......! تم بھی تو کچھ کہو...... لڑکی تمہیں کیسی لگی؟'' لڑکے کی ماں نے کہا۔

''جب آپ سب نے لڑکی پسند کرلی ہے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اصل پسند تو آپ لوگوں کی ہے۔'' بڑی بہو کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''آپ چوں کہ لڑکے کو پہلے دیکھ چکے ہیں اس کے متعلق بہت کچھ معلوم بھی کرلیا ہے اور پسند بھی کر چکے ہیں لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ ابھی اور اسی وقت بات آگے بڑھائی جائے، معاملات طے کرلیے جائیں تاکہ منگنی اور شادی کی تاریخیں آیندہ ملاقات میں طے کرلی جائیں۔'' لڑکے کے باپ نے میرے ابو سے کہا۔

''جیسی آپ کی مرضی!'' ابو نے اسی انداز سے جواب دیا۔ ''آپ سے ہم معاملات طے کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ جہیز میں کیا دیں گے؟ لڑکے کو جوڑے میں کیا دیں گے؟'' لڑکے کے باپ نے سوال کیا۔

''جہیز میں سات عدد جوڑے، چار تولے زیورات کا ایک سیٹ، بیڈ روم سیٹ اور کچھ برتن وغیرہ۔'' ابو نے کہا۔ ''ہم جوڑے میں پانچ ہزار روپے ہی دیں گے۔ یہی کچھ ہم دے سکتے ہیں۔ میں نے صاف صاف بتادیا۔''

''یہ تو جہیز نہیں ہوا؟'' لڑکے کی ماں نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ جہیز ہی کم سے کم ستر اسی ہزار کے درمیان کا ہے۔'' امی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''ستر اسی ہزار کی آج کے زمانے میں حقیقت ہی کیا ہے؟'' لڑکے کی بہن بولی۔

''ہمارے لیے تو یہ رقم بھی بہت زیادہ ہے۔'' ابو نے کہا۔

''میرے بھائی کی تنخواہ تیس ہزار روپے ہے، جہیز اس کے شایان شان ہونا چاہیے۔'' لڑکے کی دوسری بہن بولی۔

''میری بیٹی ہر لحاظ سے ایک انمول ہیرا ہے۔'' ابو کہنے لگے۔ ''آپ صرف اس کی خوبصورتی پر نہ جائیں وہ نہ صرف سگھڑ اور سلیقہ مند بلکہ کفایت شعاری کا ہنر بھی جانتی ہے، وہ نہ صرف سلائی کڑھائی کی ماہر ہے بلکہ ہر قسم کے کھانے بھی بہت عمدہ بناتی ہے، آج کل امور خانہ داری کی ماہر لڑکیاں کہاں ملتی ہیں؟''

''خیر...... ایسا بھی نہیں ہے۔'' لڑکے کی ماں جز بز ہو کے بولی۔ ''جہیز لڑکے کی حیثیت اور اس کے خاندان کو سامنے رکھ کے دیا جاتا ہے، ہماری بہو کو جو جہیز ان کے والدین نے دیا ہے آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' یہ دس دس تولے سونے کے چار سیٹ لائیں، ایک سیٹ میں تو ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ فرنیچر تو دو لاکھ کا تھا، کراکری چالیس ہزار کی۔ باون جوڑے جن کی مالیت دو لاکھ کی ہوگی۔ تحائف جو ملے وہ بھی لاکھوں کے، جوڑے میں ایک لاکھ روپے اور ہنی مون کے لیے اکیاون ہزار روپے بھی دیے اور کیا کیا بتاؤں؟''

''آپ کے سمدھی صاحب کا ذریعہ معاش کیا ہے؟'' ابو نے ان .... تفصیلات سے مرعوب ہوئے بغیر پوچھا۔

''ان کی جیولری شاپ ہے۔'' جواب ملا۔

''وہ ایک جیولری شاپ کے مالک ہیں جبکہ میں ایک نجی دفتر میں ملازم ہوں۔ آپ کے سمدھی کی دکان میں جو سیلز مین ہیں ان کی تنخواہ مجھ سے زیادہ ہوگی۔ ایک ایسے شخص جس کی تنخواہ بیس ہزار ہو اس کے لیے تیس ہزار کا جہیز دینا بھی بہت بڑی بات ہے۔ میری بیٹی میں ایسا کوئی نقص اور خامی نہیں

ہے جسے چھپانے کے لیے لاکھوں کا جہیز دوں، اس کی نیک سیرت، اخلاص اور تعلیم ہی بہت بڑی دولت ہے۔ اگر آپ تیار ہیں تو میں بھی چاند سی بیٹی دینے کے لیے تیار ہوں۔''

ان کے منہ اس طرح بن گئے جیسے کڑوا بادام آ گیا ہو۔ لڑکے کی ماں کہنے لگی۔ ''آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں۔'' ہم آپ کو تین دن کی مہلت دیتے ہیں۔ آپ اتنا جہیز اور جوڑے کی رقم نہ دیں جو بڑی بہو کے گھر والوں نے دی ہے۔ میں آپ کو بتا دوں کہ آپ کو ایسا لڑکا اور خاندان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔''

''میں ایسے جہیز اور لین دین کا دس فیصد بھی نہیں دے سکتا۔ یہ حتمی فیصلہ ہے۔'' میرے ابو نے کہا۔

وہ لوگ ٹکا سا جواب سن کے چلے گئے۔ اس کا ملال نہ مجھے ہوا اور نہ ہی میرے گھر والوں کو۔ کچھ لوگوں نے ہمارے جہیز اور لین دین پر شادی کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی۔ ابو نے معلومات کی تو پتا چلا کہ ان گھروں میں بہوؤں کو کم جہیز لانے پر نہ صرف ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا بلکہ طلاق دے دی گئی جھوٹی تہمت اور شرمناک الزام لگا کے۔ اس بہانے جہیز اور مہر کی رقم بھی رکھ لی گئی۔ میرے ماں باپ مجھے کسی جہنم میں جھونک نہیں سکتے تھے اور نہ مجھے بوجھ سمجھتے تھے وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ میرے نصیب میں جو لکھا ہے وہ مجھے مل کے رہے گا۔

میں اس بات پر بڑی دکھی ہوئی تھی کہ ہم غریب لڑکیاں بدنصیب ہیں۔ کوئی ہمارے سگھڑ پن، سلیقہ مندی، نیک سیرت اور تعلیم کو نہیں دیکھتا جو جہیز سے کہیں قیمتی ہے اور ایسی دولت ہے جو ساری زندگی کام آتی ہے۔

☆☆☆

کوئی بیس دن کے بعد سہ پہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر ساجد انکل اور ان کی بیگم زاہدہ آنٹی موجود تھیں۔ انہیں دیکھ کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ فیصل آباد سے ایک برس بعد آئے تھے۔ ساجد انکل ابو کے بچپن کے دوست تھے۔ زاہدہ آنٹی میری امی کی کزن تھیں۔ ابو نے ہی ان کا رشتہ کرایا تھا۔

دونوں میاں بیوی بڑے خوش اخلاق، پُرخلوص اور بے لوث تھے۔ ان کے آنے سے جیسے گھر میں بہار آ گئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد جب میں باورچی خانے میں چائے بنا رہی تھی تب میں نے آنٹی زاہدہ کی آواز سنی، وہ کہہ رہی تھیں۔

''میں انجم کے لیے بہت اچھا رشتہ لائی ہوں، لڑکا نہ صرف لاکھوں میں ایک ہے بلکہ بہت دولت مند بھی ہے۔''

''آپ جانتی ہیں کہ میں کس قدر غریب ہوں دولت مند لڑکے سے میری بیٹی کا رشتہ کیسے طے ہو سکتا؟'' ابو نے کہا۔

''کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا ہماری انجم کسی شہزادی کی طرح نہیں ہے؟ کیا وہ اس قابل نہیں ہے کہ کسی بڑے گھرانے کی بہو بن سکے؟''

''وہ کسی بڑے گھر میں پیدا ہوتی تو یہ ممکن تھا، میں وہ جہیز نہیں دے سکتا جو بڑے لوگ چاہتے ہیں۔'' ابو نے کہا۔

''لین دین کی کوئی غرض ہے نہ قدر.....'' آنٹی زاہدہ بولیں۔ ''آپ کچھ بھی نہ دیں تو شکایت نہیں..... کیوں کہ ان کے پاس کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے اگر کمی ہے تو کسی اچھی لڑکی کی۔''

''ان سے کہیں کہ وہ کسی دن آ کے لڑکی دیکھ جائیں۔'' ابو بولے۔ ''لیکن میں جو کچھ بھی دوں گا وہ اپنی حیثیت کے مطابق۔''

''لڑکی دیکھنے کی ضرورت ہے نہ وقت، میں نے انہیں انجم کی تصویر دکھا دی ہے۔ تصویر دیکھ کے اسے پسند کر لیا ہے۔ ہم تو شادی کی تاریخ لینے آئے ہیں۔'' ساجد انکل نے کہا۔

''لیکن میں بھی تو لڑکا دیکھوں گا۔'' ابو نے کہا۔ ''لڑکا دیکھے بغیر شادی کی تاریخ میں کیسے مقرر کر دوں؟''

''لڑکے کو دیکھ کے آپ کیا کریں گے؟'' آنٹی زاہدہ بولیں۔ ''وہ لاکھوں میں ایک ہے، دولت مند ہونے کے باوجود وہ برائی سے دور ہے۔ اس کے کردار کی میں ضمانت لیتی ہوں۔''

☆☆☆

آنٹی زاہدہ نے لڑکے والوں کو میری پرانی تصویر جو موبائل فون میں عکس بند تھی وہ دکھائی تھی چوں کہ اب انہیں میری تازہ تصویر کی ضرورت تھی اس لیے مجھے اسٹوڈیو لے جا کر تین عدد تصویریں بنوائیں۔ جب وہ تصویریں آئیں تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ میں ہوں۔ جس نے بھی میری تصویریں دیکھیں وہ عش عش کر اٹھا۔ میں ان تصویروں میں عالمی ملکہ حسن کی طرح لگ رہی تھی۔ جو بھی میری تصویریں دیکھتا سراہے بغیر نہیں رہتا۔

آنٹی زاہدہ شادی کی تاریخ طے کر کے فیصل آباد چلی گئی تھیں۔ چار دن کے بعد ان کا خط اور لڑکے کی تصویر آئی، انہوں نے ابو کے نام لکھا تھا۔ ''کیا میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ انجم لاکھوں میں ایک ہے جب میں نے لڑکے والوں کو انجم کی تازہ تصویریں دکھائیں تو اس گھر کے ہر فرد کی

آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انہیں یقین نہیں آیا کہ لڑکی اس قدر حسین بھی ہوسکتی ہے؟ میں نے ان لوگوں سے کہا بھی کہ آپ لوگ چل کے لڑکی کو ایک نظر دیکھ لیں لیکن انہوں نے صاف صاف کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تصویریں کافی ہیں۔ اس خط میں لڑکے کی تصویر بھی ہے۔ لڑکی کو بھی دکھائیں آپ یا بھابی چاہیں تو لڑکے کو آکرنل سکتے ہیں۔ یہ آپ کی بیٹی کی ساری زندگی کا معاملہ ہے، کل کلاں آپ مجھے کوئی الزام نہ دیں اس لیے آپ سے کہہ رہی ہوں۔

باجی نے مجھے لڑکے کی تصویر دکھائی اور میری رائے بھی طلب کی تھی۔ ایک لڑکی جس نے گھر کی چار دیواری میں پرورش پائی ہو اور جسے دنیا کا کوئی تجربہ نہ ہو وہ اپنی زندگی کے ہم سفر کے بارے میں بھلا کیسے فیصلہ کرسکتی ہے۔ باجی کی شادی کو تین برس ہوچکے تھے۔ انہوں نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں برسوں لگ جاتے ہیں، ماں باپ اولاد کے مقابلے میں زیادہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہوتے ہیں اور پھر انہیں اپنی اولاد سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے وہ اس کی بہتری اور مستقبل کے بارے میں جتنا سوچتے ہیں کوئی اور سوچ نہیں سکتا۔

میں نے رات کی تنہائی میں سکون اور اطمینان سے تصویر دیکھی تو دل تھوڑی دیر کے لیے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ بہت وجیہہ تھے۔ اگر وہ خوبصورت نہ بھی ہوتے تو بھی میں اپنے ماں باپ کی پسند، ان کی مرضی اور فیصلے کے آگے سر جھکا دیتی کیونکہ میرا کوئی تصوراتی نہ تھا۔ شوہر کا خوبصورت اور دولت مند ہونا ضروری بھی نہ تھا۔ اصل چیز محبت تھی۔ میری امی بہت خوبصورت تھی۔ ان کی رنگت میری اور باجی کی طرح سرخ وسفید تھی ابو خوبصورت نہ تھے لیکن ان دونوں میں مثالی محبت تھی۔

باجی کی شادی کرنے کے بعد ابو کی کمر ٹوٹ گئی تھی کیونکہ انہوں نے باجی کی شادی کے موقع پر دفتر سے ایک بڑی رقم قرض لی تھی۔ جو شخص معمولی ملازم ہو اور جس کی آمدنی ہمیشہ سے محدود رہی ہو، تنگ دستی کا شکار رہا ہو، مقروض ہو اور لڑکی کی شادی کا مسئلہ ہو تو باپ کی حالت کیا ہوگی۔ آج کل اس معاشرے میں ایک لڑکی کی شادی کرنے کے لیے ماں باپ کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اب میری شادی کا مسئلہ آن پڑا تھا۔ موتیا بند کی وجہ سے ان کی بینائی کافی متاثر ہوچکی تھی۔ انہیں تو قریب کی چیزیں بھی صاف دکھائی نہیں دیتی تھیں اس لیے ان کی آمدنی کٹ گئی تھی۔ یعنی قرض اتارنے کے لیے جو دو ایک جگہ منشی کا جز وقتی کام کرتے تھے چھوڑ دیا تھا۔ ملازمت چونکہ پرائی تھی اس لیے کسی نہ کسی طرح چل رہی تھی بس اب تنخواہ اور ماں کی کفایت شعاری کے سبب گھر کی گاڑی کسی نہ کسی طرح چل رہی تھی۔ میں صرف ابو اور اس گھر پر بوجھ بنی ہوئی تھی اور یہ بوجھ کسی چٹان سے کم نہ تھا۔

ان حالات میں ان کا میرے لیے جہیز کا بندوبست کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ اللہ نے یہ مشکل حل کردی تھی۔ انکل اور آنٹی کی کوششوں کی وجہ سے میری شادی جہیز اور کسی لین دین کے بغیر ہورہی تھی۔ میرے ماں باپ خوش تھے اور ہر طرح مطمئن بھی لیکن ابو نہ جانے کیوں ایک عجیب سی بے چینی اور خلش محسوس کرنے لگے تھے اس لیے وہ فیصل آباد جاکے لڑکے کو ایک نظر دیکھنا اور اس کے بارے میں چھان بین کرنا چاہتے تھے کہ تسلی ہوجائے۔ دل کو سکون اور قرار آجائے، کیوں کہ انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ فیصل آباد کے دولت مند گھرانے کے لڑکے کا رشتہ بھی آسکتا ہے؟ مگر ہمارے گھر کے مالی حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ آمدورفت کے لیے رقم خرچ کریں لیکن وہ پھر بھی فیصل آباد جانے کے لیے بضد ہوگئے تھے۔ جب ماں نے انہیں سمجھایا کہ انکل اور آنٹی مخلص، بے غرض اور بے لوث ہیں اور وہ انجم کو اپنی سگی بیٹی سے بھی زیادہ چاہتے ہیں اور وہ دشمن نہیں ہیں اور پھر آپ کی بینائی بہت کم زور ہے۔ موتیا بند کی وجہ سے رات کو ٹھیک دکھائی نہیں دیتا ہے اور آپ فیصل آباد اپنی چھوٹی بہن کے ہاں جاکر ٹھہریں گے۔ اس کے لیے بڑے بھائی کی حیثیت سے کچھ لے جانا بھی ہوگا۔ لڑکا پسند آیا تو اس کے ہاتھ کچھ رکھنا بھی تو ہوگا رقم کی صورت میں..... اگر چھوٹا گھرانا ہوتا تو چار پانچ سو میں بات بن جاتی۔ بڑے گھرانے کا لڑکا ہے، پانچ ہزار روپے بھی کم ہیں۔ اس پہلو پر اچھی طرح سوچ لیں۔

ابھی یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ پھر ایک روز زاہدہ آنٹی کا خط کوریئر سروس سے آیا۔ فون پر اس لیے نہیں کہ ان کی سماعت بھی کم زور تھی اور ٹھیک سے سنائی نہیں دیتا تھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ جب میں نے ان سے کہا کہ لڑکی والوں نے لڑکے کی تصویر دیکھ کے اسے پسند کرلیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ مسز خورشید نے کہا کہ لڑکی والے اس قدر بااعتماد نکلیں گے اس کی انہیں توقع نہیں تھی۔ لڑکی والوں نے لڑکا پسند کرلیا ہے اور ہم نے لڑکی..... اب باقی کیا رہ گیا ہے، امی نے یہ خط پڑھ کے ابو کو سنایا۔ انکل ساجد کا خط سن کے گھر

کا ہر فرد بہت خوش ہوا تھا۔ کسی کو اس بات کی اُمید نہیں تھی کہ خورشید صاحب بلند اور ارفع خیالات کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت نے ہر کسی کو بہت متاثر کیا تھا۔ ان سے ملنے اور انہیں دیکھنے کے لیے ہر کوئی بے تاب تھا۔ میرے چھوٹے چاچا نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ خورشید صاحب آدمی نہیں بلکہ فرشتہ ہیں۔ ہم جیسے خاندان کے لیے مسیحا بن کے آئے ہیں۔ آج کے زمانے میں ایسے لوگ کہاں؟

جب تک برات نہیں آئی تھی اس وقت تک غیر یقینی کی کیفیت طاری تھی۔ خورشید صاحب نے دو تین ہوٹلوں کے کمرے بک کر لیے تھے برات کچھ روز قبل ہی ایک ہوٹل میں آ کے ٹھہر گئی تھی اس لیے کہ وہ مہندی کی رقم بھی ادا کرنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے مہندی لے جانے پر ہماری بڑی آؤ بھگت کی تھی اور ہر طرح سے شاندار خاطر مدارات بھی۔ انہوں نے ہمارے ہاں آنے سے پہلے کہہ دیا تھا کہ چار چھ افراد ہی آئیں گے صرف شربت پی کے جائیں گے۔ کھانے کا تکلف نہ کریں۔ مگر برات دھوم دھام اور روایتی انداز سے آئی تھی اس نے ہر کسی کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ کاروں کا جلوس ایک فرلانگ لمبا تھا۔ ہمارے محلے کے لوگوں اور اردگرد کی کالونیوں والوں نے اس برات کا جلوس دیکھا تو حیران رہ گئے۔ برات کی سج دھج اور عمدہ قسم کی گاڑیوں نے انہیں اش اش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایسی مثالی برات کراچی شہر کے باسیوں نے شاید کم ہی دیکھی ہوگی۔ اہم بات یہ تھی کہ تمام براتیوں کے ہاتھ پیک کھانے کے ڈبے تھے۔ یہ سب دیکھ کر ہر کوئی مجھ پر رشک کر رہا تھا۔ شوکت چوہدری واقعی کسی دیس کے شہزادے ہی تھے اور وہ جن گاڑیوں میں براجمان تھے وہ پوری کی پوری تازہ مہکتے پھولوں سے کسی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ شادی شدہ عورتیں اور کنواری لڑکیاں اپنے زرق برق اور بھڑکیلے ملبوسات میں ملبوس گاڑیوں سے اتریں تو ان کے بھڑکیلے لباس بڑی آب و تاب دکھا رہے تھے جس نے ہر ایک کی آنکھیں چکا چوند کر دی تھیں۔ محلے کی لڑکیوں عورتوں کو احساس محرومی ... میں مبتلا کر دیا تھا۔ آنٹی مسز خورشید نے جب یہ محسوس کیا کہ یہاں کے مہمانوں پر فیصل آباد والوں کا بڑا رعب و دبدبہ چھا گیا ہے، ہر کوئی مرعوب اور متاثر نظر آ رہا ہے۔ ہر کسی کی آنکھ کو حیران و متعجب پایا... تو ان کا سینہ کچھ زیادہ ہی فخر سے تن گیا تھا۔ پھر ایک عورت کے تجسس سے دریافت کرنے پر آنٹی زاہدہ نے کہا۔

''میں نے پہلے کہہ دیا تھا کہ یہ لوگ فیصل آباد شہر کے بہت امیر لوگ ہیں۔ ان کا شمار بڑے دولت مندوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ہماری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہ راجا بھوج اور ہم گنگو تیلی..... وہ تو قسمت کی بات ہے جو انہوں نے انجم کو اپنی بہو بنانا منظور کر لیا..... ورنہ بڑے بڑے خاندان امیر لوگ ان کی دہلیز پر اپنی بیٹیوں کے لیے ناک رگڑ کے چلے گئے مگر ان لوگوں نے ان لڑکیوں سے رشتہ طے نہیں کیا۔ وہ چاہتے تو کسی بڑے گھرانے سے بہو لا سکتے تھے۔'' یہ سب باتیں بعد میں میرے علم میں آئیں۔

میں اپنے گھر کے ایک کمرے میں دلہن بنی بیٹھی ہوئی تھی اور آنٹی زاہدہ کی باتیں سن سن کے سکڑ اور سمٹ کے گٹھری بن گئی تھی۔ انہوں نے میرے ہونے والے شوہر اور سسرال والوں کی جو اتنی ساری تعریفیں کی تھیں اس نے مجھے فرطِ مسرت سے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا اور میں دل ہی دل میں خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ مجھے اپنی خوش نصیبی کا یقین نہیں آیا۔ میری زندگی میں جیسے خوش قسمتی کے ساتوں در کھل گئے تھے۔ میرے لیے قیمتی ملبوسات آئے تھے۔ عروسی جوڑا تو ایسا تھا کہ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور پھر زیورات کا کیا کہنا؟ وہ کوئی دس عدد سونے کے سیٹ تھے۔ ان میں جڑے نگینے ایسے تھے کہ ان کی جگمگاہٹ پر نگاہیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ میری امی اباجی، سہیلیاں اور محلے کی عورتیں رشک کر رہی تھیں۔ خاندان کی عورتیں کھسر پھسر کرنے لگیں۔ ان کا خیال تھا یہ سارے زیورات ایمی ٹیشن ہیں۔

شاید ہی کوئی ایسا گھر نہ ہو جس میں مختلف قسم کی رسمیں نہ ہوتی ہوں۔ یہ علاقائی رسمیں ہوتی ہیں جنہیں مشکل سے ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ میرے ہاں بھی ایک ایسی رسم تھی جو نجانے کب سے چلی آ رہی تھی۔ بیاہ سے پہلے دلہا کو گھر میں بلا کے اس پر پرندے کا صدقہ اتارا جاتا تھا۔ میرے بہنوئی دلہا کو لانے شامیانے میں چلے گئے۔ میں دلہن بنی کمرے میں بیٹھی تھی۔ میں محلے کی لڑکیوں اور سہیلیوں کے حصار میں تھی۔ فطری شرم و حیا سے میری آنکھیں بند تھیں لیکن میں حسین مستقبل کے خوش گوار خوابوں میں گم تھی۔ سوچوں کی دنیا میں بہت دور نکل آئی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ میرے ہم سفر نجانے کس مزاج اور طبیعت کے مالک ہوں گے؟ کہیں انہیں اپنی دولت کا گھمنڈ نہ ہو۔ وہ سخت مزاج کے نہ ہوں۔ معلوم نہیں وہ ایک غریب گھرانے کی سیدھی سادی لڑکی کو برداشت بھی نہ کر سکیں۔ میں ایک دقیانوسی اور متوسط طبقے کی شہری لڑکی ہوں۔ شاید انہیں میری سوچ اور خیالات بری نہ

محسوس ہوں۔ میں دل ہی دل میں رب العزت سے گڑگڑا کے دعا مانگنے لگی۔ اے میرے اللہ.....! تو بڑا کارساز ہے تو مجھے ان کے قابل بنادے کہ میں ان کی توقعات پر پوری اتر سکوں ہر لحاظ سے ان کے قابل ہو جاؤں؟

میرے چشم تصور میں ان کی تصویر گھومنے لگی جو میں نے اپنے من کے نہاں خانے میں اس روز آویزاں کرلی تھی جب باجی نے تصویر دکھائی تھی۔ اس رات میں صبح ہونے تک ان کی تصویر موبائل پر دیکھتی اور صبح ہونے تک باتیں کرتی رہی تھی۔ ان کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ نرمی تھی حلاوت تھی۔ میرے دل نے کہا کہ ایسا معصوم چہرے والا شخص سخت گیر نہیں ہوسکتا۔ ان کا چہرہ دل کا آئینہ تھا۔ میں مطمئن ہوگئی تھی۔

میں اک دم سے ہڑبڑا کے موجوں کی دنیا سے نکل آئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پورے گھر میں اچانک ایک بھونچال سا آگیا ہو۔ ایک افراتفری سی مچ گئی تھی۔ سرگوشیوں کی بھن بھناہٹ نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیا تھا۔

گھر میں ایک شور سا مچا ہوا تھا۔ باجی ایک کونے میں کھڑی سسکیاں بھر رہی تھی۔ ان کے شوہر سخت لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''یہ شادی ہرگز نہیں ہوسکتی۔''

اسی لمحے ابو اور ساجد انکل کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ساجد نے ان کی بات سن لی تھی انہوں نے بگڑ کے برہمی سے پوچھا۔ ''یہ شادی کس لیے نہیں ہوسکتی ہے؟''

''اس لیے کہ لڑکا اندھا ہے۔'' باجی کے شوہر نے جواب دیا۔ ان کا لہجہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟'' ساجد انکل نے کرخت لہجے میں پوچھا؟

''میں خود دیکھ کر آیا ہوں۔ لڑکا دونوں آنکھوں سے اندھا ہے۔'' ساجد انکل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولے۔

دولہا بھائی کی یہ بات سنتے ہی ابو تو ایسے سکتے میں آگئے جیسے ان پر کوئی بجلی سی آگری ہو۔ ادھر امی پر تو پہلے ہی سے غشی طاری تھی اور اس سے پہلے کہ ابو کپکپاتے ہونٹوں سے کچھ کہتے ساجد انکل درمیان میں بول پڑے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ کون کہتا ہے لڑکا اندھا ہے؟ یہ جھوٹ ہے، بکواس ہے، بہتان ہے۔''

''میں کہتا ہوں۔'' دلہا بھائی سینہ تان کے سامنے آگئے۔ ان کے لہجے میں نفرت اور تلخی بھری ہوئی تھی۔ وہ بلند آواز سے کہنے لگے۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کی حرکات وسکنات سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ بالکل نابینا ہے..... اندھا ہے..... بالکل اندھا۔''

''تمہارے پاس اس لڑکے کے اندھے ہونے کا کیا ثبوت ہے؟'' ساجد انکل گرجے اور ان کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ ''ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اگر تمہاری بات غلط ہوئی تو تمہاری زبان گدی سے کھینچ دوں گا۔''

''جب دودھ پلانے کی رسم جاری تھی تب میں نے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھایا تو وہ گلاس تھام نہ سکا اور گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا اور چکنا چور ہوگیا۔'' دولہا بھائی جان نے بتایا۔

''یہ کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہوئی۔'' ساجد انکل چراغ پا ہوگئے۔ ''کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ گلاس اس کے ہاتھ سے پھسل کر گر پڑا ہو وہ شاید اس وقت کسی اور طرف دیکھ رہا ہو؟ لڑکیوں اور عورتوں سے باتیں کررہا ہو؟ اس سے چھیڑ خانی کی جارہی ہو؟ شاید اس لیے اس سے بے دھیانی میں ایسا ہوگیا ہو؟ محض اتنی سی بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو؟''

''ہوش کے ناخن لو۔ لڑکا اندھا نہیں ہے۔ زاہدہ آنٹی کا پارہ چڑھ گیا۔ البتہ اس کی نظر کچھ کم زور ضرور ہے۔ آج کل کس کی نظر کم زور نہیں ہے۔ کیا تمہاری بیوی نظر کا چشمہ نہیں لگاتی ہے؟ کیا تم ہمیں انجم کا دشمن سمجھتے ہو؟ آخر وہ ہماری اولاد کی طرح ہے؟ کیا اس کے لیے دل میں درد ومحبت اور چاہت نہیں ہے؟ کیا ہم اسے کسی جہنم میں جھونک رہے ہیں؟ اور پھر میں نے رشتہ طے ہونے سے پہلے کیا خط نہیں لکھا تھا کہ فیصل آباد آکر لڑکے کو دیکھ لیں؟ اس کے بارے میں اچھی طرح سے چھان بین کرلیں۔ کل کلاں کوئی بات ہوئی تو ہم اس کے ذمے دار نہیں ہوں گے۔ اب یہ بہنوئی صاحب اپنی سالی کی شادی پر حسد کی آگ میں جل کر کباب ہورہے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے ہیں کہ ان کی سالی اتنے بڑے گھر میں جائے؟ کیوں کاشف میاں.....! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''آپ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کریں؟''

دولہا بھائی اک دم سے بھڑک اٹھے۔ ''آپ کیا جانیں..... کہ میں انجم کو کتنا چاہتا ہوں۔'' وہ مجھے اپنی بہنوں سے زیادہ عزیز ہے۔ آپ بات کو غلط رنگ دینے کی کوشش نہ کریں۔ شوکت کی نظر کم زور تھیں ہے وہ حقیقت میں اندھا ہے۔ کیا آپ بینائی کم زور بتا کر ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتی ہیں؟

آپ جان بوجھ کے اس معصوم لڑکی کو اندھے کنویں میں گرانا چاہتی ہیں؟ وہ اندھا ہے، ہم اندھے نہیں ہیں۔''

دولہا بھائی کی بات جلتی پر تیل کی طرح گری۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا مگر انہوں نے جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ وہ ہاتھ نچا کے کہنے لگیں۔ ''اسے کہتے ہیں پرائی آگ میں کودنا؟ کیا تمہارے خیال میں ہم نے انجم کا رشتہ طے کرا کے ان سے رقم بٹوری ہے؟ ہم نے تو یہ سوچ کے ہمدردی کی تھی کہ بیٹی کو جہیز دینے کی بھیا میں ہمت نہیں ہے۔ بڑی بیٹی کی شادی پر جو قرض لیا اس نے ان کی کمر توڑ دی اور ابھی تک پورا قرض ادا نہیں ہوا۔ ادھر لڑکی کی عمر نکل رہی ہے۔ آج کل لوگ لڑکی نہیں پہلے گھر، حیثیت اور لین دین دیکھتے ہیں انجم کا دو برسوں سے اس لیے رشتہ طے نہیں ہو پا رہا تھا کہ ان کے پاس شادی کے لیے اتنی رقم نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے۔ ہم نے ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے شوکت کا رشتہ انجم سے طے کرا دیا۔ انہیں ہمارا احسان مند ہونا تو درکنار الٹی ہم پر تہمت لگائی جا رہی ہے۔ کیا اس کا یہی صلہ ہے؟ کیا یہ آپ لوگوں کا انصاف ہے؟ سچ پوچھیں تو آج اس زمانے میں شرافت نام کی کوئی چیز نہیں رہی۔ کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے؟'' وہ جذبات کی رو میں بہہ کے غصے میں آ گئی تھی۔

''آخر یہ سب کیا ہے؟'' ابو کی آواز بھڑک گئی۔ ان کی حالت غیر ہونے لگی۔ چند لمحوں کے بعد وہ دل شکستہ لہجے میں بولے۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہے؟ آخر مجھے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟''

''میری بات مانیں..... ایجاب وقبول کے لیے وکیل اور گواہوں کو بلا لیتے ہیں۔ قاضی صاحب انتظار کر رہے ہیں۔ آپ ان کی ایک نہ سنیں۔ یہ لوگ بکواس کر کے آپ کا دل خراب کر رہے ہیں۔'' آنٹی زاہدہ نے ابو سے کہا۔

باجی، میری رشتہ دار بہنیں اور ان کے شوہر بھی آ گئے تھے۔ میرے برابر والے کمرے میں سب جمع ہو گئے تھے۔ ان کی ایک ایک بات اور طنزیہ جملے صاف سنائی دے رہے تھے جو بہت واضح تھے۔ ادھر جو میرے دل کی حالت ہو رہی تھی میں کسی سے بھی بیان نہیں کر سکتی تھی۔ میں اور میری محبت ایک تماشا بن گئی تھی۔ مجھے وہ فقیر یاد آیا جو میرے در پر سوالی بن کے آیا تھا۔ اس نے مجھ سے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا تھا کہ وہ دو دن سے بھوکا ہے پھر میں نے دو پراٹھے، ملائی، شہد اور آملیٹ دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ بچی! تو نے ایک بھوکے کو کھانا دے کر جو نیکی کی ہے وہ ساری زندگی کام آئے گی۔

ملاقات

ارسطو کی لکھی گئی یوطیقا (Poetics) تنقیدی ادب میں نظری و عملی لحاظ سے بائبل کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ اس میں ارسطو نے یونانی ڈرامے کو سماج سے جوڑا ہے اور اسی لیے ارسطو کے وضع کیے گئے تنقیدی اصول آج بھی کسی ادب پارے کو پرکھنے کے لیے اتنے ہی مددگار ہیں، جتنے کہ قدیم یونانی معاشرے میں تھے۔ ارسطو کے مطابق ''انسان ایک سماجی حیوان اس لیے ہے کہ معاشرے سے ہٹ کر یا تو دیوتا زندگی گزار سکتے ہیں یا پھر جانور۔''

مرسلہ: نصرت جبیں، لاہور

تیری چاندنی پیشانی بتا رہی ہے کہ تیری شادی کسی شہزادے سے ہوگی۔ تو بڑے گھرانے کی بہو بنے گی..... بچی! ایک بات یاد رکھنا جب تم کسی بڑے گھرانے کی بہو رانی بن جاؤ تب بھی بھکاریوں، فقیروں اور بھوکوں کا خیال اسی طرح سے رکھنا۔ میں تیرے لیے اللہ سے خصوصی طور پر دعا کروں گا پھر وہ مجھے بہت ساری دعائیں دیتا ہوا چلا گیا لیکن اس فقیر بابا کی دعا آج میرے کسی کام نہ آ سکی۔ میں نے ہمیشہ ہر کسی کا بھلا چاہا تھا لیکن آج میرے دل پر ایک زوردار نوکیلا پتھر آ کر لگا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میرے لبوں سے ایک سرد آہ نکل کے رہ گئی۔ میرے ہونٹ جیسے بند ہو گئے۔ ان پر غم کی مہر لگا دی گئی۔ آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ گلا بند ہوتا معلوم ہوا، دل تھمتا ہوا ایسے لگا جیسے ابھی ابھی ہاتھ پاؤں سے جان نکل جائے گی۔

حالاں کہ کب سے مجھے اس لمحے کا انتظار تھا اور میرا خیال تھا کہ میں اس گھر کی بہو بن جاؤں گی۔ میرے خواب میرے نہ ہو سکے تھے۔ میں نے تو کبھی بھولے سے بھی خواب نہیں دیکھے تھے۔ اب جو خواب دیکھے تو وہ دغا باز نکلے تھے۔ اب آنکھیں کیسے کھولوں؟ ہونٹوں سے کیسے بولوں؟ میں ان لوگوں کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی جن کی آنکھوں میں میرے لیے تضحیک تھی۔ ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹیں، میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں رونا چاہوں تو رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر میں روتی تو یہ لوگ میرے رونے پر اپنے دل میں اور ہنستیں۔

میرے دل نے مجھ سے کہا کہ پگلی! تو نے ایک لمحے کے لیے یہ کیوں نہیں سوچا کہ ایک رئیس زادہ تجھ سے شادی کر رہا ہے تو اس میں کوئی نہ کوئی کمزوری ایسی ہے جو شدید

ترین ہے۔ ایک غریب کی بیٹی ہوتے ہوئے تو نے یہ کیسے جان لیا کہ تو بڑے گھر کی بہو بن جائے گی؟ ہائے وہ کیسا لمحہ تھا جب میں نے شوکت کے بارے میں سوچا تھا کہ وہ میرا ہو جائے گا۔ میرے دل کے نہاں خانوں میں چراغاں ہو گیا تھا۔ میں سہانے، رنگین اور انجانے خواب دیکھنے لگی تھی اور پھر شوکت کو پانے کی اُمید، تمنا اور سہارے کی اس روشنی میں اتنے دنوں تک بھٹکتی رہی تھی۔ یہ میری خود فریبی تھی ورنہ یہ لمحہ اور دن دیکھنا نہ پڑتا..... اگر میں نے کوئی خواب دیکھا تھا تو اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا اس لیے کہ دنیا کی ہر لڑکی جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو وہ اس دن کے خواب دیکھنے لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت خواب لہرانے لگتے ہیں۔

دولہا بھائی جان کے سب سے بڑے بھائی ریاض چوہدری بھی اڑ گئے۔

اب یہ شادی کسی قیمت پر نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ہوتے ہوئے اس معصوم بچی پر کوئی ظلم ہونے نہیں دیں گے، انجم پڑھی لکھی ہے۔ لڑکے کے باپ سے جا کر صاف صاف کہہ دیں کہ وہ ابھی اور اسی وقت بارات واپس لے جائیں..... اگر آپ لوگ جا کر نہیں کہہ سکتے تو میں جا کر کہے دیتا ہوں۔''

مجھے اپنی شادی کے نہ ہونے کا کوئی غم نہیں تھا اور نہ ہی خوابوں کے بکھر جانے کا کوئی دکھ ہو رہا تھا بلکہ امی اور ابو کی حالت دیکھ کے میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ سب سے زیادہ اس گھر کی عزت کا خیال تھا کیوں کہ یہ عزت ہی گھر کی دولت تھی اور آج یہ عزت لٹ رہی تھی۔ سب بڑی بے بسی سے اس کے لٹنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

میرے چچا کے ہاں ایک لڑکی اور تین لڑکے ہوئے تھے۔ وہ بہت خوش حال تھے۔ آسودہ حالی اور میرے ابو کی زبوں حالی ان کے خیال میں اس لیے تھی کہ میرا پیدا ہونا جرم تھا..... ناقابل معافی..... میری جگہ لڑکا ہوتا تو وہ اس گھر کے لیے بڑا خوش قسمت ہوتا۔ انہوں نے کبھی مجھے وہ محبت اور چاہت نہیں دی تھی جس کی میں مستحق تھی۔ انہوں نے اپنی سسرال کے کسی لڑکے سے باجی کا رشتہ طے نہیں کرایا۔ وہ اس منحوس لڑکی کی کس طرح سفارش کرتے۔ ان کے نزدیک مجھے جتنی سزا دی جائے کم تھی۔ نجانے کیوں وہ مجھ سے بہت خار کھاتے تھے۔ دولہا بھائی کی بات سن کے ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ بری طرح بھنا کے بولے۔

''یہ مان لیا کہ لڑکا اندھا ہے۔ بالفرض محال اگر وہ اندھا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم لوگ تصویر کا ایک رخ کیوں دیکھ رہے ہو۔ دوسرا رخ بھی تو دیکھو؟ دوسرا رخ کس قدر روشن ہے۔ وہ دولت مند لوگ ہیں۔ وہ لڑکی کو کسی قسم کی تکلیف ہونے نہیں دیں گے۔ لڑکی عیش کرے گی اس گھر میں جا کے۔''

چچا کی بات سن کے زاہدہ آنٹی کو جیسے شہہ مل گئی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں عورتوں کو اس طرح بتا رہی تھیں جیسے انہوں نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو، وہ فخریہ انداز سے کہنے لگیں۔

لڑکی کے والد کی مالی حالت اور ان کی معمولی حیثیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ صرف ایک لڑکی کی شادی ذرا مناسب اور قرض لے کے کیا کردی ان کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ آج ان کا داماد اس لڑکے میں نقص تلاش کر رہا ہے۔ ذرا اس سے پوچھیں کہ اس نے کیا گل کھلائے تھے۔ اس نے فریج، اسکوٹر، فرنیچر اور پچیس ہزار کی رقم جوڑے میں مانگی تھی۔ اب جب کہ ہماری کوششوں سے انجم کو دولت مند گھرانا مل گیا ہے تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔''

''زاہدہ آنٹی! آپ اس وقت، بے وقت کی راگنی الاپ رہی ہیں؟'' دولہا بھائی کے بڑے بھائی بھڑک اٹھے۔

''یہ ہرگز سچی بات نہیں ہے۔ یہ آپ اپنی طرف سے گھڑ رہی ہیں؟'' وہ برہمی سے بولے۔

''انجم کے ابو سامنے کھڑے ہوئے ہیں، ان سے پوچھ لیں۔ ہم نے ان سے کچھ بھی نہیں مانگا۔ انہوں نے جو دیا اسے قبول کر لیا۔ آپ سوچے سمجھے بغیر الزام تراشی کر رہی ہیں۔ میں آپ سے شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ اس کی نظر کم زور نہیں ہے بلکہ وہ اندھا ہے۔ مجھے بھلا انجم سے کیوں اور کس لیے دشمنی ہونے لگی۔''

''اس لیے اس سے حسد، جلن اور دشمنی ہو رہی ہے کہ وہ بڑے گھر میں جا رہی ہے۔'' وہ تیزی سے بولیں۔

''جی یہ بات نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی انجم کو بہت چاہتا ہے کہ وہ بڑی نیک سیرت لڑکی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جو سگھڑ پن اور سلیقہ شعاری ہے وہ کسی اور میں دکھائی نہیں دیتی ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ انجم کہیں بھی جائے سدا خوش رہے۔ اسے کوئی دکھ نہ پہنچے۔ کوئی تکلیف نہ ہو۔'' وہ جذباتی سے ہو گئے۔

''یہ باتیں رہنے دیں اگر انجم سے اتنی محبت تھی تو اس کا رشتہ کیوں نہیں لگایا؟'' زاہدہ آنٹی بولیں۔

''میں نے بہت کوشش کی، جہیز اور لین دین آڑے

آتا گیا اور نہ اب تک اس کے ہاتھ پیلے ہو چکے ہوتے۔''

''ہم کسی کو انجم کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔'' دولہا بھائی نے ہذیان لہجے میں کہا۔

''آپ لوگ خوامخواہ آپس میں الجھ کر بدمزگی نفرت اور تلخی پیدا کررہے ہیں؟'' پڑوسی افتخار صاحب بولے۔

''آپ ہی بتائیں کہ کیا کریں؟'' دولہا بھائی نے کہا۔ ''اس گھر کی عزت اور لڑکی کی زندگی کا سوال ہے۔''

''آپ لوگ ایسا کریں کہ اس لڑکے کو ساتھ لے جا کر کسی ماہر چشم کو دکھا دیں۔'' افتخار صاحب نے مشورہ دیا۔

''یوں تو ہم لوگ بھی ان کی بینائی کا امتحان لے سکتے ہیں۔'' زاہدہ آنٹی بولیں۔

''نہیں.....اس طرح بات نہیں بنے گی؟'' افتخار صاحب نے کہا۔ ''مناسب یہ ہوگا کہ کسی آنکھوں کے ڈاکٹر سے ہی رجوع کیا جائے۔ اس طرح لڑکے والوں کو اس کا فیصلہ ماننے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوگا۔''

''میں اس کی تائید کرتا ہوں۔'' دولہا بھائی نے جلدی سے کہا۔ ''اتفاق سے آج چھٹی کا دن بھی ہے۔ ایک بہت بڑا آئی کلینک کھلا ہوا ہوگا۔ ہم لوگ لڑکے کو ساتھ لے کر وہیں چلتے ہیں۔''

''افتخار صاحب نے بروقت مشورہ دیا ہے۔'' ابو نے اپنی زبان سے خاموشی کے قفل کو کھولا۔ ''نکاح سے پہلے ہم کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ لڑکے کی آنکھوں کا معائنہ کرواتے ہیں۔ اگر لڑکے کی بینائی کم زور ہوئی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دوں گا۔''

''شہر میں دو تین آنکھوں کے بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر موجود ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ وقت ضائع کیے بغیر لڑکے کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلیں؟ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟ اس طرح شک وشبہ بھی ختم ہو جائے گا۔ کیوں؟''

''آنکھوں کا معائنہ بعد میں ہوتا رہے گا۔'' ساجد انکل سے پہلے زاہدہ آنٹی بول پڑیں۔ ''پہلے نکاح تو ہو جائے۔ اس میں دیر ہو رہی ہے، قاضی اور مہمان پریشان ہو رہے ہیں اور۔''

''آپ کو نکاح کی پڑی ہوئی ہے۔'' دولہا بھائی گرم ہو گئے۔ ''نکاح میں دیر ہوتی ہے تو ہونے دیں، یہاں ایک لڑکی کی زندگی کا سوال ہے، اس کا مستقبل خطرے میں ہے۔ نکاح تو بعد میں بھی ہوتا رہے گا۔ معائنہ کروانے میں کوئی دو تین دن تو نہیں لگیں گے۔ صرف دس پندرہ منٹ کی تو بات ہے۔ آئی کلینک بہت قریب ہے۔''

''ٹھیک ہے آپ لوگ اپنے ساتھ لڑکے کو کسی بھی ڈاکٹر کے پاس جلدی سے لے جائیں اور ساتھ ہی رپورٹ بھی لیتے آئیں۔ دیر نہ کریں۔ میں جب تک مہمانوں کو سنبھالتا ہوں۔'' ابو بولے۔

ابو کی بات سن کے ساجد انکل بری طرح سٹ پٹا گئے تھے اور بدحواس ہو کر بولے۔ ''آپ لوگ ان کی عزت پر چھینٹے اڑانے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ لیں۔ وہ نہ صرف دولت مند بلکہ عزت دار لوگ بھی ہیں۔ وہ اسے اپنی اہانت نہ سمجھ لیں۔ خورشید چوہدری کو یہ بات سخت ناگوار لگ سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ برات واپس لے کے چلے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو سف افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیں۔''

''اگر خورشید چوہدری صاحب ہماری اس بات سے ناراض ہو کے برات لے کے واپس چلے جانا چاہیں تو شوق سے لے جائیں۔ جب تک میں اور میرا داماد جو مجھے اولاد سے کہیں عزیز ہے، لڑکے کی بینائی سے مطمئن نہیں ہو جاتے اس وقت تک یہ شادی نہیں ہوسکتی۔ میری چاندسی بیٹی مجھ پر بھاری نہیں ہے۔ اگر انہیں اپنی عزت پیاری ہے تو مجھے بھی اپنی بیٹی پیاری ہے۔'' ابو نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے ابا کے دل کے کونے میں اتنی محبت بھری ہوئی ہے۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ نے میرے وجود میں جیسے ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ میری نظروں کے سامنے کتنے سارے پردے ایک ایک کر کے ہٹ گئے تھے۔ ان کی باتوں نے میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب کو روک دیا تھا۔ میرے اندر ایک اعتماد پیدا ہوا۔ میرے دل میں ابو کی اتنی محبت، اتنی چاہت اور بے پناہ قدر مزید بڑھ گئی میرا دل بے اختیار بھر آیا۔ میرا چہرہ ایک عجیب سی خوشی کے احساس سے دمک اٹھا تھا۔

ادھر ابو کی صاف اور کھری کھری باتیں سن کے ساجد انکل کا منہ لٹک گیا۔ ان پر جیسے کوئی بجلی سی آگری تھی۔ اب ان کے پاس فرار کی کوئی راہ نہیں رہی تھی۔ میری نگاہیں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ ان کی زبان سے کچھ سننا چاہتے تھے۔ ادھر زاہدہ آنٹی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد ساجد انکل نے زبان کھولی تو ان کی آواز بے روح تھی۔

''اگر آپ لوگ لڑکے کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جا کر اطمینان کرنا چاہتے ہیں تو پھر آپ لوگ یہیں میرا انتظار

کریں۔ میں بذات خود جا کر خورشید چوہدری صاحب سے تنہائی میں بات کرتا ہوں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ جانے سے شاید وہ برا مان جائیں۔''

''ہمیں ان سے جا کر بات کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' دولہا بھائی جان نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہتر یہی ہے کہ آپ بذات خود ہی تشریف لے جا کے کوئی عظیم کارنامہ انجام دے آئیں۔''

ساجد انکل تلملاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

ادھر ایک ایک لمحہ اس قدر اذیت ناک اور جان لیوا بن گیا تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کمرے ہی میں نہیں سارے گھر پر ایک سوگوار سا سناٹا مسلط ہو گیا تھا۔ وحشت سی برسنے لگی تھی۔ چند لمحے پہلے جو رونق اور گہما گہمی تھی وہ رخصت ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ حسرت و یاس اور افسردگی نے لے لی تھی۔ یہ گھر شادی کا گھر نہیں لگ رہا تھا۔ اس گہرے سکوت میں ہر شخص کو اپنے دل کی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں دلہن نہیں تھی، ارمانوں کی لاش تھی، ایک مردے کو سرخ جوڑا پہنا کے اس کا نام دلہن رکھ دیا تھا۔ سب کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں جس دروازے سے ساجد انکل گئے تھے۔ ہر کسی کے چہرے ڈھلی چادر کی طرح ہو رہے تھے اور سب بے حس و حرکت بتوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ وہ آپس میں بات کرنا بھی بھول گئے۔

کچھ دیر بعد ساجد انکل آئے ہر کسی کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''میں نے بڑی مشکل سے خورشید چوہدری صاحب کو ان کے بیٹے شوکت کی آنکھوں کا معائنہ کرانے پر رضامند کر لیا۔ پہلے تو وہ میری بات سن کے اک دم بھڑک اٹھے تھے۔ انہوں نے اسے اپنی توہین سمجھا اور برات واپس لے جانے پر اڑ گئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کا غصہ سرد کیا انہیں اونچ نیچ سمجھائی اور معاملے کی نزاکت بتائی تو تب کہیں جا کر وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں کا معائنہ کرانے کے لیے تیار ہوئے لیکن ان کی ایک شرط ہے۔''

''کیسی شرط؟'' دولہا بھائی جان نے قہر زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''اس میں شرط لگا دی بہت خوب..... گویا دال میں کچھ کالا ہے؟ بڑی عجیب سی بات ہے۔''

خورشید چوہدری صاحب یہ چاہتے ہیں کہ صرف لڑکی کے والد اکیلے ڈاکٹر کے پاس لے کے چلیں۔ زیادہ لوگوں کو ساتھ لے جانا انہیں بالکل پسند نہیں ہے۔''

☆☆☆

کچھ دیر بعد ایک گاڑی میں ابو، خورشید چوہدری صاحب اور ساجد انکل ایک مشہور آئی کلینک کی طرف روانہ ہوئے۔ ادھر میرے دل کو ڈھارس ہی بندھی کہ شوکت کی نظر صرف کمزور ہو گی۔ وہ اندھے نہیں ہیں، اگر وہ اندھے ہوتے تو وہ اور ان کے والد کسی قیمت پر معائنہ کرانے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے۔ اندھا پن ایسی چیز نہیں ہے جو کسی سے چھپا رہ سکے۔ میں نے بعض اندھے بھکاریوں کو دیکھا تھا کہ وہ اپنی حرکات و سکنات سے بالکل اندھے نہیں لگتے تھے۔ میری امی اپنے کمرے میں جا کے سورہ یاسین کی تلاوت کر کے اللہ سے گڑگڑا کے دعا مانگ رہی تھیں کہ اے اللہ تو ہماری عزت رکھ لے۔ شوکت اندھے نہ ہوں۔

انتظار کی کرب ناک گھڑی کس طرح ختم ہوئی یہ دل ہی جانتا ہے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ چاروں آئی کلینک سے واپس آئے۔

ساجد انکل کمرے میں قدم رکھتے ہوئے بلند اور گرج دار آواز میں اکڑ کے بولے۔

''میں نہیں کہتا تھا کہ آپ لوگوں کو وہم ہو گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ کچھ لوگوں کی فطرت ہے کہ وہ بنے بنائے کام کو بگاڑ دیں۔''

اپنی بات کہہ کے انہوں نے دولہا بھائی جان کی طرف دیکھا۔

''اب تو آپ مطمئن ہو گئے ہوں گے؟ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا ہے تو آپ اپنے سسر صاحب سے دریافت فرما لیں..... ڈاکٹر نے بھی وہی کہا ہے جو میں نے کہا تھا۔ میں نے بار بار دہرایا تھا کہ لڑکے کی نظر کم زور ہے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ لڑکے کی دونوں آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔''

ساجد انکل کی بات سنتے ہی میرے من کے نہاں خانے میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ ماں فوراً ہی سجدے میں گر پڑیں۔ ان لڑکیوں عورتوں کے منہ لٹک گئے جو کچھ دیر پہلے میری بربادی شادی خانہ آبادی پر خوش ہو رہی تھیں اور ان کا بس چلتا تو وہ خوشی سے والہانہ انداز سے رقص کرتیں۔ ان کے چہروں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے دلوں میں زہر میں بجھی ہوئی چھری اتر گئی ہو۔

دولہا بھائی کا چہرہ فق پڑ گیا تھا۔ وہ بہت حیران تھے اور

چکرا بھی رہے تھے۔ انہیں نجانے کیوں اب بھی یقین نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے اس لیے یقین کرلیا کہ ابو بھی ان کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس گئے تھے اور پھر وہ نہ صرف مطمئن بلکہ خوشی خوشی واپس بھی آئے تھے۔

'' میں دولہا کے والد اور باراتیوں کے پاس جارہا ہوں۔'' ساجد انکل کہنے لگے۔ ''اب آپ نکاح کی تیاری کریں۔ ان فضول باتوں میں نہ صرف بہت سارا وقت برباد اور ضائع ہوگیا ہے بلکہ ان کی نظروں میں ہماری عزت بھی نہیں رہی۔ مہمانوں کو بھی الگ پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے۔ اس وقت رات کے نو بج رہے ہیں، وہ تو یہ کہیے کہ ڈاکٹر صاحب بہت شریف آدمی ہیں وہ اتنی دیر اور وقت نہ طے کرنے پر مریض نہیں دیکھتے ہیں۔ ان سے وقت لینا پڑتا ہے پھر بھی وہ معائنہ کرنے کے لیے تیار ہوگئے تھے کسی کی شادی اور زندگی کا مسئلہ تھا۔ اللہ نے بڑا فضل وکرم کیا تھا کہ اس نے ایک بہت بڑی مصیبت کو ٹال دیا تھا۔ میرے سر سے چٹان جیسا بوجھ اتار دیا تھا۔''

ساجد انکل کے کمرے سے نکلتے ہی پھر سے گھر میں خوشی کا سا سماں بندھ گیا تھا۔ زاہدہ آنٹی چہکنے لگی تھیں، ڈینگیں مارنے لگیں، گھر میں پھر سے خوشی کا احساس جاگ گیا۔ رونق اور گہما گہمی لوٹ آئی۔

☆☆☆

خاصی دیر کے بعد دروازہ کھلا تو شوکت اندر داخل ہوئے، انہیں میری باجی اندر پہنچا کے دروازہ بند کر کے چلی گئی تھیں۔ میں نے فطری شرم وحیا سے سر جھکا لیا اور آنکھوں پر پلکوں کی چلمن گرالیں۔

وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہے تھے جیسے میری موجودگی کا اشارہ خوشبوئیں کررہی ہوں۔

وہ پلنگ کے کنارے پر آبیٹھے۔ میں نے ان کی طرف چور نظروں سے دیکھا۔ اللہ نے انہیں بڑی فیاضی سے بنایا تھا۔ بلاشبہ وہ مردانہ وجاہت کا انمول نمونہ تھے۔ وہ ایسے تصوراتی محبوب کی طرح دکھائی دے رہے تھے جس کا خواب کنواری لڑکیاں دیکھتی ہیں۔

''کیا ایک اندھے سے شادی کرنا بھی آپ کے فرض میں شامل تھا.....؟'' انہوں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ میں نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا تو وہ بولے۔ ''میں آپ کے اس احسان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں آپ کو منہ دکھائی دوں۔'' وہ اپنی شیروانی کی جیب سے ڈبیا نکالتے ہوئے بولے۔

انہوں نے انجانے میں ایک ایسی بات کہہ دی جس کا انہیں کوئی خیال نہیں رہا۔ میں نے ان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کے میرے ہاتھ کو تھام لیا تو میری نظروں کے سامنے ایک کوندا سا لپکا۔ ایک پردہ ہٹ گیا۔

انہوں نے میرے ہاتھ کی انگلی میں جڑاؤ ہیرے کی انگوٹھی پہنائی تو میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''جلدی سے مجھے ایک گلاس پانی پلادیں۔ میرا دل ڈوبا جارہا ہے۔''

وہ فوراً ہی جگہ سے اٹھ کے سرہانے والی میز کی طرف لپکے جس میں پانی سے بھرا جگ رکھا تھا۔ وہ گلاس میں پانی انڈیلنے لگے۔ پھر یکایک انہیں احساس ہوا کہ ان کی چوری پکڑی گئی ہے تو وہ اک دم سے ہنس پڑے اور میری طرف دیکھا تو میں نے شرما کر اپنا سر جھکا لیا اور پھر اپنی آنکھوں پر پلکوں کی چلمن گرالیں۔ میری پیشانی عرق آلود ہوگئی جبکہ کمرا ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گئے اور میری ٹھوڑی کو انگلی سے اوپر اٹھایا۔

''آپ بہت چالاک ہیں۔ آپ نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔'' انہوں نے شوخی سے کہا۔

میں نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔ ''آخر یہ سب کچھ کیا تھا.....؟''

''دراصل مجھے ایک اچھی شریکِ حیات کی ضرورت تھی جو پُرخلوص اور سچے جذبے والی ہو۔ اس میں ایثار اور قربانی کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی ہو۔ ساجد انکل اور زاہدہ آنٹی نے مجھے آپ کے متعلق بتایا۔ میں آپ کی آزمائش کرنا چاہتا تھا اس لیے ایک منصوبہ بنالیا اور میں نے سوچا کہ شادی میں ذرا ایڈونچر ہونا چاہیے، روایتی انداز سے شادی ہوگی تو اس میں لطف نہیں آئے گا۔''

''اوہ میرے خدایا.....'' میں بولی۔ ''میں آپ سے کچھ عرض کروں تو.....؟''

''پہلے آپ میری عرض سنیں مجھے معاف کردیں۔ میں نے آپ کو بہت تنگ اور پریشان کیا۔'' وہ جُل ہو کر بولے۔

''اچھا اب میرے عرض سنیں.....''

''اس کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔ لہٰذا میری عرض ہی سنتی رہیں۔'' انہوں نے شوخی سے کہا۔

++

محبت

محترم مدیر
السلام علیکم!
ارسال کردہ سچ بیانی ایک ایسی خودسر دوشیزہ کی ہے جس نے اپنے والد کو بھی کچھ نہیں سمجھا لیکن جب اس کے دل میں کسی کی محبت جاگی تو اس کی زندگی گویا منجدھار میں آگئی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کی زندگی ست رنگی ہے۔ ایسے حالات کبھی کبھی ہی کسی کی زندگی میں رونما ہوتے ہیں ورنہ تو ایسی باتیں صرف کہانی قصّوں میں نظر آتی ہیں۔

سنبل
(کراچی)

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں مری کانونٹ میں پڑھتی تھی۔ کانونٹ میں پڑھنا میرا شوق نہیں مجبوری تھی۔ میرا ہائی کوالیفائڈ اور ہائی لی اسٹیبلشڈ باپ اپنی سیدھی سادی نازک سی کزن کو کبھی اپنے دل میں جگہ دے ہی نہ سکے میری ماں کوئی جاہل عورت نہیں تھی۔ وہ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز تھیں مگر تھیں سیدھی سادی اپنے وجود کو دوپٹے اور چادروں میں لپیٹ کر رکھنے والی۔ وہ خالصتاً دادا دادی کی پسند تھیں خود نے تو بیٹے کی پسند کے خلاف جا کر بیٹے کی مما

سے شادی کروادی۔

بقول دادا دادی کے راحیل کو راہِ راست پر لانا تمہاری ذمے داری ہے اور مما، پاپا کو راہِ راست پر کس طرح لاسکتی تھیں کیونکہ پاپا کو یہ پردے دار عورتیں پسند نہیں تھیں۔ انہوں نے ایک بڑا عرصہ یورپ میں گذارا تھا انہیں شمع محفل عورتیں پسند تھیں مما نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ پاپا کو ان اخلاقیات کی طرف موڑ لیں جو کہ پاکستان میں مروج ہیں اور جنہیں پاپا کو سکھانے کی ذمے داری دادا دادی کی تھی مگر وہ بری طرح ناکام رہیں کیونکہ پاپا کو تو اپنی یہ نازک سی ڈھکی چھپی کزن پسند ہی نہیں تھی جو وہ ان کی سنتے، ہاں اگر ماما، بغیر آستینوں اور گہرے گلے والے بلاؤز کھلی کمر والی ساڑھی کے ساتھ پہنتیں تو وہ ان کی بات سنتے۔

... دادا دادی نے سارا ملبا ماما پر گرادیا کہ تمہیں شوہر کو سنبھالنا آتا ہی نہیں ہے اور مما یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ اگر بیٹے کو سنبھالنا ہی تھا تو ان کی پسند کے مطابق لڑکی لے آتیں۔

میں بھی پتا نہیں کیسے شاید پاپا کی نفسانی خواہشات کے ہی زیرِ اثر دنیا میں آگئی تھی ورنہ وہ تو مما کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ مما چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پسنے لگیں۔ شوہر کی بے اعتنائی بلکہ نفرت و بے زاری اور ساس سسر کے طعنوں نے ان کی ہمت کو جوانی میں ہی چاٹ لیا اور وہ اعصابی دباؤ کے باعث کمزوری کا شکار ہوکر دائمی مریضہ بن گئیں۔ ہر وقت بیمار رہنے لگیں اور مما کی بیماریوں کو وجہ بنا کر پاپا نے اپنی پرسنل سیکریٹری میں دلچسپی لینا شروع کردی جو کہ ان کی پسند کے عین مطابق آدھے ادھورے کپڑے پہن کر جانِ محفل بنی رہتی تھیں۔ مما تک یہ خبریں آتی تھیں مگر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مما کو سلو پوائزن بھی دیا گیا تھا بہرحال میں 6th اسٹینڈرڈ میں ہی تھی کہ مما چل بسیں اور میں اکیلی رہ گئی۔ دادا کے لیے دادی تھیں اور پاپا اپنے لیے اپنی پرسنل سیکریٹری کو لے آئے۔ شزاء آنٹی خود کو مام کہلوانا پسند کرتی تھیں مگر میرے لیے وہ آنٹی ہی رہیں اور پاپا ان کے مام ہوتے ہی خود بخود ڈیڈ ہوگئے۔ باپ والے نہیں اصل والے ڈیڈ (Dead)۔ کیونکہ وہ قطعی بھول گئے کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے جو ان کی پہلی شادی سے ہے۔ بیوی کا لفظ اس لیے نہیں کہا کہ بیوی تو ان کے لیے اپنی زندگی میں ہی Dead تھی۔ ان کی نئی بیوی کو مجھ سے چڑ تھی اور وہ اپنی بیوی کے بے دام کے غلام سو مجھے کراچی سے اٹھوا کر مری کے مشنری اسکول میں داخل کروادیا گیا۔

وہ سب اپنی اپنی زندگی میں مشغول ہوگئے اور بھول گئے کہ میرا وجود بھی ان کی زندگیوں میں موجود ہے۔ ہاں اسکول اور ہاسٹلز کے چارجز کے علاوہ میری ضرورت کی ہر آسائش مجھے مہیا تھی۔

شروع شروع میں، میں بہت چپ چپ رہتی تھی مجھے ہر وقت اپنی ماں کی بے بسی کی موت یاد آتی تھی، اپنے باپ کے مظالم یاد آتے تھے۔ محض سوئم کے اگلے ہی دن شزاء آنٹی کو گھر لے آنا یاد آتا تھا۔ مجھے اپنی ماں پر ترس آتا تھا کہ وہ اتنے عرصے میں میرے باپ کے دل میں اتنی بھی جگہ نہ بنا سکیں کہ میرا باپ ایک ہفتہ ہی ان کا سوگ منالیتا۔

☆☆☆

میری دوستی لینا سے ہوگئی وہ عیسائی تھی مگر کم و بیش میرے والے ہی حالات کا شکار تھی۔ اس کے مام ڈیڈ کی لو میرج تھی مگر اس کے باپ کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے بھی وہی کیا جو میرے باپ نے کیا۔ وہ اسلام آباد سے تھی۔ بس ہم تھے اور ہماری شرارتیں، ہماری شرارتوں سے ہماری ساری ٹیچرز پناہ مانگتی تھیں۔ ہم دونوں انگلش مووی "Problem Child" سے متاثر تھے۔ ہم نے اپنی ٹیچرز کو اتنا ہی زچ کیا جتنا کہ اس بچے نے کیا تھا بس فرق صرف اتنا تھا کہ ہمیں اسکول اور ہاسٹل سے نکالا نہیں گیا تھا شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ہم دونوں شرارتی جتنی بھی تھیں مگر ذہین بہت تھیں۔

بس ہم دونوں کا برا وقت تب شروع ہوتا تھا جب چھٹیاں پڑنے والی ہوتی تھیں۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ کسی طرح ہاسٹل میں ہی رک جائیں مگر ایسا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ تب ہم کوشش کرتے تھے کہ جب تک پورا ہاسٹل خالی نہ ہوجائے تب تک نہ جائیں ہم اکثر ہی مری یا تراکو نکل جاتے گلیات، گھوڑا گلی، سینٹ لارنس کالج کے لمبے لمبے راستے ناپتے، آدھی آدھی چھٹیاں گذار کر گھر جاتے۔

اور ویسے بھی گھر میں کون ہمارا انتظار کررہا ہوتا تھا۔ دادا دادی کے اپنے بوڑھوں کے گروپس تھے وہ وہاں نکل جاتے تھے۔ آنٹی دوپہر کو اٹھ کر کہیں نکل جاتیں اور پاپا صبح سے نکلے ہوتے تھے۔ آنٹی کی بڑی شدید خواہش تھی کہ ان کے گھر بیٹے کی پیدائش ہو جو پاپا کی ساری جایداد کا مالک ہو مگر وہ ابھی تک اس سلسلے میں محروم تھیں اور اس دن پتا نہیں ان کے دل میں کیا آیا کہ مجھ سے کہنے لگیں کہ ''حریم! دعا

کرو اللہ سے تمہارا بھائی آجائے۔'' وہ لبوں پر مسکراہٹ لاکر بناوٹی انداز میں بولی تھیں۔

''قطعی نہیں۔ آپ کیا سمجھتی ہیں میری ماں کے مرقد پر آپ نے اپنا محل تعمیر کرلیا ہے قطعی نہیں۔ آپ کو لگتا ہے میں نے آپ کو معاف کردیا، قطعی نہیں۔ آپ میری بددعاؤں میں میری ماں کی زندگی میں بھی تھیں اور اب بھی ہیں۔ جب تک میں یا آپ ہم دونوں میں سے کوئی بھی زندہ ہے میری بددعاؤں میں شامل رہیں گی اور بیٹا آپ کو اس لیے چاہیے ناں کہ اس طرح آپ میرے باپ کو بھڑکا کر ساری جایداد اس کے نام کروالیں تو یہ آپ کی بھول ہے۔ میرے بالغ ہونے تک یا چلیں چھوڑیں اپنے مرنے تک جتنا اپنے خاندان کو نوازنا ہے نوازلیں پھر بے نام ونشان مرجائیے گا کیونکہ یہ جایداد کل بھی سارہ راحیل کی بیٹی حریم راحیل کی تھی آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔'' میں نے تمسخر سے کہا۔ میرے ہر لفظ کے ساتھ ان کے لبوں کی مسکراہٹ ختم ہورہی تھی، ان کا چہرہ بگڑ رہا تھا۔

''تمہیں نہیں پتا حریم! میں کیا چیز ہوں اور تم نے کس سے پنگا لیا ہے اب دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔ تمہاری ماں جب میرے سامنے نہیں ٹھہر سکی تو تم کیا چیز ہو۔'' وہ جو اس وقت کوئی خون آشام چڑیل نظر آرہی تھیں پھنکاری تھیں۔

''آپ ایک بات بھول رہی ہیں مسز راحیل! کہ میں سارہ راحیل نہیں حریم راحیل ہوں۔ سارہ راحیل نے زندگی میں صرف سرینڈر ہونا سیکھا تھا جبکہ حریم راحیل نے سب کچھ سیکھا بس سرینڈر ہونا نہیں سیکھا۔ آپ ہر مقام پر مجھے اپنے مقابل پائیں گی۔'' میں چیلنج کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے مجھے بڑی کینہ توز نظروں سے گھورا تھا۔

☆☆☆

پھر ہم تھے اور ''جیسز اینڈ میری کانونٹ اسکول'' تھا۔ وقت کے ساتھ مجھ میں اور لینا میں بردباری آتی گئی۔ یہاں پر میری سب سے پسندیدہ ٹیچر سسٹر جوزفین تھیں وہ بڑی ینگ ایج میں نن بن گئی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں ایک حزن وملال آکر ٹھہر سا گیا تھا۔ وہ پڑھاتی بھی بہت اچھا تھیں۔ ان کے سمجھانے کا انداز بھی بہت اچھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہمیں زندگی گذارنے کے اصول بھی سکھاتی تھیں۔ میری ان سے خاصی دوستی تھی مگر میں جب بھی ان کے چہرے کے حزن وملال کی بات کرتی تو وہ بات بدل دیتی تھیں۔

پتا نہیں مجھے بھی کیوں ضد سی ہوگئی تھی کہ میں ان کے بارے میں جان کر رہوں گی... لینا میرے عزائم جانتی تھی اور وہ اکثر کہتی ''او چھڈ یارا، زندگی میں بڑے بڑے دکھ نپٹنے کے لیے'' مگر مجھے سسٹر جوزفین کی غمزدہ آنکھوں کا راز جاننا تھا۔ مجھے اس اسرار کا پتا لگانا تھا کہ وہ محض 22 سال کی عمر میں کیوں دنیا تیاگ کر بیٹھی تھیں وہ ہنوز ٹالتی ہی چلی جارہی تھیں۔

ان ہی دنوں لینا کو اپنے کزن ایرک سے بڑی طوفانی محبت ہوگئی مگر اس محبت میں بھی بڑی کٹھنائیاں تھیں کیونکہ ایرک ممی کے پہلے شوہر یعنی لینا کے باپ کا بھتیجا تھا اور لینا کا سوتیلا باپ اس کے باپ کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک ان دیکھی انجانی سی جلن تھی اس شخص میں لینا کے باپ کے حوالے سے۔ یہ جلن اور کھولن اکثر ہی لینا پر نکلتی بھی تھی تو جو شخص اس مردہ شخص کے نام تک سے خائف تھا تو وہ اس کے زندہ بھتیجے کو کیسے برداشت کرلیتا اور اس بات پر گھر میں کئی معرکے ہوچکے تھے۔

مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

''اگر آسانی سے نہیں مانے تو کورٹ میرج کرلوں گی۔'' وہ آرام سے کہتی۔ میں بھی اس کی ہم نوا تھی مگر جب سسٹر جوزفین کو پتا چلا تو انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔

''لینا! کسی بھی انتہا تک جانے سے پہلے ایرک کو جانچ ضرور لینا کہ وہ تمہارے ساتھ کس مقام پر کھڑا ہے، آیا اسے تم سے محبت ہے بھی یا وہ صرف فزیک سے متاثر ہے... تمہارے جسم کا طالب ہے کیونکہ اگر وہ صرف تمہارے جسم کا طالب ہے تو اس کے لیے اسٹینڈ لینا بیکار ہے۔ ایسی صورت میں تمہارے آگے کھڈا اور پیچھے کھائی ہوگی۔ تم نہ آگے بڑھ سکوگی نہ پیچھے ہٹ سکوگی۔'' سسٹر نے اسے سمجھایا تھا۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں درد ہلکورے لے رہا تھا۔

''میں اسے بہت بار آزما چکی ہوں سسٹر! میں نے اس کے ساتھ بہت برا برا برتاؤ کیا ہے۔ اسے ہر طرح سے زچ کرکے دیکھ لیا ہے مگر وہ بہت محبت کرتا ہے مجھ سے۔ کئی بار اسے موقع ملا کہ وہ مجھے پامال کرسکے مگر وہ بہت عزت کرتا ہے میری، مجھے اپنی عزت بنانا چاہتا ہے۔'' لینا کی آنکھوں میں نمی چمکی اور سسٹر نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

"God Bless You" انہوں نے دعا دی اور

میں نے انہیں غور سے دیکھا تھا۔ وہ خود بھی رو رہی تھیں اور تب مجھے ادراک ہوا کہ وہ محبت کی ڈسی ہوئی ہیں۔۔۔ اب تو مجھے پکا ان کے بارے میں جاننا تھا۔

☆☆☆

ان ہی دنوں پاپا مجھے ویک اینڈ پر آکر گھر لے گئے۔ ایسا زندگی میں شاید پہلی ہی بار ہوا تھا۔ مجھے حیرت سے زیادہ خدشات تھے۔ مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ اس ناگن نے اپنی پہلی چال چلدی ہے اور وہ چال کیا تھی یہ مجھے وہاں پہنچ کر پتا چلا۔

''حریم بیٹے! تمہاری مام نے تمہارے لیے لڑکا پسند کیا ہے۔ ان کا بھتیجا ہے اس نے حال ہی میں MBA کیا ہے اب رشتے داری جڑے گی تو میں اسے اپنے ساتھ کاروبار میں شامل کرلوں گا۔'' پاپا نے بتایا اور میں اش اش کر اٹھی۔ کیا اعلیٰ دماغ پایا ہے اس عورت نے کیا گیم کھیل رہی تھی۔

''واہ! فنی (Funny) جو کام مجھے کرنا تھا وہ آنٹی نے کرلیا۔ ویسے آنٹی آپس کی بات ہے آپ نے اپنے لیے لڑکا پسند کرلیا ہے وہی کافی ہے میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔'' میں نے کہا۔

''حریم۔'' پاپا نے فوراً مجھے تنبیہہ کی۔

''جی۔'' میں نے فوراً پاپا کی طرف رخ کیا۔

''ماں ہے تمہاری تمیز سے بات کرو۔'' انہوں نے برہمی سے کہا۔

''سوری پاپا! میری ماں ایک ہی تھی سارہ راحیل جو کہ اب منوں مٹی تلے سو چکی ہے۔'' میں نے آنکھ کے کونے سے نمی پونچھی۔

''بہرحال جواد اچھا لڑکا ہے تم چاہو تو اس سے مل سکتی ہو۔'' انہوں نے مجھے ایک اور آپشن دیا جسے میں نے فوراً رد کردیا۔

''پاپا! آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارا ایج ڈفرنس خاصا ہے وہ MBA کرچکا ہے اور میں ابھی او لیول کررہی ہوں۔ ماما کی مہربانیوں کی وجہ سے خاصی ارلی ایج یعنی صرف 14 سال کی عمر میں کررہی ہوں۔'' میں نے ایک اور توجیہہ پیش کی۔

''ہاں تو 14 اور 22 میں کون سا زیادہ فرق ہے محض آٹھ سال کا اور اتنا فرق تو ہونا ہی چاہیے لڑکے اور لڑکی میں۔'' انہوں نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

''آنٹی! اللہ کو مانیں اتنی بھی نہ پھینکیں'' دیکھ رکھا ہے میں نے جواد بھائی کو، 28 سال سے کم کے نہیں ہے۔ آدھے فارغ البال ہو چکے ہیں، انکل ٹائپ لگتے ہیں۔'' میں نے پاپا کا لحاظ نہیں کیا۔

''مرد کی عمر کون دیکھتا ہے۔'' انہوں نے بے پروائی سے کہا گویا انہوں نے قبول لیا کہ جواد بھائی اسی عمر کے تھے جو میں نے بتائی تھی۔ غالباً اس بات کو پاپا نے بھی محسوس کیا تھا انہوں نے چونک کر اپنی عزیز از جان بیوی کو دیکھا تھا۔

''آپ نہیں دیکھتی ہوں گی میں دیکھتی ہوں۔'' میں نے ان پر چوٹ کی اور انہوں نے تلملا کر مجھے دیکھا۔

''کیونکہ میرے پاس وہ سب پہلے سے موجود ہے جسے حاصل کرنے کے لیے آپ میرے گرد تار عنکبوت بن رہی ہیں مگر آپ غالباً جانتی نہیں کہ تار عنکبوت سب سے بودا گھر ہے صرف ایک ہاتھ کی مار ہوتی ہے اور سب فنا۔'' میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی میں نے یہ باب ہی بند کردیا اور پاپا نے بھی۔

☆☆☆

اس بار سردی بہت پڑی تھی۔ سارا علاقہ سفید سفید نرم نرم برف سے بھر گیا تھا سردیوں کی چھٹیاں بڑھ گئی تھیں مگر اس سے پہلے ہی گھر سے فون آگیا تھا۔ پاپا آنٹی کے ساتھ یورپ چلے گئے تھے دادا دادی اپنے کسی رشتے دار سے ملنے پنڈی چلے گئے تھے سو مجھے اگر کراچی آنا تھا تو اکیلے سائیں سائیں کرتے گھر میں ملازمین کے ساتھ رہنا ہے۔ آنٹی ہمیشہ مجھ پر اس جگہ سے وار کرتی تھیں جہاں سے انہیں معلوم ہوتا تھا کہ مجھے تکلیف ہوگی۔ پاپا ماما کو گھر سے بھی باہر نہیں لے کر جاتے تھے، وہ ہمہ وقت گھر میں قید رہتی تھیں جبکہ پنجرے تک بنانے میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اس کے گرد جالی کی دیواریں ہوں تاکہ باہر کا منظر نظر آتا رہے۔ ہم جانوروں تک کی طبع نازک کا خیال رکھتے ہیں اور پاپا کے لیے ماما کسی جانور سے بھی گئی گذری تھیں، انہوں نے انہیں اس بلند و بالا دیواروں کے محل میں قید کردیا تھا۔ وہ نمک کی شہزادی تھیں جو اپنے ہی آنسوؤں سے گھل گئی تھیں۔ سو جب پاپا آنٹی کو ابروڈ لے کر جاتے تھے تو قدرتی طور پر مجھے تکلیف ہوتی تھی۔

میرے لیے احکامات تھے کہ میں پنڈی اپنے دادا دادی کے پاس چلی جاؤں۔ ہاسٹل آہستہ آہستہ خالی ہورہا تھا اور میرا نہ کراچی جانے کا دل تھا نہ پنڈی، لیکن کہیں نہ

کہیں تو جانا تھا ہی بہر حال ایک دن میں نے سسٹر جوزفین کو گھیر لیا مگر وہ ہاتھ آنے والی کہاں تھیں آسانی سے۔

''حریم! تم ابھی بہت چھوٹی ہو ان معاملات کو جاننے کے لیے۔'' انہوں نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے پھر آپ میرے بڑے ہونے کا انتظار کریں تاکہ میری بھی لاش ایک دن میرے گھر والوں یا کانونٹ والوں کو بستر پر پڑی یا پنکھے سے جھولتی ہوئی ملے لینا کی طرح۔'' میں نے بڑی بے رحمی سے کہا تھا اور سسٹر جوزفین بڑی زور سے میرا نام لے کر چلائی تھیں، انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ عموماً سسٹرز اس قسم کی جذباتیت سے دور ہوتی ہیں مگر وہ سسٹر جوزفین تھیں باقی سسٹرز سے قطعی مختلف اور الگ۔

''نہیں میں تمہیں لینا نہیں بننے دوں گی میں تمہیں سب بتاؤں گی۔'' وہ رو رہی تھیں۔

ابھی کچھ عرصہ قبل ہی لینا نے خودکشی کر لی تھی۔ لینا کا سوتیلا باپ ایرک پر الزام لگاتا تھا ایرک اس کے باپ کو بلیم کرتا تھا اور اس کی ماں خاموش تھی۔

میں اور سسٹر جوزفین ابھی تک اس حادثے کے بداثرات سے نہیں نکلے تھے کہ ایک ہنستی کھیلتی اور زندہ دل لڑکی نے اتنا خطرناک فیصلہ کیسے کر لیا تھا، وہ تو بہت پُراُمید تھی کہ زندگی سے اپنی خوشیاں چھین لے گی۔

☆☆☆

''میرا تعلق کٹر کیتھولک فرقے سے تھا۔ ہم عیسائیوں میں بھی دو فرقے ہیں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک۔ جیسے تم لوگوں کے فرقے یا مسلک ہوتے ہیں ویسے ہی ہمارے بھی فرقے ہیں۔ میرے گھر والے بہت کٹر قسم کے مذہب پرست تھے اور چاہتے تھے کہ میں بھی ان کے رنگ میں رنگ جاؤں مگر میں نے کبھی ان چیزوں کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں۔ میرے سب بہن بھائی باقاعدگی سے چرچ جاتے تھے۔ میرے علاوہ میرے گھر والے چاہتے تھے کہ میں کسی دوسرے مذہب کے لوگوں سے نہ ملوں لیکن میرے تقریباً ہر مذہب کے ماننے والے دوست تھے۔

ان میں پارسی، ہندو، عیسائی (پروٹسٹنٹ)، بوہری، بدھ مت، مسلم، آغا خانی گو جتنے مذاہب پاکستان میں پائے جاتے ہیں سب ہی دوست تھے مگر تین لوگوں سے سب سے زیادہ دوستی تھی ایک مورا ک تھا جو پروٹسٹنٹ عیسائی تھا دوسرا روہن تھا جو کہ ہندو تھا اور تیسرا حاشر تھا جو کہ مسلم تھا۔

یہ تینوں ہی مجھے پسند کرتے تھے اور مجھے یہ بات اچھی طرح سے معلوم تھی۔

مگر میرا اپنا دل حاشر کی جانب جھکتا تھا۔ میرے گھر والوں کو سب سے زیادہ اعتراض حاشر پر ہی تھا۔

''بقول ان کے مسلمان جادوگر ہوتے ہیں۔ اپنے سحر میں پھنسا لیتے ہیں۔ مذہبی جنونی اور شدت پسند ہوتے ہیں۔ جنسی جنونی ہوتے ہیں۔ ایک ایک وقت میں چار چار شادیاں کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ ان کی معلومات تھیں اور میرا مشاہدہ تھا کہ ان کی صرف پہلی بات درست تھی۔ حاشر ساحر ہی تھا اور اس نے مجھے اپنے سحر میں پھنسا لیا تھا مگر وہ شدت پسند نہیں تھا، وہ اپنا نقطۂ نظر واضح ضرور کرتا تھا مگر اسے کسی پر مسلط نہیں کرتا تھا جبکہ میرے گھر والے شدت پسند اور روہن اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنے والا تھا۔ رہ گئی جنسی جنون کی بات تو میں نے سب سے زیادہ پاکیزگی بھی حاشر کی نظروں میں ہی محسوس کی تھی۔ وہ اپنی نظروں کی حفاظت کرتا تھا۔ میں پاکستانی معاشرے میں رہنے کے باوجود اپنے لباس کے سلسلے میں محتاط نہیں تھی اور حاشر اکثر مجھے ٹوک دیتا، لباس مکمل پہنا کرو جوزفین یہ عیسائیت کی تعلیم کے بھی خلاف ہے۔'' اور میں ہنسی میں اڑا دیتی۔

مگر روہن اور موراک میرے لباس سراہتے تھے اور بڑے کھلے ڈلے کمنٹس دیتے Looking Hot یا Looking Sexy ٹائپ۔

وقت گذرتا چلا گیا ہم نے اسکول سے کالج اور پھر یونیورسٹی کا سفر ساتھ شروع کیا۔ میں حاشر کے کردار و عمل سے متاثر ہوتی چلی گئی۔ میرا پکا ارادہ تھا کہ میں مذہب اسلام کا مطالعہ کر کے شادی سے پہلے ضرور اسلام قبول کر لوں گی۔ حاشر کو میں نے اپنا جیون ساتھی مان لیا تھا۔

انہی دنوں کی بات ہے میرے گھر والے ایک شادی کے سلسلے میں لاہور گئے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ ہماری ایک میڈ رکی ہوئی تھی۔

وہ پورا دن میرے پاس رکتی تھی مگر رات میں چلی جاتی تھی۔ اس کے اپنے بھی چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ایسا ہی ایک دن تھا میڈ جا چکی تھی کہ اچانک میرا دل گھبرانے لگا اور مجھ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میں نے اپنی حالت سے گھبرا کر حاشر کو فون کر کے گھر آنے کو کہا مگر اس نے فوراً معذرت کر لی۔

''سوری جوزفین! اس وقت تم گھر پر اکیلی ہو رات کے اس پہر میں تمہارے پاس نہیں آسکتا۔'' اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

''میں گھر پر اکیلی ہوں اس لیے تم یہ بھی خیال نہیں کرو گے کہ میری طبیعت بگڑ رہی ہے میں مرنے والی جیسی کیفیت میں ہوں۔ میں تمہیں اتنا کمزور نفس نہیں سمجھتی تھی۔'' میں چلّائی تھی۔

''بات نفس کی کمزوری کی نہیں ہے جوزفین! بات نفس کو امتحان میں ڈالنے کی ہے بہرحال میں کوشش کرتا ہوں آنے کی۔'' اس نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے دروازہ کھول دیا میں بے ہوشی میں چلی گئی اور صبح میں جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنا سب کچھ لٹا چکی تھی۔ وہ اپنی نظروں تک کی حفاظت کرنے والا اپنے نفس کی حفاظت نہ کرسکا۔ میں لباس کے سلسلے میں بے پروا ضرور تھی مگر بدکردار نہیں تھی۔ اس نے مجھے داغدار کردیا۔ وہ بری طرح رو رہی تھیں۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا یہ میرے گھر والوں کے بدترین خدشات تھے جن کی تصدیق ہوگئی تھی۔ میں کیسے اپنے گھر والوں کو یہ سب بتاتی اور پھر میں نے نن بننے کے لیے ضد کرنی شروع کردی۔ میرے گھر والے مجھے مذہبی تو بنانا چاہتے تھے مگر وہ اس راہبانہ زندگی کے خلاف تھے مگر میرے آگے ان کی ایک نہ چلی اور میں یہاں آگئی۔ آج سردی روزانہ سے زیادہ تھی۔ ہم دونوں موسم کی شدت سے بے نیاز ہاسٹل کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ سامنے سفید سفید برف اسٹفڈ ٹوائز کے اسٹف کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ اونچے اونچے درختوں نے سر پر برف کی اوڑھنی اوڑھ رکھی تھی۔ ہر جانب برف ہی برف تھی سوائے سسٹر جوزفین کی آنکھوں کے جو بری طرح سے برس رہی تھیں اور میں گنگ بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی۔

''تو پھر کبھی حاشر آپ سے نہیں ملے؟'' میں نے پست آواز میں پوچھا۔

''نہیں اس نے بہت کوشش کی مگر میں ہی کبھی نہیں ملی اس سے۔'' سسٹر جوزفین نے کہا۔

''کیوں ملنے کی کوشش کرتا رہا ہے وہ آپ سے کیا اسے کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوئی۔'' میں تڑخی تھی۔

''شاید وہ شرمندہ ہو، معافی مانگنا چاہتا ہوگا مگر میرا دل نہیں چاہتا اسے معاف کرنے کے لیے، بہت چاہا تھا میں نے اسے، میں مذہب تک تبدیل کرنے کے لیے تیار

بہترین کتاب

مسلم ہسپانیہ میں قائم ہونے والی مسلمانوں کی وہ عظیم الشان سلطنت کہ جس کا علمی سرمایہ آج بھی دنیا بھر کی جامعات میں موجود ہے، دراصل یورپ میں روشن خیالی اور آزادیٔ اظہار رائے کو فروغ دینے کا باعث بنا لیکن اس بات کا ذکر بھی قوموں کی زندگی کے عروج وزوال کی یاد دلائے گا کہ جب اسی سلطنت کے آخری چشم و چراغ کو فرڈیننڈ (Fredind) نے غرناطہ کی ایک ایسی جیل میں قید کیا کہ جہاں سے مسجد قرطبہ اور عبدالرحمن اوّل کا بنایا ہوا محل نظر آتا تھا اس بادشاہ کا گریہ دیکھ کر اس کی ماں نے کہا۔ ''تو عورتوں کی طرح اس سلطنت کے چھن جانے پر آنسو بہا رہا ہے جسے تو مردوں کی طرح بچا نہ سکا۔''

مرسلہ: سلطانہ حزین، حیدرآباد

1965ء کی جنگ اور یاور مہدی

پاکستانی قوم کی یہ خاصیت رہی ہے کہ اس نے ہر مشکل وقت میں اندرونی اور بیرونی دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے خواہ وہ طالبعلم ہو یا صنعت کار، سرکاری عہدہ دار ہو یا عام شہری، سب نے قوم کی پکار پر لبیک کہا، تو بھلا یاور مہدی اس دوڑ میں کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ ان کی قومی ذمّے داریوں کا ایک مظاہرہ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران دیکھنے میں آیا، جب یاور مہدی نے اس مشکل مرحلے میں پاکستانی عوام کو باخبر رکھنے سے لے کر جذبہ حب الوطنی کی نشرو اشاعت تک ہر معاملے میں ریڈیو جیسے موثر نشریاتی ادارے کو ہر کام میں آگے رکھا۔

مرسلہ: نبّی جامی، کراچی

تھی مگر وہ.....'' ان کے رونے میں شدت آچکی تھی۔

''وہ تو اب بھی آٹھ ماہ گذرنے کے باوجود مجھ سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی تھیں۔

''میں ملوں اس سے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا تھا۔ میری آواز سردی کی شدت سے بھانپ بن کر باہر نکلی تھی۔

''نہیں۔'' جواب بڑی قطعیت سے آیا تھا۔

''مگر میں ملوں گی اس سے۔'' میرے لہجے میں بھی قطعیت اتر آئی۔

''کیوں، کیوں ملوگی اس سے، وہ واقعی ساحر ہے سحر کردیتا ہے اور میں تمہیں کسی تجربے کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتی تم بہت خالص ہو حریم اور میرے لیے بہت خاص۔'' وہ روہانسی ہوگئی تھیں۔

''اس لیے ملوں گی اس سے کہ اگر وہ شرمندہ نہیں ہے تو اس کا بھیانک چہرہ آئینے میں دکھاؤں اور اگر وہ شرمندہ ہے تو اس سے پوچھوں کہ اس نے کیوں کیا یہ سب اس لڑکی کے ساتھ جو پہلے سے ہی اس کی تھی۔'' میں قطعیت سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

چھٹیاں کافی تھیں اور مجھے گھر نہیں جانا تھا مجھے ان چھٹیوں میں کئی کام مکمل کرنے تھے۔ ان میں سے ایک کام حاشر سے ملاقات بھی تھا۔

کاش میں سسٹر جوزفین کی بات مان لیتی اور نہ ملتی حاشر سے وہ واقعی ساحر تھا اس نے مجھے بھی سحر زدہ کردیا۔ میں نے سسٹر اور حاشر کی ملاقات کس طرح ارینج کی یہ اپنے اندر ہی ایک بہت بڑی کہانی ہے بہرحال سسٹر اس سے ملنے پر راضی ہوگئیں اور تب پتا چلا کہ حاشر تو اس دن ان کے گھر ہی نہیں آیا تھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا ناں جوزفین! کہ تم گھر میں اکیلی ہو میرا آنا مشکل ہے مگر تمہارے زور دینے پر میں نے کہا تھا کہ میں کوشش کرتا ہوں یہی بات ہوئی تھی ناں!'' حاشر نے پوچھا اور سسٹر نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

''اس کے بعد میں نے اپنی بہن کو راضی کرنے کی کوشش کہ وہ میرے ساتھ چلے مگر اس کے لیے امی راضی نہیں ہوئیں۔ سو نہ آنا میری مجبوری بن گئی۔ میں نے اس کے بعد کئی بار تمہارے سیل اور لینڈ لائن پر کالز کیں مگر تم نے ریسیو نہیں کیں تو میں نے موراک کو کال کی وہ کسی تقریب میں تھا۔ مجبوراً میں نے روہن کو کال کی اور اسے کسی خاتون کے ساتھ تمہارے گھر جانے کو کہا تھا۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''خود سوچو جوزفین میں تم سے محبت کرتا ہوں، میں کیوں تمہیں پامال کروں گا۔ اب بھی یہ سب ہوجانے کے باوجود... میں تمہیں اپناؤں گا۔'' وہ محبت سے بولا تھا لیکن جوزفین ابھی اسے سن کہاں رہی تھیں وہ تو کڑی سے کڑی جوڑ رہی تھیں، اوہ تو روہن۔ جبھی اس دن کے بعد سے روہن نہ کبھی ان سے ملا تھا اور نہ ہی آج تک اس نے ان سے بات کی تھی۔ کال تک نہیں کی تھی۔ معاملہ صاف ہوچکا تھا کاش وہ اس وقت حاشر کی بات سن لیتیں اس سے بات کرلیتیں تو آج یوں اس طرح تنہا نہ ہوتیں۔

''چلوگی نا میرے ساتھ۔'' حاشر نے بڑے مان سے پوچھا تھا تو وہ بڑی بے بسی سے مسکرائی تھیں اور نفی میں سر ہلایا۔

''میں نے خدا کے بتائے ہوئے راستے پر زندگی گذارنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اب تو بہت دیر ہوچکی ہے کاش میں نے پہلے تمہاری بات سن لی ہوتی مگر اب یہ سب ناممکن ہے۔'' وہ دکھ سے بولیں۔ ''کاش میں تمہیں اپنا گناہ گار ہی سمجھتی رہتی، کاش میں تم سے نہ ملتی مگر اب تو اور بھی مشکل ہوگیا ہے یوں جینا۔ بہت تکلیف ہورہی ہے۔ کتنی تکلیف ہوتی ہے ناں! جب محبت آپ پر مہربان ہو اس سے منہ موڑنا۔'' وہ رو رہی تھیں۔

''نہیں جوزفین! یہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ نہیں ہے کسی بھی آسمانی کتاب میں بن باس لینے کو نہیں کہا گیا ہے۔ کہیں بھی تارک الدنیا ہونے کو نہیں کہا۔ دنیا میں رہ کر اس کی آسائشات کو دیکھتے ہوئے تقویٰ اختیار کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔'' حاشر نے کہا۔

''پھر بھی حاشر! اب بہت مشکل ہے میرے گھر والے کٹر مذہبی تھے مگر پھر بھی انہوں نے مجھے اس راستے پر چلنے سے روکا تھا۔ غالباً وہ واقف تھے اس راستے کی مشکلات اور کٹھنائیوں سے مگر میں نہیں مانی۔ میں پہلے بھی ان کی نافرمان اولاد تھی اب مزید نہیں ہونا چاہتی نہ ان کی نہ اپنی نہ اپنے خدا کی۔'' انہوں نے قطعی لہجے میں کہا اس کے بعد بھی حاشر بہت کوشش کرتے رہے وہ روتی تھیں وہ دکھی تھیں مگر انہوں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔

☆☆☆

ابھی کچھ چھٹیاں باقی تھیں کہ میں لاہور کی طرف عازم سفر ہوئی۔ وہاں مجھے لینا کی ماما سے ملنا تھا۔ لینا کی ماما اب اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ نہیں تھیں وہ اپنی والدہ کے ہمراہ رہ رہی تھیں۔ مجھے حیرت تو ہوئی مگر میں نے اس پر زیادہ سوچا نہیں۔ میں ان سے تعزیت کرنے آئی تھی اور یہاں سے پتا چلا کہ یہاں پر بھی مجرم محبت نہیں تھی۔ ایرک واقعی اس سے پاکیزہ محبت کرتا تھا نیت بری اس کے سوتیلے باپ کی تھی اور ایک دن گھر میں اکیلے پا کر اس کے سوتیلے باپ کا داؤ چل گیا اور جب اس شیطان کو احساس ہوا کہ وہ کیا کر چکا ہے تو اس نے لینا کو مار کر خودکشی کا رنگ دے دیا اور اب وہ جیل میں تھا۔ تکلیف کیا ہوتی ہے کوئی پوچھتا مجھ سے۔ وہ میری ہمدم و ہمراز دوست اس کسمپرسی میں دنیا سے گئی تھی میں دل پر بوجھ لیے واپس ''جیسز اینڈ میری کانونٹ'' آ گئی۔

تمام بات سسٹر جوزفین کو بتائی اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کے خوب روئے وہ شاید اپنے دکھ پر روئیں اور میں اپنے دکھ پر۔

☆☆☆

مجھے کوئی یہی ایک دکھ تھوڑی تھا۔ اب تو میری زندگی میں درد بھی موجود تھا حاشر سے محبت کا درد اور وہ بھی یک طرفہ محبت کا درد۔ تو طے ہوا کہ ہم دونوں ایک ہی دکھ کے درد میں مبتلا ہو کر روئے تھے۔

میرا او لیول کمپلیٹ ہو گیا تو میں کراچی آ گئی اے لیول میرا یہیں کراچی سے کرنے کا ارادہ تھا کیونکہ کراچی میرا ہی نہیں حاشر کا بھی شہر تھا اور میں اسی شہر میں رہنا چاہتی تھی جہاں حاشر رہتے تھے۔ فون پر اب بھی اکثر ہماری بات ہو جاتی تھی۔ اس دن حاشر کی سالگرہ تھی۔ میں نے انہیں ''کولاچی'' میں انوائیٹ کیا تھا ایک خوبصورت سے گفٹ کے ساتھ میں وہاں ان کا انتظار کر رہی تھی تب وہ اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ وہاں آئے تھے۔

''لٹل گرل! کیا ضرورت تھی اتنا خرچا کرنے کی۔'' انہوں نے تکلف سے کہا۔

''میں کوئی لٹل گرل نہیں ہوں I Am 15 Year Old اور مجھے اچھا لگتا ہے آپ کے لیے کچھ کرنا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا مگر انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''میرے لیے بچی ہی ہو۔'' اب ان کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

''تو آپ کون سے بوڑھے ہیں مجھ سے چار، پانچ سال ہی بڑے ہوں گے۔'' میں نے ان کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

''5,4 سال نہیں میں تم سے پورے آٹھ سال بڑا ہوں۔'' وہ قطعیت سے بولے۔

''اور تم میرا نام مت لیا کرو بھائی کہا کرو۔'' انہوں نے لائن کھینچی۔

''جب بھائی سمجھتی ہی نہیں تو بھائی کیوں بولوں۔'' میں نے لائن کراس کی۔

''شٹ اپ حریم! الف از الف۔'' وہ میری بات کو پا چکے تھے۔

"I Love You Hashir" میں نے کہا اور ان کا ہاتھ اٹھا تھا مگر انہوں نے درمیان میں ہی روک لیا۔

''گڑیا! تم ان معاملات کے لیے ابھی بہت چھوٹی ہو بڑی ہو گی تو ان باتوں کو سوچ کر ہنسا کرو گی۔'' انہوں نے مجھے بہلایا۔

''میں نے زندگی کو جس طرح برتا ہے ناں! حاشر! میری سوچ وقت سے پہلے ہی میچور ہو گئی ہے اگر میں نے آپ کو کھو دیا ناں! تو میں کبھی بھی ہنس نہیں سکوں گی میری زندگی میں صرف آنسو رہ جائیں گے۔'' میں نے دکھ سے کہا۔

''بہرحال اگر مجھ سے دوستی رکھنی ہے تو آئندہ اس موضوع پر بات نہیں ہو گی۔'' انہوں نے حتمی لہجے میں کہا اور میں بے بس ہو گئی۔

☆☆☆

اور بس پھر میری حاشر سے دوستی ہو گئی۔ انہوں نے اتنی سختی سے آئندہ اس موضوع پر بات کرنے سے منع کیا تھا کہ میں ڈر گئی کہ آئندہ کے لیے کہیں میں اس دوستی سے بھی نہ جاؤں۔ میں حاشر کو کھونا نہیں چاہتی تھی میری سسٹر جوزفین سے بھی ویسی ہی دوستی تھی۔ میں حاشر کے گھر بھی جاتی تھی ان کی امی، ابو اور بہن بھائیوں سے بھی میری بڑی اچھی دوستی تھی۔

آنٹی اب بھی اپنے خاندان کے نمونوں سے میری شادی کروانے کے چکروں میں مصروف تھیں مگر میں نے ایک دن براہِ راست پاپا سے بات کر لی۔

''پاپا! آپ آنٹی کو اپنی زبان میں سمجھا دیں کہ مجھے ان کے خاندان میں شادی نہیں کرنی ہے، لہٰذا وہ اپنی توانائیاں یہاں نہ ضائع کریں۔'' میرا لہجہ قطعی تھا۔

''کیوں اس میں برائی کیا ہے اور اگر میں بھی اس کا حامی ہوں تو؟'' انہوں نے مجھے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''تو کوشش کیجیے گا کہ مجھ سے زور زبردستی نہ ہو ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی مگر اس خاندان میں کبھی نہیں جاؤں گی اور برائی۔ برائی یہ ہے پاپا کہ میں اپنی ماں کے قتل کی مسبب خاتون کے خاندان سے نفرت کرتی ہوں ان خاتون سمیت۔'' میں نے استہزائیہ کہا تھا اور پاپا نے چونک کر میرا چہرہ دیکھا۔

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟'' پاپا کا غصہ ہی نہیں بی پی بھی شوٹ کر گیا۔ آنٹی موقع غنیمت جان کر فوراً اندر آ گئیں۔

''کیا ہوا راحیل! سنبھالیں خود کو۔'' وہ مصنوعی فکرمندی سے بولیں اور فوراً گلاس میں جگ سے پانی بھر کر پاپا کو دیا۔

''کیا کیا ہے تم نے ان کے ساتھ۔ تم ان کی جان لے کر چھوڑو گی۔'' انہوں نے آگ لگانے کی کوشش کی۔

''میں نے کیا کیا ہے پتا تو ہے آپ کو آنٹی۔ یہیں باہر ہی تو موجود تھیں آپ۔'' میں نے آنٹی پر زور دے کر کہا۔ ''اور پاپا! میں اتنی بے خبر نہیں ہوں جتنا آپ مجھے سمجھتے ہیں میں کم عمر ضرور تھی اس وقت مگر بے وقوف نہیں تھی ایک معمولی نزلہ زکام کیسے ڈبل نمونیے میں تبدیل ہوا تھا مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ آپ دونوں کوشش کیا کریں کہ میں بولنے پر مجبور نہ ہوا کروں اور آنٹی اپنی تمام کوششیں ترک کر دیں میں مر جاؤں گی مگر آپ کے خاندان میں شادی کبھی نہیں کروں گی۔'' کہہ کر میں جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میرا اے لیول کمپلیٹ ہوا تو میں نے بی بی اے میں ایڈمیشن لے لیا اس دوران آگے پیچھے ہی دادا دادی کا انتقال ہو گیا ان دونوں کی ناانصافیوں کی وجہ سے مجھے کبھی بھی ان دونوں سے محبت نہیں تھی پھر بھی افسوس ہوا کچھ نہ کچھ رونق تھی ان دونوں کے دم سے۔ اب گھر ایک دم سے خالی ہو گیا تھا اور ایسے میں اگر آنٹی اور پاپا بھی کسی غیر ملکی ٹور پر چلے جاتے تھے تو گھر میں اُلو بولنے لگتے تھے۔

پاپا میری فیلڈ سے خوش تھے کیونکہ آگے چل کر میں نے ہی ان کا بزنس سنبھالنا تھا۔ ایسے ہی ایک بزنس ٹرپ پر وہ دونوں گئے ہوئے تھے کہ مجھ پر حملہ ہوا باقاعدہ میرے کمرے پر فائرنگ کی گئی مگر میرے ملازمین نے مجھے جان پر کھیل کر بچایا چوکیدار تو جان سے گیا اور ڈرائیور، مالی بہت زیادہ زخمی تھے۔ پاپا کو پتا چلا تو وہ پہلی دستیاب فلائٹ سے واپس آ گئے اور آنٹی مجھے گلے لگا کر مصنوعی فکرمندی سے بولیں۔

''کچھ پتا چلا کس نے کیا ہے یہ سب کچھ؟'' میں اس وقت اسپتال میں تھی کیونکہ میرے کمرے میں سامنے کے رخ پر گلاس وال تھی جس کے شیشے اڑ اڑ کر مجھے لگے تھے سو زخمی میں بھی تھی۔

''اسی نے جس کو میرے مرنے سے سب سے زیادہ فائدہ پہنچنے والا ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''مگر جب تک میرا اللہ میرے ساتھ ہے مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا تو وہ چوری بن گئیں۔ پاپا اس وقت فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔

''مجھے کچھ نہیں پتا 24 گھنٹے کے اندر مجھے وہ شخص اپنے سامنے چاہیے جس نے میرے گھر میں گھس کر میری بیٹی پر حملہ کیا ہے۔'' وہ شدید غصے میں تھے۔

''چھوڑیں پاپا! اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام آ جائیں گے۔'' میرے لہجے میں استہزائیہ تھا۔

''وہ کوئی بھی ہو میں چھوڑوں گا نہیں کسی کو بھی۔'' پاپا بہت غصے میں تھے اور میرے لیے یہی بہت تھا۔ آنٹی اب ایسا کوئی کام کرتے ہوئے ڈریں گی ضرور۔

حاشر بھی آئے تھے۔

''یہ تو حد ہے یعنی کہ تم اپنے گھر میں بھی محفوظ نہیں ہو۔'' حاشر نے فکرمندی سے کہا۔

''تو لے چلیں ناں حاشر! مجھے کسی محفوظ جگہ پر سب سے چھپا کر۔'' میں نے کہا تو انہوں نے ناراضگی سے مجھے دیکھا۔

''تمہارے دماغ کا خناس ابھی گیا نہیں ہے۔'' انہوں نے برہمی سے کہا۔

''خناس ہوتا تو چلا جاتا محبت نہیں جاتی اگر کہیں ڈیرہ ڈال لے کہیں قیام کر لے کہیں پڑاؤ ڈال لے۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''ہاں محبت نہیں جاتی۔'' وہ مجھ سے زیادہ بے بسی سے بولے اور اس بات کو کہاں لے گئے تھے میں اچھی طرح جانتی تھی سو خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

مجھ پر حملہ کروانے والے کے ڈانڈے آنٹی کے بھائی اور بھتیجے تک ملے، پاپا نے کوئی بھی رعایت نہیں برتی آنٹی نے بیچ میں پڑنے کی کوشش کی تو نوبت طلاق دینے تک آگئی اور آنٹی ڈر گئیں، سہم کر بیٹھ گئیں کیونکہ وہ مجھے اب تک اپنے سامنے بہت ہلکا لے رہی تھیں کہ وہ کچھ بھی کرجائیں گی پاپا ان کی محبت بلکہ عشق میں ان کو چھوڑ دیں گے کچھ نہیں کہیں گے وہ نہیں جانتی تھیں کہ اب جبکہ وہ چڑیا کا بچہ بھی نہیں پیدا کر پائی ہیں تو میری اہمیت پاپا کی نظر میں ان سے زیادہ ہوگئی ہے کیونکہ میں ان کی واحد اولاد بھی واحد وارث۔

☆☆☆

میرا بی بی اے کمپلیٹ ہوا تو میں نے ایم بی اے میں ایڈمیشن لے لیا اس دوران حاشر کے سب بہن بھائیوں کی شادیاں ہوگئیں ان کی امی اکثر مجھ سے کہتیں کہ ''بیٹا! حاشر تمہارا سب سے اچھا دوست ہے اسے سمجھاؤ اب گھر بسالے اب تو اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی گھر بار والے ہوگئے ہیں۔'' اس دن انہوں نے کہا تو میں نے نگاہ اٹھا کر حاشر کو دیکھا۔

''امی! میں بس آپ کا بیٹا ہوں آپ کی اور ابو کی خدمت کروں گا مجھے نہیں کرنی کوئی شادی وادی، نئی آنے والی آکر ہم ماں بیٹا کی محبت میں حائل ہوجائے گی۔'' وہ آکر بیٹھے اور ماں کے گلے میں اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے بولے۔

''میری پسند کی لڑکی سے شادی کرلو ہم دوست بن کر رہیں گے۔'' انہوں نے فوراً کہا۔

''اور آپ کی پسند کی لڑکی کون ہے؟'' انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''یہ اپنی حریم۔'' آنٹی نے کہا تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے نظریں چرائیں۔

''یہ بچی ہے سعدیہ سے بھی چھوٹی۔'' انہوں نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

''مگر یاد رکھو کہ سعدیہ بھی اب ایک بچی کی ماں ہے۔'' آنٹی نے کوئی رعایت نہیں برتی۔

''امی! محبت عقیدے اور ایمان کی طرح ہوتی ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔'' وہ بے بسی سے بولے تھے۔

''میں تمہیں عقیدہ اور ایمان بدلنے کے لیے نہیں کہہ رہی شادی کرنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔'' آنٹی نے آج کوئی جائے فرار نہیں چھوڑی تھی۔

''مگر امی! کیا یہ زیادتی نہیں ہوگی اس لڑکی کے ساتھ جو میری زندگی میں آئے گی۔'' وہ بولے۔

''قطعی نہیں زندگی کے ساتھی کو بنیادی ضروریات کے ساتھ عزت و احترام کی ضرورت ہوتی ہے بس۔'' ان کا لہجہ قطعی تھا۔

''تو یہ نظریہ ضرورت ہوگیا ناں! ماں محبت کہاں گئی اس میں سے۔'' انہوں نے الجھ کر ماں کو دیکھا۔

''نظریہ ضرورت بہت جلد نظریہ محبت میں بدل جاتا ہے۔ نکاح کے بولوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے یہ خود ہی محبت کروادیتے ہیں۔'' آنٹی نے پھر گھیرا۔

''پھر بھی ماں! ابھی میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔'' حاشر نے ٹالا۔

''تو کیا بڑھاپے میں تیار ہوگے تم سے چھوٹے بلکہ چھوٹے پانچ پانچ، چھ چھ سال چھوٹے بہن بھائی شادی شدہ ہوکر ایک ایک، دو دو بچوں کے اماں ابا بن بیٹھے ہیں اور تم ابھی تک ذہنی طور پر تیار نہیں ہو۔'' آنٹی خاصی برہم تھیں مجھے ہنسی آگئی جسے چھپانے کے لیے مجھے چہرہ جھکانا بھی پڑا اور ہاتھ رکھ کر چھپانا بھی پڑا، حاشر نے مجھے خاصی برہم نگاہوں سے دیکھا۔

''دیکھو حاشر! میں جوزفین کے لیے بھی تیار تھی کہ مسلمان نہ سہی اہل کتاب تو تھی مگر اب تو وہ راہ ہی بند ہوچکی ہے جس پر چل کر اس تک پہنچا جاسکتا تھا۔ مجھے اب مزید نہ ستاؤ وہ تیار ہوسکتی تو میں جاکر اس کے پیر پکڑ لیتی اسے منالیتی مگر اب بتاؤ میں کیا کروں۔ میں اپنی زندگی میں ہی تمہارا گھر بسا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ بڑی بے بسی سے کہہ رہی تھی۔

''ماں! نوبت اگر پیر پکڑنے کی آجاتی تو اس سے پہلے میں خود اسے چھوڑ دیتا آپ خود کو اتنا ہلکان کیوں کررہی ہیں۔ آپ میری زندگی کی سب سے اہم انسان ہیں۔'' حاشر نے کہہ کر ان کے ہاتھ چومے تھے ان کے سامنے بیٹھ کر۔ انہوں نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

''امی! تھوڑا سا وقت اور دے دیں۔'' انہوں نے ملتجی لہجے میں کہا۔ آنٹی نے سر ہلایا اور یوں بات آئی گئی ہوگئی۔

☆☆☆

میرا ایم بی اے کمپلیٹ ہوگیا اور پاپا مجھے اپنے ساتھ آفس لے جانے لگے وہ مجھے بزنس کے اسرار و رموز سکھانے لگے۔

میں آج بھی حاشر سے ملتی تھی۔ حاشر آج بھی میرے جذبات سے اسی طرح نظریں چراتے تھے۔ ایک دن پھر میں ان کے مقابل آگئی۔

''حاشر! اب میں 22 سال کی ہوگئی ہوں اب تو میں بچی نہیں رہی اب کیا خیال ہے میرے بارے میں آپ کا۔'' میں نے اچانک پوچھا تھا۔

''میرے لیے ہمیشہ بچی ہی رہو گی کیونکہ جیسے جیسے تم بڑی ہو رہی ہو ویسے ویسے میں بھی عمر میں آگے بڑھ رہا ہوں پیچھے نہیں ہٹ رہا ہوں۔ تم جوانی کی جانب قدم بڑھا رہی ہو تو میں ادھیڑ عمر کی جانب۔'' ان کا لہجہ دوٹوک تھا۔ میں خاموش ہوگئی تھی دولحوں کے لیے بلکہ بول ہی نہیں پائی تھی۔

''حاشر! آپ مجھے سسٹر جوزفین سے ملوانے لے چلیں گے۔'' میں نے یونہی برسبیل پوچھا تھا۔

''ہاں کیوں نہیں، بولو کب چلنا ہے۔'' انہوں نے کہا تو ہم دن اور وقت طے کرنے لگے۔

جس دن ہم وہاں گئے اس دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی آسمان سے منوں ٹنوں کے حساب سے پانی برس رہا تھا بجلی پتا نہیں تڑپ رہی تھی یا چمک رہی تھی۔ میں موسم کے لحاظ سے خاصے ہلکے کپڑوں میں تھی اور سردی سے میری کپکپی بندھ رہی تھی۔

حاشر نے مجھے اپنا کوٹ دینے کی کوشش کی اور میں نے ان کی آفر شکریے کے ساتھ لوٹا دی۔

''مجھے ہمدردی اور ترس نہیں چاہیے حاشر! ہاں محبت سے دیتے تو لے لیتی۔'' میں نے دوٹوک کہا۔

''تم میری بہترین دوست ہو اور دوست سے محبت ہوتی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''اپنی دوستی اور محبت اپنے پاس رکھیں۔'' میں کہہ کر کپکپاتے ہوئے آگے چل پڑی مگر حاشر نے میرے کاندھوں پر اپنا کوٹ ڈال دیا اور خود لیدر جیکٹ پہنتے ہوئے میرے پیچھے چلے آئے۔ اس بار میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

سسٹر جوزفین کے سامنے پہنچ کر میں بکھر گئی۔

''سسٹر! آپ حاشر کو اپنی محبت سے آزاد کیوں نہیں کر دیتیں آپ کو اللہ کا واسطہ ہے آپ انہیں آزاد کر دیں۔''

میں بلک بلک کر رو رہی تھی اور حاشر مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ سسٹر نے مجھے اپنی دونوں بانہوں میں بھر کے گلے سے لگا لیا۔

''میں تو کب کا انہیں آزاد کر چکی ہوں آج سے سات سال پہلے ہی۔'' انہوں نے محبت سے کہا۔

''اور جو خود آزاد نہ ہونا چاہے۔'' حاشر نے ٹوٹے اور بکھرے لہجے میں کہا۔

''حاشر! محبت کو قیدی نہیں بناتے اسے آزاد رکھتے ہیں اور جو خود محبت کے درد سے واقف ہوں وہ کسی اور کو اس درد میں مبتلا نہیں کرتے۔'' سسٹر نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مگر یہ ترس و ہمدردی نہیں خالص محبت کی حقدار ہے۔'' حاشر نے بے بسی سے کہا۔

''محبت کے دامن میں بڑی وسعت ہوتی ہے یہ سب کو سمیٹ لیتی ہے تم قدم تو بڑھاؤ کیوں پچھلے مقام پر جمے کھڑے ہو۔'' انہوں نے اسی باوقار لہجے میں کہا تو حاشر نے ایک ٹھنڈی سانس لی یا شاید آہ بھری۔

''ٹھیک ہے۔'' انہوں نے سسٹر کی بات مان لی اور ہم واپس آگئے۔

☆☆☆

آج ہماری شادی کو 5 سال ہو چکے ہیں ہمارے دو بچے ہیں حاشر بہت اچھے باپ اور بہت ہی اچھے شوہر ہیں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں یہ احساس مجھے ہر دم رہتا ہے میں اور بچے کہیں اِدھر اُدھر ہو جائیں تو بے چین ہو جاتے ہیں کیونکہ واقعی محبت کے دامن میں بڑی وسعت ہوتی ہے یہ سب کو سمیٹ لیتی ہے۔

ہاں کبھی کبھی وہ بہت اداس اور بے چین ہو جاتے ہیں اور تب مجھے پتا ہوتا ہے یہ لمحات سسٹر جوزفین کی یادوں کے چراغ کے جلنے کے ہوتے ہیں کہ ان کے دل کا ایک کونا آج بھی سسٹر جوزفین کی یادوں سے آباد ہے اور میں نے کبھی بھی اس کونے کو مرنے نہیں دیا اور ایسے وقت میں، میں ان کو تنہائی میسر کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہوں۔ بعد میں اکثر وہ نادم بھی ہوتے ہیں اور میرے شکر گزار بھی مگر محبت پر ندامت کیسی؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

++

کاش

راوی: ڈاکٹر سونیا

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم!

یہ ایک ایسی سچ بیانی ہے جس میں معاشرے کا عکس صاف نظر آرہا ہے کہ کچھ لوگ کس طرح نادانی میں اپنی زندگی برباد کرتے ہیں اور کس طرح شاطر مرد زندگی میں زہر گھولتے ہیں۔

سنبل

(کراچی)

گل رخ میری بڑی اچھی دوست تھی اور تھی کیا اب بھی ہے ہم کم ملتے ہیں لیکن اب بھی ہماری ملاقات رہتی ہے۔

گل سے میری دوستی کالج آتے جاتے ہوئی ہم دونوں ایک ہی کالج میں زیرِ تعلیم تھے اور کالج زیادہ دور نہ ہونے کے باعث پیدل ہی آتے جاتے تھے۔ یوں تو ہم کافی ساری لڑکیاں گروپ کی صورت میں ساتھ آتی جاتی تھیں مگر میری گل رخ سے دوستی کی وجہ ایک ہی علاقے میں آمنے سامنے کی گلیوں میں ہونے کی وجہ سے زیادہ ہوگئی تھی۔ باقی ساری لڑکیاں ہم سے کافی آگے جاتی تھیں۔

اور یوں ہم دونوں کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی ہم دونوں قریب رہائش کی وجہ سے، بہ آسانی ایک دوسرے کے گھر چلے جاتے تھے نوٹس وغیرہ میں ایک دوسرے کی مدد کردیا کرتے تھے۔ گل ایک لاابالی لڑکی تھی، وہ زندگی کو اتنا سیریس نہیں لیتی تھی جتنا کہ میں۔ شاید اس کی وجہ وہ تربیت بھی تھی جو مجھے گھر سے ملی تھی۔

گل کا مسئلہ یہ تھا کہ گل تین بہن اور سات یا آٹھ بھائی تھے اور اتنے بچوں میں سب سے آخری بچے کے ساتھ جو ہوتا ہے وہی اس کے ساتھ ہوا۔ وہ والدین کی عدم توجہی کا شکار رہی۔ اس کے بھائی بہنوں میں اکثریت کی اس کے بچپن میں ہی شادی ہوچکی تھی اب صرف یہ دو بہن اور دو بھائی تھے جن کی اب شادی ہوتی تھی۔

گھر میں ان کی صرف ایک بھابی ساتھ تھیں جو کہ عام سی شکل وصورت کی مالک تھیں، ان کے مقابلے میں گل بہت حسین تھی کیونکہ وہ پنجابی ماں اور پٹھان باپ کی اولاد تھی۔ ان دونوں کا ہی حسن اس میں اکٹھا ہوگیا تھا۔ پتا نہیں بھابی کو اس سے کیا خار تھی وہ اس سے جلتی تھیں۔ گل سے بڑی رانی تھی وہ ایک تو منہ پھٹ بہت تھی اور دوسرے وہ بھابی ہی کی طرح عام سی شکل وصورت کی تھی سو اس سے ان کی پھر بھی بن جاتی تھی مگر گل سے تو ناممکنات والی بات تھی۔

ہم دونوں ہی پری میڈیکل کے اسٹوڈنٹس تھے، ان دنوں ہم دونوں کے ہی گھروں کے معاشی حالات ایسے ہی تھے۔ ہم دونوں نے بڑی محنت کی مگر صرف کالج سے پڑھ کر ہم اپنی میڈیکل کی میرٹ نہ بنا سکے ہم دونوں کے ہی A گریڈز آئے مگر میڈیکل کے لیے تو +A میں سے بھی Highest مارکس والوں کو لیا جاتا ہے۔

ہم نے دلبرداشتہ ہونے کے بجائے D.H.M.S کالج میں داخلہ لے لیا۔ ہم دونوں ہی ہومیو پیتھی کی طرف آگئے۔ ہمارا کالج کراچی کے سب سے بڑے میڈیکل کالج میں شمار ہوتا تھا ہومیو پیتھی کے۔

ہمارے سارے ہی Subjects وہی تھے جو کہ M.B.B.S والوں کو پڑھائے جاتے ہیں بس سرجری میں مائنر سرجری پڑھائی جاتی ہے اور میڈیسن کی جگہ ہم میٹریا میڈیکا پڑھتے ہیں۔

اس کالج سے بھی ہماری بڑی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں، بڑا سا لان بڑے بڑے کوریڈور اور بڑی بڑی کلاسز، نیم کے گھنے درخت، لان کے گرد ڈم ڈم، سدا بہار، بوگن ویلیا، چائنا روز جھوم جھوم کر لہلہاتے تھے۔

کالج میں بڑا اچھا وقت گذرا اور بڑی جلدی گذر گیا۔ فرسٹ ایئر میں سوچتے تھے کہ فائنل ایئر کب آئے گا اور فائنل ایئر اتنی جلدی آگیا کہ پتا ہی نہ چلا۔ یہاں ہر سال ولمار شوابے والے فنکشن کرتے تھے اور یہ فنکشن بہت بڑا شاندار ہوتا تھا، اس کے بعد لنچ بھی بہت ہی شاندار دیا جاتا تھا۔

گل کو گل نام میں نے دیا ورنہ وہ ہر شخص کو اپنا پورا ہی نام بتاتی تھی اور اسی نام سے پکاری جاتی تھی۔ جب میں نے گل کہنا شروع کیا تو شروع میں چڑتی تھی پھر اسے خود بھی اس نام سے پکارے جانا اچھا لگنے لگا، اب وہ اپنا نام گل ہی بتاتی تھی گل ایک بڑی بے چین روح تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم ابھی۔۔ فائنل ایئر میں آئے ہی تھے اور گرمیوں کی چھٹیاں پڑگئیں، چھٹیوں کا تصور ہی کتنا خوبصورت ہوتا ہے ابھی میں اس خوبصورتی کو محسوس بھی نہیں کرسکی تھی کہ وہ آگئی۔

''چلو علاقے کے ہومیو پیتھک ڈاکٹرز کو ڈھونڈتے ہیں ان کے پاس پریکٹس کریں گے۔'' وہ بے تکلفی سے میرے سامنے بیٹھ گئی۔

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' میں سستی سے کہہ کر مزید پھیل کر لیٹ گئی۔

''تمہارے ہاں کچھ کھلانے پلانے کا رواج نہیں ہے چلو اٹھو جلدی سے چائے بنا کر لاؤ۔'' اس نے حکمیہ کہا۔

''ہے تو مگر روزانہ آنے والے مفتوں کو نہیں۔'' میں نے بھی ترنت جواب دیا اور وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

''میری اچھی دوست نہیں ہو میرے گھر آؤ گی تو کافی پلاؤں گی۔'' اس نے پچکار کر کہا۔

''ایسے کارنامے تم ہی کرسکتی ہو پگھلاتی ہوئی گرمیوں میں کافی، یرقان کروا کر مارنا چاہتی ہو مجھے۔'' میں نے منہ بنایا اور اس نے ہنستے ہوئے مجھے گدگدایا۔

''مرو مت ابھی تھوڑی دیر میں بناتی ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ خوش ہوگئی۔ میں دودھ پتی بناتی تھی جو کہ اسے بہت پسند تھی اور وہ مجھے ملباری کہتی تھی۔

''ہاں اور چائے بنا کر تیار ہو جانا ہم نے جانا ہے ہومیو پیتھس کو ڈھونڈنے۔'' اس نے دوبارہ وہی بات نکالی۔

''مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔'' میں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

''دیکھیں ناں ابو! اگر ہم کسی ڈاکٹر کے پاس پریکٹس کریں گے تو ہمارے تجربے ہی میں اضافہ ہوگا ناں! اور کلینک کھولنے میں بھی آسانی رہے گی۔'' اس نے میرے ابو کو بھی ساتھ ملالیا۔

''بیٹا! کہہ تو ٹھیک رہی ہے گل۔'' انہوں نے بھی اسی کا ساتھ دیا اور وہ خوش ہوگئی۔ کچھ ہی دیر میں ان دونوں نے مجھے کنوینس کرلیا۔

اسے اسٹیکس اور چائے تھما کر میں نے کپڑے بدل کر بال باندھے اور جانے کو تیار ہوگئی۔

''مانا کہ حسین ہو مگر ایک لپ اسٹک کا تو حق بنتا ہے۔'' اس نے لوفرانہ انداز میں کہا۔

''بی بی! ہم ڈاکٹر ڈھونڈنے جارہے ہیں برنہیں؟'' میں نے منہ بنایا۔

''کیا پتا۔'' وہ گنگنائی اور میں نے اسے ایک دھپ لگائی۔

☆☆☆

اس دن وہ پورے علاقے میں لے کر مجھے پھرتی رہی تھی پہلے ڈاکٹر پیروں سے معذور تھے۔ مگر مجھے ان کا طریقہ علاج سمجھ نہیں آیا کیونکہ ہومیو پیتھی Single Remedy سے Based ہے اور وہ Compound Medicine استعمال کررہے تھے اور یہ Compound انہوں نے خود تیار کیے تھے اس لیے میں نے باہر نکل کر فضا میں کراس بنایا اور کہا۔

''یہ تو قطعی نہیں؟''

''کیوں۔'' اس نے منہ بنایا۔ ''یہ گھر کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔''

''ان کا طریقہ علاج درست نہیں ہے، یہ Single Remedy سے علاج نہیں کرتے، محنت کرنی پڑتی ہے ناں! ساری علامات پر ایک ہی دوا نکالنے سے۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

''او کھری ہومیو پیتھو! آج کل سارے ہومیو پیتھ یہی کررہے ہیں، انہوں نے اپنے گھر بھی چلانے ہیں ہومیو پیتھک میڈیسن دیر سے اثر کرتی ہے اس سوچ نے سب کو ہومیو پیتھک علاج سے دور کردیا ہے اور اسی وجہ سے ہومیو پیتھس کو بھی پروفیشنل ہونا پڑا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''لیکن میں تو سب سے بڑی معتقد ہوں ہومیو پیتھی کے یا نی ڈاکٹر سموئیل ہانی مین کی۔ میں تو اسی طریقے کو پسند کرتی ہوں۔'' میں نے بھی بے نیازی سے کہا۔

اس کے بعد ہم جس کلینک میں گئے انہوں نے تمام دواؤں کا Data کمپیوٹر میں Save کیا ہوا تھا اور وہ علامات ٹائپ کرکے فوراً دوا نکال لیتے تھے مگر ان کے تو دماغ ہی نہیں مل رہے تھے۔ وہ تو اس معرکے پر خود کو خلائی مخلوق سے کم نہیں سمجھ رہے تھے سو ان پر بھی لعنت بھیج کر ہم تیسرے کلینک چلے گئے۔

یہاں پر ہماری ملاقات ڈاکٹر خان سے ہوئی۔ ڈاکٹر خان سابق R.M.O تھے K.M.C اسپتال کے جو کہ ہمارے کالج کے ہی ساتھ تھا اور اکثر ڈاکٹرز یہیں سے ہاؤس جاب کرتے تھے مگر ابھی ہمارا ایک سال باقی تھا۔

ڈاکٹر خان کی وائف اسی اسپتال میں نرس تھیں۔ انہوں نے ہم دونوں کو مشورہ دیا کہ کلینکس پر ہم اتنا تجربہ نہیں حاصل کرسکیں گے۔ وہ اپنی بیوی سے بات کرلیں گے... ہم دونوں کل اسپتال چلی جائیں۔ ان کی بیوی آج کل سیکنڈ شفٹ میں ہوتی ہیں، وہاں پر خاصا سیکھنے کو ملے گا اور یہ بات ہم دونوں کو ہی اچھی لگی۔

یوں ہم دوسرے دن ہی اسپتال پہنچ گئے۔ مسز خان یعنی عائشہ خان سے ان کے شوہر ہر بات کرچکے تھے۔ یوں ہم روزانہ سیکنڈ شفٹ یعنی 2 سے 8 میں اسپتال جانے لگے۔ یہاں دو وارڈ عورتوں کے تھے اور دو وارڈ مردوں کے، اسپتال خاصا روشن اور ہوادار تھا۔ پوری پوری دوپہر ہم دونوں کا مریضوں کی Case History لکھنے میں گذر جاتی تھی کیونکہ صبح OPD میں صرف مریض ایڈمٹ کیے جاتے تھے، نائٹ والا عملہ سونے آتا تھا، بچے سیکنڈ شفٹ والے تو ساری Case History ہمیں ہی لینی ہوتی تھی۔ ہمارے ساتھ خاصے اور بھی ہاؤس آفیسرز تھے جن میں میل و فی میل دونوں تھے۔ بہرحال ہم دونوں کی مریضوں سے بھی فوراً دوستی ہوجاتی تھی۔

انہی ہاؤس آفیسرز میں ایک رضوان بھی تھا جو بہت زیادہ خوش شکل اور ہینڈسم تھا۔ گل نے ایک دن اپنے خاندان میں کسی جاننے والے کے مغالطے میں اس سے بات کی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان میں دوستی ہوگئی۔ مجھ سے بھی رضوان کی بات چیت تھی مگر میں عموماً مردوں سے ایک فاصلے اور ایک محسوس کی جانے والی سختی سے بات کرتی تھی سو ہماری کوئی ایسی خاصی دوستی نہیں ہوسکی۔ یہیں پر ہماری ملاقات

ڈاکٹر ارمانی سے بھی ہوئی وہ یہاں R.M.O تھے۔ مجھے ڈاکٹر ارمانی اچھے نہیں لگے تھے ان کی آنکھوں میں ہوس تھی مگر گل کو ڈاکٹر صاحب بہت پسند آئے وہ اکثر کہتی۔ ''وہ بہت تجربے کار ڈاکٹر ہیں اور میرا ارادہ ہے کالج کے شروع ہونے کے بعد میں ان کے پاس پریکٹس کروں گی۔ وہ کریم آباد پر ایک بڑے اسپتال میں شام میں بیٹھتے ہیں تم بھی چلنا میرے ساتھ۔'' اس نے کہا تھا۔

''تم جانا مجھے تو معاف ہی رکھو تمہارے اچھے اور تجربے کار ڈاکٹر کو میں یہاں اسپتال میں ہی برداشت کرلیتی ہوں یہی بہت ہے۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''کیوں ایسی کیا برائی ہے ان میں۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''اچھائی کیا ہے۔ نظریں دیکھی ہیں ان کی۔ ایکسرا کرتی ہوئی وجود میں گڑتی ہوئی، لگتا ہے نظروں کے ذریعے نگل لینا چاہتے ہوں۔'' میں نے طنزیہ کہا۔

''ہوتی ہیں کچھ لوگوں کی نظریں، ایسی مگر وہ خود بہت نائس ہیں۔'' اس نے اپنے فطری لاابالی انداز میں کہا۔

''میرا ماننا ہے گل! جو جس فطرت کا ہوتا ہے وہ چیز اس کے چہرے پر کھد جاتی ہے میں بہرحال ارمانی صاحب سے حتی الامکان دور رہنے کی کوشش کروں گی۔ تمہیں سمجھانا میرا فرض تھا ماننا یا نہ ماننا تمہاری مرضی ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''مجھے پتا ہے تم اپنی اہلی کاہلی کی وجہ سے وہاں جانا نہیں چاہتیں یہاں بھی کتنے جتنوں سے آتی ہو۔'' اس نے میری بات کو سیریس نہیں لیا۔

''جو بھی سمجھو۔'' میں نے بحث کو غیر ضروری جانا کیونکہ وہ ایسی ہی تھی جس کی معتقد ہوجاتی تھی وہ دنیا میں سب سے زیادہ اچھا ہوتا تھا۔ باقی سمجھانے والے سارے بے وقوف اور آج کل اس کی زندگی میں دو اچھے آگئے تھے ایک ارمانی صاحب اور دوسرا رضوان۔

رضوان میں مجھے بظاہر کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی۔ اچھا، شریف اور اچھی فیملی کا لگتا تھا۔

مگر مجھے گل کا اس تیزی سے اس کی جانب بڑھنا کھل رہا تھا کیونکہ ہمیں مشکل سے یہاں ایک مہینا گذارنا تھا کیونکہ یہاں صرف چھ مہینے کی ہاؤس جاب ہوتی تھی اور وہ سیشن جون میں ختم ہونا تھا۔ جولائی میں نیا سیشن آنا تھا اور پھر ہم یہاں یہ سب کرنے تھوڑی آئے تھے۔

ابھی ہمیں یہاں آئے صرف پندرہ دن ہی ہوئے تھے کہ اس نے واپسی کے لیے جلدی نکلنا شروع کردیا اور ہر بار اس کے پاس نیا ہی بہانہ ہوتا تھا۔ باجی کی طبیعت خراب ہے مجھے ان کے گھر جانا ہے۔ ان کی طبیعت کی خرابی کے باعث مجھے ہی سارا کام کرنا ہے۔ رانی کی طبیعت خراب ہے مجھے جلدی گھر جانا ہے ورنہ امی کو ہر کام کرنا پڑے گا، بھابی بھی میکے گئی ہوئی ہیں۔

مگر اس کے جھوٹ کا بھانڈا اس طرح کھلا کہ ایک دن وہ یہ سب کہہ کر جارہی تھی تبھی ایک مریض کی طبیعت بگڑ گئی اور میں تیزی سے اپنا اسٹیتھس کوپ اور (بی پی کا آلہ) لے کر بھاگی مگر مریض تک پہنچنے سے قبل ہی میرے پیر سست پڑ گئے تھے کیونکہ میں نے کھڑکی سے گل کو رضوان کی گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا اور مجھے بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ اس بات پر نہیں کہ وہ رضوان سے اتنا بے تکلف کیوں ہورہی ہے بلکہ اس پر کہ اس نے تقریباً 5 سالہ دوستی پر اس نئی محبت کو ترجیح دی تھی۔ اسپتال سے کوئی دس منٹ تک کا پیدل راستہ تھا۔ بس اسٹاپ تک کا اور آٹھ بجے کے بعد یہ راستہ سنسان ہوجاتا تھا صرف اسپتال کے سامنے والے میڈیکل اسٹور کھلے ہوتے تھے، باقی سب بند ہوجاتے تھے اسٹریٹ لائٹس تک اِکا دُکا جل رہی ہوتی تھیں اکثر ہی گھور اندھیرا ہوتا تھا اور اس اندھیرے میں مجھے اکیلے ہی بس اسٹاپ جانا پڑتا تھا۔ میں نے اسپتال صرف اس کے مجبور کرنے پر ہی آنا شروع کیا تھا ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی چھٹیاں انجوائے کرنے کے بجائے اس کے ساتھ خوار ہونے کی۔ بہرحال میں نے جیسے تیسے مریض کو چیک کیا۔ اس کا بی پی شوٹ کررہا تھا۔ میں نے اسے دوا دی اور باہر نکل آئی۔

☆☆☆

دوسرے دن ہم اسپتال کے لیے نکلے تو میں نے اس سے بات کرنے کی ٹھانی۔

''گل! تم یہ سب ٹھیک نہیں کررہی ہو ہم یہاں یہ سب کرنے نہیں آئے ہیں، ہم یہاں تجربہ حاصل کرنے آئے ہیں۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''چلو ایک تجربہ یہ بھی سہی۔'' وہ فوراً میری بات کو پاگئی سو لاابالی پن سے بولی۔

''تمہیں ڈر نہیں لگتا گل! اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟'' مجھے خوف سا محسوس ہوا۔

''دیکھ لے کوئی اچھا ہے کچھ بتانا نہیں پڑے گا۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''تم تو اس معاملے میں سیریس ہو مگر کیا رضوان بھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں تو کیا یہ مذاق چل رہا ہے۔'' وہ چڑی تھی۔

''ان لڑکوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا گل! یہ مذاق ہی مذاق میں لڑکیوں کو بہت آگے لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں اور پھر خود کو انجان بھی ثابت کرتے ہیں کہ وہ تو صرف اچھے دوست تھے۔ سارا فتور ہی ہماری سوچ کا ہے۔'' میں نے اپنے طور پر ایک اور کوشش کی مگر بے سود ہی رہی۔

''نہیں وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اس نے خود کہا ہے۔'' اس نے خوشی سے بتایا۔

''پھر بھی دیکھ لو۔ شادی کا جھانسا بھی لڑکے چارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔'' میں نے آخری کوشش کی۔

''تمہیں بہت تجربہ ہے؟'' اس نے شوخی سے کہا۔

''الحمدللہ! میں دیکھ کر نصیحت پکڑنے والوں میں سے ہوں مجھے تجربے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''ویسے وہ ڈاکٹر شاہ میر بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے تمہیں دیکھتے ہیں۔'' اس نے شرارت سے مجھے آنکھ مارتے ہوئے ایک اور ہاؤس آفیسر کا نام لیا۔ اس بات کا مجھے بھی پتا تھا مگر میں نے کبھی بھی ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ جتنے پیارے تھے کسی بھی لڑکی کا ارمان ہو سکتے تھے۔

''پتا ہے مجھے مگر ہم یہاں یہ سب کرنے نہیں آئے ہیں اور تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ میں اپنے کزن سے انگیجڈ ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو انہیں کیا پتا چلنا ہے؟ ارے اتنا تھوڑا بہت تو چلتا ہے۔ اگر کچھ وقت رنگین ہو سکتا ہے تو کر لو۔'' اس نے پھر سے مجھے آنکھ مار کر کہا۔

''جب ایسی لوفرانہ باتیں اور حرکتیں کرتی ہو ناں! تو بائے گاڈ دل چاہتا ہے کہ تمہاری دوستی پر لعنت بھیجوں۔'' میں نے تپ کر کہا۔

''تمہیں پتا تو ہے سونو! کہ میں جس ماحول اور گھر سے اٹھ کر آتی ہوں وہاں کس قدر گھٹن ہے بس مجھے چند سانسوں کی ہی تو طلب ہے کھلی فضا میں۔'' وہ اداس ہو گئی اور میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

جون کے اختتام پر تمام ہاؤس آفیسر کو سرٹیفکیٹ ملنے کی تقریب تھی جس میں انہوں نے ہمیں بھی بلایا تھا اور یوں ہمارا بھی اسپتال جانے کا اختتام ہوا۔

☆☆☆

وہ اس عرصے میں کسی کلینک پر بیٹھنے کا کہتی رہی مگر میں تیار نہیں تھی۔

''ایک مہینا خوار ہوئی ہوں تمہارے پیچھے بس اب اور نہیں۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

''سچ بتاؤ یہ مہینا ضائع ہوا ہے یا اس سے ہم نے سیکھا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں ضائع تو واقعی نہیں ہوا، دواؤں کے متعلق اور امراض سے متعلق بہت کچھ جاننے کو ملا ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''تو پھر میری بات مانتی کیوں نہیں ہو۔'' اس نے چڑ کر کہا۔

''کیونکہ ایک مہینے بعد کالج کھلنے والے ہیں اور میں یہ ایک مہینا آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''حالانکہ تم جانتی ہو کہ ایلوپیتھی کے مقابلے میں ہومیو پیتھی کی دوا سلیکٹ کرنا کتنا مشکل کام ہے اور پھر تمہیں مراق بھی ہے Single Remedy کا۔'' اس نے میرے لتے لیے۔

''ہو جائے گا سب ابھی کچھ آرام کرنے دو۔'' میں نے پھیل کر لیٹتے ہوئے کہا اور اس نے تالف سے سر ہلایا۔

☆☆☆

ایک مہینے بعد کالج کھل گئے، کالج میں ہمارا خاصا بڑا گروپ تھا۔ میں، گل، ثمینہ، رخشی، فوزیہ، افشاں، تابندہ، روزمین اور روزلین۔

کالج اسٹارٹ ہونے کے ساتھ ہی گل نے ارمانی صاحب کے پاس اسپتال جانا شروع کر دیا اس نے اپنے ساتھ فوزیہ کو بھی ملا لیا اور فوزیہ صرف دو دن میں کانوں کو ہاتھ لگاتی وہاں جانے سے توبہ کرنے لگی۔

''کیوں ایسا کیا ہو گیا؟'' رخشی نے پوچھا۔

''محترم اپنے کلینک میں آنے والی گائنی پرابلم والی خواتین کو یہاں اسپتال بلاتے ہیں کیونکہ اپنے کلینک پر گائنی اسپیشلسٹ بنے بیٹھے ہیں اور ان خواتین کا ہر قسم کا معائنہ کر لیتے ہیں اور شاباش تو ان خواتین پر ہے جو ایسا کروا بھی لیتی ہیں۔'' وہ گال بری طرح سے پیٹتے ہوئے بولی تو میں نے ملامتی نظروں سے گل کو دیکھا تو وہ ہنسنے لگی۔ ''اس وقت ان کی نگاہوں کی ہوس۔'' فوزیہ نے جھرجھری لی۔

''اگر میڈیکل کی فیلڈ میں آ کر بھی ذرا ذرا سی باتوں پر

تم لوگوں کو شرم آتی ہے تو یہ فیلڈ چھوڑ دو۔'' اس نے آرام سے فیصلہ صادر کیا۔

''گل! تم جانتی ہو ہم اپنے فی میل اساتذہ سے ہر موضوع پر اور ہر چیز پر بغیر جھجکے بات کر لیتے ہیں اور میل اساتذہ سے بھی مگر اس طرح سے Live دیکھنا اور بات ہے۔'' فوزیہ کو اس کی بات بری طرح سے چبھی تھی۔ ''اور وہ بھی کسی مرد کے ہاتھوں۔''

''بہر حال میں تو جاؤں گی مجھے تجربہ حاصل کرنا ہے اور ظاہر ہے لڑکی ہونے کے ناطے مجھے گائنی کے ہی مریضوں سے زیادہ پالا پڑنے والا ہے۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''تمہاری مرضی۔'' ہم سب نے کہا۔

☆☆☆

ہمارا مسئلہ اس قسم کے کیس دیکھنا نہیں تھا اگر ایسا کوئی مریض یا مریضہ موجود ہوتی تھی تو پردے کا خیال رکھ کر ان کا تفصیلی معائنہ کروایا جاتا تھا میرا سارا مسئلہ ڈاکٹر ارمانی تھے۔ میرا ذہن ان کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اور بالکل میرے جیسے ہی خیالات صرف دو دن میں ہی فوزیہ کے بھی ہو گئے تھے تو یعنی کہ کچھ تو گڑ بڑ تھی بہر حال اب گل ان کے پاس اکیلی ہی جانے لگی۔

اب وہ مجھ سے رضوان کے متعلق بھی کوئی بات نہیں کرتی تھی اور مجھے بھی کریدنے کی عادت نہیں تھی۔

اسی دوران ہماری ایک کلاس فیلو کے ہی توسط سے ہمیں کالج کی پرمیشن کے ساتھ 21 دن کے لیے ایک سرکاری اسپتال میں پریکٹس کا موقع ملا۔

وہاں مریضوں کی بہتات تھی بہت بڑے بڑے وارڈز اور سارے کے سارے بھرے ہوئے بلکہ جگہ کی کمی کے باعث کوریڈور میں بھی بیڈز لگا کر مریض رکھے ہوئے تھے۔

ہم تینوں کی پہلی ہی سات روزہ نائٹ لگی تھی اور وہ بھی لیبر روم میں۔ رات مصروف گذرتی تھی۔ ڈاکٹرز روم میں جانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا اور یہ کوئی تیسرا دن تھا اس دن شمینہ کسی وجہ سے نہیں آئی تھی۔ ہم دونوں ہی موجود تھے کہ چوکیدار نے گل کو آکر بتایا کہ اس سے کوئی ملنے آیا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی یہاں ہمارا ایسا کون سا جاننے والا نکل آیا بہر حال میں گل کے ساتھ باہر آ گئی اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ باہر رضوان اور اس کا ایک دوست کھڑا تھا چونکہ ان دنوں موبائل اتنے عام نہیں تھے کہ ہر ہاتھ میں موجود ہوں۔ ایک واحد ذریعہ کسی سے بھی رابطے کا PTCL ہی تھے اور وہ بھی ہر گھر میں نہیں تھے، گل کے گھر تو تھا ہی نہیں۔ میں نے ایک ناگوار بھری نگاہ گل پر ڈالی تھی تو وہ حسب معمول ڈھٹائی سے ہنس دی تھی۔ تو میرا غصہ بڑھ گیا تھا۔

رضوان کا دوست بہت شوخ ہو رہا تھا۔

''یار! دیکھو تمہاری بھابی اندر ہیں کیا ہوا ہے....؟''

گل ہنسے جا رہی تھی مگر میں ہنوز سنجیدہ ہی تھی اور رضوان میری برہمی کو محسوس کر چکا تھا۔

''تمہیں برا لگا ہے سونو!'' اس نے پوچھا تھا۔

''کیا نہیں لگنا چاہیے؟'' میں نے جواب دیا۔

''اس کو چھوڑو یہ تو ایسی ہی ہے نانیوں دادیوں والی روح ہے اس کے اندر۔'' وہ بے پروائی سے بولی تھی۔

''چلو تم دونوں ہمارے ساتھ ایک آدھ گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔'' رضوان نے آفر کی۔

''سوری! میری طرف سے تو معذرت ہے میں صبح آٹھ بجے تک آن ڈیوٹی ہوں۔'' میں نے رکھائی سے کہا اور گل نے مجھے دیکھا پتا نہیں کیوں مجھے لگا جیسے اس کا جانے کا ارادہ ہے مگر میں ایسا کوئی بھی رسک لینے کے لیے تیار نہیں، رات کے ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا ایسے میں ہم دو لڑکیاں تن تنہا دو لڑکوں کے ساتھ نکل جاتیں کیا گارنٹی تھی کہ ہم جیسے جاتیں ویسے ہی واپس بھی آ جاتیں اور شاید گل بھی میرے احساسات کو پا گئی تھی۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے رضوان! ہم یہاں آن ڈیوٹی ہیں اور ہماری غیر حاضری کی اطلاع ہمارے کالج اور وہاں سے لازمی ہمارے گھر تک پہنچے گی۔'' اس نے کہا۔

''یار! بہت دن ہو گئے ہیں تم سے ملے ہوئے۔'' وہ بولا تھا۔

''ملتے ہیں بعد میں ابھی یہ ڈیوٹی ختم ہو جانے دو۔'' اس نے رضوان کو تسلی دی۔

''ٹھیک ہے مگر جلدی۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔

وہ دونوں چلے گئے اس دن مجھے پتا چلا کہ گل اس سے مستقل رابطے میں ہے، وہ اسے OPD سے کال کرتی ہے۔ مجھے اس پر غصہ آیا۔

''گل! اٹ از ناٹ فیئر۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

''سونو! وہ مجھے اچھا لگتا ہے، مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں بھی۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''جو محبت کرتے ہیں وہ عزت بھی کرتے ہیں اور Sorry to Say اگر رضوان تم سے محبت کرتا تو رات کے اس پہر تم سے باہر چلنے کو کبھی نہیں کہتا۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

''جو بھی کہو مجھے اس پر پورا اعتماد ہے۔'' اس نے اپنی ازلی بے پروائی سے کہا۔

''سمجھانا میرا فرض تھا سمجھنا نہ سمجھنا تمہاری مرضی ہے۔'' میں نے اپنا مخصوص جملہ بول کر بات ختم کردی۔

21 دن میں ہماری ڈیوٹیز ختم ہوگئیں اور ہم نے اگلے ہی دن سے کالج جوائن کرلیا۔ اس دوران ہمارا پڑھائی کا کافی حرج ہوا تھا اسے Cover کرنے میں بھی خاصا وقت لگا تھا۔

اس کے بعد ایک دن گل کالج نہیں آئی تھی۔ ایگزام ہونے والے تھے۔ وہ عموماً چھٹی نہیں کرتی تھی اور اب جبکہ جرنل سر ٹیفائیڈ کروانے تھے، ہماری پروفیسرز اس وقت اہم ٹاپکس کو ڈسکس کررہی تھیں Presentations چل رہی تھیں Tests شروع ہونے میں صرف پندرہ دن باقی تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی اس کے نہ آنے سے، مجھے لگا شاید کہ وہ بیمار ہے ورنہ اس وقت چھٹی کی کوئی تک بنتی نہیں تھی جبکہ پنکچوئل اسٹوڈنٹ تھی۔ میرا ارادہ تھا شام میں اس کے گھر جانے کا۔

کالج سے واپس آکر میں نماز ادا کرکے سوگئی شام میں، میں روٹی پکا رہی تھی تب گل کی امی اور بہن رانی آئیں۔ امی نے ان کو بٹھا کر مجھے بلایا، ان کا سوال سن کر تو گویا میرے پیروں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی۔

''گل کہاں ہے؟'' رانی کا لہجہ کچھ سخت سا تھا۔

''کیا مطلب میں آپ کی بات سمجھی نہیں؟'' میں نے الجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''وہ تمہارے ساتھ گھر آتی ہے ناں! آج وہ کالج سے اب تک گھر نہیں آئی ہے۔'' اس کی امی نے دھماکا کیا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ آج تو وہ کالج آئی ہی نہیں ہے نہ ہی بس اسٹاپ پر ملی تھی صبح میں۔ میں سمجھی اسے دیر ہوگئی ہے وہ پہلے چلی گئی۔'' میں نے بتایا تو اس کی امی رونے والی سی ہوگئیں۔ رانی نے انہیں بڑی ہمت و حوصلے سے سنبھالا۔

''کوئی ایسی دوست جس کے گھر وہ جاسکتی ہو۔'' رانی نے پوچھا۔

''نہیں ہم لوگ عموماً دوستوں کے گھر جاتے نہیں ہیں کیونکہ سب ہی دور دور رہتی ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''اور کوئی رازدار جس سے اگر تم واقف ہو؟'' رانی نے مجھے بغور دیکھا۔

''نہیں کوئی رازدار نہیں ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ ''کیا آپ لوگ شک سے ہٹ کر اس بات کو نہیں سوچ سکتے کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہوگیا ہو۔'' میں نے تیزی سے بات مکمل کی۔

''ہم اس چیز کو پہلے ہی چیک کرچکے ہیں۔'' پہلی بار رانی کے لہجے میں سرد مہری کے بجائے دکھ اترا۔

اور پھر وہ دونوں ماں بیٹی چلی گئیں اس دن گل کی واپسی ساڑھے گیارہ بارہ بجے ہوئی تھی۔ اس کے گھر میں گھستے ہی اس کی امی نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ پتا نہیں اس نے اپنے گھر والوں کو کس طرح مطمئن کیا بہرحال وہ دوسرے دن کالج آئی تھی اور مجھے ہنس ہنس کر بتا رہی تھی۔

''تم گئی کہاں تھیں؟'' مجھے اس کی ذہنی حالت پر افسوس ہوا۔

''یہ ٹاپ سیکرٹ ہے۔'' اس نے اٹھلا کر کہا۔

''ایسا بھی ٹاپ سیکرٹ نہیں ہے مجھے غالباً امی کو بتا دینا چاہیے تھا غلطی کی میں نے چھپا کر۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

''یہ تو تمہارا احسان ہوتا میری ذات پر مجھے اپنا منہ نہ کھولنا پڑتا۔'' اس نے مزے سے کہا۔

''تو کیا تم نے بتا دیا امی کو۔'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''دماغ خراب ہے میرا ابھی تو صرف مار پڑی ہے بتا دیتی پھر تو امی بوٹیاں کرکے چیل کوؤں کو کھلا دیتیں۔'' اس نے کہا۔

''تو کہا کیا اتنی لمبی غیر حاضری کا کیا ریزن دیا؟'' میں نے الجھن آمیز انداز میں اسے دیکھا۔

''اپنی جھوٹی بیماری بے ہوشی اور دوست کے گھر ہونے کا قصہ۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''انہوں نے یقین کرلیا اس قصے پر مجھے تو یقین نہیں آرہا۔'' میں نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''یقین کرنے کے سوا کوئی آپشن نہیں تھا ان کے پاس۔ میں نے اس دوست کا نمبر دے دیا انہیں کہ کال کرکے معلوم کرسکتی ہیں اور دوست کو میں پہلے ہی PCO سے کال کرکے سمجھا چکی تھی۔'' اس نے بڑے مزے سے کہا۔

''کون دوست؟'' میں نے اسے دیکھا۔

''ہے ایک اسکول کے زمانے کی تم نہیں جانتیں

اسے۔'' اس نے بتایا۔

''سنبھل جاؤ گل! کوئی ٹھوکر کھانے سے پہلے۔'' میں نے اسے تنبیہہ کی۔

''نہیں لگتی ٹھوکر۔'' اس کا وہی بے پروا انداز تھا۔

''سمجھانا میرا فرض تھا سمجھنا نہ سمجھنا تمہاری مرضی۔'' میں نے اپنا مخصوص جملہ بولا۔

☆☆☆

اس کے بعد پیپرز شروع ہوگئے اور اس وقت تو سر کھجانے کا بھی وقت نہیں ہوتا تھا۔ پیپرز، پریکٹیکل اور Viva۔ میرے پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے۔ گل سے جب بھی بات ہوئی ''ہاں ٹھیک ہے۔'' کا ہی جواب آیا لیکن پتا نہیں مجھے کیوں لگتا تھا کہ اس بار اس کے پیپرز اچھے نہیں ہوئے کیونکہ ہم تین سال پہلے بھی پیپرز دے چکے تھے مگر ان کے مقابلے میں فائنل ایئر میں اس کی تیاری نظر نہیں آتی تھی نہ ہی وہ پہلے کی طرح میرے پاس آتی تھی کہ مل کر پڑھیں گے وغیرہ۔ پیپرز کے دنوں میں بھی اس کا انداز ڈھیلا ڈھیلا اور کھویا کھویا تھا۔ بہرحال پیپرز ہوگئے۔

اب House Job کے لیے انٹرویو ہو رہے تھے۔ ہم دونوں بھی گئے بلکہ فوزیہ، رخشی بھی ساتھ تھیں ہم چاروں ہی سلیکٹ ہوگئے۔

فوزیہ میں اور رخشی ہم سب مارننگ شفٹ میں تھے اگر دیکھا جائے ..... تو سب سے زیادہ کارآمد شفٹ مارننگ کی ہی ہوتی ہے اس وقت OPD ہوتی ہے۔ اس میں امراض کو سمجھنے کا بہت موقع ملتا ہے۔ گل کی بھابی ان دنوں پریگننٹ تھیں اور غالباً ان کی ڈلیوری نزدیک ہی تھی۔ کام وغیرہ کے پریشر کی وجہ سے وہ مارننگ اور ایوننگ کی شفٹ نہیں کرسکتی تھی۔ لہٰذا اس نے نائٹ شفٹ لگوائی تھی۔

جیسا کہ میں نے بتایا بھی تھا کہ لڑکیوں اور لڑکوں کے پیپرز ساتھ ہی ہوتے تھے تو ان پیپرز کے دوران بھی کئی نظریں خود پر محسوس ہوتی تھیں چونکہ میں اپنے کزن سے انگیجڈ تھی اور دوسرا میرا رجحان بھی نہیں تھا اس طرف۔ لاسٹ پیپرز والے دن بھی ایک مستقبل کے ڈاکٹر مسلسل مجھ سے بس اسٹاپ تک پوچھتے آئے تھے کہ ''کیا میں ولمار شوایے کے فنکشن میں آؤں گی۔'' کیونکہ فائنل ایئر میں شوایے کا فنکشن لیٹ ہوگیا تھا اور پیپرز کے بعد ہونا تھا مگر میرے دو کزنز کی شادی تھی پیپرز کے بعد میرا آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لہٰذا میں نے انہیں اگنور کردیا تھا۔

وہ صاحب بھی موجود تھے، یہاں House Officers میں تھے اور وہ ہی نہیں بلکہ ان کے مزید دو دوست بھی تھے۔ ایک وہ خود راحیل، دوسرے رئیس اور تیسرے احمر یہ تینوں اپنے گروپ کو Traingle of Death کہتے تھے۔ بات بات پر مرنے مارنے کو تیار رہتے تھے۔ مجھے ان پر شدید غصہ آتا تھا۔ ایک دن تو میں نے ان سے کہہ بھی دیا تھا۔

''اتنا ہی مرنے مارنے کا شوق ہے تو ڈاکٹر بننے کی کیا ضرورت تھی، کوئی بھائی لوگ والا گروپ جوائن کرلیتے.....'' اس بات پر وہ خوب ہنسے بھی تھے۔

یہیں پر ہماری دوستی صائمہ سے ہوئی، کلاس میٹ تو وہ تھی مگر بات چیت نہ تھی۔ دوستی نہیں تھی یہاں آکر دوستی پختہ ہوئی، ہم تینوں کو یعنی مجھے گل اور صائمہ کو سب Three Fantastic Ladies کہنے لگے تھے۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب پورا Traingle of Death مجھے پسند کرنے لگا، ہر تھوڑے دن بعد جب کسی نہ کسی کی طرف سے اظہار محبت ہونے لگا تو میں چونکی اور ایک دن جب IRMO ابھی نہیں آئے تھے تو وہ تینوں ان کے آفس میں بیٹھے تھے میں ان کے سر پر پہنچ گئی۔

''یہاں اور بھی Female House Officers ہیں، کسی اور کو بھی ٹرائی کرلیں یا مجھ پر کوئی شرط لگی ہوئی ہے۔'' میرا تو Attitude ہی الگ تھا۔ ان دونوں نے چونک کر راحیل کو دیکھا۔

''یعنی کے تم بھی۔ گھر چل بھابی کو بتاتے ہیں۔'' دونوں نے اس کا ایک ایک طرف سے کان پکڑ لیا۔

''بھابی۔'' میں نے چونک کر بندے کو دیکھا۔ ''اوہ! چھپے رستم۔'' میں نے طنزیہ کہا۔

''جی جناب اور بہت جلد ہی بابا جانی کے عہدے پر بھی فائز ہونے والے ہیں۔'' رئیس نے کہا۔

''کم از کم اس عورت سے تو باوفا رہیں جسے اپنے نکاح سے باندھ کر لائے ہیں۔'' میرا لہجہ اب بھی طنزیہ ہی تھا۔

''نہیں وہ ایک زبردستی کی شادی ہے میرے Parents نے.....'' مگر اس کی بات درمیان میں ہی تھی کہ احمر نے اسے ایک زبردست دھپ لگائی۔

''ایک نمبر کا جھوٹا ہے یہ۔ ایک الگ کمیونٹی کی لڑکی سے محبت کی ہے اس نے..... اس لڑکی نے اس کے لیے اپنی کمیونٹی چھوڑ دی ہے۔'' احمر نے کہا اور میں نے استہزائیہ

انداز میں راحیل کو دیکھا۔

اسی وقت ارمانی صاحب آگئے تو میں ان سے اجازت لے کر باہر آگئی۔

☆☆☆

صائمہ کو لیب اسسٹنٹ پسند کرتا تھا اس کا نام رضا تھا۔ صائمہ اور وہ دو الگ فرقوں سے تھے اور ایسے الگ فرقوں سے جو ایک دوسرے میں شادی کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ صائمہ بھی اس میں انوالو ہونے لگی تو ہم لوگوں نے اسے سمجھانا اپنا فرض سمجھا مگر وہ سوچنے سمجھنے کی حد سے نکل چکی تھی۔

''مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے ہمارے ہاں ہو جاتی ہے۔ میرے دادا اور دادی بھی الگ الگ فرقوں سے ہیں۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''اور ان کی اولاد؟'' میں نے برسبیل پوچھا۔

''وہ بھی دونوں کے فرقوں سے ہیں آدھی ماں کے فرقے پر اور آدھی باپ کے فرقے پر۔'' اس نے کہا۔

''یعنی گھر میں ہی ایکا نہیں ہے اور مسئلے وہیں سر اٹھاتے ہیں جہاں مسئلوں کو مسئلہ نہ سمجھا جائے ایک ہی گھر میں فرقہ وارانہ فساد ہوں تو کیا یہ مسئلہ نہیں ہے؟'' رخشی نے ناگواری سے کہا۔

''تو کیا اب اتنی سی بات پر انسان اپنی محبت سے ہاتھ دھو لے۔'' وہ بڑی تلخی سے ہنسی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی اس لیے میں نے رخشی کو اشارہ کر دیا تھا کہ اب کچھ نہ بولے۔

صائمہ سے ہی مجھے پتا لگا کہ راحیل نے ایک میمن لڑکی سے شادی کی ہے۔ اس کی بیوی نیا بے حد حسین ہے۔ ان دونوں میں باقاعدہ 5,4 سال افیئر چلا تھا۔ میمن اپنی کمیونٹی سے باہر لڑکی نہیں دیتے، نیا کے بہت رونے دھونے پر اس کی شادی تو راحیل سے کر دی گئی تھی مگر گھر والوں نے نیا سے قطعی قطع تعلق کر لیا تھا۔ بس وہ اپنی ایک بہن سے ملتی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ ایک لڑکی جس نے اس کے لیے اپنی کمیونٹی اپنا گھر بار اپنے رشتے دار ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیے وہ شخص اس سے بھی باوفا نہیں تھا اور اب نئے جہانوں کی تسخیر میں مصروف تھا۔

میرے سختی سے منع کرنے کے باوجود وہ ایک دن نیا کو اسپتال لے آیا مجھ سے ملانے کے لیے اور میں نے اس دن بڑے واضح انداز میں نیا کے چہرے پر تاریکی پھیلتے ہوئے دیکھی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا تھا۔

''مجھ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں Engaged ہوں اپنے کزن سے۔'' میں نے اسے دلاسہ دیا۔

''نکاح ٹوٹ جاتے ہیں منگنی کیا چیز ہے۔'' راحیل نے تپ کر کہا۔

''ضرور ٹوٹ جاتے ہوں گے جہاں دونوں اطراف میں پسند پائی جاتی ہوگی یکطرفہ پسند میں نہیں۔ اور For your kind information مسٹر راحیل ہم پٹھان ہیں ہمارے ہاں قتل ہو جاتے ہیں مگر رشتے ختم نہیں ہوتے۔'' میں نے دوٹوک اور سرد لہجے میں کہا۔

رئیس کچھ شاعری بھی کر لیا کرتا تھا وہ اپنے کچھ اشعار مجھے سنانے لگا تو میں نے دوٹوک کہا۔

''میرا خیال ہے ڈاکٹر رئیس! آپ اپنی توانائیوں کا استعمال کہیں اور کریں۔''

''کیوں آپ پر کیوں نہیں؟'' وہ بھی ڈھیٹ تھا۔

''کیونکہ میرے پاس میرا مسٹر رائٹ موجود ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس کی خیر ہے۔'' یعنی وہ کوئی طبیعت سے ٹھرکی بندہ تھا۔

''اپنی ٹھرک پر قابو پالیں ڈاکٹر رئیس میرا منگیتر میری ہی طرح پٹھان ہے بات بعد میں کرتا ہے بندہ پہلے پھڑکا دیتا ہے۔'' میں نے ڈرایا اسے۔

''یعنی بھائی لوگ ہے۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

''جی نہیں کیمیکل انجینئر ہے۔'' مجھے برا لگا تھا اور میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

رئیس سارے Patients سے اپنے حق میں دعا کرواتا تھا کہ ''میرا دل اس کی طرف پھر جائے۔''

مگر مجھے وہ کبھی اچھا ہی نہیں لگا ہاں اس دوران گل اس کی جانب مائل ہوگئی کیونکہ رئیس نائٹ بھی کرتا تھا اور مارننگ کا بھی آدھا وقت گذار کر ہی جاتا تھا۔

انہی دنوں گل ایک مسئلے میں الجھ گئی جس کا تعلق گائنی سے تھا سو وہ مارننگ میں بھی رکنے لگی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں ارمانی صاحب سے بات کی تو ڈاکٹر صاحب نے اسے شام میں اپنے اسپتال آنے کو کہا جہاں گل نے آج کل یہاں کی نائٹ کی وجہ سے جانا چھوڑا ہوا تھا۔

اور پھر اسے اس مسئلے سے نجات مل گئی۔ لڑکوں کی اکثریت نائٹ ہی کرتی تھی کیونکہ میڈیسن لے کر مریض

رات میں سو جاتے تھے ۔ ڈیوٹی پر موجود تمام ڈاکٹرز اور ہاؤس آفیسرز بھی سو جاتے تھے علاوہ کسی ایمرجنسی کے، اسی لیے میل ہاؤس آفیسرز کو نائٹ زیادہ سوٹ کرتی تھی۔

گل کی بھابی کے گھر بیٹی ہوئی تو وہ دوبارہ مارننگ کرنے لگی۔ اب ہم پھر ساتھ آنے لگے تھے میں، گل اور صائمہ عموماً ایک ہی وقت میں نکلا کرتے تھے سو بس اسٹاپ سے ساتھ ہی بس میں سوار ہوا کرتے تھے۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد گل جیسے مسئلے سے میں بھی سفر کرنے لگی اس کی وجہ میری نظر میں تو میری کمزوری ہی تھی۔ میں کھانے کی بہت چور تھی اس لیے اکثر کمزوری ہی رہتی تھی میں انڈر ویٹ تھی۔ اور انیمک بھی تھی خون کی کمی کا شکار اور اس پر جب کالج میں فاطمید والے آئے تھے تو انہیں میں نے اور گل نے ہی بلڈ دیا تھا۔ لڑکیاں ہم دونوں کا مذاق اڑاتی تھیں۔ ''زیادہ خون ہے تو ہمیں دے دو۔''

سب سے زیادہ غصہ ابو نے کیا تھا۔ انہیں ٹھنڈا کرنے کے لیے میں نے کہا۔

''ابو! میرا خون کسی کی زندگی بچانے میں کام آئے گا۔''

ہاں دوسری بار خون دینے کے بعد زندگی میں پہلی بار مجھے پتا چلا تھا کہ چکر کیا ہوتے ہیں، اس دن مجھے پوری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

بہر حال میری وہ کنڈیشن کمزوری کی وجہ سے تھی اور اس دن OPD چل رہی تھی۔ میں ایک مریض کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی تبھی میں نے انہیں اپنا مسئلہ بتایا اور ساتھ ہی بلڈ پریشر ریڈنگ بھی۔ ڈاکٹر ارمانی کی ڈیوٹی تھی ان دنوں۔

''اگر کوئی بات ہے تو تم مجھ سے اکیلے میں شیئر کر سکتی ہو۔ یہیں ایک House Officers کے ساتھ مسئلہ ہوا تھا دیکھو اس کا نام بھی کسی کو پتا نہیں چلا اور اس کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔'' اس کے ساتھ ہی گل نے پہلو بدلا میرا دھیان بھی اس وقت گل کی طرف ہی گیا تھا۔

''میں سمجھی نہیں آپ کی بات۔'' میرا لہجہ بہر حال روڈ تھا۔

''ہو جاتی ہیں جوانی میں غلطیاں بچوں سے۔'' ان کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہاں موجود میل آفیسرز کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی ۔ میرا پارہ ایک دم سے ہائی ہوا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی تھی ۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اپنا میٹر والا بی پی آپریٹس پوری قوت سے زمین پر مارا جس کا شیشہ چکنا چور ہو گیا اور اس کی سوئی نکل کر پتا نہیں کہاں گم ہو گئی تھی۔

''اپنے پیشے نہیں تو اپنی عمر کا ضرور لحاظ کر لیں ٹھرکی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بندہ اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی کا بھی لحاظ نہ کرے۔'' میں نے غصے سے کہا تھا۔ میرے آنسو بہنے لگے تھے ۔ میرا اتنا شدید ردِعمل دیکھ کر سب ایک دم سے سنجیدہ ہو گئے۔ اس کے بعد میں رکی نہیں تھی باہر کی طرف تیزی سے بڑھی تھی۔ دنگ تو ارمانی صاحب خود بھی رہ گئے تھے۔ وہ ٹھرکی تھے یہ بات ہر کوئی جانتا تھا مگر اکثر House Officers ان کی باتوں کو مذاق میں اڑا دیتیں۔ وہ ڈرتی بھی رہی تھے کہ اگر اس واقعے کی اطلاع اوپر ہو جاتی تو ان کی کھنچائی ضرور ہوتی۔ نوکری تو سرکاری تھی وہ تو اتنی آسانی سے جانے والی نہیں تھی۔ میں نے گل کی آواز سنی۔

''اتنی عمر میں انسان کو اتنا اندازہ تو ہو جاتا ہے سر! کہ کون کیسا ہے، کون کس نیچر کا ہے اور ہر کوئی جوانی کے جوش میں غلطیاں نہیں کرتا بعض کو فرشتوں کا روپ دھارے شیطان بھی مل جاتے ہیں۔'' وہ بولی تھی مگر میں رکی نہیں۔ صائمہ، رخشی اور فوزیہ کو پتا چلا تو وہ سب بھی غصے میں آ گئیں۔

''کون کیسا ہے صاف پتا چلتا ہے لیکن اس بندے کے تو اندر گندگی بھری ہوئی ہے اسے تو ہر لڑکی شکار ہی لگتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے میں نے اس کے پاس اسٹال جانا چھوڑ دیا۔'' فوزیہ سب سے زیادہ چڑی تھی۔

اس دن میرے آنسو کسی طور خشک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ میں نے آج سر کے ساتھ وارڈز کا وزٹ بھی نہیں کیا تھا بس ایک جانب بیٹھی روئے چلی جا رہی تھی۔ سر کے ساتھ کچھ دیر پہلے طنزیہ ہنسی ہنسنے والے میل ہاؤس آفیسرز بھی آ گئے تھے وہ بھی مجھے سر کی نیچر سمجھانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے مگر مجھے تو کچھ سنائی اور سمجھائی دے ہی نہیں رہا تھا میرے ذہن میں تو ان کے رکیک الزام کی بازگشت تھی۔

اس کے بعد میں کس طرح سے گھر پہنچی مجھے نہیں پتا لیکن میں اس کے بعد تین دن تک بخار میں جلتی رہی تھی۔ وہ میرے اندر کا دکھ تھا تکلیف تھی غصہ تھا کھولن تھی جو کہ بخار کے روپ میں ڈھل گیا تھا۔

ٹھیک ہونے کے بعد میں نے ارمانی صاحب کے پاس سے اپنی ڈیوٹی بدلوالی لیکن گل نے میرے پیچھے سنا ہے

ان سے کافی بحث کی تھی اور وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار ہو گئے تھے۔ ویسے بھی M.S کی ان سے بنتی نہیں تھی وہ بہر حال ان کا ٹرانسفر ضرور کروا سکتے تھے اگر اس واقعے کی اطلاع انہیں مل جاتی۔ انہوں نے مجھ سے سوری کی بھی تھی مگر میرا دل نہیں چاہتا تھا ان کی شکل دیکھنے کو۔ سو میں نے اس کے بعد ان کے پاس ڈیوٹی نہیں کی۔

رئیس نے بتایا تھا کہ میری ذات کو لے کر راحیل اور نیا میں بہت لڑائیاں ہو رہی ہیں مگر میں کیا کر سکتی تھی روابط کے ذرائع ان دنوں اس قدر آسان نہیں تھے اور پھر ایک دن ان دونوں میں زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ یہ لڑائی کچن میں ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیسے راحیل کا پیر سلیپ ہوا اور وہ چولہے پر جا گرا۔ سلیب پر رکھا چولہا گرا تو پائپ کھل گیا اور پورا کچن آگ سے بھرا تنور بن گیا۔ محلے والوں نے گیس کا مین والو بند کیا..... پھر بھی راحیل بری طرح سے جل گیا اسے ٹراما سینٹر کے برنس وارڈ میں داخل کروایا گیا تھا۔ ہم سارے ہاؤس آفیسرز دیکھنے گئے تھے مجھے اس پر ترس آیا تھا وہ واقعی بہت بری طرح سے جلا تھا مگر یہ اس کی اپنی ہی ٹھرک تھی ناں! اچھی خاصی زندگی کو جہنم بنا لیا تھا۔ میں نے نیا کو تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ پھڑک اٹھی۔

''سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے تم آسیب ہو میری زندگی کا۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''میں نے کبھی تمہارے شوہر کو کوئی آسرا نہیں دیا اگر وہ ایسا سوچتا ہے تو یہ اس کا اپنا پاگل پن ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔'' مجھے ایک دم ہی غصہ آ گیا تھا۔ رئیس اور گل نے میری بات کی تائید کی تھی۔

''ہاں تم نے خود ایسے ٹھرکی سے شادی کر کے اپنے پیر پر کلہاڑی ماری ہے اپنی کمیونٹی بھی چھوڑ دی۔'' گل نے کہا تھا۔

''ہاں ماں باپ کا دل دکھانے کی سزا تو ملنی ہی ہے۔'' وہ استہزائیہ بولی جیسے اپنا ہی مذاق اڑا رہی ہو۔

بعد میں راحیل کا علاج ہومیو پیتھک برنس کے اسپتال میں کروایا گیا اور وہ تیزی سے Recover ہونے لگا۔

☆☆☆

ایسے ہی گذرتے دنوں میں ایک دن اسپتال میں رضوان کی آمد ہوئی۔ اسے دیکھ کر گل نے جس نفرت سے منہ پھیرا تھا اس نے مجھے حیرت میں مبتلا کر دیا۔

''کیا ہوا گل رضوان سے ملو گی نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ قطعیت سے کہہ کر آفس کی جانب بڑھ گئی۔ تب رضوان نے مجھ سے اور صائمہ سے بات کی کہ ہم اس کی کسی بھی طرح سے رضوان سے بات کروا دیں، ہمارے گھر کے راستے میں ہوٹل Largess پڑتا تھا اس کا کہنا تھا کہ ہم گل کو اگر وہاں لے آئیں تو وہاں سہولت سے بات ہو سکتی ہے۔

مگر گل نے قطعیت سے انکار کر دیا۔

''مجھے بتانا پسند کرو گی کہ جس شخص کے پیچھے تم دیوانی تھیں اب اس میں کون سے کیڑے پڑ گئے ہیں۔'' میں نے برہمی سے پوچھا۔

''تم کچھ نہیں جانتیں اور میں بتا بھی نہیں سکتی۔'' وہ اٹھ کر جانے لگی۔

''بتا تو میں بہت آسانی سے سکتی ہوں محترمہ گل صاحبہ تم بتاؤ یا نہ بتاؤ۔'' میں نے طنزیہ کہا۔

''کیا بتا سکتی ہو تم کچھ نہیں جانتیں۔'' وہ غصے سے تیز لہجے میں بولی۔

''گل! میں کراچی میں رہتی ہوں اور بچی بھی نہیں ہوں۔ روٹی کو اوٹی اور پانی کو مانی نہیں کہتی، نہ کان کی جگہ ناک پکڑتی ہوں اگر کڑی سے کڑی ملائی جائے تو ساری کہانی سمجھ آ جاتی ہے۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا۔

''کون..... کون سی کہانی۔'' وہ ہکلائی تھی۔ ''اور کون سی کڑیاں۔'' اس نے مجھے دیکھا۔

''تمہارا پورے دن گھر سے غائب رہنا اور گائنی پرابلم سے سفر کرنا۔ ارمانی صاحب کی مدد سے اس پرابلم سے نکل آنا، اور اب رضوان سے اتنی نفرت کا اظہار، ساتھ ہی ارمانی صاحب سے بے تحاشہ عقیدت۔ ان کڑیوں کو ملاؤ ناں تو پوری زنجیر بن جائے گی۔'' میں نے بے رحمی سے تجزیہ کیا تھا اور وہ گرنے کے سے انداز میں بینچ پر بیٹھی تھی۔

''ہاں میں نے غلط آدمی پر اعتبار کیا تھا وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس پر اعتبار کیا جاتا۔ وہ شیطان ہے۔ وہ لڑکیوں کے پاس اس وقت آتا ہے جب وہ اکیلی ہوتی ہیں۔'' میں نے تیزی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا وہ رو رہی تھی۔

''اب بس آگے مزید کچھ مت کہنا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن گل! وہ اکیلا قصوروار نہیں ہے خود تک آنے کا راستہ تم نے اسے دیا۔ تنہائی میں تو تیسرا شیطان ہی ہوتا ہے عورت مرد کی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ہوں میں قصوروار، مگر میں نے یہ فریب محبت کے نام پر کھایا ہے۔'' مجھے بتانا تھا گل بری لڑکی نہیں تھی وہ شکار ہوئی تھی فریب محبت کی۔ ''اگر خدا زمین پر آتا ناں! تو میں اس سے گواہی دلواتی، میں غلط نہیں تھی۔'' وہ بولی تھی اور میں ان الفاظ پر لرز گئی تھی۔

جب گل جانے کے لیے تیار نہیں تھی تو میرا اور صائمہ کا تو جانا بنتا ہی نہیں تھا اور وہ بھی اس کے کرتوت جاننے کے بعد۔ مگر رات میں ہی رضوان کا PTCL پر فون آ گیا وہ کر کرنے لگا اور میں نے بھی کہہ دیا کہ جب گل ہی تیار نہیں تو ہمارے آنے کا فائدہ۔

اور اس نے مجھے آفر کی کہ میں اس کے کلینک پر پریکٹس کرلوں۔

''مشکل ہے۔'' میں نے دوٹوک کہا۔

''کیا مشکل ہے۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''تمہارا کلینک بہت دور ہے اور میں اپنے فیصلے خود نہیں کرتی گھر والوں سے مشورہ کرنا پڑے گا۔'' میں نے اسے ٹالا۔

''پک اینڈ ڈراپ میں کردوں گا۔'' اس نے ترنت کہا۔

''نہیں، نہ ابو مانیں گے نہ میرے فیانسی۔'' میں نے دوٹوک کہا۔

''بس تم لوگ میل شاؤنزم کا ہی شکار رہنا۔'' وہ چڑا تھا۔

''اسی میں بقا ہے ورنہ تم جیسوں کا شکار ہو جائیں۔'' میں نے دوٹوک بات کرنے کی ٹھانی۔

"What do you mean by" مجھ جیسے۔ اس کا لہجہ بدلا تھا۔

''ہاں تم جیسے، گل مجھے بتا چکی ہے کہ تم کیسے ہو۔'' میرا کہنا تھا کہ اس نے کال ڈراپ کردی۔

☆☆☆

مجھ سے مایوس ہو کر رئیس نے گل کی محبت کو قبول کرلیا۔ رئیس ایک ملٹی ٹیلنٹڈ انسان تھا۔ وہ بہت اچھا آرٹسٹ بھی تھا بہترین اسکیچز بناتا تھا، کارڈ وغیرہ بھی۔ گل کی محبت کو قبول کرنے کے باوجود وہ مجھے میرا نام بڑے خوبصورت انداز میں، آرٹسٹک انداز میں لکھ لکھ کر دیتا رہتا تھا اس نے اردو میں بڑے آرٹسٹک انداز میں میرا نام لکھ کر اس کی چین بنوا کر مجھے گفٹ کی تھی پلاسٹک کی۔

میں نے گل سے کہا تھا کہ رئیس کو اپنے ماضی اور اس کی غلطیوں کے متعلق مت بتانا مگر نہیں اس وقت تو وہ دیوی بنی ہوئی تھیں اپنی ہر خامی اور کمی رئیس کو بتانے کو تیار جو دیوتا کے روپ میں انہیں فوراً قبول کرلے۔

میرے بہت منع کرنے کے بعد بھی اس نے اپنا اور رضوان والا راز اس کے سامنے کھول دیا تو میں نے سر پکڑ لیا۔ ''گل! یہ تمہاری زندگی کی دوسری بڑی غلطی ہے، رضوان پر اعتبار کے بعد جس پر تمہیں زندگی میں کبھی نہ کبھی پچھتانا ضرور پڑے گا۔'' میں نے اسے تاسف سے دیکھا۔

''مگر میں کسی کو دھوکا کیوں دوں اپنی پچھلی زندگی کو راز میں رکھ کر۔ اب اس کی مرضی ہے مجھے اپنائے نہ اپنائے۔'' وہ فیئر تھی زندگی سے مگر ابھی زندگی کی مکاریوں سے ناواقف تھی۔

''پہلی بات تو یہ ہے گل کہ جس راز کی حفاظت اللہ نے کی اسے تم آشکار کرنے والی کون ہوتی ہو؟ اور تم لڑکوں کو جانتی نہیں ہو ابھی وہ محبت پا ہمدردی میں یا ہیرو اور دیوتا بننے کے شوق میں اسے کچھ برا نہیں لگے گا لیکن بعد میں وہ اس بات کو تمہارے لیے سزا بنا دے گا۔'' میں نے افسوس سے کہا۔

''تو میں نے اپنا راز بتا کر گناہ کیا؟'' اس نے مجھے دیکھا۔

''گناہ تو نہیں مگر برا ضرور کیا۔ گل جب ہم اپنا راز کھول رہے ہوتے ہیں یا دوسرے کا تو اس آیت کو بھول جاتے ہیں کہ ''وتعز من تشآء وتذل من تشآء'' کہ عزت و ذلت تو اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا؟'' میں نے کہا۔

''مگر وہ ایسا نہیں ہے اور تم تو ایسے بات کر رہی ہو جیسے بڑی تجربہ کار ہو۔'' اس نے بات ہنسی میں اڑائی۔

''وہ کیسا ہے مجھے پتا ہے؟'' ٹھہر کی لفظ میں نے جان کر ادا نہیں کیا ورنہ پورے اسپتال میں ارمانی صاحب کے بعد دوسرے نمبر پر رئیس اور تیسرے نمبر پر راحیل تھا۔ ''اور ضروری نہیں گل! تجربات ہمیشہ اپنی زندگی سے حاصل کیے جائیں، جو سیکھنے والے ہوتے ہیں وہ ہر واقعے سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ مجھے مطالعے کی بھی عادت ہے۔ بہت سی باتیں مجھے اس عادت نے سمجھائی ہیں۔'' میں نے بات لپیٹی۔

''لیکن مجھے نہیں لگتا کہ میں نے کچھ غلط کیا ہے۔'' اس

نے آرام سے کہا۔

''اوکے! سمجھانا میرا فرض تھا سمجھنا یا نہ سمجھنا تمہاری مرضی۔'' میں اپنا مخصوص جملہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

بہرحال یونہی ہماری ہاؤس جاب ختم ہوگئی۔ ہاؤس جاب کے بعد میری شادی ہوگئی اور میں نے ساتھ ہی B.Sc میں ایڈمیشن لے لیا۔ گل اور رئیس میری شادی میں شریک ہوئے تھے۔ ولیمے میں بھی۔

میری سسرال خاصے کنزرویٹو نظریات کی حامی تھی۔ سو گل سے ملنا یوں بھی بند ہوگیا کہ اب وہ رئیس کے ساتھ ہی آتی جاتی تھی۔ بہرحال وہ دونوں اپنی شادی کا کارڈ دینے ساتھ ہی ہمارے گھر آئے تھے۔

شادی کے بعد میرے گھر بیٹی ہوئی اور میری بیٹی سے سوا سال چھوٹی گل کی بیٹی تھی ساتھ ہی میرا گریجویشن بھی چل رہا تھا۔ اس کی شادی کے بعد اس کا اور میرا اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہوگیا۔ ان دونوں نے کلینک شروع کر دیا اور اب وہ اکثر میری اس کی شادی سے پہلے کہی ہوئی باتوں کا مذاق اڑاتی تھی۔ رئیس کی مالی حیثیت گل کے گھر والوں کے مقابلے میں خاصی کمزور تھی۔ رئیس دو بھائی اور چھ بہنیں تھے، ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جس میں وہ رہائش پذیر تھے۔ یہ آٹھ بہن بھائی دو ماں باپ گل اور اس کی بیٹی۔

گل کے رئیس کے علاوہ بھی کافی رشتے آئے تھے۔ ایک تو اس کا کزن ہی تھا مگر وہاں کچھ ناراضگیاں تھیں سو یہ رشتہ نہ ہوسکا اور دوسرا کوئی ملک سے باہر رہائش پذیر تھا اس کا آیا تھا ان کی بھابی کے خاندان سے اور یہ رشتہ بھابی نے نہیں ہونے دیا یوں گل کی شادی رئیس سے ہوگئی۔ جس دن گل مایوں بیٹھی اس دن پتا نہیں اس کے بڑے بھائی کو کیا ہوا کہ انہوں نے اس سے کہا بھی کہ ''گل ناز! ابھی بھی وقت ہے اگر دل راضی نہ ہو تو انکار کر دو میں سب سنبھال لوں گا....'' گل ہنسی تھی۔

مگر اب مجھے اور اسے بھی افسوس ہوتا ہے کہ کاش وہ اس وقت بھائی کی بات مان لیتی۔

فلیٹ چھوٹا ہونے کی وجہ سے گل اور رئیس کو کلینک ختم کر کے اس فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا جو کہ کلینک کے ہی برابر کا تھا۔ یہ فلیٹ گاڑیاں کھڑی کرنے کی جو جگہ ہوتی ہے اس جگہ پر بنایا گیا تھا سو چیں کس قدر چھوٹا ہوگا۔ یہاں منتقل ہو کر رئیس پر سے ماں باپ کا جو ایک ڈر ہوتا ہے وہ بھی ختم ہوگیا۔

رئیس ایک درندہ تھا۔ وہ بیوی بچوں کے فرائض سے غافل تھا اسے صرف اپنے حقوق چاہیے تھے اور ہر روز چاہیے تھے۔ وہ گل پر شک کرتا تھا... اسے مارتا پیٹتا تھا۔ ان تمام باتوں پر بھی اس کی ہوس روزانہ پوری ہونی چاہیے تھی خواہ وہ کتنی ہی زخمی یا بیمار کیوں نہ ہوتی۔ خرچ کے نام پر ایک پیسا بھی اسے نہ دیتا تھا۔

یہ تو گل کو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں سے بھی اس کے افیئرز چل رہے ہیں اور سارا پیسا وہ ان پر اڑا دیتا۔ بھائی اور بڑی بہنیں کافی عرصے تک اسے خرچ کے پیسے دیتے رہے مگر آخر کب تک وہ سب بھی بال بچے دار تھے اور تب گل کو ہی کمر ٹھونک کر میدان میں اترنا پڑا۔

اس دوران فوزیہ کی بھی شادی ہوگئی۔ وہ حیدر آباد سے آئی تھی، اپنے ماموں کے پاس رکی ہوئی تھی۔ شادی اس کی وہیں حیدر آباد میں ہوئی تھی۔ رخشی شادی کے بعد امریکا چلی گئی سو اس سے ملنا ملانا ختم ہوگیا۔

صائمہ کی رضا سے ہی شادی ہوگئی مگر وہ دو الگ مسالک کے لوگ تھے، رضا کی امی کو صائمہ کے مسلک پر آئے دن اعتراض رہتا، صائمہ ویسے تو خاصی صلح جو تھی مگر کبھی کبھی انسان کی برداشت سے باہر بھی ہو جاتا ہے اسی حالت میں وہ دو بچوں کی ماں بن گئی اور رضا کا افیئر کسی اور لڑکی سے چلنے لگا... اب صحیح معنوں میں صائمہ کی زندگی اجیرن ہوئی تھی اب وہ اکثر کہا کرتی تھی۔

''تم ٹھیک ہی کہتی تھیں میں ہی نہیں سمجھی، میری ہی آنکھوں پر عشق کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اب آٹے دال کا بھاؤ پتا چلا ہے۔'' اکثر اس کا فون آجاتا تھا۔

''عشق نہیں محبت۔ عشق تو فنا ہو جانے کا نام ہے۔ فنا فی اللہ یا پھر فنافی المحبوب۔ یہ وصل کی خواہش سے ماوراء کیفیت ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں محبت ہی تھی اور محبت ہمیشہ نامساعد حالات میں مرجاتی ہے جیسے رضا کی محبت۔'' اس کا لہجہ تھکا ہوا تھا۔

''اور تمہاری محبت۔'' میں نے اسے ٹٹولا۔

''یہ میری محبت ہے کسی مرد کی محبت نہیں جو حالات کی ناموافقیت برداشت نہ کر سکے۔'' اس کے لہجے میں محبت کرلائی تھی اور یہ چیز مجھے رلاتی تھی۔ رضا نے پتا نہیں اپنے خاندانی دباؤ یا تازہ ترین محبت میں مبتلا ہو کر دوسری شادی کر لی اور اب صائمہ کی حیثیت اس گھر میں دوسرے درجے

کے شہری جیسی ہوگئی تھی۔ صائمہ مختلف بیماریوں کی آماجگاہ بن چکی تھی۔ جوش جوانی میں کیے گئے غلط فیصلے کیسے خون کے آنسو رلاتے ہیں یا رلائے جاتے ہیں اس کا علم بہت بعد میں ہوتا ہے۔

☆☆☆

گل نے اپنی ذات پر تو سب برداشت کرلیا مگر اب وہ دو بچوں کی ماں تھی میری بھی دو سری بیٹی ہی ہوئی تھی۔ جب ان کی اسکول جانے کی عمریں نکلنے لگیں تو اس نے Lady Health Worker کی جاب کرلی۔ اب وہ بچیوں کو دادی اور پھپھو کے پاس چھوڑ کر جاب پر چلی جاتی۔ اس کی شام میں واپسی ہوتی اور پھر گھر کے کام کرتی کھانا پکانا، کپڑے برتن دھونا صفائی ستھرائی۔

رئیس کی وہی روش تھی۔ گھر پر کچھ بھی نہ خرچ کرنا اور آدھی آدھی رات تک غائب رہنا گل پر بلاوجہ شک کرنا بلاوجہ مارنا پیٹنا۔ اب تو اکثر ہی گل کہتی تھی۔

''سونو! تم بالکل ٹھیک کہتی تھیں میں نے غلط آدمی کو اپنا راز دے دیا۔ بس میرا قصور یہ ہے کہ میں اسے دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی۔'' وہ اکثر ہی روہانسی ہوجاتی تھی۔

''یہ مرد ذات ہوتی ہی ایسی ہے گل! خود خواہ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ہوں مگر بیوی گنگا نہائی ہوئی ہی چاہیے، پتا نہیں تمہیں اور صائمہ کو تجربات کرنے کا شوق کیوں چڑھا تھا۔ تم نے دوسروں کے تجربات سے سبق لینا کیوں نہیں سیکھا۔ والدین جب فیصلہ کرتے ہیں تو دل سے نہیں دماغ سے کرتے ہیں ہم لڑکیاں جوش میں عقل کو بھلا دیتی ہیں اس کا رزلٹ ہے یہ سب۔'' مجھے دکھ ہوتا تھا ان دونوں کو دیکھ کر۔

''بس ہماری قسمت۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''یہ اچھا ہے غلطیاں ساری خود کرو اور قصوروار قسمت کو دو۔'' مجھے غصہ آیا۔

''بس یہ جو ناصح ہوتے ہیں ناں! یہ سب سے زیادہ برے لگتے ہیں جب ہم پر عشق کا بھوت چڑھا ہوا ہوتا ہے۔'' وہ استہزائیہ ہنسی تھی۔

''عشق نہیں محبت۔ عشق فنا کردیتا ہے مگر خود فنا نہیں ہوتا۔ یہ منصور حلاج بنا دیتا ہے۔ شمس تبریز بنا دیتا ہے۔ یہ بھٹکاتا نہیں ہے۔ یہ تو منزل کی طرف ہاتھ پکڑ کر لے جاتا ہے لہٰذا اپنی فضول سی محبتوں کو عشق کا نام مت دیا کرو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یار! محبت ہی تھی تبھی فنا ہوگئی اب تو مجھے اس شخص سے گھن ہی آتی ہے کوئی، بھیڑیا لگتا ہے یہ شخص مجھے۔'' وہ دکھ سے بولی تھی۔

اسی دوران میرے گھر ایک بیٹے اور اس کے دو سال بعد ایک بیٹی نے جنم لیا اور گل کے گھر جڑواں بیٹیوں نے۔

اب بچے بڑے ہو رہے تھے ایک کمرے کا گھر بڑی ہوتی بچیاں اور رئیس کی وہی روش۔ اسی چیز نے گل کی بچیوں کو وقت سے پہلے ہی بالغ کردیا گل کی مجبوری تھی وہ گھر کو وقت دے نہیں سکتی تھی۔ رئیس کو گھر سے کوئی دلچسپی قطعی تھی ہی نہیں اب جب سے بچیاں کچھ بڑی ہوئی تھیں پھپھیوں نے رکھنا چھوڑ دی تھیں تین پھپھیوں کی اور اکلوتے چاچو کی بھی شادی ہوچکی تھی۔ دادا اور دادی اللہ کے پاس چلے گئے تھے۔

گو کہ بچیاں ابھی بہت بڑی نہیں تھیں ان دنوں بڑی بیٹی تاثیر نو سال کی تھی باقی تینوں چھوٹی تھیں۔ میری سب سے چھوٹی بیٹی عمیمہ ان دنوں کچھ ہی مہینوں کی تھی کہ میرے بچوں نے کہیں لے جانے کے لیے ضد کرنی شروع کی جون، جولائی کی چھٹیاں ہوئی تھیں میں نے ان سے کہا۔ ''دوپہر میں اگر وقت ملے تو ہمیں گل کے گھر چھوڑ دیں۔'' میں عموماً کیونکہ انہیں تنگ نہیں کرتی تھی تو وہ میری کوئی بھی بات رد نہیں کرتے تھے۔

انہوں نے دوپہر ایک بجے ہمیں گل کے گھر ڈراپ کردیا اور بدقسمتی سے آج گھر میں رئیس بھی موجود تھا مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''زہے نصیب! بڑے نصیب ہمارے جو آپ ہمارے گھر آئیں۔'' شادی کے دس سال بعد جبکہ بڑی بیٹی نو سال کی تھی اور چاروں بیٹیاں ہی تھیں۔ اب بھی اس کا انداز خاصا لوفرانہ تھا۔ میں نے گل کو دیکھا تو اس نے ایسے سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو۔ ''یہ بندہ لاعلاج ہے۔''

''ڈاکٹر صاحبہ! بتائیں آپ کیا کھائیں گی؟'' اس نے بڑے فدویانہ انداز میں پوچھا تھا۔ مجھے بریانی کے مقابلے میں پلاؤ شروع سے پسند تھا یہ بات سب جانتے تھے مگر پتا نہیں مجھے اچانک کیا ہوا کہ میں نے سوچا کوئی ایسی چیز بتاتی ہوں جو کہہ یہ کسی بھی طرح سے نہ لا سکے۔

اور یہ سوچ آتے ہی میں مسکرائی.... میں نے کہا۔

''مجھے کھٹل کھانا ہے اتنا کھانا ہے۔''

''اور کوئی حکم ڈاکٹر صاحبہ!'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''نہیں۔'' میں کہہ کر گل کے ساتھ باتوں میں لگ گئی۔ میری رات اس سے بات ہوچکی تھی سو آج اس نے چھٹی کی تھی۔

غالباً دیر سے بھی اٹھی تھی میرے ہی سامنے ان لوگوں نے گھر سمیٹ کر جھاڑ پونچھا کیا اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیا پکائے۔

تبھی رئیس بہت سارے شاپرز کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ وہ میرے لیے خاصا کھانے کا سامان لے کر آیا تھا جس میں پلاؤ رائتے کے ساتھ قورمہ، چپاتی اور ہوٹل کی روٹی بھی تھی۔ سب سے حیرت انگیز جو اس سامان میں چیز موجود تھی وہ کٹھل تھا۔

ساتھ میں بچوں کے لیے بھی چیزیں تھیں۔ میں نے مڑ کر گل کو دیکھا تو وہ بڑے استہزائیہ انداز میں ہنسی تھی۔ یعنی پیسے کی واقعی کوئی کمی نہیں تھی۔ کٹھل کوئی ایسا پھل نہیں ہے جو پاکستان میں آسانی سے دستیاب ہو۔ اگر دستیاب ہو تو پھر وہ کسی عام قیمت پر تو دستیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ اس پر ہوٹل کا کھانا اور بچوں کے لیے اسنیکس۔ تو کیا وجہ تھی کہ وہ اپنے ہی بیوی بچوں کو ان کی بنیادی ضروریات کے لیے ستا رہا تھا۔ میں نے اس کی چاروں بچیوں کی طرف دیکھا جو کہ عجیب ترسی ہوئی نگاہوں سے ان سب چیزوں کو دیکھ رہی تھیں۔

میں نے وہ اسنیکس والا شاپر ان بچیوں کی طرف بڑھایا مگر انہوں نے سہمی ہوئی نظروں سے باپ کو دیکھا تو میں نے کہا۔ ''پاپا کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے یہ میں دے رہی ہوں یہ لے کر جلدی سے برتن لے کر آؤ ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے۔''

''ارے نہیں یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں تم لوگ کھالو پھر یہ لوگ کھالیں گے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''کیوں یہ فقیر ہیں بھکاری ہیں نوکر ہیں یا تمہاری رعایا کہ ان کے سامنے بچا کھچا ڈال دیا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''ان لوگوں نے ابھی ناشتا کیا ہے؟'' اس نے جلدی سے کہا۔

''ہاں دیکھا تھا میں نے وہ ناشتا۔ پوری رات کی Fasting کے بعد کالی چائے اور دو روٹیوں میں پانچ کھانے والے۔'' مجھے ابل ابل کر غصہ آرہا تھا مگر اس پر غصے کا کوئی رائٹ بھی نہیں تھا سو میں نے کنٹرولڈ لہجے میں کہا۔

''عادی ہیں یا تم نے بنادیا ہے۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''کوئی کمی نہیں ہے دو دو کمانے والے موجود ہیں اس گھر میں۔ بس ان لوگوں کو عادت ہے اپنی مظلومیت دکھانے کی۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''ہاں وہ بن برستا ہوا صاف دکھائی دے رہا ہے اس گھر میں جو چھپا کر یہ لوگ اپنی مظلومیت دکھا رہے ہیں۔'' میں نے عسرت زدہ گھر، بچیوں اور ان کی ماں کو دیکھا۔

''اب برتن آئیں گے یا ہم تمہاری مظلومیت کے قصوں سے ہی پیٹ بھر لیں۔'' وہ بھڑکا تھا اور تاثیر نے تیزی سے آگے بڑھ کر دسترخوان لگا کر اس پر برتن رکھ دیئے جس میں اس نے خود ہی کھانا نکالا۔

''آجاؤ بچوں!'' اس نے میرے بچوں کو پکارا۔

''آجاؤ گل! بچیوں۔'' میں نے بھی ساتھ ہی آواز لگائی۔

''تم کھاؤ ہم بعد.....'' اس کی بات درمیان میں تھی کہ میں نے اچک لی۔

''اگر تم نہیں کھاؤ گی تو ہم میں سے بھی کوئی نہیں کھائے گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور رئیس نے بھی بادل نخواستہ لہجے میں کہا۔

''آجاؤ۔'' لہجہ ایسا تھا گویا کہہ رہا ہو کہ ''ٹھونسو'' بہرحال تھوڑا تھوڑا ہی سہی ہم نے مل کر کھانا کھایا اور اس کے بعد رئیس نے کٹھل کاٹ لیا۔

''اگر میں اور تلاش کرتا تو اتنا اس بھی مل جاتا مگر پھر میں نے سوچا کہ کہیں دیر ہونے پر تم چلی نہ جاؤ۔'' اس نے اپنا کارنامہ بیان کیا۔

کھانا کھا کر اور کٹھل کھا کر ہم نے برتن سمیٹے — میں گل کے پیچھے اس گھٹے ہوئے کچن میں چلی آئی جہاں دوسرے بندے کے کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں تھی۔

''تمہیں پتا ہے سونو! اس بندے نے مجھ سے کبھی نہیں چھپایا کہ یہ تمہیں پسند کرتا تھا۔ اگر میں درمیان میں نہ آتی تو کوئی درمیانی راستہ نکل ہی آتا۔'' اس نے دکھ سے کہا۔

''کوئی درمیانی راستہ نہیں نکلنا تھا، تمہیں پتا ہے میں Engaged تھی اور مجھے میرے منگیتر پسند بھی تھے۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''اور اب بھی نہیں چھپاتے۔'' اس نے دکھ سے کہا۔

''اب بھی..... چار بچیوں کے بعد بھی؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

''ہاں اب بھی، اور ایک سے تو بڑا زبردست افیئر ہے۔'' میں اسے سمجھانے اپنے حالات بتانے کے لیے ملی تھی مگر وہ تو مجھے ہی سمجھانے بیٹھ گئی۔

''آپ کی یاد انہیں اتنا ستاتی ہے کہ وہ گھر سے باہر پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔''

میں نے اسے حیرت سے دیکھا تھا وہ بتا کر ہنسی تھی گویا خود کا ہی مذاق اڑا رہی ہو مگر ساتھ ساتھ آنکھ کے کنارے پر ٹکا آنسو پونچھنا نہیں بھولی تھی۔ ''پھر میں نے رئیس سے بات کی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''تو رئیس نے کیا کہا؟'' میں نے گل کو بغور دیکھا۔

''کہنا کیا تھا کہنے لگے ہاں وہ مجھے اچھی لگتی ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر ابھی نہیں کروں گا ذرا بچیوں کو بڑا ہونے دو۔'' وہ پھر سے استہزائیہ ہنسی تھی۔

''اس پر تم نے کیا کہا؟'' میری نظریں گل پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

''میں نے کیا کہنا ہے؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے ان سے کہا کرنی ہے تو ابھی کرلیں بچیاں بڑی ہوگئیں تو ان پر برا اثر پڑے گا۔'' اس نے کہا اور میرا غصہ ایک دم سے شوٹ کر گیا۔

''یہ تم جیسی دیویاں ہی ہیں جنہوں نے رئیس جیسے مردوں کو شیطان بنا کر رکھ دیا ہے۔'' شک وہ تم پر کرے اور حرکتیں خود کرے، جانوروں کی طرح مار کر خود کو مظلوم ظاہر کرے، تم پر درندگی کا مظاہرہ کرنے اور باہر افیئرز چلائے اور تم ہو کہ تمہارا دیوی پن ختم ہی نہیں ہوتا۔''

اس نے سر جھکا لیا۔

''تمہیں پتا ہے کہ طلاق اللہ کا ناپسندیدہ فعل ہونے کے باوجود حلال کیوں ہے؟'' میں نے اسے غصے سے دیکھا، اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تاکہ اگر ایسے حالات ہوں، ایسے ناپسندیدہ حالات تو علیحدگی اختیار کی جاسکے۔ جب بچیوں کو تمہیں ہی پالنا ہے گھر تمہیں ہی چلانا ہے تو تم مزید بیگار کیوں بھرو اور ساتھ میں اسے بھی کیوں پالو؟ الگ ہوجاؤ۔'' مجھے شدید غصہ تھا۔

''تم نہیں جانتیں سنو! میری بچیاں اپنے باپ کے اتنے برے رویے کے باوجود ان سے بہت شدید محبت کرتی ہیں اور میں ان کی شخصیت کو توڑنا نہیں چاہتی۔'' وہ بڑی بے بسی سے بولی تھی۔ مجھے اس پر پیار آگیا یہ مشرقی عورت شوہر سے دل ملے یا نہ ملے مگر اپنے بچوں کے لیے گھر سے ضرور دل لگا لیتی ہے۔

☆☆☆

گل کی بڑی بیٹی تاثیر نے بمشکل میٹرک کیا حالانکہ اس کا Maths بہت اچھا تھا، آگے وہ انجینئرنگ کی طرف جاسکتی تھی مگر گھر کے حالات ہی ایسے نہیں تھے کہ مزید تعلیم آگے جاری رکھ پاتی۔ Maths اچھا ہونے کی وجہ سے کئی لوگوں نے ٹیوشن کے لیے بھی کہا مگر رئیس نے اجازت نہیں دی۔ ایک گھر میں اس نے چھپ کر ٹیوشن پڑھانی شروع کردی جب رئیس کو پتا چلا تو اس نے اس گھر میں جا کر وہ ہنگامہ اور گالم گلوچ کی کہ اس گھر والوں نے خود ہی معذرت کرلی اور یوں تاثیر گھر پر ہی بیٹھ گئی۔ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے، تاثیر کا کسی لڑکے سے افیئر شروع ہوگیا جو کہ خود خاصا چھوٹا تھا بلکہ تاثیر سے بھی دو سال چھوٹا تھا اس کے گھر والے بھی اس رشتے پر راضی نہیں تھے گل نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ مانی ہی نہیں۔ گل کی مجبوری تھی کہ وہ گھر پر رہ کر نگرانی بھی نہیں کرسکتی تھی۔

مجبوراً گل نے اس لڑکے کو بلا کر اس سے بات کی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ آپ کی بیٹی ہی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے میری شادی تو میری کزن سے ہوتی ہے میری امی کی پسند ہے۔ گل نے یہ ساری بات تاثیر کے سامنے ہی کی تھی مگر اس پر اس ساری بات کا کوئی بھی اثر نہیں ہوا۔ بقول تاثیر کہ وہ اپنی امی کی وجہ سے مجبور ہے لیکن وہ محبت مجھ سے ہی کرتا ہے۔ گل نے ہر طرح سے سمجھا لیا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہے۔

انہی دنوں گل کی بھانجی کی شادی ہوئی۔ وہ چوتھی کی دعوت تھی جب گل کی بہن نے اسے پورے گھر والوں کے ساتھ بلایا تھا۔ اس تقریب میں بھانجی اور داماد کے واپس جانے کے بعد رئیس نے گل کو سب کے سامنے مارا اور الزام یہ لگایا کہ وہ اپنے بھانجی کے شوہر میں گھس گھس کر بیٹھ رہی تھی۔ ''اللہ اکبر''

الزام لگانے کے لیے انتخاب بھی کیا تو کس شخص کا، داماد کا۔ ظاہر ہے بھانجی کا شوہر داماد ہی تھا اس کا۔ یہ حالت تھی اس شخص کی ذہنی کراوٹ کی۔ وہ ایک نفسیاتی مریض تھا جس نے پتا نہیں کس جھونک میں اس سے شادی کرلی تھی اور اب گن گن کر بدلے لے رہا تھا گل اب مجھ سے کہتی تھی کہ میں واقعی ٹھیک کہتی تھی اسے کسی بھی حال میں یہ بات (رضوان والی) رئیس کو نہیں بتانی تھی۔ اس نے گل کے ساتھ ہوئے ایک دھوکے، اس کی ایک غلطی کو اس کے کردار میں ڈھال دیا تھا۔

اس دن رئیس نے گل کو اتنا برا مارا کہ گل کے بھانجے کو بھی طیش آگیا اور وہ رئیس کو مارنے لپکا تھا مگر باجی اور بھائی

صاحب درمیان میں آ گئے تھے۔ اس مار پیٹ سے گل کی بائیں آنکھ ضائع ہوگئی پتا نہیں اس کی آنکھ میں کیا لگا کہ وہ بوٹی کی طرح سرخ ہوگئی تھی نظر تو اسی وقت آنا بند ہوگیا تھا بعد میں سرخی تو ختم ہوگئی مگر روشنی بھی ختم ہوگئی۔

تب گل سے اس کی دونوں بہنوں، بہنوئیوں نے طلاق لینے کو کہا میری بھی یہی رائے تھی مگر وہ تو دیوی بنی ہوئی تھیں وہ کیسے طلاق لے لیتیں، مجھے اب اس پر ترس کی بجائے غصہ آنے لگا تھا۔ لڑائی جھگڑے تمام میاں بیویوں میں ہوتے ہیں مگر یوں مار پیٹ کرنا، بلاوجہ شک کرنا، بنیادی ضروریات سے محروم رکھنا۔

☆☆☆

ایک دن گل کی باقی بچیاں اسکول گئی ہوئی تھیں اور تاثیر گھر میں تھی کہ ایک خاتون آئیں انہیں اوپر فلیٹس میں کسی گھر میں جانا تھا مگر وہ بیمار خاتون تھیں نیچے ہی ہانپنے لگیں گل کے سامنے ہی۔ تو تاثیر نے انہیں پانی وغیرہ پلایا اور گھر میں بھی بٹھایا ساتھ ہی ان کا بیٹا بھی تھا ان دونوں ماں بیٹے کو تاثیر بہت پسند آئی۔ ان خاتون کا بیٹا کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں تھا۔ وہ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ان لوگوں کے گھر سے تاثیر کا رشتہ آ گیا۔ گل ان لوگوں سے ملی تو اسے وہ لوگ بہت پسند آئے بس لڑکا تاثیر سے سات آٹھ سال بڑا تھا اور کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ گل نے ہاں کردی۔

گل نے رئیس سے کہا کہ وہ لوگ منگنی کرنا چاہ رہے ہیں تو رئیس نے ہری جھنڈی دکھادی کہ اس کے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں۔ تب گل نے اِدھر اُدھر سے ادھار پکڑ کر تاثیر کی منگنی کردی۔ منگنی تو تاثیر نے خاموشی سے کروالی مگر اس کے بعد اس نے اس منگنی کے خلاف بولنا شروع کردیا اسے لڑکے کی عمر سے مسئلہ تھا۔ وہ اسے بڈھا کہتی تھی۔

''تو کیا تم اب سے نو دس سال بعد بڈھی نہ ہوجاؤ گی۔'' گل کو بھی غصہ آتا تھا۔

''جو بھی ہو مجھ میں آپ کی طرح صبر ہے نہ برداشت نہ میں آپ کی طرح مار کھا کر بھی کسی کی جوتیاں سیدھی کرسکتی ہوں اگر آپ نے مجھ سے زبردستی کی تو میں دوسرے دن طلاق لے کر آجاؤں گی۔'' اس نے کہا اور گل نے اسے ایک تھپڑ رسید کیا پھر خود رونے لگی اور تاثیر تن فن کرتی باہر نکل گئی۔

گل کو بہت سے دکھ تھے اس پر اس منگنی کی وجہ سے خاصا قرضہ چڑھ گیا تھا اگر تاثیر کو رشتہ نہیں پسند تھا تو پہلے ہی منع کردیتی مگر پہلے تو اس نے چپ چاپ منگنی کروالی تھی اور اب منگنی ٹوٹتی تو جگ ہنسائی الگ ہونی تھی اسی وقت تاثیر دوبارہ گل کے سامنے آئی تھی۔

''میں مذاق نہیں کررہی ہوں اگر آپ نے ان لوگوں کو منع نہیں کیا تو میں خود کردوں گی مجھے صرف اور صرف مظہر سے ہی شادی کرنی ہے۔'' اس نے دوٹوک کہا۔

اور یوں وہ منگنی ختم ہوگئی۔

☆☆☆

گل کو اس منگنی کے ٹوٹنے کا بہت دکھ تھا ایک تو وہ لوگ بہت اچھے تھے دوسرے وہ کھاتی پیتی فیملی تھی گل کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ بچیاں یہاں پر ترسی ہوئی زندگی گذارتی رہی ہیں تو انہیں ایک اچھی فیملی مل جائے تو ان کی تمام محرومیاں دور ہوجائیں گی مگر اصل میں گل سے اس کی بچیوں سمیت کسی کو بھی کوئی ہمدردی نہیں تھی اب گل قرض اتارنے میں جت گئی تھی۔

گل کی بیٹیاں اگر دیکھا جائے تو بری نہیں تھیں وہ بے تربیت بچیاں تھیں۔ جنہیں ماں اپنی مصروفیات کے باعث وقت نہ دے سکی تھی اور جن کی باپ کو قطعی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ گل کی زندگی بہت مشکل تھی۔ وہ صبح ناشتا بنا کر اور دوپہر کا انتظام کرکے نکلتی تھی۔ چار چار بیٹیوں کی موجودگی کے باوجود واپس آکر جھاڑو پونچھا، برتن اور رات کا کھانا پکانا سب گل کی ذمے داری تھی۔

میں اکثر تاثیر اور حادیہ کو غیرت دلانے کی کوشش کرتی کہ ماں کا ہاتھ بٹائیں تو ڈھٹائی سے ہنستی رہتیں۔ ہاں سوشل میڈیا پر وہ خوب ان تھیں۔ میں ان کو اپنی بیٹیوں کی مثال دیتی کہ وہ کس طرح اسکول سے آنے کے بعد بھی میرا ہاتھ بٹانے کو تیار رہتی تھیں۔ تب بھی ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ Tik Tok پر ویڈیوز بن بن کر اپ لوڈ ہورہی تھیں مگر ماں سے کسی کو ہمدردی نہیں تھی۔

تاثیر کا پہلا ائیر ختم ہوچکا تھا اب اس کا جوائیر تھا وہ اس سے تین سال چھوٹا تھا اور محض 9th کا اسٹوڈنٹ تھا۔ فلیٹس میں ساتھ رہنے کی وجہ سے یہ بات جانتا تھا کہ ان کی عمروں میں اتنا فرق ہے اور اکثر تاثیر کو چھیڑتا بھی تھا کہ ''مجھے اپنی باجی پسند آئی ہے۔'' یہ فیملی بھی اچھی کھاتی پیتی تھی۔ گل کی تو خواہش تھی کہ یہاں تاثیر کی شادی ہوجائے مگر یہاں پر بھی اس کے ماں باپ راضی نہیں تھے مگر لڑکا خاصی سے بھی زیادہ راضی تھا۔

☆☆☆

انہی دنوں رئیس ایک کیس میں پکڑا گیا۔ وہ ایک

عورت کے ساتھ دیکھا گیا تھا اور وہ عورت غائب تھی۔ لاک اپ میں پولیس والوں نے اسے خوب مارا تھا۔ اب گل ایک ایک سے فرض پکڑتی پھر رہی تھی تاکہ اسے مزید مار سے بچایا جاسکے اور اسے باہر نکلوا سکے۔ گل کے ہمدردوں کا خیال تھا کہ پڑا رہنے دو اسے مگر وہ تو وفا کی دیوی تھی۔ پولیس والے تک کہتے تھے کہ آپ اس مرد کے لیے اتنا کر رہی ہیں، آپ کو پتا ہے اس کے اس عورت سے کیا تعلقات تھے مگر گل کو نہ کچھ دیکھنا تھا نہ سننا تھا کیونکہ وہ تو وفا کی دیوی تھی۔

اور پھر جو کہانی سامنے آئی تھی اس نے سب کو ہی شرمسار کر دیا وہ عورت جس کا نام آسیہ تھا وہ واقعی آسیہ ہی تھی۔ اس کی پہلے ایک شادی ہو چکی تھی جس سے اس کا ایک بیٹا تھا۔ تب اسے اپنے آفس میں کام کرنے والا ایک کولیگ پسند آگیا۔ اس نے اپنے پہلے شوہر سے طلاق لے لی اور اپنے بارہ سالہ بیٹے کو بھی پہلے شوہر کے پاس چھوڑ آئی تاکہ اپنے اس کولیگ سے شادی کر سکے۔ اس شوہر سے بھی اس کا ایک بیٹا تھا ڈھائی سال کا تو اب اسے رئیس پسند آگیا تھا مگر اس بار اس نے طلاق والی غلطی نہیں دہرائی بلکہ رئیس سے ایسے ہی تعلقات قائم کر لیے۔ اس کا دوسرا شوہر ویسے بھی اس پر اعتبار نہیں کرتا تھا کہ جس عورت نے 13 سالہ رفاقت کو دو منٹ میں ٹھوکر مار دی تھی۔ اس نے اس ساڑھے تین سالہ رفاقت کا کیا پاس رکھنا تھا اور اس کا شک بالکل درست ثابت ہوا جب اس نے ایک دن ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ اس دن اس نے آسیہ کو بہت مارا۔ رئیس بھاگ نکلا تھا اور پھر یہ مار پیٹ معمول کا حصہ بن گئی کیونکہ آسیہ رئیس سے ملنا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ ایک دن تو آسیہ کو اس کے شوہر نے بہت ہی مارا کیونکہ اس سے اگلے دن وہ رئیس کے ساتھ بائیک پر دیکھی گئی تھی پھر غائب ہو گئی۔ دراصل وہ اپنے پہلے شوہر کے گھر جا کر چھپ گئی تھی۔ جب اسے رئیس کی گرفتاری کا پتا چلا تو ظاہر ہے کہ اس نے عدالت میں رئیس کے حق میں بیان دیا، ساتھ ہی خلع کا کیس فائل کر دیا اور خلع لے کر اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر لیا۔

اس نے گل سے کہا تھا۔ ''رئیس ایک شاندار مرد ہے اور اگر میری دوسری شادی کا تجربہ اتنا تلخ نہ ہوتا تو میں پہلے شوہر کے پاس جانے کے بجائے رئیس سے شادی کر لیتی۔''

گل نے اسے دوٹوک جواب دیا تھا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے آپ جب چاہیں یہ شوق پورا کر سکتی ہیں۔''

اس نے حیرت سے گل کو دیکھا۔

بہرحال اس واقعے کے کچھ عرصے تک تو رئیس سدھرا رہا پھر وہی مار پیٹ اور درندگی پر اتر آیا۔ ایک دن وہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی تو اسے ٹانگ کھینچ کر گرا دیا جس سے اس کی ہڈی میں بال آگیا مگر وہ اس حالت میں بھی جاب پر جاتی رہی۔

اتنے عرصے جاب کرنے پر اس کے گریڈ بھی بڑھ گئے اور سیلری بھی اچھی ہو گئی تھی۔ اب اسے گھر گھر جا کر پولیو ویکسینیشن نہیں کرنی پڑتی تھی۔ بہرحال اب زندگی کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ رئیس کی روش اب بھی وہی تھی بلکہ اب تو اس نے کئی کئی دن گھر آنا بھی چھوڑ دیا اور اپنے حقوق کا مطالبہ بھی۔ اس سے وہ مطمئن ہو گئی تھی اس کا خیال تھا کہ شاید اس نے دوسری شادی کر لی ہے بہرحال جب بھی وہ گھر میں ہوتا ہے اس کا جنگلی پن اپنے عروج پر ہی ہوتا۔

گل کی سب سے بڑی بیٹی تاثیر اب 20 سال کی ہے اور اس کا اسی لڑکے راحم سے افیئر ہے۔ میری دعا ہے کہ تاثیر سمیت اس کی چاروں بیٹیوں کو اچھے رشتے ملیں خواہ محبتیں ملیں یا نہ ملیں کیونکہ محبتوں کا ملنا اہم نہیں ہوتا۔ اچھے انسان کا مل جانا اہم ہوتا ہے۔

آج میں سوچتی ہوں گل سے کون سی ایسی فاش غلطی ہوئی تھی جس کی اس نے ساری زندگی سزا بھگتی اور اب بھی بھگت رہی ہے۔

اگر اس کی بھابی اتنی بری نہ ہوتیں ان کے کزن کا جو رشتہ اس کے لیے آیا تھا اس سے اس کی شادی ہونے دیتیں تو شاید وہ آسودہ ہوتی یا اس کے گھر کا ماحول اتنا گھٹا ہوا نہ ہوتا۔

اگر وہ رضوان سے اتنی بے تکلف نہ ہوتی تو یوں وہ اپنی عصمت نہ گنواتی۔

اگر وہ سچ کی دیوی نہ بنتی اور رئیس کو رضوان کے متعلق نہ بتاتی تو شاید اتنی اذیت ناک زندگی کا شکار نہ ہوتی۔ یا رئیس ہی اعلیٰ ظرف مرد ہوتا اور اس سچ کو ہضم کر لیتا۔ اپنی طرف سے تو اس نے کوشش کی تھی کہ رئیس کو کسی دھوکے میں نہ رکھے مگر میرا ماننا یہ ہے کہ جس راز کو اللہ نے راز رکھا ہوا سے ظاہر کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں اور بہرحال یہ غلطی تو اس سے ہوئی تھی۔

بہرحال لڑکیوں کی عزت آبگینے کی مانند ہوتی ہے اور اس کی حفاظت بھی انہی پر فرض ہوتی ہے کاش لڑکیاں اس بات کو وقت پر سمجھ لیں۔

++

بہار کا موسم رخصت ہوا بھی نہیں تھا کہ ہلکا ہلکا جاڑا شروع ہوگیا جو بڑا فرحت بخش تھا۔ جو دل و دماغ کو بھی سرور بخش رہا تھا۔ سنہری دھوپ چاروں طرف اپنا سونا بڑی فیاضی سے لٹا رہی تھی۔ نس نس میں خون رقص کرتا لگ رہا تھا۔ اس روز جب میں ورانڈے میں آ کر بیٹھا تو ہلکی ہلکی دھوپ خوش گوار لگ رہی تھی۔ چاروں طرف کا نظارہ بڑا دل فریب محسوس ہو رہا تھا۔ میری نگاہ تھی کہ ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

خبیث

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں اس کی ایک ہلکی سی جھلک۔ انسان پر کب شیطان قابض ہو جائے کہا نہیں جا سکتا۔ اس سچ بیانی میں آپ خود ملاحظہ کرلیں۔

ایم الیاس

(کراچی)

میں شجاعت کی راہ دیکھ رہا تھا جو ہر اتوار کو خبریں سننے سنانے کے لیے باقاعدگی سے اسی وقت آتا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا جو عرصے دراز سے نبھا رہا تھا۔ وہ اپنے وقت پر آیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''شاہ جی! میں آپ کو آج کی تازہ خبر سناؤں؟'' اس نے میری طرف مسکرا کے دیکھا۔

''کیوں نہیں.....؟ میں تمہیں خبریں سناتا رہتا ہوں۔ آج تم نئی اور تازہ خبر سنا دو؟''

''شاہ جی! سنیے آج کی نئی، تازہ اور سنسنی خیز خبر یہ ہے کہ آج اخبار کی چھٹی ہے۔''

دفعتاً مجھے یاد آ گیا کہ اس ناغے کا ایک روز قبل اعلان کر دیا گیا تھا۔ شجاعت نے جس انداز میں وہ خبر سنائی تھی اس میں اپنائیت کے ساتھ ساتھ محبت اور خلوص کا جذبہ شامل تھا، جس کا آج کل فقدان ہے چنانچہ میں نے متاثر ہو کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تو وہ کیاری میں لگے گلاب کے تازہ مہکتے پھولوں کو دیکھنے لگا جن کی کلیاں پھوٹنے لگی تھیں۔ قریب ہی چنبیلی کی بیل تھی جو دیوار پر چڑھی ہوئی تھی۔

میں یہ بات شجاعت کے سلسلے میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ وہ کبھی بھی میرا ملازم نہیں رہا تھا۔ دوسرے سائلوں کی طرح وہ بھی تقریباً چار برس قبل میرے پاس آیا تھا۔ اس کی اہلیہ کو ایک مرض لاحق ہو گیا تھا اسی سلسلے میں میرے پاس دعا کی درخواست لے کر آیا تھا۔ بعد میں بیوی کے فوت ہو جانے کے بعد وہ میرے در کا ہو کر رہ گیا تھا اور اس نے رفتہ رفتہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ خدا کے فضل سے اور شاید میری محبت کے اثر نے اسے نماز و روزے کا پابند بنا دیا تھا۔ اس کے آنے کے بعد مجھے اس بات کا آرام ہو گیا تھا کہ وہ حجرے میں آنے والے سائلوں کا خیال بڑی ایمانداری اور ذمے داری سے رکھتا تھا۔ امیر و غریب کی تشخیص کیے بغیر وہ سب کو باقاعدہ نمبر سے حجرے میں بھیجتا تھا۔

''شجاعت.....!'' کچھ دیر بعد میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''کیا گھر میں کوئی اور نہیں رہتا جو تم میری خدمت میں لگے رہتے ہو۔ تمہاری عمر بھی ایسی زیادہ نہیں ہوئی ہے، میری مانو تو.....''

''شاہ جی.....!'' اس نے حسبِ معمول پُرزور احتجاج کیا۔ ''میں آپ سے پہلے بھی درخواست کر چکا ہوں کہ دوسری شادی کے لیے نہ تو زور دیا کریں اور نہ ہی اصرار فرمائیں۔ کیونکہ میں نے مرنے والی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی جدائی کے بعد کبھی گھر آباد نہیں کروں گا۔''

''ایسی باتیں وقتی جذبات کے اظہار کے طور پر زبان سے نکل جایا کرتی ہیں جس کی پابندی شرط نہیں ہوتی ہے۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تجرد کی زندگی گزارنے میں بھی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو شیطان زیادہ ورغلاتا ہے، ہو سکتا ہے کہ صراط مستقیم سے بھٹکا بھی دے۔ جوانی جذبات اور ان جانے خواہشات پر غالب آ جاتی ہو، جوانی سرکش اور ضدی بھی ہوتی ہے۔ بہکنے غلاظت کے دلدل میں گرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔''

''لیکن جب میں آپ کے ساتھ ہوں تو شیطان خبیث آس پاس بھٹکنے سے گریز کرے گا۔''

''یہ بھی تمہاری خوش فہمی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کی بات میں بڑا وزن تھا۔ میری جگہ شاید کوئی اور ہوتا تو لاجواب ہو جاتا، تاہم میں نے سوچا کہ اس کی خوش فہمی دور کر دیں وہ مرد و دسب سے زیادہ اللہ والوں کو بہکاتا ہے، ان کا ایمان متزلزل کرتا رہتا ہے اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ہے۔ خصوصاً نماز میں ایسے پراگندہ خیالات پیدا کرتا ہے تاکہ بھول اور غلط ہو جائے۔''

''اور وہ ملعون کبھی کبھی شوہر کو اس بات پر اکسا دیتا ہے وہ کسی شک و شبہ کی بنیاد پر اپنی شریکِ حیات کی گردن پر چھری پھیر دے اور راندہ درگاہ ہو جائے۔''

میں نے چونک کر حیرت سے شجاعت کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا، میں نے پوچھا۔ ''یہ تمہارے ذہن میں بیوی کی گردن پر چھری پھیرنے کا خیال کیسے آ گیا.....؟''

''میں نے کل کے اخبار میں یہ ہولناک اور سنسنی خبر دیکھی تھی۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کے کردار پر شک کرتے ہوئے اسے بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تین معصوم اور کم سن بچوں کو بھی ماں کے سائے سے محروم کر دیا۔ خود قانون کی نظروں سے بچنے اور آشنا کو قتل کرنے کے ارادے سے فرار ہو گیا۔''

''ایسی خبروں کو پڑھنے سے گریز کی عادت اور ذہن کو پراگندہ کرنے سے باز رکھو میرے عزیز، جو انسان کو گمراہ بھی کر سکتی ہے خدا کی مصلحتوں کو سمجھنا ہر شخص کے سمجھنے کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ حقیقت کیا ہے صرف اوپر والا ہی

جانتا ہے، ویسے شک ایک ایسا موذی مرض ہے جو انسان کو اس طرح چاٹ جاتا ہے جیسے زنگ لوہے کو، جیسے دیمک لکڑی کو.....''

میں شجاعت کو قرآن اور احادیث کی روشنی میں شک کے مفہوم اور مضرات سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ پوری توجہ اور دھیان سے میری بات سنتا رہا۔ درمیان میں کوئی سوال اور بات نہیں کی جیسا کہ کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ میں خاموش ہوا تو اس نے کسمسا کر دبی زبان میں پوچھا۔ ''جی ہاں شاہ جی ! اگر میں آپ سے سزا اور جزا کے بارے میں کچھ دریافت کروں تو آپ برا تو نہیں منائیں گے؟''

''ضرور پوچھو میرے عزیز.....!'' میں نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ کسی الجھی گتھی کو سلجھائے بغیر انسان اچھے اور برے کی بھی تمیز نہیں کر سکتا۔''

''شاہ جی.....!'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد قدرے تذبذب سے ایک پیچیدہ نوعیت کے مسئلے کو چھیڑ دیا۔ ''جب تقدیر کا لکھنا خدا کے اختیار میں ہے تو پھر انسان کو جرم کی سزا کیوں ملتی ہے؟ کیونکہ وہ تو وہی کرتا ہے جو اس کی تقدیر میں درج ہوتا ہے؟''

میں اس وقت اعصاب کو سکون دینے کے موڈ میں تھا لیکن شجاعت نے جو سوال کیا وہ بڑا اہم اور نازک بھی تھا۔ ایسے سوالات ہر چند کہ ایسے افراد کرتے ہیں جنہوں نے کبھی قرآن و حدیث کے اوراق کو پلٹنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اگر یومیہ ایک رکوع یا چند سطریں بامعنی قرآن کی آیتیں تلاوت کر لیں تو آگاہی ہو سکتی ہے۔ جبکہ ٹی وی کے سامنے گھنٹوں وقت دیتے ہیں۔ ہر بات تقدیر کے لکھے پر تھوپ کر خود کو بری الذمہ ہو جانے کا سہل ترین راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری کا ذمے دار بھی شیطان مردود ہے جو اسے گناہ کی طرف راغب کرنے کے لیے غلط قسم کا لٹریچر پڑھنے کی طرف چٹ پٹی کتابوں میں الجھا دیتا ہے مگر اپنے مذہب کی چھوٹی چھوٹی ضروری باتوں سے بھی دور رکھتا ہے، اس خیال کے پیش نظر میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو برخوردار.....! سب سے پہلے یہ بات گرہ سے باندھ لو، رب العزت نے جنت اور جہنم کو اس لیے تخلیق کیا ہے کہ انسان کو اس کے اچھے اور برے اعمال کے مطابق سزا دی جا سکے۔ اس کے علاوہ موٹی عقل والا بھی اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اس دنیا کی تخلیق کا اصل مقصد بھی یہ ہے کہ ہر انسان کو ایک امتحان سے گزارا جائے اور پھر اس امتحان میں حاصل کردہ نمبروں کے مطابق اسے کامیاب اور ناکام قرار دیا جائے۔ علاوہ ازیں اس کے رسول مقبولؐ نے تمام عمر انسان کو یہی درس دیا ہے کہ اللہ نے بتوں کی پرستش کو شرک قرار دیا ہے تو شرک کرنے والوں کے لیے معافی کی کوئی گنجائش روز قیامت نہیں رکھی گئی۔ قرآن و سنت پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی۔ آپ کی ذات مبارکہ تخلیق کا مقصد بس یہی تھا کہ انسان کو غفلت سے بیدار کیا جائے۔ قرآن کی روشنی میں روشن گزرگاہوں پر چلنے کے آداب سے آگاہ کیا جائے اس بات کا کامل یقین دلایا جائے کہ اللہ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے۔ گناہ گار کو یہ بتایا گیا کہ اس پر توبہ کے دروازے قیامت سے ذرا پہلے تک بند نہیں ہوں گے۔ وہ جب بھی اپنے گناہوں سے تائب ہو کر اپنے حقائق کے سامنے گڑگڑا کے سچے اور صدق دل سے توبہ کی درخواست کرے گا اس کی توبہ قبول ہوگی۔ اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ بشرطیکہ موت کے آنے سے قبل وہ اپنی پرانی روش کی طرف نہ لوٹے اور ثابت قدم رہے۔ ایک جگہ کہا گیا کہ.....''

''شاہ جی.....!'' شجاعت نے درمیان میں عرض کیا۔ ''میں موٹی عقل والا اتنی باریکیوں میں غوطہ نہیں لگا سکتا..... مجھے تو آپ بس اتنا بتا دیں کہ کیا تقدیر کے لکھے پر انسان کا اختیار ہے یا نہیں؟''

''مجھے تمہاری یہ بات بہت پسند آئی شجاعت!'' میں نے اسے سرزنش کرنے کی بجائے پیار سے سمجھانے کی غرض سے کہا۔ ''اس بات کی باریکیوں کو سمجھنا اس شخص کے اختیار کی بات بھی نہیں ہے جسے ہدایت نہ ملے بہرحال یہ سمجھ لو کہ ایک حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ نے زمین، آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار برس پہلے تمام مخلوقات کی تقدیر لکھ دی ہیں۔ اس وقت اللہ کا عرش پانی پر تھا گویا خداوند کریم کو اس وقت بھی جب زمین، آسمان اور کرسی میں سے کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی تھی تو اس وقت بعد میں پیدا ہونے والی ساری کائنات کا پورا پورا علم تھا۔ چنانچہ اس نے دور ازل میں اس کا ارادہ اور فیصلہ کر لیا کہ اس تفصیل اور ترتیب کے مطابق جو اس کے علم میں تھی کہ پورے عالم کو پیدا کرے گا اور اس میں کیا کیا واقعات کس انداز میں پیش آئیں گے۔ الغرض آئندہ وجود میں آنے والے عالم کے متعلق جو ترتیب و تفصیل اس کے ازلی علم میں بخوبی تھی۔ اس نے ازل میں طے فرمالی کہ وہ اس ترتیب و تفصیل سے سب کو وجود میں لائے گا۔''

شجاعت بے چین اور اضطراب سے دوبارہ پہلو بدلنے لگا۔ اس کے بشرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے یہ دقیق باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں اور اس کے ذہن میں عجیب سی کشمکش جاری ہے، تو میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے سوال کیا۔

"شجاعت......! کیا تم میری باتوں تک نہیں پہنچ سکے؟ الجھ رہے ہو؟"

"شاہ جی! بات یہ ہے کہ مجھے اپنی کم علمی کا احساس ہے۔" اس نے بڑی سادگی سے اعتراف کرتے ہوئے عاجزی سے درخواست کی۔ "کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ ان باتوں کو آسان طریقے سے سمجھا دیں تاکہ اصل نکتہ میری کھوپڑی میں سما جائے۔" میں نے اس کی دشواری کو محسوس کرتے ہوئے بات کو سہل کرتے ہوئے سمجھانے کی ممکن کوشش کی۔ "تم اس طرح سمجھ لو برخوردار! ہم اپنی پیدائش کے بعد جس انداز میں اپنے ارادے اور اختیار سے جو بھی اچھے یا برے عمل کر رہے ہیں اس کا علم رب العزت کو ازل سے تھا۔ لہٰذا تقدیر میں صرف یہی بات حرف آخر کے طور پر درج نہیں کی گئی کہ کون شخص اچھا اور برا کام کرے گا بلکہ یہ لکھا گیا کہ کون سی مخلوق اپنے ارادے اور اختیار سے کیا کام کرے گی؟ اس کا کیا عمل ہوگا۔ پھر اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ اسے کیا سزا یا جزا ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم خوش نصیب یا بدبخت انسانوں کو اپنے اختیار اور ارادے پر عمل کرنے کو ختم نہیں کیا۔ اب آسان انداز میں یہ نکتہ سمجھ لو کہ تقدیر کی وجہ سے ہم نہ تو مجبور و بے بس ہیں نہ ہی ہمارے اعمال کی ذمے داری (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ پر عائد کی جاسکتی ہے۔ اس کے مقرر کردہ فرشتے ہمارے تمہارے کارناموں پر مجبور ہیں جو ہمارے نیک و بد اعمال کی تفصیل لکھ رہے ہیں۔ روز قیامت ان کی روشنی میں انہیں سزا اور جزا کی خبر سنا دی جائے گی۔ جو جیسا کرے گا ویسا ہی بھرے گا۔"

"بات میری عقل میں تو آ گئی لیکن......" شجاعت کچھ کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "جو کہنا ہے وہ کھل کر کہو میرے عزیز! اگر کوئی بات کہنا ہے تو کھل کر کہو، اس لیے کہ کوئی گرہ باقی رہ جائے تو پھر ڈور بھی پوری طرح سلجھتی نہیں ہے بلکہ اور الجھتی جاتی ہے۔"

"شاہ جی......! اگر اوپر والا ہمیں اپنے ارادوں کا پابند کر لیتا تو کتنا اچھا ہوتا؟"

میں اس کی بات سن کر بے اختیار مسکرا دیا۔ پھر اسے وضاحت سے بتایا۔ "اگر ایسا ہوتا تو پھر آدم و حوا اور دنیا کی تخلیق کی ضرورت بھی نہ رہتی۔ خدا کی عبادت کے لیے وہ فرشتے ہی بہت تھے جن کے سجدے تمام آلودگیوں سے پاک ہوتے ہیں۔"

"ہاں...... یہ بات بھی آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔" شجاعت نے ایک طویل سانس لے کر کہا، پھر وہ مزید کچھ کہنے اور پوچھنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سن کر لپکتا ہوا یہ دیکھنے کے لیے چلا گیا کہ کون آیا ہے۔

میں اتوار کے دن صرف آرام کرتا تھا جو کسی مصلحت کے تحت مجھ سے تنہائی میں یکسوئی سے ملنا چاہتے تھے یا جن کو میں خود تخلیے میں بلاتا۔ تاکہ وہ کھل کے اپنی کسی کمزوری اور خواہش کے بارے میں کہہ سکیں۔ وہ مجھے ایک حکیم کی طرح روحانی علاج معالجے کے لیے رجوع کرتے تھے۔

"شاہ جی......! ایک خاتون اور ان کے شوہر آپ کے مربی افضال احمد صاحب کے بیٹے ابرار میاں کے ساتھ آئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے افضال احمد صاحب کا حوالہ سن کر کہا۔ "ادھر ہی بلا لو۔"

افضال احمد میرے پڑوسی تھے۔

کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کی برقع پوش خاتون اور ان کے شوہر برآمدے میں موجود تھے۔ ابرار میاں ان کا تعارف کرکے واپس لوٹ گئے۔ خاتون نے تخت پر بیٹھنے کے بعد چہرے سے نقاب الٹ دیا۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی عمر چالیس برس کے درمیان نظر آتی تھی۔ انہوں نے اپنا نام زاہدہ بتایا اور ان کے شوہر کا نام عابد خان تھا۔ بیوی کے مقابلے میں عابد خان کی عمر میں تین چار برس کم ہی محسوس ہوتی تھی۔ وہ خاصے صحت مند اور بھرے ہوئے جسم کے مالک تھے۔ شجاعت میرا اشارہ پاکر وہاں سے ہٹ گیا تو میں نے عابد خان سے رسمی تعارف کے بعد پوچھا۔

"فرمایئے۔ کیسے زحمت کی......؟ خادم کیا خدمت کرسکتا ہے؟"

"سب سے پہلے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ملاقات کی اجازت دے دی۔ افضال صاحب بتا رہے تھے کہ آپ اتوار کے دن......"

"پڑوسی ہونے کے علاوہ میرے ان کے تعلقات بھی

دیتے ہیں اس لیے آپ کسی تکلف سے کام نہ لیں۔ یہ بتائیں کہ آپ کو کیا مسئلہ درپیش ہے؟'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''ہم بے وقت آپ کو بلاوجہ زحمت نہ دیتے شاہ جی صاحب......! لیکن......'' عابد خان کی بجائے زاہدہ بیگم نے زبان کھولی۔

''مسئلہ ایسا ہے کہ ہم اسے ذرا تنہائی میں اور تفصیل سے آپ کے گوش گزار کرنا چاہتے تھے اسی لیے افضال صاحب کے توسط سے آنا پڑا۔ آپ کو بے وقت تکلیف دینے پر معذرت خواہ ہیں۔''

''میں فارغ ہی ہوں......اتوار کے دن میں کسی کو وقت نہیں دیتا ہوں اسی لیے کوئی نہیں آتا ہے۔ آپ اطمینان سے بات کریں۔''

زاہدہ بیگم کے بولنے کی وجہ سے عابد خان نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ بیوی کی جلد بازی انہیں اچھی محسوس نہیں ہوئی تھی اس لیے ان کے چہرے پر ناگواری اسی آئی تھی۔ میری وجہ سے انہوں نے اس کے اظہار سے بھی پرہیز کیا۔

''شاہ جی ! مسئلہ دراصل میری جوان بیٹی نادرہ کا ہے۔'' عابدہ بیگم نے حوصلہ پاکر اپنی روداد شروع کی۔ ''خیر سے اب اس کی عمر اٹھارہ برس ہونے کی ہے۔ قبول صورت ہے اور اس نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔''

زاہدہ بیگم نے سانس لینے کے لیے توقف کیا تو میں نے سوال کیا۔ ''کیا اب بھی آپ کی بچی زیرِ تعلیم ہے؟''

''جی نہیں......'' زاہدہ بیگم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دو برس کا عرصہ ہوا ہے، ہم نے کالج کے ماحول کو دیکھتے ہوئے اسے کالج سے اٹھالیا ہے۔ اب وہ خیر سے اسلامی تعلیمات کے زیور سے آراستہ ہورہی ہے۔''

''بہت خوب......!'' میں نے ستائش کی اور دبی زبان سے سراہتے ہوئے کہا۔ زاہدہ بیگم نے کالج کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں کہا تھا۔ خصوصاً ایسے کالج جس میں مخلوط تعلیم تھی نہ صرف لڑکے بلکہ لڑکیاں بھی آلودہ ہوجاتی ہیں۔ موبائل فون نے انہیں ان جانے راستوں پر ڈال دیا تھا۔ ان لڑکیوں کو جن کے ہاں انٹرنیٹ تھا۔ فیس بک، چیٹنگ اور ویب سائٹ سے اور ہم جماعتوں لڑکوں کی دوستی رنگ لارہی تھی۔ خود انہیں خبر نہیں تھی کہ ان جانے راستے غلاظت کے دلدل سے بھرے ہوئے ہیں۔

''سبحان اللہ......!'' میں نے چند ساعتوں کے بعد کہا۔ ''اگر اس عمر میں بھی انسان توشہ آخرت کی فکر کرے تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن...... اگر بچوں کے بچپنے سے ہی والدین اور سرپرست والدین ذمے داری سے ان پر توجہ دیں تو زیادہ احسن ہوتا ہے۔ خاص طور پر پودوں کی نشوونما اگر شروع ہی سے ہو تو پھر ان باڑھ کو مناسب طور پر سنوارا بھی جاسکتا ہے۔''

''آپ سو فیصد درست فرمارہے ہیں میرے محترم! لیکن کبھی کبھی حالات انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے ہیں۔'' اس بار عابد خان نے جواب دیا۔ ''جو شخص پودا لگاتا ہے اور وہ اس کی دیکھ بھال بھی روزِ اوّل ہی سے کرتا ہے مگر موسم اگر تبدیل ہوجائے یا مالی روٹھ جائے تو حالات بھی دگرگوں ہوجاتے ہیں۔''

میں نے عابد خان کے جملوں کی ساخت پر خاص طور پر توجہ دی۔ زاہدہ بیگم کی خاموشی محسوس کی جو بڑی غمگین لگ رہی تھی۔ جنہوں نے میری تنقید پر کسمسانا شروع کردیا تھا اور اپنی نگاہیں نیچی کیے ہوئے تھیں۔ ان کی زبان بندی کی وجہ ہوسکتی تھی۔ ایک یہ کہ وہ جو معاملہ لے کر میرے پاس آئی تھیں اسے کھل کے بتانے سے ہچکچارہی تھیں یا پھر ایسی کوئی مجبوری ہوسکتی تھی اور کوئی وجہ بھی ہوسکتی تھی۔ شاید اس لیے اپنی زبان سے کہنے سے گریز کررہی تھیں۔ میں نے عابد خان کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کے جواب سے میں پوری بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ بہتر ہوگا کہ ہم کھل کر بات کریں۔ آپ کو جو پریشانی لاحق ہے اسے دور کرنا رب العزت کے اختیار میں ہے۔ میں صرف دعا کرسکتا ہوں لیکن اس کے لیے بھی اصل ضرورت کی غرض وعنایت جاننا ضروری ہے۔''

''شاہ جی صاحب!'' زاہدہ بیگم نے دوبارہ میری سمت اُمید بھری نظروں سے دیکھا۔ ''ہم نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ افضال احمد صاحب بھی یہی کچھ فرمارہے تھے کہ آپ جس کے حق میں دعا کردیں اس کی مراد پوری ہوتی ہے۔''

''اپنی اپنی سوچ اور عقیدے کی بات ہے لیکن بندہ عاجز اور لاچار ہے۔ وہ صرف اس قادرِ مطلق کے حضور گڑگڑا سکتا ہے۔ دعا کے لیے دامن پھیلا سکتا ہے۔ دینا نہ دینا اس کے اختیار میں ہے۔''

''آپ دعا فرمائیں ہمارے حق میں۔ وہی ان شاء

اللہ کار آمد ثابت ہوگی۔'' عابد خان نے عقیدت کا اظہار کیا۔

''آپ نے ابھی تک یہ فرمایا نہیں کہ مسئلہ کیا ہے؟''

میں نے دونوں کو باری باری نظروں کی گرفت میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''دعا کروں تو کیا اور کس لیے کروں؟ میں اندھیرے میں جو ہوں۔''

''دراصل نادرہ کی ایک ضد نے ہم دونوں کو بے حد پریشان و متفکر کر رکھا ہے۔'' زاہدہ بیگم نے کہا۔ ''وہ خیر سے اس قابل ہوگئی ہے کہ اس کا گھر آباد ہوجائے۔ وہ کوئی گوری نہیں ہے جیسا کہ لڑکے اور ان کے والدین چاندسی دلہن ڈھونڈتے ہیں لیکن اس کی سانولی رنگت میں اتنی جاذبیت اور دلکشی ہے کہ اس کے لیے کئی رشتے آچکے ہیں اور آرہے ہیں۔ جب وہ کسی شادی یا تقریب میں جاتی ہے لڑکے والے پوچھتے ہیں کہ بچی کا کہیں رشتہ تو نہیں ہوگیا ہے؟ لیکن وہ شادی کے لیے تیار نہیں۔ یہ رشتے امریکا یورپ میں ملازمت کرنے والے ہیں لیکن وہ ہے کہ شادی کرنے کے لیے کسی طرح رضامند نہیں ہوتی ہے۔''

''اس بچی کے انکار کی کوئی معقول وجہ تو ہوگی؟'' میں نے کہا۔ ''ورنہ آج کی لڑکیاں تو شادی کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہوتی ہیں۔ خصوصاً ایسے رشتوں کے خواب دیکھتی ہیں کہ امریکا، یورپ یا دبئی میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں۔ جیسا کہ آپ نے بتایا کہ غیر ممالک میں ملازمت کرنے والے لڑکوں کے رشتے بھی آرہے ہیں۔''

''وہ کھل کر اس بات کا اظہار نہیں کرتی ہے؟'' عابد خان نے لقمہ دیا۔ ''جو رشتے شروع شروع میں آئے وہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی پسند نہیں آئے اس لیے ٹال دیئے گئے بعد میں جب ہم نے کہیں بات کرنے سے پیشتر نادرہ کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی تو اس نے صاف انکار کردیا۔''

''اس کی ایک وجہ یہ بھی تو ہوسکتی ہے کہ ممکن ہے کوئی رشتہ بچی کو پسند ہو جسے آپ نے رد کردیا ہو اور اب وہ آپ کی پسند سے انکار کررہی ہو۔'' میں نے ایک امکانی بات کہی۔ ''لڑکیوں کے سلسلے میں اللہ اور اس کے رسول نے بھی یہی فرمایا اور درس دیا ہے کہ کوئی اچھا رشتہ آئے جسے دل قبول کرے اور کوئی تردّد نہ ہو تو اس سے انکار نہ کرو۔ البتہ جہاں شک ہو اسے انکار کردو' لیکن لڑکی کے بالغ ہونے کے بعد اس کی شادی میں دیر نہ کرو۔''

''ہوسکتا ہے کہ آپ درست فرما رہے ہوں لیکن ہم نے نادرہ کو ہر قسم کی آزادی اور اختیار دے رکھا ہے۔ اس کی کئی قریبی اور گہری بے تکلف سہیلیوں نے بھی اسے ٹٹولنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جب بھی شادی کا ذکر آتا ہے تو وہ مہر بہ لب ہوجاتی ہے اور اس موضوع پر گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتی ہے۔'' عابد خان نے کہا۔ ''ہم ہر طرح اس کی خوشی پوری کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن نہ جانے کیوں نادرہ اپنی زبان نہیں کھولتی۔''

''شاہ جی!'' زاہدہ بیگم نے پھر منت کی۔ ''آپ ایسا کوئی مجرب تعویذ لکھ دیں کہ وہ شادی پر آمادہ ہوجائے۔ ہم مرتے دم تک آپ کے شکر گزار رہیں گے، وہ اپنی دنیا آباد کرلے۔ گھر بسالے تو ہماری ساری پریشانی دور ہوجائے گی۔ ہر لڑکی پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ رشتے آنا شروع ہوجاتے ہیں۔ جب عمر ہوجائے تو پھر ایک بھی نہیں آتا۔ ہم نے بڑی اُمیدوں سے آپ تک رسائی حاصل کی ہے۔ آپ ہمیں مایوس نہ کیجئے گا۔''

میں نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ علم قیافہ کی روشنی میں باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھتا اور پڑھتا رہا۔ چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ وہ ایک کھلی کتاب کی مانند ہوتا ہے پھر مراقبے کی کیفیت اختیار کی لیکن بجز دھند اور گھپ اندھیروں کے کوئی واضح اشارہ تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ دونوں میرے جواب کے بے چینی سے منتظر تھے۔ ان کی حالت ماہی بے آب کی سی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر میں مراقبے کی حالت ختم کرکے آنکھیں کھولیں تو زاہدہ بیگم عاجزی سے بولیں۔

''خدا کے بعد آپ ہماری آخری اُمید ہیں..... ہمیں مایوس نہ کیجئے گا۔''

''میری نہیں بلکہ اس کی ذات سے مایوس نہ ہوں۔ وہ نہ صرف مشکل کشا بلکہ مسبب الاسباب بھی ہے۔ انسان سچے دل اور عقیدت سے مانگے تو اس کی رحمت ضرور جوش میں آجائے گی۔''

''محترم.....! کوئی تعویذ لکھ دیں۔'' عابد خان نے انکساری سے درخواست کی۔ ''ہوسکتا ہے کہ آپ کا وسیلہ ہی اوپر والے کے حکم سے ہمارے کام آجائے۔''

''بچی کا پورا نام کیا ہے؟'' میں نے تعویذ لکھنے کی غرض سے پوچھا۔

''نادرہ پروین ذکریا۔'' اس بار زاہدہ بیگم کے

ہونٹوں نے حرکت کی۔ انہوں نے ہونٹ چباتے ہوئے دبی زبان میں جواب دیا۔ تو میں نے عابد خان کی طرف دیکھا۔ زاہدہ بیگم نے میرے ہونٹوں کا مفہوم بھانپ کر وضاحت کی کہ اس وقت نادرہ کی عمر پندرہ برس کی ہوگی جب میں نے حالات سے مجبور ہوکر دوسرا عقد کیا تھا۔''

''اوہ.....!'' میں نے چونک کر کہا۔ ''کہیں آپ کا عقد ثانی تو بچی کے انکار کی وجہ نہیں ہے؟''

''جی نہیں..... اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ اس شادی کے وقت اپنی خفگی کا اظہار کرسکتی تھی۔'' زاہدہ بیگم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''میری دوسری شادی ہونے کے ڈیڑھ برس بعد تک بھی اس نے اپنی کسی خفگی یا ناراضگی کا مطلق کوئی اندازہ بھی ہونے نہیں دیا بلکہ وہ اس بات سے مطمئن تھی کہ عابد خان کی شخصیت اس کی جانی پہچانی تھی۔ ہماری شادی سے قبل بھی وہ عابد خان سے بڑی گرم جوشی اور اپنائیت سے پیش آتی تھی۔ یہ بھی اسے بچی کی طرح پیار کرتے تھے۔ اب بھی کرتے ہیں اور اس کا ہر طرح سے خیال کرتے ہیں۔ اس کی کوئی بھی فرمائش ہو تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پوری نہ کی ہو۔'' زاہدہ بیگم بڑے وثوق سے کہے جارہی تھی۔ اس کے شادی نہ کرنے کی وجہ میرا عقد ثانی نہیں ہے جو اس نے قسم کھا رکھی ہے۔''

میں ایک لمحہ ان کی باتوں پر غور کرتا اور سوچتا رہا پھر ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے ایک اور ممکنہ خدشے کا اظہار کیا۔

''کہیں آپ کے قریب رشتہ داروں یا واقف کاروں میں کوئی ایسی شادی کی مثال تو موجود نہیں جو خلاف توقع بری طرح ناکام ہوئی ہو اور نادرہ بچی نے اس کا اثر دل پر لے لیا ہو؟''

''میرے خیال میں تو ایسی کوئی مثال بھی موجود نہیں ہے۔'' زاہدہ بیگم نے عابد خان کی طرف تصدیق طلب انداز میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا آپ نے کبھی بچی کو کریدنے کی کوئی کوشش کی؟'' میں نے براہِ راست عابد خان سے سوال کیا۔

''جی نہیں..... میں نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی..... اس لیے بھی کہ ماں کی موجودگی میں ایک نوجوان بچی سے اس موضوع پر بات کروں؟'' عابد خان نے بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں ایک معقول جواب دیا البتہ ہم دونوں نے مل کر بھی اسے ٹٹولنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر اس نے کبھی کھل کر جواب نہیں دیا، یا تو صاف طور پر انکار کردیتی یا پھر خاموشی سے ٹال دیتی۔''

''کیا کوئی ایسا لڑکا آپ کی نظر میں اور علم میں ہے جو نادرہ کو پسند کرتا ہے لیکن آپ دونوں اسے ناپسند کرتے ہوں؟'' میں نے مزید کریدا۔

''جی نہیں.....'' اس بار زاہدہ بیگم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ پھر اکتائے ہوئے انداز میں بولیں۔ ''خدا جانے کیا گتھی ہے جس نے ہماری بچی کی زبان پر تالے ڈال دیے ہیں۔''

''شاہ جی صاحب!'' عابد خان نے زاہدہ بیگم کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے کسی بدخواہ نے ہماری بچی پر ایسا کوئی گندہ عمل کرادیا ہو کہ اچھے سے اچھے رشتے کو وہ خاطر میں نہ لاتی ہو؟''

''یہ بھی بعید از امکان نہیں لیکن آپ کے ذہن میں اچانک یہ خیال کیوں آیا؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''بس یوں ہی یا چھٹی حس نے آگاہ کیا ہو؟'' عابد خان نے سادگی سے جواب دیا۔ ''کچھ لوگ بلاوجہ بھی کسی کو ایذا دے کر خوش ہوتے ہیں۔''

میں خاموشی سے تمام باتوں پر غور کررہا تھا کہ زاہدہ بیگم نے کہا۔ ''ہمارے ایک دو دور پرے کے واقف کار ہیں جو ہم سے اللہ واسطے کی عداوت رکھتے ہیں۔ انہیں میرا دوسری شادی کرنا پسند نہیں۔'' زاہدہ بیگم کے لہجے میں نفرت کا زہر بھرا ہوا تھا۔

''کسی ..... مرد اور عورت کا دوسری شادی کرنا نہ جرم ہے اور نہ ہی کوئی گناہ ہے بی بی! جب کہ ضرورت ہو اور پرسان حال نہ ہو۔'' میں نے ایک عام سی بات کہی پھر کسی خیال سے دریافت کیا۔ ''آپ کے سابقہ شوہر کے کچھ عزیز و اقارب بھی ایسے ضرور ہوں گے جنہیں آپ کے عقد ثانی سے تکلیف پہنچی ہوگی۔''

''جی ہاں۔'' زاہدہ بیگم نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''مرحوم کے ایک چچازاد جن کو میرا گھر بسانا پسند نہیں آیا۔''

''کیا انہوں نے اس بات کا کھل کر اظہار بھی کیا تھا؟''

''جی ہاں۔ شادی سے قبل انہوں نے کسی کے ذریعے ایک دھمکی آمیز پیغام بھیجا تھا کہ میں دوسری شادی سے باز آجاؤں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''کیا کوئی وجہ تھی اس تنبیہہ کے اظہار کی؟'' میں نے انہیں ٹٹولا۔
''وہ ایک نمبر کا اوباش آدمی ہے۔'' زاہدہ بیگم نے جواب دیا۔ ''شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی اس نے کسی کی معرفت مجھے یہ پیغام دیا تھا کہ میں اس کے ساتھ نکاح کرلوں چوری چھپے جس کا کسی اور کو بھی علم نہ ہو۔''
''پھر......؟''
''میں نے صاف انکار کردیا تھا۔ میں کوئی بدچلن عورت تھوڑی تھی؟ اگر میرے پاس پستول ہوتا تو اسے چھلنی کرکے رکھ دیتی۔''
''ہوسکتا ہے کہ اس نے انتقاماً نادرہ پر کچھ تعویذ گنڈے کرکے ہمیں تنگ کرنے کی کوشش کی ہو؟' عابد خان نے سنجیدگی سے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ ''میں براہِ راست تو موصوف سے کبھی ملا اور نہ ہی اس کی صورت دیکھی ہوئی ہے لیکن درمیانی لوگوں کے ذریعے یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ انتہائی بدمعاش واقع ہوا ہے۔ جس علاقے میں رہتا ہے وہاں اس سے بیشتر افراد نالاں ہیں۔ ار ہے کوئی ملتا جلتا نہیں ہے۔ ایک شخص نے مجھے بتایا کہ اس نے دو ایک مطلقہ عورتوں کو جھانسا دے کر چوری چھپے شادی کی پھر جب اس کا جی ان سے بھر گیا تو انہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کے پھینک دیا......''
''کیا نام ہے ان موصوف کا؟'' میں نے غیر ارادی طور پر پوچھ لیا۔
''اکمل نواب......!'' زاہدہ بیگم نے اپنی حقارت کا اظہار کیا، ''بس خالی نام کا نواب ہے ورنہ اس کے کچھن اٹھائی گیروں جیسے ہیں۔''
میں خاموشی سے تمام باتوں پر غور کرتا رہا۔ بات ابھی تک کھل کر واضح نہیں ہوسکی تھی کہ وہ شادی سے کیوں منکر ہے؟ لہٰذا میں نے ایک مجرب تعویذ لکھ کر اسے زاہدہ بیگم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال آپ اسے نادرہ کے تکیے کے نیچے یا بستر میں اس طرح کہیں چھپا کر رکھ دیں کہ اسے علم نہ ہو اور ایک ہفتے کے بعد مجھے دوبارہ حالات سے آگاہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو بہتر ہی ہوگا۔''
''شاہ صاحب......!'' زاہدہ بیگم نے تعویذ لے کر پرس میں رکھا اور جاتے جاتے کہا۔ ''میں ایک ہفتے بعد دوبارہ قدم بوسی کو حاضر ہوں گی......لیکن آپ کو بہرحال نادرہ کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔''

''کیا اس وقت کوئی مناسب رشتہ ہے آپ کی نظر میں؟'' میں نے دریافت کیا۔
''ایک چھوڑ دو دو ہیں۔'' عابد خان نے جواب دیا۔ ''دونوں کے والدین کئی بار تقاضا بھی کرچکے ہیں لیکن ہم نے ابھی تک انہیں آخری جواب نہیں دیا۔''
''ہوسکے تو جو رشتہ آپ دونوں کو پسند ہے اس کی تفصیل سے مجھے اگلی ملاقات پر ضرور آگاہ کریں۔ میں اس عرصے میں رب العزت سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کی بچی کو سنت ادا کرنے پر بخوشی آمادہ کرے۔''
ان کے جانے کے بعد شجاعت دروازہ بند کرکے میرے پاس آگیا۔ میں تادیر نادرہ کی لاحق گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہ کرسکا۔ اس میں بھی اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور تھی۔ مجھے اس کی ذات پر یقین تھا کہ وہ میری ضرور رہنمائی کرے گا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ اس کا نظام قدرت ہر طرح مربوط ہے۔ جس کام کے لیے جو وقت مقرر کردیا گیا ہے وہ اٹل ہے، اس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی طے شدہ وقت سے پہلے حرکت کیا جنبش تک نہیں کرسکتا۔ اگر اس کی مصلحتوں کا علم ہم گناہ گاروں کو ہوجائے تو پھر ان کی شان کریمائی پر کون توجہ دے گا؟ مختلف انداز اور طریقوں سے اپنے بندوں کو پرکھتا ہے اور ان کا امتحان لیتا اور آزمائش بھی کرتا ہے اور پھر یہ بھی طے ہے کہ آدمی دنیا میں جو کچھ بوئے گا وہی کاٹے گا بھی......اس ضمن میں حضور پاکؐ نے فرمایا۔ ''دنیا مومن کے لیے قید خانہ (پابندیوں کی جگہ) اور کافر کے لیے جنت ہے۔
''کیا بات ہے شاہ جی!'' شجاعت نے مجھے گہری سوچ میں غرق دیکھ کر پوچھا۔ ''آپ کس سوچ میں گم ہیں؟''
''شجاعت!'' میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے فرمائش کی۔ ''اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو ایک کپ قہوہ بنا دو۔ شدید طلب ہورہی ہے۔ اپنے لیے کافی یا اوولٹین بنالو یا دودھ پتی چائے۔''
شجاعت نے مجھے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا اور وہ میرے بشرے سے جیسے کچھ بھانپنا چاہتا تھا۔ دوسرے لمحے وہ بڑی سعادت مندی سے باورچی خانے کی طرف تیزی سے لپک گیا۔ میں پھر عابد خان اور زاہدہ بیگم کے اس الجھے ہوئے مسئلے کو سلجھانے میں محو ہوگیا جس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ آج تک ایسا کوئی مسئلہ نہیں آیا تھا جسے میں

نے فوری یا تھوڑی دیر میں حل نہ کرلیا ہو۔

اس رات عشاء کی نماز کے بعد میں سونے کے ارادے سے بستر پر دراز ہوا تو شجاعت نے ایک بار مجھے پھر کریدنے کی کوشش کی۔

''شاہ جی.....! میں آپ کو صبح سے ملول دیکھ رہا ہوں۔ آپ کسی ایسی سوچ میں غرق ہیں جیسے کوئی مسئلہ آپ کو پریشان کررہا ہے۔ میں نے کبھی بھی آپ کو ایسی کیفیت میں مبتلا نہیں پایا۔ میرا اندازہ ہے کہ جو میاں بیوی صبح آپ سے ملاقات اور مشورے کے لیے تشریف لائے تھے ان کے کسی مسئلے نے آپ کو بری طرح الجھا دیا ہے۔''

''ہاں شجاعت عزیز! بات ہی کچھ ایسی ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''اس لیے آپ سے درخواست کرتا رہتا ہوں کہ آپ اتوار کے دن آرام فرمایا کریں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔''

''میں تمہاری محبت، اس خلوص اور جذبے کی قدر کرتا ہوں، لیکن کسی دوسرے کے کام آنا بھی تو عبادت ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ آئے تھے انہیں افضال احمد نے بھیجا تھا۔ اگر میں ان سے ملنے سے انکار کردیتا تو ان کے بار خاطر پر بھی میری بے رخی گراں گزرتی۔''

''آپ بجا فرمارہے ہیں لیکن ہر بات پر آپ اتنا غور وفکر نہ کیا کریں۔'' شجاعت نے مجھے حسب استطاعت ..... قائل کرنے کی کوشش کی۔ ''آپ ہی تو فرماتے رہتے ہیں کہ جو کچھ اوپر والے کو منظور ہے وہ ہو کر رہتا ہے پھر آپ اپنی صحت ہلکان کیوں کرتے رہیں۔''

شجاعت کی بات سن کر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے سمجھانے کی خاطر کہا۔ ''بے شک اس کے کارخانے میں کسی پرندے کو پر مارنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بھی اس کا فرمان ہے کہ تم پھر سے مانگو اگر تم نے صدق دل سے مانگا تو میری رحمت کہیں مایوس اور نامراد نہیں کرے گی اس لیے انسان کو ہر حال میں اس کے سامنے گڑگڑانا اور اپنے گناہوں پر نادم، شرمسار ہونا توبہ اور استغفار کرتے رہنا چاہیے۔''

شجاعت خاموش ہوگیا۔ رات کو جب میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتا تو کچھ دیر تک میرے پیر دبایا کرتا تھا۔ میں نے شروع شروع میں اسے کئی بار باز رکھا اور سختی سے منع کیا لیکن پھر اس کے جذبوں کی صداقت دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ البتہ کچھ دیر میں اسے نیند کا بہانہ کرکے ٹال دیا کرتا تھا اس وقت بھی اس کے جانے کے بعد میں نے سونے کی کوشش کی لیکن کچھ باتیں ایسی تھیں جو میرے ذہن میں نیزے کی انی کی طرح چبھ رہی تھیں۔ نادرہ کی شادی سے انکار والی بات زیادہ تعجب خیز اور ناقابل فہم نہیں تھی۔ کیوں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ اور مخلوط تعلیم عام ہونے کے ساتھ معاشرہ کا ماحول، رجحانات اور سوچ بدلنے کے سبب اکثر لڑکیاں بے باک ہونے کی عادی ہورہی تھیں۔ ٹی وی ڈراموں اور ہندوستانی فلموں کی یلغار نے ذہن بدلنا شروع کردیا ہے کہ لڑکیاں مرد کی برتری کو یا تو پسند نہیں کرتیں یا پھر ایسی کوئی مثال جوان کے تحت الشعور میں بیٹھ جائے اس کے پیش نظر وہ والدین اور سرپرستوں کے فیصلے نہیں مانتیں بلکہ بڑے فیصلے خود کرنے لگی ہیں۔ والدین کی نافرمانی کا خیال بھی نہیں کرتیں لیکن نادرہ کے بارے میں مجھے جو تفصیل بتائی گئی اس کے مطابق اسے ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ اختیار بھی دیا ہوا تھا اور کیا چاہیے.....؟ ماں کی دوسری شادی کے بعد بھی اس نے کسی ناپسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ایک زاویے سے یہ بات صاف ہوئی تھی کہ وہ ہر معاملے میں خود مختار بھی تھی۔ شادی کے سلسلے میں بھی کھل کر انکار کرسکتی تھی لیکن اس نے ایسی کسی بات کا انکار نہیں کیا تھا۔ ماں کی دوسری شادی کے وقت زاہدہ بیگم کے بیان کے مطابق وہ پندرہ برس کی تھی اور اب وہ سترہ، اٹھارہ برس کے لپیٹے میں تھی۔ اس حقیقت کی روشنی میں میرا ذاتی اندازہ تھا کہ اس ڈھائی تین برس کے درمیان کوئی تھی ایسی ضرور الجھ گئی تھی جس نے نادرہ کو شادی کے نام سے ہی متنفر کردیا تھا کہ وہ کسی قیمت پر اس کا ذکر سننے کی روادار نہیں تھی۔ اس نفرت کی بے شمار وجوہات ہوسکتی تھیں جس میں امکان یہ بھی تھا کہ کسی موقع پر نادانی میں اس کے پاؤں کسی ان جانے راستے پر پھیل گئے ہوں اور اب اس کی وجہ سے اس نے خود کو اپنے خول میں بند کرلیا ہو۔ عزیز داروں اور سہیلیوں کی فہرست میں کسی شادی کے امکان بھی ممکن تھے جس نے ناکامی کی صورت اختیار کرنے کے بعد دلہن کو اس قدر کسمپرسی کی کیفیت سے دوچار کردیا ہو اور بہت زیادہ نفسیاتی امکانات بھی تھے۔ ایک بات یہ بھی قرین قیاس تھی کہ نواب کی دھمکی سے اسے خوف لاحق ہو کہ اس کا گھر بسنے کے بعد نواب جو اچھی شہرت کا مالک نہیں تھا اس کے شوہر یا اس کے سوتیلے باپ کو مار کر اپنی دھمکی کو عملی جامہ نہ پہنادے، دونوں

صورتوں میں نادرہ کو صدمے سے دوچار ہونا پڑتا۔

میں جتنا غور کرتا اور مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتا جارہا تھا اتنا الجھتا جارہا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ تمام حالات کو ذہن سے جھٹک کے سونے کی کوشش کروں۔ نیند کا غلبہ حاوی ہورہا تھا جب کسی کی مدھم آواز کانوں میں آئی۔ ''کیا سوگئے پیرومرشد!''

میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو ارسلان جن میری نظروں کے سامنے تھا۔ ایک عرصہ بعد اسے اپنی خواب گاہ میں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ ''اس وقت کیسے زحمت کی! کافی عرصہ بعد شکل دکھائی۔''

''حضرت خواجہ کی رفاقت میں ایسا مصروف تھا کہ آپ کے نیاز حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔'' وہ جواب دے کر ہمیشہ کی طرح میرے سامنے فرش پر دوزانو ہوکر بیٹھ گیا۔

''کہیں کوئی اور وجہ تو نہیں ہے؟'' میں نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ وہ اکثر پیچیدہ معاملات میں چوں کہ خواجہ کے اشارے پر میری مدد کرچکا تھا اس لیے مجھے شبہ ہوا کہ شاید نادرہ کی گتھی سلجھانے کا کام بھی اس کے سپرد کیا گیا ہو۔

''اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟'' ارسلان نے مجھے مسکرا کے دیکھا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے آپ کے ذہن میں ان کا خیال آگیا ہو جو آپ سے ملنے آئے تھے.....؟''

''گویا میرا خیال ہے.....'' میں نے دانستہ اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔

''محترم.....ایسا ہرگز نہیں ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''آپ کے استفسار پر میرا خیال عابد خان اور ان کی زوجہ کی طرف چلا گیا۔ میں آپ سے ضرور دور رہا لیکن کبھی بھی آپ کی طرف سے غافل نہیں رہا۔''

''یہ بھی حضرت خواجہ کی نوازش ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے مطلب کی بات کی۔ ''اب جب کہ عابد خان اور ان کی بیگم کا ذکر درمیان میں آگیا ہے تو یہ بھی بتادو کہ نادرہ کی شادی کے مسئلے پر پُراسرار خاموشی کا مطلب کیا ہے؟''

جواب میں ارسلان نے ایک پل کے لیے خلا میں جھانکا۔ پھر کسمسا کر بولا۔ ''میرے عزیز! میری یہ جرأت نہیں کہ آپ کی کسی بات سے انکار کرسکوں لیکن کچھ بندشیں حضرت خواجہ اور رب العزت کی جانب سے ایسی ہیں جن کو پھلانگنا میرے بس کی بات نہیں ہے ایک غلطی یا فرمانی بھی بندے کو در بدر کرسکتی ہے۔

''میں چونکہ اس بات سے بخوبی واقف ہوں اس لیے تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔'' میں نے اس کا مفہوم سمجھ کر کہا۔ ''لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابھی تک میں اس گتھی کو سرے سے سلجھانے میں ذرہ برابر بھی کامیاب نہیں ہوسکا ہوں۔''

''ہوسکتا ہے کہ اس میں بھی اوپر والے کی کوئی مصلحت ہوگی۔''

''نواب کے سلسلے میں تمہاری کیا معلومات ہیں؟'' میں نے ایک پہلو پر غور کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''انتہائی اوباش اور بدخصلت واقع ہوا ہے۔'' ارسلان نے کھل کر جواب دیا۔ ''اس کا شمار ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جن کو نہ اپنی عزت کا خیال ہوتا ہے اور نہ دوسروں کا احساس ہوتا ہے کسی کی بھی پگڑی اچھال کر وہ خوش ہونے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کا شمار بھی ان بدنصیب لوگوں میں کیا جاسکتا ہے اللہ تعالیٰ جن کی رسی دراز کرتا رہتا ہے۔ روز قیامت ایسے بدکرداروں کے لیے رعایت کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ یہ نہ تو خود سکون سے رہتے ہیں نہ دوسروں کو سکون سے رہنے دیتے ہیں۔ خیانت ان کی سرشت میں داخل کردی گئی ہے۔''

''میں نے زاہدہ بیگم کو ایک ہفتے بعد بلایا ہے۔'' میں نے یوں برسبیل تذکرہ کیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ جو تعویذ میں نے دیا ہے اس کے نتیجے میں کوئی دوسرا ایسا نظر آجائے کہ اس گتھی کو سلجھا سکنے میں مدد کرسکے۔''

''آپ جو کار خیر انجام دے رہے ہیں اس کا علم نیلی چھتری والے کو بھی ہے۔'' ارسلان نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ''اگر اس کی مرضی نہ ہوتی تو آپ کسی کو فیض بھی نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ وہی ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کی کوئی نہ کوئی رہنمائی ضرور کرے گا۔''

میرے ذہن میں اور بھی سوالات جو بہت سارے تھے زبان پر آنے کے لیے تڑپ رہے تھے لیکن میں بخوبی اس بات سے واقف تھا کہ ارسلان جن ہونے کے باوجود حضرت خواجہ کے ہاتھوں بیعت کرنے کے بعد پکا مسلمان ہوچکا تھا اس وجہ سے وہ میرے سامنے زبان کھولنے سے ہمیشہ محتاط رہتا تھا اس لیے میں نے نادرہ کے مسئلے کو مزید نہیں چھیڑا۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ارسلان رخصت ہوگیا تو میں دوبارہ بستر پر دراز ہوکر آنکھیں

موندلیس لیکن نہ جانے کیوں ارسلان کی آمد کے بعد مجھے قدرے ....طمانیت ضرور محسوس ہوئی تھی جو کرب اور بے چینی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔

☆☆☆

دوسرے روز سے میں حسب معمول اپنے روزمرہ کی مصروفیت میں الجھ گیا تھا۔ تین روز گزر گئے لیکن اس دوران میں نادرہ کو بھولا نہیں اسے ایک بچی کی طرح دعاؤں میں ضرور یاد رکھا لیکن زیادہ الجھنے اور متفکر ہونے کی کوشش نہیں کی۔ سینکڑوں ضرورت مندوں کی موجودگی میں کسی ایک کے بارے میں خود کو محور رکھنا میرے اصول کے بھی خلاف تھا۔

چوتھے روز میں دستور کے مطابق اپنے حجرے میں بیٹھا آنے والے ضرورت مندوں کی روداد سننے میں مصروف تھا جب اپنے نمبر پر ایک ایسا شخص میرے سامنے آیا جسے دیکھ کر میں پوری طرح محتاط ہو گیا۔ آنے والے کی صورت دیکھتے ہی میری چھٹی حس نے خبردار کیا تھا کہ وہ صورت شکل سے جیسا نظر آ رہا ہے اندر سے ایسا نہیں ہے۔ اس نے اپنے اصل چہرے پر شریف النفس کی نقاب ڈال رکھی ہے جس سے ساری دنیا دھوکا کھا جاتی ہے۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی میں پوری طرح محتاط ہو گیا تھا۔ میں خدا نخواستہ عالم الغیب نہیں ہوں کہ کسی کے دل کا احوال جان سکوں لیکن گزرتے وقت کے ساتھ..... خدا کے فضل و کرم سے اتنا تجربہ ضرور ہو گیا تھا کہ کسی سائل کو دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی گمان کر سکوں۔ یہ بھی خدا کا فضل تھا کہ میرا ذہن اکثر درست سمت میں میری رہنمائی کرتا تھا۔

آنے والا تقریباً چھیالیس برس کا یا اس سے کچھ اوپر نظر آیا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے سیاہ بالوں کی چمک دار فرنچ کٹ داڑھی بھی تھی۔ شلوار قمیص کے اوپر اس نے سیاہ رنگ کی واسکٹ بھی پہن رکھی تھی لیکن اس کے بٹنوں کو بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ صورت و شکل کے اعتبار سے اسے خوب رو بھی کہا جا سکتا تھا لیکن اس کی آنکھوں کی چمک میں ایسی کوئی بات ضرور تھی جو اس کے ظاہر و باطن کے فرق میں چغلی کرتی نظر آ رہی تھی۔

اس نے کمرے میں داخل ہو کر ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ آگے بڑھ کر عقیدت سے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا (میں اسے بدعت ہی کہوں گا) پھر آلتی پالتی مار کر سامنے بچھی اجلی چاندنی پر بیٹھ گیا۔

''فرمایئے.....؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظر جما کر حسب معمول سلجھے ہوئے الفاظ میں مخاطب کیا۔ ''کیسے زحمت کی؟''

''ایک ضرورت مجھے آپ کی چوکھٹ تک لے آئی ہے لیکن میں یہ بات واضح کر دوں کہ یہ میں پیری مریدی کا قائل ہوں اور نہ ہی میں تعویذ گنڈوں پر اعتقاد رکھتا ہوں۔'' اس نے بڑی صاف گوئی سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا۔ ''آپ کے پاس آنے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ میرا نام کسی حوالے سے آپ تک پہنچ چکا ہے جس کی اطلاع مجھے بھی کسی نہ کسی طرح ہو گئی۔ میں آپ کو محض یہ بتانے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ جس معاملے میں مجھے ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کا مجھ سے دور تک کا تعلق نہیں ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ درست ہو لیکن میں بغیر کسی حوالے کے کس طرح جان سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور آپ کی آمد کا اصل مقصد کیا ہے؟''

''اوہ.....!'' اس نے مجھے عجیب انداز سے دیکھا۔ ''گویا آپ ابھی تک روشن ضمیر کے رتبے تک نہیں پہنچ سکے؟''

اس کے انداز میں گستاخی تھی لیکن میں نے حضور کی اس حدیث پر عمل کیا کہ جو چپ رہ گیا وہ نجات پا گیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے تضحیک انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ آپ فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں؟''

''آپ نے درست سنا ہے میرے محترم!'' میں نے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہا۔ ''جہاں پیسوں کا لالچ درمیان میں آ جائے وہاں خلوص نیت پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔''

''میں آپ کی اس بات سے اتفاق کروں گا اور اس بات کی اُمید رکھتا ہوں کہ آپ کم از کم کسی حوالے سے بھی تصدیق کیے بغیر میرے تعلق سے کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں گے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے پھر ایک ایسی بات اپنی ذات سے متعلق کہی جو میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ ''اب میں اجازت چاہوں گا۔''

''آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔'' میں نے اس بات پر قدرے خشک لہجہ اختیار کیا۔ ''جب آپ نے اپنا تعارف ہی نہیں کرایا تو پھر آپ کے بارے میں بھلا کیا رائے قائم کر سکتا ہوں۔''

''یہ بھی درست ہے۔'' اس نے پھر احمقانہ انداز

اختیار کیا۔ ''فی الحال میں اپنا تعارف صرف اتنا کرا سکتا ہوں کہ میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے کسی بھی جاندار یا بے جان چیز چھین جھپٹ کر حاصل کرنے کا عادی ہوں۔ گو کہ ناک پکڑ نا بزدلوں کا کام ہے۔''

''محترم! میں آپ کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

اس بار میں نے بے زاری کا مظاہرہ کیا۔

''میرا حلیہ اور میرے جملوں کو ذہن میں محفوظ کرلیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی حوالے پر آپ کو میرا نام بھی دوسرے بتادیں۔'' وہ بازاری انداز میں اپنی بات مکمل کر کے الٹے قدموں چلا گیا تو میں نے شجاعت کو اندر بلا کر دریافت کیا:

''یہ شخص جو ابھی اندر آیا تھا کیا تم اس سے واقف ہو؟''

''جی نہیں.....''

''کیا اس نے اپنا کوئی نام بھی بتایا تھا؟''

''نہیں شاہ جی.....!'' شجاعت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میں نے دریافت بھی کیا تھا مگر اس نے کسی وجہ سے اپنا نام بتانا مناسب نہیں سمجھا، ٹال گیا۔ میں نے بھی آپ کی ہدایت کے مطابق اصرار نہیں کیا البتہ یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ پہلی بار آیا تھا۔''

''باہر اور کتنے افراد موجود ہیں۔''

''تین.....'' اس نے میری اکتاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ ''شاہ جی! کیا کوئی خاص بات پیش آگئی ہے؟''

''اطمینان سے بتاؤں گا۔ تم فی الحال دوسرے لوگوں کو باری باری اندر بھیجتے رہنا۔''

شجاعت خاموشی سے واپس لوٹ گیا اور میں باقی کے حاجت مندوں میں مصروف ہوگیا لیکن یہاں ضرور عرض کروں گا کہ وہ خوددار میری زندگی میں پہلا، پُراسرار اور آخری فرد تھا جس نے برملا اپنے گھٹیا پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس کی آمد پر بے حد غور کیا۔ لیکن یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ کون تھا اور کس مقصد سے آیا تھا۔

☆☆☆

اس روز دوشنبہ تھا۔ عام طور پر اتوار کے اگلے دن حاجت مندوں کی آمد کی تعداد روزمرہ کے مقابلے میں زیادہ ہوا کرتی تھی لیکن اس دن عیدالاضحیٰ کی پانچ تاریخ تھی۔ اس لیے بیشتر افراد جانوروں کی خریداری اور عید کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بہرحال اس روز شجاعت نے مجھے بیٹھک کا دروازہ کھولنے کے بعد یہی اطلاع دی کہ آنے والوں کی تعداد کل چار تھی۔ ان میں عابد خان اور زاہدہ بیگم بھی شامل تھے۔ چونکہ میں خواتین کو اوّل وقت فارغ کردینے کا عادی تھا اس لیے میں نے پہلے زاہدہ بیگم اور عابدہ خان کو اندر بلایا۔ ان کے حجرے میں داخل ہونے کے بعد میرے ذہن میں نادرہ کے سارے واقعات تازہ ہوگئے۔ زاہدہ بیگم نے حسبِ سابق اندر آنے کے بعد برقع کا نقاب الٹ دیا تھا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ عابد خان بھی کچھ دبے دبے نظر آئے تھے۔ میں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خیریت رسمی انداز میں دریافت کیا۔ ''میں نے جو تعویذ دیا تھا اس کے سلسلے میں ایسی کوئی خاص بات سامنے آئی جو آپ نے خاص طور پر محسوس کیا ہو.....؟''

''جی ہاں.....'' زاہدہ بیگم نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر رو دینے والی آواز میں منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ کے دیئے ہوئے تعویذ تین چار روز تو ہمارے لیے نیک شگون ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ آپ کی دعا سے اب ہماری مشکل آسان ہوجائے گی لیکن اس کے بعد جو صورتِ حال پیش آئی وہ بڑی مایوس کن اور دل شکن تھی۔'' وہ سسک پڑیں۔

''میں کچھ سمجھا نہیں.....'' میں نے وضاحت چاہی، کیوں کہ کوئی بات واضح نہیں ہوئی تھی۔

''میں بتاتا ہوں۔'' عابد خان نے اپنی بیوی کے اشارے گفتگو شروع کی۔ ''نادرہ نے جس انداز میں آپ کے دیئے ہوئے تعویذ کے بعد ہنسنا بولنا شروع کیا تھا اور گھر کے معمولات اور کام کاج میں دلچسپی لینا شروع کی تھی اس سے میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا کہ اب حالات میں بہتری آئے گی۔ ایک روز ہم دونوں نے اسے ہموار کرنے کی خاطر ایک رشتے کی بات چھیڑی جس میں لڑکے والوں کی طرف سے بار بار بات پکی کرنے کا تقاضا ہو رہا تھا۔ یہ رشتہ ہم دونوں کے خیال میں ہر لحاظ سے بہتر اور موزوں تھا میں ذاتی طور پر اس لڑکے کے بارے میں ضروری معلومات بھی حاصل کر چکا تھا اور ہر طرح سے مطمئن بھی تھا اور ایسے رشتے شاذ و نادر آتے ہیں۔'' عابد خان نے بیوی کی طرف دیکھ کر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس دن نادرہ بھی خاصی خوشگوار موڈ میں تھی، ہم دونوں اسے سمجھا رہے تھے وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی ہماری باتیں سنتی رہی پھر اک دم سے

کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی۔ انتہائی برہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہذیانی انداز میں چیخ کر بولی۔ ''اگر آپ نے اس گھر میں میری شادی کی بات چھیڑی تو زہر کھا کر جان دے دوں گی، اس کے بعد انتہائی نفرت سے ہم دونوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔''

''دو روز اس بات کو گزر چکے ہیں شاہ جی صاحب!'' زاہدہ بیگم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ بس پانی پی پی کر زندہ رہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہم دونوں سے بات کرنا تو دور کی بات ہے وہ ہماری صورت دیکھنے سے بھی نالاں ہے۔''

جو صورتِ حال بیان کی گئی وہ میرے لیے بڑی مایوس کن اور ناقابل فہم بھی تھی۔ میں نے جو تعویذ دیا تھا وہ بیشتر دوسرے معاملات میں بے حد کارآمد ثابت ہوا تھا میرے متعدد بار کا آزمودہ بھی تھا۔ میں یہاں قارئین پر ایک اور بات واضح کر دوں کہ اس تعویذ کا صرف یہی نہیں تھا کہ نادرہ خود اپنی زبان سے شادی کا اظہار کر دے بلکہ ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ جو بات ہو زبان پر آجائے۔ بہرحال..... نئی صورت سے آگاہی کے بعد میں نے ایک بار پھر مراقبہ کیا۔ لیکن اس بار مجھے بالکل مایوسی نہیں ہوئی لیکن جو اشارہ ملا وہ اس قدر الجھا ہوا تھا کہ پوری طرح میری سمجھ میں نہ آسکا، میں اس کی وضاحت بھی کر دوں۔

مراقبے کی کیفیت اختیار کرنے کے بعد کچھ دیر تک گھپ اندھیرا طاری رہا پھر میں نے ایک درخت پر کسی پرندے کا گھونسلا دیکھا جس میں ایک معصوم فاختہ سکون سے بیٹھی تھی۔ جب اچانک تیز آندھی چلنی شروع ہوئی تو فاختہ گھونسلے سے نکل کر باہر آگئی لیکن اس کی بے چینی قابلِ دید تھی۔ وہ اپنے گھونسلے کے گرد منڈلاتی رہی تھی جب بجلی زور سے کڑکی تو ایک شعلہ لپکا اور اس درخت کو جلا کر راکھ کر دیا جس پر گھونسلا تعمیر کیا گیا تھا۔ فاختہ پر میرے ذہن میں نادرہ کا ہی تصور ابھرا لیکن آندھی اور بجلی کے کڑکنے کے بعد پورے درخت کا جل کر خاکستر ہونے کا مقصد پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ البتہ یہ گمان ضرور ہوا کہ کوئی ناقابلِ یقین صورت ایسی پیدا ہوئی ہوگی جس نے نادرہ کے سکون کو درہم برہم کر دیا ہوگا۔ وہ حادثہ کیا تھا؟ اگر اسے زاہدہ بیگم کا عقدِ ثانی تصور کیا جائے تو پھر خود زاہدہ بیگم کا سابقہ بیان بھی مشکوک ہو جاتا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ان کی شادی کے وقت نادرہ کی عمر پندرہ برس کی تھی اور شادی کے دو برس تک وہ نہ صرف یہ کہ اس سلسلے میں خاموش رہی بلکہ بہت خوش بھی تھی اس لیے کہ وہ عابد خان کو پہلے سے جانتی تھی۔ الغرض اگر یہ بیان غلط تھا تو ایسی صورت میں نادرہ کے انکار کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ گھر کی ریشہ دوانی سے بچنے کی خاطر تو اسے جتنا جلد سے جلد ہو سکے اپنا گھر بسا کر رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ ہرے بھرے درخت کے جل کر خاکستر ہو جانے کے اور بھی کئی پہلو نکلتے تھے جو غور طلب تھے۔ یہ بات بھی اہم تھی کہ صرف گھونسلا نہیں جلا تھا بلکہ پورا درخت قدرت کے قہر کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ ان اشاروں کے ضمن میں ایک بات پڑھنے والوں کے لیے بھی یہ عرض کروں کہ خواب یا غیبی اشاروں کو سمجھنے کا علم خداوندے کریم نے اپنے محبوب یا چند پیغمبروں کو دیا تھا۔ جو افراد خواب کے غلط مطلب اخذ کرنے میں عجلت کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ مداخلت خداوندی کے زمرے میں شمار ہو کر نقصان بھی اٹھاتے ہیں اور مفت کی پریشانی مول لیتے ہیں اس لیے دانشوروں کا کہنا ہے کہ عجلت میں اخذ کیے گئے اکثر نقصان کا سبب بنتے ہیں۔ میں ابھی غیبی اشاروں کو حل کرنے میں کوشاں تھا کہ زاہدہ بیگم نے اضطراب کی کیفیت میں کہا۔

''شاہ جی صاحب.....! کہیں ایسا تو نہیں کہ میری معصوم بچی پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہو جسے آپ کے تعویذ نے چھیڑ کر برہم کر دیا ہو۔ اس سے پیشتر نادرہ نے ہذیانی انداز میں چیخ کر برہم کر دونوں کو کبھی ہم کلام نہیں کیا تھا۔''

''جی نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''میں نے جو تعویذ دیا تھا یہ اسی کا اثر ہے کہ اس نے کھل کر اپنی بات واضح کر دی کہ وہ شادی کرنے کے لیے کسی طور پر آمادہ نہیں ہے۔ میرے نزدیک ایک لحاظ سے اور بھی اچھا ہی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں.....'' عابد خان نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''آپ نادرہ کے حقارت آمیز رویے کو کس لیے اور کس وجہ سے سراہ رہے ہیں؟''

''فی الحال میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اسے درپیش مسئلہ ناقابلِ علاج ہرگز نہیں ہے۔'' میں نے دانستہ بات کو الجھا کر جواب دیا جس کا فوری اثر بھی ہوا۔ زاہدہ بیگم اک دم سے چونک کر بولیں۔

''شاہ صاحب! ہم اب کسی بھی قیمت پر آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ آخر اصل وجہ کیا ہے؟ اگر آپ نے اس کی اصل وجہ معلوم کر لی ہے تو اس کا علاج بھی آپ کے پاس

یقیناً ہوگا؟''

''لیکن یہ بھی تو معلوم ہو کہ اصل وجہ کیا ہے جس نے نادرہ کو اس قدر گستاخ بنا دیا ہے؟'' عابد خان نے سنجیدگی کا اظہار کیا ہے؟ پہلے تو اس نے کبھی کم از کم میری موجودگی میں اس طرح چیخ کر بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''میں نا صرف آپ کی محسوسات بلکہ احساسات کو بھی بخوبی سمجھ رہا ہوں میرے عزیز! ......لیکن اگر مرض بگڑ جائے تو مریض کا علاج بھی انتہائی صبر و تحمل سے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ لوگوں نے نادرہ پر اپنی خفگی کا اظہار کیا تو پھر اس کے مرض میں کمی کی بجائے بگاڑ کی صورت کے امکان زیادہ ہیں۔''

''ہم ایسا کوئی عمل نہیں کریں گے جو ہماری بچی کے لیے تکلیف اور اذیت کا سبب ہو... مگر آپ وعدہ فرمائیں کہ ہماری مشکل کو حل کر دیں گے۔'' زاہدہ بیگم نے بڑی عاجزی سے اس بار درخواست کی۔

''آپ مجھے گناہ گار کر رہی ہیں بی بی......! مشکل کو دور کرنا صرف اور صرف اس کے اختیار میں ہے جو معبود برحق ہے۔''

''آپ کے ذہن میں نادرہ کے علاج کا کوئی حل تو ہوگا؟'' عابد خان نے پہلو بدل کر سوال کیا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے تعویذ کا جو ردعمل سامنے آیا تھا وہ عابد خان کو سوتیلا باپ ہونے کے سبب پسند نہیں آیا تھا۔ اگر نادرہ اس کی سگی بیٹی ہوتی تو اس کا ردعمل بھی کچھ اور ہی ہوتا۔

''آپ حضرات کا تعلق کہاں سے ہے؟'' میں نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کر کے سوال کیا۔

''تعلق تو کراچی سے ہی ہے لیکن تقریباً دو ماہ سے ہم کوٹری میں رہائش پذیر ہیں۔''

''اگر آپ کچھ خیال نہ فرمائیں تو کیا میں اس کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟ کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''جی ہاں......'' عابد خان نے اثباتی انداز میں سر ہلاتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''مرحوم کے کاروبار کا کچھ تعلق چونکہ کوٹری سے بھی ہے ہم اس کی دیکھ بھال کی خاطر سال میں دو تین ماہ ادھر ہی گزارتے ہیں۔''

''اوہ......!'' میں نے کچھ سوچ کر دریافت کیا۔ ''پہلی ملاقات میں آپ نے بتایا تھا کہ نادرہ آپ کو شادی سے پہلے جانتی تھی؟''

''میں نے غلط نہیں کہا تھا شاہ صاحب......!'' زاہدہ بیگم نے جواب دیا۔ ''عابد خان مرحوم کے دوست بھی تھے اور کاروبار میں بھی ہاتھ بٹاتے تھے اس لیے ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔''

''کیا اس کاروبار میں شراکت داری بھی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں......کاروبار خالصتاً مرحوم کا ذاتی تھا جسے انتقال سے دو برس قبل باقاعدہ میرے نام کر دیا تھا۔'' زاہدہ بیگم نے کھل کر وضاحت کی۔ ''شاید انہیں خدشہ تھا کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے لواحقین مجھے پریشان کریں گے۔''

''اب بھی میں ایک ذاتی سوال کرنے کی خاطر معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے دبی زبان میں بات کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ نے مرحوم سے محبت کی شادی کی تھی؟''

جواب میں زاہدہ بیگم نے نظریں نیچی کر کے رضا مندی کا خاموش اظہار بھی کر دیا، زبان سے کچھ کہنے اور اقرار کی ضرورت نہ رہی تھی۔

''شاہ جی صاحب......!'' عابد خان نے پھر مداخلت کی۔ ''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ ان سب باتوں کا نادرہ کا شادی سے انکار کا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟''

''جو مرض خطرناک صورت اختیار کر جائے اس کے لیے کئی زاویوں پر غور کرنے کے بعد ہی کسی موثر علاج کا فیصلہ زیادہ مناسب ہوتا ہے۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ حضرات کو چونکہ میرے پڑوسی افضال احمد صاحب کی سفارش حاصل ہے اس لیے میں نادرہ کے علاج کے سلسلے میں کسی کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔ آپ دونوں بھی اس کے حق میں دعا ضرور کریں۔''

''میں دست بستہ آپ کی خدمت میں عرض کروں گی کہ شاہ صاحب! اب آپ کوئی اور ایسا علاج کریں کہ ہماری مشکل اور پریشانی ختم ہو جائے۔ جوان بیٹی کی ذہنی کیفیت نے ہماری جو حالت بنا رکھی ہے وہ بھی آپ سمجھتے ہوں گے۔''

میں کچھ دیر خاموش رہا، پھر میں نے پہلو بدل کر جواب دیا۔

''عابد خان صاحب! ہوسکتا ہے کہ ایک دو دن بعد آپ کو ایک چکر اور لگانا پڑے۔ میں کچھ غور کرنے کے بعد

ہی کوئی دوسرا عمل کر سکوں گا۔''

''اگر آپ کا حکم ہو تو ہم دونوں سر کے بل حاضر ہو جائیں گے۔'' عابد خان نے کہا۔

''بلاوجہ آپ اپنی اہلیہ کو زحمت کیوں دیں گے؟'' میں نے ازراہ ہمدردی کہا تو عابد خان نے صاف گوئی سے کہا۔

''میں معذرت خواہ ہوں محترم! لیکن میں نادرہ کے سلسلے میں اس بات کو زیادہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کی ماں کو بھی ہر مرحلے میں ساتھ رکھوں، وہ اس لیے کہ ہر بات اس کے علم میں رہے۔ اسے شکایت نہ ہو کہ میں پردے میں ہوں۔''

مجھے عابد خان کا ضرورت سے زیادہ چوکنا ہونا اور محتاط رویہ مشکوک سا لگا۔ زاہدہ بیگم کے رویہ سے میں نے محسوس کیا کہ اسے ناگوار سا لگا ہے لیکن میری موجودگی میں انہوں نے بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس سلسلے میں زاہدہ بیگم کی بھی کوئی مصلحت رہی ہو۔ بہرحال وہ ان کا ذاتی معاملہ یا مسئلہ بھی ہو سکتا تھا اس لیے میں نے کچھ مناسب نہیں سمجھا کہ رائے دوں۔ اگر میں کچھ کہتا تو شاید یہ بداخلاقی ہوتی۔

جب وہ دونوں رخصت ہو گئے تو میں نے دوسرے آنے والوں سے ملاقات، مشورے اور ہدایات دینے کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن میرے ذہن میں غیبی اشارے کسی سیارے کی طرح گردش کر رہے تھے جو مجھے نادرہ کے سلسلے میں مراقبے کی حالت میں نظر آتے رہے تھے۔

بات چونکہ تازہ تازہ اور گرما گرم تھی جیسے لوہا گرم ہو جاتا ہے۔ جو صورت حال بیان کی گئی تھی وہ غور طلب بھی تھی اس لیے میں نے اس روز عشاء کی نماز کے بعد دوبارہ مراقبہ کیا اور کم و بیش وہی کچھ دیکھا جو اس سے قبل نظر آ چکا تھا۔ میں نے وقتی طور پر نادرہ کے سلسلے میں ایک جلالی عمل کرنے کا ارادہ کر لیا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن اس میں کسی عجلت بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اس لیے کہ اس میں ابھی دو دن کی مہلت باقی تھی۔ عام حالات میں بھی کسی جلالی عمل سے پرہیز ہی کیا کرتا تھا اس لیے کہ جلالی عمل کے نتائج اکثر و بیشتر زیادہ مہلک ہوتے ہیں جس میں کسی کی جان جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ مجھے خدا کی ذات پر یقین تھا کہ اگر اس نے مجھے خدمت خلق پر معمور کیا تھا تو وہی نادرہ کے پیچیدہ مسئلے میں بھی میری رہنمائی کرے گا۔

دوسرے روز میں حسب معمول عقیدت مندوں میں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

گھر ابیٹھا تھا کہ شجاعت نے ایک تنہا عورت کی بابت آگاہ کیا جو مجھ سے ملاقات کی غرض سے آئی تھی۔ شجاعت نے اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ دوسرے روز اوّل وقت آئے لیکن آج ابھی اور اسی وقت وہ ملاقات پر بضد ہے، اس لیے شجاعت نے مجھے آگاہ کرنا مناسب سمجھا۔

''کیا وہ پہلے بھی کسی دن آچکی ہے، انتظار کرنے کے باوجود دیر ہونے پر مایوس ہوکر چلی گئی ہو؟''

''میں یقین سے اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ اکثر خواتین برقع میں آتی اور چلی جاتی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ برقع پوش ہے، صرف اس کی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔''

''میں خواتین کو اوّل وقت ہی دیتا ہوں بی بی! اس لیے اگر آپ کل.....''

''مجھے یہ بات آپ کے آدمی نے دروازے ہی پر بتائی تھی لیکن میں اس وقت بہ مشکل جان پر کھیل کر آئی ہوں آج کی رات گزر گئی تو شاید میں آپ سے مل بھی نہ سکوں۔ کل کس نے دیکھا ہے؟''

''ایسی کیا پریشانی لاحق ہے آپ کو.....؟'' میں نے ازراہ ہمدردی دریافت کیا۔

جواب میں اس نے جو کہانی سنائی اس کے پیشِ نظر ضروری تھا کہ میں اس کی مدد کرتا۔ مختصراً عرض کردوں کہ اس کی بیان کردہ پریشانی یہ تھی کہ اس کا شوہر چوری چھپے دوسری شادی رچانا چاہتا ہے جس کی بھنک اسے مل گئی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کا شوہر اچھی شہرت اور عادت کا مالک نہیں ہے۔ اس کی کسی بات پر تعرض کرنے سے جان سے مارنے کی دھمکی دیتا ہے، اسے اپنی شادی کے بعد یہ علم ہوا تھا کہ وہ پیشتر بھی دو مرتبہ سہرا باندھ چکا تھا۔ اس کی یہ دو شادیاں زیادہ عرصہ اس لیے نہیں چل سکی تھیں کہ اس کی عادت اور حرکات ناقابلِ برداشت اور اذیت ناک تھیں مگر وہ اس لیے برداشت کرتی آرہی تھی کہ وہ ایک لاوارث ہے، میرے معلوم کرنے پر اس نے اپنا نام شگفتہ بانو بتایا۔

''مجھے آپ سے ہمدردی ہے بی بی! لیکن ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔'' میں نے اس کی بپتا سننے کے بعد دریافت کیا۔ ''جب آپ کا کوئی رشتہ دار اور حمایتی نہیں ہے تو پھر آپ نے اس شخص سے بلاسوچے سمجھے شادی کیوں کرلی تھی؟''

''میں اسے بھی اپنی بدقسمتی ہی کہوں گی۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں اپنی مظلومیت کا اظہار کیا۔ ''میرے سابقہ شوہر نے اپنی ایک خودغرضی کے تحت طلاق نامہ تھما دیا تھا جس کے بعد میں بالکل بے سہارا ہوگئی۔ عدت پوری کرنے کے دوران مجھے میرے موجودہ شوہر نے جب شادی کا پیغام بھیجا تو میرے پاس اسے قبول کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ طلاق کے بعد میرے جس پڑوسی نے مجھے ازراہ ہمدردی وقتی طور پر پناہ دی تھی اس کی بیوی بھی کسی نہ کسی طرح مجھ سے چھٹکارا چاہتی تھی اس لیے میں نے آنکھ بند کرکے ہامی بھرلی۔ ایک برس تک سکون رہا۔ اس دوران مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ میرا دوسرا شوہر کس قماش کا ہے؟ مگر اسے برداشت کرنے کے سوا کچھ اور کرنے کی حالت میں نہیں تھی اس لیے صبر وشکر کے ساتھ گزارہ کرتی رہی لیکن اب جب اس نے علی الاعلان کہنا شروع کردیا ہے کہ وہ ایک اور شادی کرنے والا ہے تو میری جان پر بن آئی ہے۔ مجھے بغیر اجازت آنے جانے کی آزادی نہیں ہے لیکن اب آج اتفاق سے موقع مل گیا اس لیے آپ کے پاس یہ درخواست لے کر آئی ہوں کہ میری مدد فرمائیں۔ اگر آپ نے بھی منہ موڑ لیا تو میرے پاس حرام موت مرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوگا۔''

''آپ کا قیام کہاں ہے؟'' میں نے اس کی مکمل المناک روداد سننے کے بعد دریافت کیا۔

''کراچی میں۔''

''حیدرآباد آنا کس کے ساتھ ممکن ہوا؟''

''یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جس پڑوسن نے مجھے آپ کا پتا دیا اس کا ایک عزیز یہاں حیدرآباد میں رہائش پذیر ہے۔ میری قسمت سے وہ کراچی آیا ہوا تھا بڑی منت سماجت کے بعد اپنے ساتھ لانے کو اس شرط پر تیار ہوا تھا کہ وہ دور سے مجھے آپ کا پتا بتا کر چلا جائے گا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ رات کو ساڑھے دس بجے ایک گاڑی کراچی جاتی ہے۔'' شگفتہ بانو نے سرد آہ بھر کے جواب دیا۔ ''میں اسی گاڑی سے لوٹ جاؤں گی۔''

ہر چند کہ شگفتہ بانو کی روداد میں کئی جھول تھے لیکن وقت کے پیشِ نظر اس کی کھوج مشکل بھی تھی۔ وہ جس مقصد کے لیے آئی تھی وہ ناجائز بھی نہیں تھا اس لیے میں نے فوری طور پر اس کی مدد کی خاطر چند ضروری سوالات کیے۔

''آپ کا پورا نام بمعہ ولدیت کیا ہے؟''

''شگفتہ بانو بنت زین الدین۔''

''دوسرے شوہر کا نام؟''

''نواب چودھری ولد آفتاب چودھری۔''

میں نواب کا نام سن کر چونکا۔ زاہدہ بیگم اور عابد خان نے بھی نواب چودھری کا ذکر پہلی ملاقات کے وقت کیا تھا جس نے زاہدہ بیگم کو نا صرف شادی کی پیشکش کی تھی بلکہ دوسری شادی کے وقت دھمکی بھی دی تھی۔ اس ضمن میں اس شخص کا چہرہ بھی ابھرا جس نے کچھ دن قبل ہی مجھ سے بڑے سہل انداز سے ملاقات کی تھی۔

''خاتون.....!'' میں نے شگفتہ بانو کو مخاطب کیا۔ ''کیا آپ مجھے نواب چودھری کا حلیہ تفصیل سے بتا سکتی ہیں؟''

جواب میں مجھے جو حلیہ بتایا گیا وہ اس کا تھا جو مجھ سے مل چکا تھا میں نے تصدیق کرنے کی خاطر سنجیدگی سے دوسرا سوال کیا۔

''کیا آپ کسی زاہدہ بیگم کے نام سے واقف ہیں شگفتہ بی بی؟''

''جی نہیں۔'' شگفتہ بانو نے فوری جواب دیا۔

''کیا آپ نے کسی عابد خان کا نام سنا ہوا ہے؟''

اس بار میرے اس سوال پر شگفتہ بانو بری طرح چونکی۔ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر کسمسا کر بولی۔ ''یہ میرے پہلے شوہر کا نام ہے جس نے دولت کے لالچ میں مجھے طلاق دے کر ایک بیوہ سے دوسری شادی کر لی لیکن آپ اسے کس طرح اور کب سے جانتے ہیں؟'' وہ بڑی حیران ہو رہی تھی۔

''فی الحال میں اس کا جواب نہیں دوں گا بی بی! مگر آپ نے میری ایک بڑی مشکل حل کر دی ہے جس کے لیے میں اللہ کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔ اگر آپ اس وقت مسیحا بن کر نہ آتیں تو شاید وہ گتھی کبھی نہ سلجھتی جو مجھے درپیش تھی۔ میں آپ کو فوری طور پر ایک آزمودہ تعویذ دے رہا ہو جو زعفران سے رقم کیا گیا ہے، آپ اسے کسی طرح پانی، شربت یا چائے میں گھول کر پلا دیں اس طرح سے کہ اسے کوئی شک نہ ہو سکے۔ اگر اس نے پینے سے انکار کر دیا تو پھر آپ کا مسئلہ حل نہ ہو سکے گا۔ مجھے خدا کی ذات برتر سے قوی اُمید ہے کہ آپ کا بدقماش شوہر دوسری شادی کا ارادہ ترک کر دے گا۔ وہ جس عورت سے شادی کا ارادہ رکھتا ہے اسے اس عورت سے شدید نفرت ہو جائے گی۔ وہ عورت جب کبھی سامنے آئے گی وہ اسے کسی چڑیل کی مانند مکروہ لگے گی۔ وہ نا صرف آپ کا وفادار بلکہ ایک زرخرید غلام کی طرح بن کر رہے گا۔''

میں نے ایک تیار شدہ تعویذ کی ضروری خانہ پری کرنے کے بعد شگفتہ بانو کے حوالے کر دیا۔ چونکہ وہ بھی واپسی کی جلدی میں تھی اس لیے عابد خان کے بارے میں زیادہ کریدنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں نے اسے ایک اور تعویذ بھی دیا تھا کہ سفر کے دوران اس کی آبرو پر آنچ نہ آئے کیونکہ برقع میں بھی اس کے حسن و شباب کی کرشمہ سازیاں اس کے نشیب و فراز میں بجلیاں بن کر مردوں کو متوجہ کر سکتی تھیں۔ رخصت ہوتے وقت اس نے اتنا ضرور کہا تھا۔

''شاہ جی.....! اللہ کرے آپ کی زبان مبارک ہو۔ اگر آپ کا دیا ہوا تعویذ اور دعائیں کام آ گئیں تو میں آخری سانس تک آپ کو دعا دیتی رہوں گی۔''

شگفتہ بانو کے جانے کے فوراً بعد میں نے پہلی فرصت میں دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ اس قادر مطلق نے میرے ان اشاروں کو بڑی حد تک حل کر دیا تھا جو مجھے مراقبے کی کیفیت میں دو بار مل چکے تھے۔ اس کا تفصیلی ذکر میں بعد میں کروں گا۔ اس رات میرے ذہن میں رہ رہ کر ڈور کا وہی سرا ابھرتا رہا جو شگفتہ بانو کے آنے سے میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ دو روز بعد جب عابد خان اور زاہدہ بیگم دوبارہ اوّل وقت مجھ سے ملنے آ گئے۔ عابد خان اس وقت بھی مجھے اتنا معصوم نظر آیا تھا جتنا طمع اس نے روز اوّل سے چڑھا رکھا تھا۔ بقرعید چونکہ ایک یا شاید دو ایک روز بعد تھی اس لیے اس روز بھی گنتی کے چند حاجت مند آئے۔ میں نے دیدہ دانستہ عابد خان اور زاہدہ بیگم کو اپنی رہائش گاہ کے اندر بیٹھنے پر آمادہ کیا۔ مقصد یہی تھا کہ ان سے اطمینان سے بات کی جا سکے۔ زاہد بیگم نے میری اس پیشکش کو بغیر کسی جھجک اور تذبذب کے فوری قبول کر لیا تھا۔ میں حجرے سے فارغ ہو کر اندر گیا تو وہ دونوں میرے مختصر کمرے میں بے چینی سے منتظر تھے۔ چند رسمی جملوں کے بعد گفتگو کا آغاز خود عابد خان نے کیا۔

''میں انتہائی شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہم سے علیحدگی میں گفتگو کرنے کا اپنا قیمتی وقت نذر کیا۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ اطمینان سے گفتگو کی جائے۔''

''شاہ صاحب! مجھے اُمید ہے کہ آپ نے ہماری مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور تلاش کر لیا ہوگا۔'' زاہدہ بیگم نے مضمحل لہجے میں کہا۔ ''بڑا تہوار سر پر ہے لیکن نادرہ کی وجہ سے ساری خوشیاں روٹھ گئی ہیں۔''

''گتھی کے سلسلے میں ایک عمل میرے ذہن میں ہے

جسے میں آپ حضرات کے بغیر نہیں کرسکتا۔'' میں نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا تو زاہدہ بیگم نے بے چینی سے دریافت کیا:

''اگر کوئی عمل آپ کے ذہن میں ہے تو اس میں ہماری اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ نادرہ کسی سے شادی کرنے پر آمادہ ہوجائے تو اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی ہے ہم دونوں کی یہی خواہش ہے۔''

''درست فرمایا آپ نے مگر کچھ عمل ایسے ہوتے ہیں جو کسی ایک کے حق میں سودمند ہوتے ہیں مگر دوسرے کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوسکتے ہیں۔''

''کیا آپ کسی جلالی عمل پر غور کررہے ہیں؟'' عابد خان نے پہلی مرتبہ میری توقع کے عین مطابق قدرے الجھن کا اظہار کیا۔

''جی ہاں.....'' میں نے سادگی سے جواب دیا۔

''مجھے مراقبے کی صورت میں جو دوبار مبہم اشارے ملے ہیں وہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ جلالی عمل کیا جائے لیکن ایک بات پھر قبل از وقت ہے جو عرض کردوں کہ کامیابی یا ناکامی کا انحصار بہرحال اس قادر مطلق کے اختیار میں ہے جو دلوں کے بھید جانتا ہے۔''

''میں اب بھی یہ سمجھ نہیں سکی کہ آپ کسی عمل کے کرنے میں اس قدر تاویل کیوں کررہے ہیں؟'' زاہدہ بیگم نے مجھے وضاحت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری بیٹی کسی طور پر ہماری بات مان لے، ہمارا بنیادی مقصد یہی ہے۔''

''آپ کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟'' میں نے عابد خان کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہم دونوں کا ایک ہی مدعا ہے محترم! لیکن ایک بات قبل از وقت عرض کردوں۔'' عابد خان نے میری توقع کے عین مطابق بڑی کسر نفسی سے جواب دیا۔ ''میں ذاتی طور پر جلالی عمل کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا لیکن سنا ضرور ہے کہ اس میں صاحب معاملہ کو آدھی رات میں قبرستان جانا پڑتا ہے یا پھر کسی پرانے قبرستان کی سب سے قدیم اور بوسیدہ قبر کے اندر کوئی تعویذ وغیرہ دبانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی عامل حضرات کچھ ایسی خوفناک ہدایتیں دیتے ہیں کہ جسے کم ازکم میں پورا نہیں کرسکوں گا اور نہ ہی اپنی اہلیہ کو اس بات کی اجازت دوں گا۔''

''جلالی عمل کے بارے میں کچھ خطرناک کام ضرور انجام دینے پڑتے ہیں لیکن اب نادرہ والے اس معاملے میں اس کے علاوہ دوسرا راستہ بھی کم ازکم مجھے نظر نہیں آتا۔ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''میں جو کچھ سمجھ چکا ہوں اسی کی بنیاد پر فیصلہ بھی کیا ہے اور اب آپ حضرات کو اس کا آخری فیصلہ کرنا ہے اگر آپ مجھ سے مطمئن نہیں ہیں تو بے شک کہیں اور قسمت آزمائی کرلیں۔''

''جب آپ نے ارادہ کر ہی لیا ہے تو میں کہیں اور نہیں جاؤں گی۔'' زاہدہ بیگم نے دبی زبان میں شوہر سے اختلاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ پھر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ مجھے یہ بتائیں کہ اس عمل کی خاطر مجھے کیا کرنا ہوگا؟ اولاد کی بہتری اور اس کی زندگی کی خاطر میں ایک ماں ہونے کے ناتے ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔''

''مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی لیکن جو کام کرنا ہے اس کے لیے کسی مرد کی خدمات کی ضرورت ہے۔''

''کیا کرنا ہوگا ہمیں.....؟'' عابد خان نے دل پر جبر کرکے سوال کیا۔ اسے شاید زاہدہ بیگم کا جواب پسند نہیں آیا تھا۔

''آپ حضرات کو صرف اجازت دینی ہوگی۔'' میں نے اس بار عابد خان کے چہرے کے تاثرات کو بھانپ کر کہا۔ ''آپ اگر کسی بات سے ڈرتے ہیں یا خوفزدہ ہیں تو میں آپ کو کسی مشکل سے دوچار نہیں کروں گا۔ یہ بھی عرض کردوں کہ میں نے جس عمل کا فیصلہ کیا ہے اس میں کسی قبرستان میں آدھی رات کو جانے یا کسی بوسیدہ قبر میں کھڑے ہوکر کوئی جنتر منتر پڑھنے والا بے ہودہ کام بھی نہیں ہے۔ مجھے چار روز تک چار فتیے جلانے ہوں گے۔ یہ خدمت میں خود انجام دے لوں گا مگر ایک بات صاف طور پر بتادوں اس میں کسی ایسے فریق کو نقصان بھی ہوسکتا ہے کہ جس نے نادرہ کو شادی سے باز رکھنے کی کوئی بھی ایسی کوشش کی ہوگی۔''

''اگر بالغرض ایسی کوئی بات ہے تو آپ پہلی فرصت میں فتیے جلانے کا نیک کام کرڈالیں۔'' زاہدہ بیگم نے کہا۔ ''جس نے ہمارے ساتھ دشمنی کی اور اس معصوم بچی کو ورغلایا ہے اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' عابد خان نے پہلو بدل کر کہا۔ ''آپ اپنا عمل فوراً کریں۔ ایک دن کیا، لمحہ بھر کی بھی تاخیر نہ کریں..... پھر جو اوپر والے کو منظور ہوگا۔''

کچھ دیر بیٹھ کر وہ دونوں چلے گئے تو میں نے اسی

رات مطلوبہ فیتے بھی تیار کر لیے اور دوسرے روز سے ایک مقرر وقت پر خدا کا نام لے کر جلانا بھی شروع کر دیے۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ بقرعید کے دوسرے دن میں نے دوسرا فیتہ جلایا۔ تیسرے دن عید کی وجہ سے حجرا بند تھا لیکن شجاعت نے مجھے تنہا عابد خان کی آمد کی اطلاع دی تو میں نے اسے اندر بلالیا۔ عابد خان نے مجھ سے بڑی گرم جوشی سے گلے ملنے کے بعد کہا۔

''شاہ جی صاحب! افضال احمد صاحب نے جو کچھ آپ کے بارے میں بتایا تھا وہ ہمارے حق میں نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ میں آپ کو یہ اطلاع دینے کی غرض سے آیا ہوں کہ نادرہ نے اچانک اور غیر متوقع طور پر خود اپنی زبان سے شادی پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہے۔ یہ درشتہ میں نے لگایا ہے، ادھر لڑکے والے بھی نادرہ کی ماں کی خوشی پوری کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ تین روز کے بعد سادگی سے نکاح کی رسم ادا کر دی جائے گی۔ پھر ایک ماہ کے اندر اندر رخصتی بھی ہو جائے گی۔ یہ سب کچھ آپ کے عمل اور خدا کی مرضی کا پھل ہے۔''

''بے شک! وہی مشکلوں میں آسانیاں بھی پیدا کرنے والا ہے۔ میری طرف سے آپ کو بچی کی خوشی مبارک ہو۔'' میں نے خلوص دل سے جواب دیا۔

''شاہ صاحب! ایک چھوٹی اور عاجزانہ درخواست اور بھی ہے۔''

''فرمایئے.....؟'' میں نے چونک کر عابد خان سے سوال کیا۔ ''کیا کوئی نیا مسئلہ.....؟''

''جی نہیں..... میں یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اگر نادرہ کے نکاح میں آپ کی شرکت بھی ہو جائے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔''

''نکاح کے لیے معذرت خواہ ہوں البتہ رخصتی کے وقت اگر فارغ ہوا تو ضرور کوشش کروں گا۔''

''میں اب اجازت چاہتا ہوں۔'' وہ جانے کے ارادے سے اٹھا، پھر رک کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ شاید اب آپ کو مزید فیتے جلانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

''جلالی عمل کو مکمل کیے بغیر ادھورا چھوڑ دینا مناسب نہیں ہوتا۔'' میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''دو فیتے باقی رہ گئے ہیں۔ ان کے جلانے کے بعد ان شاء اللہ بچی کی تمام مشکلات خدا کے حکم سے دور ہو جائیں گی۔''

''آپ جیسا مناسب اور بہتر خیال کریں۔'' عابد خان اپنا جملہ مکمل کر کے رخصت ہو گیا۔

میں نے مراقبے میں ملنے والے اشاروں اور شگفتہ بانو سے ملاقات کے بعد جلالی عمل کا جو فیصلہ کیا تھا وہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ چند شبہات جو میرے ذہن میں ابھرے تھے وہ بھی درست ثابت ہوئے تھے۔ اس کی تصدیق خود دبی زبان میں زاہدہ بیگم نے کر دی۔ نادرہ کے نکاح کے تقریباً ایک ہفتہ یا دس دن بعد مجھ سے ملنے تنہا آئیں تو میں نے ان کے چہرے لکھی تحریروں سے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کسی نئے غم کا شکار ہوئی ہیں۔ میرے استفسار پر انہوں نے نظریں جھکالیں اور نئی افتاد کا اظہار بھی دل پر جبر کر کے کہا۔

''شاہ صاحب.....! نادرہ کے نکاح کے دو روز بعد میرے شوہر پر نہ جانے اچانک کیا دورہ پڑا کہ وہ واہی تباہی بکنے لگے..... کچھ ایسی باتیں، انکشافات اور لغویات ان کی زبان سے ادا ہوئیں کہ جنہیں سن کر میں کانپ اٹھی۔ اگر میں مضبوط اعصاب کی مالک نہ ہوتی تو شاید بے ہوش ہو کر گر جاتی۔ میں نے خود کو کس طرح سنبھالا یہ میرا دل اور میرا خدا جانتا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی باپ اپنی سطح سے اس قدر بھی گر سکتا ہے۔''

''اب آپ کے شوہر کی کیا کیفیت ہے؟'' میں معاملہ کی تہہ میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے ان کی پریشانی اور جملے کا مفہوم بھانپ کر عابد خان کے بارے میں دریافت کیا۔

''وہ نفسیاتی اسپتال میں زیر علاج ہے اور اسے رسیوں سے جکڑا ہوا ہے کیونکہ کسی بھی نرس کو دبوچ کر من مانیاں کرنے لگتے تھے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے۔'' انہوں نے کانپتے ہوئے لبوں سے بتایا۔

''کیا اب آپ اپنے شوہر کے لیے بھی مجھ سے.....''

''مجھے شرمندہ نہ کریں شاہ جی صاحب!'' زاہدہ بیگم نے ہاتھ مسلتے ہوئے نیک نیتی سے جواب دیا۔ ''جو سزا اس پر قدرت کے عتاب کی شکل میں داخل ہوئی ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت ٹال نہیں سکتی..... ایسا سوچنا بھی کسی گناہ سے کم نہیں ہے۔''

''بے شک! آپ نے بجا فرمایا۔ اس کے فیصلوں کے بعد کوئی پرندہ بھی پر مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔'' زاہدہ بیگم کے جانے کے فوراً بعد میں نے پہلی فرصت میں بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہو کر نماز شکرانہ ادا کیا جس نے شگفتہ بانو کے ذریعے ایک طرح سے غیبی اشاروں کو حل کرنے میں

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

میری مدد فرمائی تھی۔ شگفتہ بانو نے عابد خان کے کرتوتوں اور سیاہ کاریوں کی اصل تصویر الفاظ میں کھینچ دی تھی۔ زاہدہ بیگم نے آخری ملاقات پر ہر چند کہ عابد خان کی باتوں، انکشافات اور لغویات کی وضاحت نہیں کی تھی۔ صرف علامات میں بات کی تھی لیکن ایک باپ کو جو خواہ سوتیلا ہی کیوں نہ ہو اپنی سطح سے گرنے کی جو بات کی تھی میرے اس شبہے کی تصدیق بھی کردی کہ وہ بدبخت، کینہ اور خبیث عابد خان ہی تھا جس نے نادرہ کی آبرو اور زندگی برباد کردی تھی۔ اس کی شادی کے بعد وہ اسے کھلونا بنا کر غالباً اپنی خباثت جاری رکھنا چاہتا تھا جس کے خوف سے نادرہ نے سرے سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا۔

میں اب آپ کو تفصیل اور وضاحت سے بتاتا ہوں کہ اصل کہانی کیا ہے۔ زاہدہ بیگم چونکہ بیمار بیمار رہتی تھیں اس لیے انہوں نے اپنی شادی سے پہلے تمام دولت اور جائیداد نادرہ کے نام کردی تھی جبکہ انہیں اپنی شادی سے قبل اپنی نوجوان بیٹی کی شادی اصولاً کردینا تھی یا بعد میں بھی کرسکتی تھیں۔ عابد خان ایک اوباش مرد تھا وہ لڑکیوں کی نفسیات اور کمزوریوں سے واقف تھا۔ زاہدہ بیگم چونکہ سیدھی سادی سی عورت ہیں انہوں نے اپنے شوہر کو سمجھنے میں غلطی کی لیکن عابد خان نے نہیں کی۔ عابد خان نے یہ دیکھا کہ نادرہ سولہ برس کی لڑکی ہے ایک نوجوان لڑکی کی یہ عمر بے حد خطرناک ہوتی ہے، اس نے ماحول اور گھر کی تنہائی سے فائدہ اٹھایا، اس نے نادرہ کو ایک ایسا موبائل فون لاکر دیا اور اسے سمجھایا کہ وہ اس سے کیا کیا دیکھ سکتی ہے، نادرہ کو چونکہ ہر طرح کی آزادی تھی وہ ایسے تنگ و چست لباس پہنتی تھی کہ بے لباس لگتی تھی۔ اس کی بے حجابی نے دہکتا ہوا آتش فشاں بنادیا۔ عابد خان کوئی فرشتہ، زاہد یا پارسا نہیں تھا، اس نے کتنی کلیوں کو پھول بنایا تھا، دوشیزاؤں کو عورت..... وہ اس فن میں ماہر تھا۔ نادرہ اس کی جھولی میں ٹپک پڑی تو یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ اس کے علم میں شادی سے قبل ہی یہ بات آچکی تھی کہ نادرہ اپنے باپ کی دولت اور جائیداد کی تنہا وارث ہے جو زاہدہ بیگم کے نام تھی۔ زاہدہ بیگم نے بیٹی کے مستقبل کی خاطر اپنی شادی سے پہلے ہی جائیداد اس کے نام اس لیے کردی تھی کہ کہیں سوتیلا باپ کسی حیلے بہانے سے ہڑپ نہ لے۔ اس نے نادرہ کو بلیک میل کرنے کے لیے زاہدہ بیگم کی عدم موجودگی میں کلوروفارم سونگھا کے بے ہوش کیسا پھر اس کی نامناسب حالت کی تصویریں اتاریں اور نادرہ کو بلیک میل کرنے لگا۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا، وہ ایک شکاری تھا، اس نے نادرہ اور دولت کو ہتھیانے کے لیے منصوبہ بنایا۔ اس نے زاہدہ بیگم کی ایک جھوٹی طبی رپورٹ بنوائی جس میں ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ وہ صرف ایک ڈیڑھ برس کی مہمان تھی۔ اس رپورٹ کا مقصد یہ تھا کہ زاہدہ بیگم کو سلوپائزن کردے۔ اس طرح سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی، پھر اس کے بعد نادرہ سے شادی کرکے اس کی ساری دولت اور جائیداد ہتھیالے گا۔ عابد خان نے نادرہ سے کہا ہوا تھا کہ وہ شادی سے انکار کرتی رہے۔ وہ دونوں زاہدہ بیگم کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان کی غیر موجودگی میں میاں بیوی بن جاتے تھے۔ زاہدہ بیگم کی یہ فاش ترین غلطی تھی کہ انہوں نے اپنی شادی سے قبل اور بعد میں فوری طور پر نادرہ کی شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ اس بات کی قائل نہیں تھی کہ نادرہ ابھی تو سولہ برس کی ہے اس عمر میں شادی کرنا مناسب نہیں ہے۔ اللہ رسول کا فرمان ہے کہ لڑکی کے بالغ ہوتے ہی اس کا گھر بسا دیا جائے۔ جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے ہیں وہ اس کا خمیازہ بھگتتے ہیں۔ موبائل فون، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے کتنی ہی لڑکیوں کو بارہ، تیرہ برس اور پندرہ، سولہ برس اور اٹھارہ، بیس برس کی لڑکیوں کو داغ دار کیا ہوا ہے۔ کتنی مائیں اس داغ کو مٹانے اسپتالوں اور زچہ خانوں میں ہزاروں کی رقم خرچ کرتی ہیں۔ جیسا بھی لڑکا ملے اس سے بیاہ دیتی ہیں۔ عابد خان نے جس مرد سے نادرہ کا رشتہ طے کیا تھا وہ ایڈز کا مریض اور دو ایک مہینے کا مہمان تھا۔ نکاح تو ہوگیا تھا لیکن رخصتی کی نوبت نہیں آئی تھی، نکاح کے ایک ماہ بعد نادرہ بیوہ ہوگئی تھی۔

ہمارے ہاں جو معاشرہ موبائل، انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی زد میں آزادانہ ماحول کا عادی اور ماڈرن ہونے لگا ہے۔ بہنوئیوں، سالیوں، دیور، بھابیوں سے بے تکلفی ہوجاتی ہے وہ رنگ ضرور لاتی ہے، شرح طلاق جو بڑھ رہی ہے وہ شرمناک حد تک ہے۔ بے حیائی بڑھانے میں ٹی وی ڈراموں، کیبلز، موبائل فون اور انٹرنیٹ کا اہم کردار ہے۔ دس بارہ برس کی بچیوں کے ہاتھوں میں بے حد قیمتی موبائل نظر آتے ہیں جس سے وہ ہر ممنوع فلمیں دیکھ لیتی ہیں۔ آج کے والدین اور سرپرست اندھے ہوچکے ہیں، ان بچیوں سے شیطان، خبیث لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ میں مزید کیا عرض کروں۔ سب آپ کے سامنے ہے۔

++